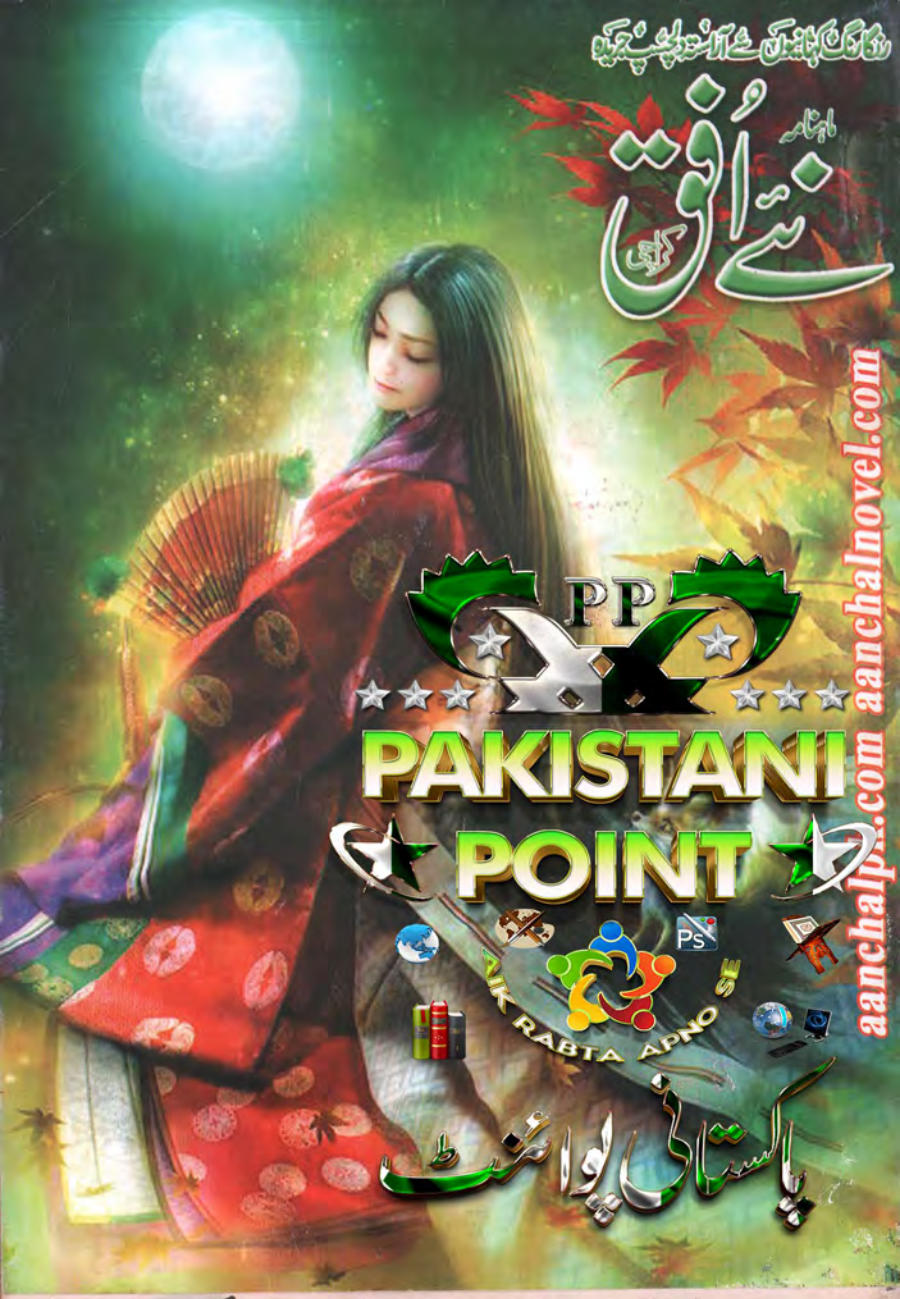

رنگارنگ کہانیوں سے آراستہ دلچسپ جریدہ
ماہنامہ
نئے اُفق
کراچی
aanchalnovel.com
PP
PAKISTANI
POINT
AIK RABTA APNO SE
پاکستانی پوائنٹ

نئے اُفق

مدیر اعلیٰ
مشتاق احمد قریشی
مدیر
اقبال بھٹی
مدیر معاون
طاہر احمد قریشی
مترجمین
نورالدین

جلد	41
شمارہ	07
اگست	2017

رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹر
رکن چیمبر آف کامرس

NAEYUFAQ
PUBLICATION

پاکستان (فی پرچہ)..........50 روپے
پاکستان (سالانہ)..........600 روپے

اشتہارات و رابطہ
0300-8264242

aanchalpk.com
aanchalnovel.com
naeyufaqonlinemagzine
aanchal.com.pk/blog
onlinemagazinepk.com/recipes
editorufaq@aanchal.com.pk

دستک — مشتاق احمد قریشی — 10

گفتگو — اقبال بھٹی — 12

اقرأ — طاہر قریشی — 20

دل مشکل — حسین اشرف — 22

سیانا کوا — ریاض بٹ — 48

ایک سو سولہ چاندکی راتیں — عشنا کوثر سردار — 64

سنہرے لوگ — سلیم اختر — 86

سرفروش — تفسیر عباس بابر — 96

ایفائے عہد — زرین قمر — 138

پبلشر مشتاق احمد قریشی پرنٹر جمیل حسن مطبوعہ ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

دفتر کا پتا: 7 فرید چیمبرز عبداللہ ہارون روڈ صدر کراچی

پتھارے والا
عارف شیخ 144

روٹی کا ٹکڑا
صداقت حسین ساجد 158

میلا پراتا
اسحاق جنجوعہ 166

ہو جذبۂ عشق گر
فاطمہ عبدالخالق 174

وفا کی دیوی
عائشہ بٹ 190

فن پارے 193

ذوق آگہی
سباس گل 224

خوش بوئے سخن
نوشین اقبال نوشی 228

مرشد
ساحر جمیل سید 232

ادارہ استابت کا پتہ: "آنچل" پوسٹ بکس نمبر 75 کراچی 74200 فون: 021-35620771/2
فیکس 021-35620773 یکے از مطبوعات نئے اُفق پبلی کیشنز۔ ای میل info@aanchal.com.pk

دستک

مشتاق احمد قریشی

امریکی بلی تھیلے سے باھر آگئی.....!!

گزشتہ دنوں سعودی عرب نے قطر سے نہ صرف اپنے سفارتی تعلقات منقطع کیے اس کے ساتھ ساتھ متحدہ عرب امارات، مصر، بحرین وغیرہ نے بھی سفارتی تعلق ختم کردیا یہ سب کچھ سعودی عرب میں ہونے والی ایک کانفرنس جس میں امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ بھی شریک ہوئے تھے کہ بعد ہوا تجزیہ کاروں کا کہنا ہے کہ اس ساری کارروائی کے پس پشت امریکا کا ہاتھ ہے امریکا کہ موجودہ صدر ڈونلڈ ٹرمپ جو ایک معروف تاجر ہیں جن کی کئی مختلف تجارتی کمپنیاں عالمی سطح پر کام کررہی ہیں وہ اپنے منصب صدارت کو بھی اپنی تجارت کی طرح ہی چلا رہے ہیں سعودی عرب جو پہلے ہی یمن اور شام کے محاذوں میں الجھا ہوا ہے اور دھڑا دھڑ ان محاذوں پر امریکی اسلحہ استعمال کررہا ہے سعودی عرب پہلے ہی اربوں ڈالر کا اسلحہ امریکا سے خرید چکا ہے اب ایک اور معاہدے کے تحت ایک سو دس ارب ڈالر کے ہتھیار خریدے گا امریکی ادارے پینٹا گون کے ترجمان کے مطابق اس معاہدے سے قطر اور امریکا کے درمیان سیکورٹی تعاون بڑھانے میں مدد ملے گی کیونکہ حالیہ حالات جنگ کے باعث قطر حکومت نے بھی امریکا سے بارہ ارب ڈالر کا معاہدہ کیا ہے اس معاہدے پر امریکی وزیر دفاع جیمز میٹس اور قطر کے وزیر دفاع خالد بن العطیہ نے دستخط کیے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ اس سے داعش کے خلاف جاری جنگ میں مدد ملے گی، اگر دیکھا اور سمجھا جائے تو امریکا کا اپنے ہتھیار فروخت کرنے اور اپنی اسلحہ ساز فیکٹریوں کو مسلسل چلتا رہنے کے لیے کہیں نہ کہیں میدان کارزار گرم رکھنا ضروری ہے اپنی اسی حکمت عملی کے تحت امریکا نے سعودی عرب اور قطر کو آمنے سامنے کھڑا کردیا ہے اگر کسی وجہ سے یا کسی ثالثی کی کوششوں سے جنگ نہ بھی ہوتو بھی امریکا کا تو الوسیدھا ہو ہی گیا اس کے ہتھیار تو فروخت ہو ہی گئے اب انہیں کب اور کیسے استعمال کرنا ہے یہ بعد کا مسئلہ ہے امریکا ان ہتھیاروں کو استعمال کرائے بغیر چین سے بیٹھنے والا نہیں ہے کیونہ فروخت شدہ اسلحہ استعمال ہوگا تب ہی ان ممالک کو مزید اسلحہ کی ضرورت پڑے گی۔

امریکا ہی کیا تمام یورپی ممالک کا یہ شیوار ہا ہے کہ لڑاؤ اور حکومت کرو، ویسے بھی چاہے یورپ ہو یا امریکا ان کا نزلہ مسلمانوں پر ہی گرتا ہے یہ خود تو آگ لگا کر ہاتھ تاپنے والوں میں شامل رہتے ہیں اور ایک طرف روس تو دوسری طرف امریکا متحارب ممالک کے پشت پر آکر اس کی حوصلہ افزائی کرنے لگتا ہے کہ چڑ جا بیٹا سوئی پہ رام بھلی کرے گا، ہر دونوں فریق لڑنے والوں کی حوصلہ افزائی اور تعاون کے خالی خولی وعدوں پر مسلمانوں کا خون بہانے میں ہر طرح سے مدد کرنے میں پیش پیش رہتے ہیں گزشتہ نصف صدی کی تاریخ اٹھا کر دیکھ لی جائے تو ان تمام غیر مسلم ممالک میں تمام تر اختلافات کے باوجود کبھی میدان کارزار نہیں سجا ہاں اپنی سرپرستی میں کبھی کویت کو ایران سے لڑوا دیا کبھی عراق کو ایران پر چڑھا دیا تو کبھی خود اپنی غرض اور مفادات حاصل کرنے کیلئے مسلم ملک پر چڑھائی کردی عراق میں کوئی جوہری اسلحہ نہ ہونے کے باوجود جوہری ہتھیاروں کی تیاری اور موجودگی کا الزام لگا کر عراق کے تیل کی پیداوار پر قابض ہوگئے ایسے ہی افغانستان کو اپنے نشانے پر رکھ لیا ہے کہ روس یا چین افغانستان پر نہ ہاتھ صاف کرلے یہاں بھی اسلحہ کی تجارت کا پہلو اپنی جگہ کام کرتا نظر آتا ہے ایک طرف خود امریکا اپنے جدید ترین ہتھیاروں کو آزما کر تجربہ کررہا ہے تو دوسری طرف مدمقابل بھی امریکی اسلحہ ہی استعمال کررہا ہے امریکا خود اپنا اسلحہ اپنے مدمقابلوں کو خفیہ ذرائع سے مہیا کررہا ہے جیت بھی اپنی پٹ بھی اپنی، اسی بھاگ دوڑ میں روس بھی پیچھے رہنے والا نہیں ہے وہ بھی اپنا اسلحہ طالبان، داعش اور دیگر دہشت گرد تنظیموں کو اپنے خفیہ ذرائع سے مہیا کررہا ہے اگر مسلمان آپس میں لڑیں گے نہیں تو ان کے مضبوط ہونے متحد ہونے کا خطرہ رہتا ہے اور اگر مسلمان ممالک کو لڑا تا رکھا جائے تو اس طرح ان کی تیل اور دیگر ذرائع سے حاصل ہونے والی آمدن جمع کرنے کے بجائے وہ امریکی خزانے میں جمع ہوتی رہے گی اگر مسلم ممالک آپس میں نہیں لڑے گے اور امریکا سے اپنی حفاظت کے نام پر اسلحہ نہیں خریدیں گے تو پھر وہ آہستہ آہستہ خود کفیل ہوتے چلے جائیں گے پھر وہ امریکا اور اس کے زیر سایہ کام

کرنے والے مالیاتی ادارے آئی ایم ایف اور ورلڈ بینکوں کے مقروض بھی نہیں رہے گے اس لیے بھی ضروری ہے کہ ان قدرتی وسائل کے حامل اسلامی ممالک کو کسی نہ کسی حیلے بہانے سے ایک دوسرے سے الجھائے رکھا جائے ابھی تو سعودی عرب کو پھکی دے کر میدان کی طرف دھکیلا جارہا ہے سعودی عرب پہلے ہی مالی مسائل کا شکار ہے اب رہی سہی کسر اور پوری ہوجائے گی۔

کچھ تجزیہ کاروں کا کہنا یہ بھی ہے کہ امریکا اور روس کی خواہش ہی نہیں بلکہ پوری پوری کوشش ہے کہ مسلم ممالک ان کی لگائی آگ میں کود پڑیں ایران اپنی جگہ اپنی حفاظت یعنی سیکیورٹی کے نام پر اپنی تیاریوں میں مصروف ہے اگر کہیں واقعی قطر اور سعودی عرب میدان جنگ میں آمنے سامنے آجاتے ہیں تو ایران جو ہر ایسی جگہ جہاں سعودی عرب مداخلت کرتا ہے یا اپنی تائید وحمایت کا اظہار کرتا ہے تو ایران سعودی عرب مخالفت میں اس کے مدمقابل کی حمایت میں اس کی پشت پناہی کے لیے آ کھڑا ہوتا ہے یمن اور شام میں دراصل مقابلہ داعش یا حواشیوں سے نہیں بلکہ ایران اور سعودی عرب میں ہو رہا ہے سعودی عرب تو کھل کر میدان میں کود چکا ہے جبکہ ایران حسب سابق حسب معمول پس پردہ رہ کر ہی روس کی معاونت سے اپنا کام کررہا ہے وہ یمن اور شام میں امریکی ارشاد کے مطابق دہشت گردوں کی معاونت کرتا ہے جبکہ روسی ذرائع کے مطابق ایران اپنی ملت کی حفاظت وحمایت کررہا ہے ایسے ہی خیالات کا سعودی عرب نے بھی اظہار کیا ہے اگر دیکھا جائے تو امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ کے تھیلے سے بلی باہر آ گئی ہے۔

صورت حال جو بھی ہو چاہے خربوزہ چھری پر گرے یا چھری خربوزے پر نقصان خربوزے کا ہی ہوتا ہے ایرانی بھی مسلمان ہیں اور سعودی اور اس کے حلیف بھی مسلمان ہیں دونوں متحارب فرقے مسلمانوں کے ہیں، دونوں ہی اسلام کے نام لیوا ہیں پھر اختلاف کس بات کا ہے پھر کیوں آپس میں دست وگریباں ہیں ہوش کے ناخن کیوں نہیں لیتے اپنے اصل دشمنوں کو کیوں نہیں پہچانتے بظاہر کلمہ کے ماننے والے اور تمام دیگر مذاہب کے ماننے والے مسلمانوں سے ہمیشہ سے خوف زدہ رہے ہیں کلیسا ہمیشہ سے مسلم دشمنی میں ہر قسم کے وسائل کا بے دریغ استعمال کرتا ہے مسلمانوں کی دشمنی ان کی گھٹی میں پلا دی جاتی ہے جب نائن الیون کا سانحہ ہوا تھا تو اس وقت کے امریکی صدر کے منہ سے بے ساختہ نکلا تھا کہ صلیبی جنگ شروع ہوگئی ہے۔ اس کا سارا ملبہ والزام امریکی اداروں نے مسلم امت پر ڈال دیا اور برسوں کی تحقیق کے بعد ثابت ہوگیا کہ وہ ساری کارروائی ان کی اپنی ہی تھی صرف اس لیے کہ مسلمانوں پر الزام لگایا جاسکے اور افغانستان پر چڑھائی کی جاسکے امریکا نے نائن الیون کی آڑ لے کر ہی تو افغانستان کی اینٹ سے اینٹ بجائی تھی لیکن اسے یہ سودا مہنگا پڑ رہا ہے برسوں گزر جانے کے باوجود افغان اس کے قابو میں نہیں آرہے امریکا اب تک اپنے اربوں ڈالر افغانستان میں لٹا چکا ہے لیکن پھر بھی افغانستان پر تمام تر کوششوں کے باوجود مکمل طور پر قبضہ حاصل نہیں کرسکا اب اس کی برداشت جواب دیتی جارہی ہے وہ آہستہ آہستہ پسپا ہورہا ہے سانپ کے منہ میں چھچھوندر پھنس کر رہ گئی ہے نہ نگلتے بن رہی ہے نہ اگلتے بن رہی ہے اس کی برداشت کہ وہ کیسے ایران سے نمٹے، دراصل ایران بڑی ہوشیاری سے امریکی چالوں کو مات دے رہا ہے امریکا کی سمجھ میں نہیں آرہا کہ وہ کیسے ایران سے نمٹے کیونکہ اگر ایران پر براہ راست حملہ آور ہوتا ہے تو اس کی پشت پناہی کے لیے روس اور کسی قدر چین بھی میدان میں آسکتے ہیں کیونکہ امریکی ایجنسیوں کے مطابق ایران، روس میں، افغانستان میں، یمن شام میں اور ہر اس جگہ جہاں ایرانی ملت کے حامی موجود ہوتے ہیں وہ ان کے حفاظت کے نام پر وہاں سامنے آ کھڑا ہوتا ہے چونکہ وہ براہ راست میدان عمل میں نہیں آتا اس لیے نہ امریکا اور نہ اس کے حلیف ہی اس پر کسی طرح ہاتھ ڈال سک رہے ہیں اس کے لیے وہ اپنے حلیف مسلم ممالک جن میں سعودی عرب پیش پیش ہے کو آگے کردیتا ہے قطر کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے کیونکہ اگر جنگ چھڑی تو ایران قطر کی حمایت کرے گا، آنے والے دنوں کے لیے سعودی عرب اور اس کے حلیفوں نے بھی اپنی تیاریاں مکمل کرلی ہیں دوسری طرف قطر اور اس کے حمایتی ایران بھی پوری طرح تیار کھڑے ہیں اللہ مسلم امہ کو شعور بخشے اور توفیق دے کہ وہ کلیسا کی ان سازشوں کو سمجھیں اور عقل سے کام لیتے ہوئے اس آنے والی آفت سے بچیں اللہ ہماری ہماری قوم کی پوری مسلم امہ کی ہر طرح سے حفاظت فرمائے، مسلمانوں کی نادانیوں، غلطیوں کو معاف فرمائے، آمین۔

گفتگو

اقبال بھٹی

"حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میری امت بہتر فرقوں میں تقسیم ہو جائے گی سب کے سب جہنم میں جائیں گے سوائے ایک امت کے۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے پوچھا یا رسول اللہ! وہ کون سی امت ہے؟ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا جس پر میں اور میرے صحابہ ہیں۔" (الترمذی، ابوداؤد و احمد)

نئے افق کا شمارہ اگست حاضر خدمت ہے۔

اس شمارے کے ساتھ ہی آج دل گرفتگی کا شدید احساس ہو رہا ہے، محترم ابن صفی صاحب کی یاد شدت سے آ رہی ہے اس کی وجہ فیس بک پر ہونے والے ان کے ذکر نے ایک بار پھر سوئے ہوئے جذبوں کو جگا دیا ہے محبان ابن صفی نے بڑے خلوص سے اپنے جذبات عقیدت کے اظہار کیلئے ابن صاحب کے قارئین کو دعوت دی ہے کہ وہ اپنے جذبات احساسات کا اظہار اپنے قلم کے ذریعے کریں یوں کئی نئے لکھنے والے سامنے آئیں گے اور ان کی خوب صورت جذباتی تحریریں اب تک سامنے آ چکی ہیں میں ان تمام احباب کو دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں اللہ تعالیٰ تمام محبان ابن صفی کو جزائے خیر سے نوازے میری کوشش ہوگی کہ ان مضامین کو بتدریج نئے افق کی زینت بنا سکوں۔

نئے افق کے مدیر جناب اقبال بھٹی الحمدللہ آپ کی دعاؤں سے کافی بہتر ہو چکے ہیں جلد ہی ان شاء اللہ وہ اپنی ذمہ داریاں سنبھال لیں گے۔

مجید احمد جائی.....ملتان شریف۔ مزاج گرامی! اُمید واثق ہے خیر سے خیر بانٹتے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ تمام جہانوں کی خوشیاں، نعمتیں، رحمتیں، عطا کرتا رہے۔ صحت و تندرستی کے ساتھ حق اور سچ کی زندگی بسر کرنے کی توفیق عطا فرمائے آمین ثم آمین! ماہ جولائی کا نئے اُفق عید سعید کہتا کسی جنگ جو پری کے خوبصورت ٹائٹل کے ساتھ موصول ہوا۔ سرورق جاذب نظر اور دل کش ہے۔ کون کتنا پہلوان ہے؟ کے عنوان سے مشتاق احمد قریشی صاحب خوبصورت فکر انگیز کالم تحریر فرما رہے ہیں۔ بے شک الیکشن مہم کا آغاز ہو چکا ہے اور اکثریت یہی کہہ رہی ہے کہ اگلی حکومت بھی ن لیگ کی ہوگی۔ عوام اتنی بے حس ہے یا مجبور کہ ان کے قدرت میں فیصلہ کرنا ہی نہیں ہے۔ حق کہتے ہیں تو سر کٹتا ہے اور جھوٹ کا ساتھ دیتے ہیں تو بھی خود مرتے ہیں۔ عجیب اُلجھن کا شکار ہیں۔ اس عوام پر حکومت مسلط کی جاتی ہے یہ حکومت کہاں بناتے ہیں۔ رہا سوال بدعنوان اور بدکردار سے محفوظ رہنا کا، تو کہیں نہ کہیں ہمارا اپنا قصور بھی ہے۔ ہم خود ہی تو رشوت دیتے ہیں۔ آواز اُٹھاتے نہیں دباتے ضرور ہیں۔ آج بھی اس قوم کا ہر فرد یہ عہد کر لے کہ نہ رشوت لوں گا نہ دوں گا، اور سود سے توبہ کر لیں تو یہ قوم اور اس کی قسمت بدل سکتی ہے۔ آج بھی قائداعظم اور محمد اقبال جیسے مفکر کی ضرورت ہے۔ خود سے انصاف کرنے لگیں تو انصاف بھی انصاف فراہم کرنے لگ جائے گا ان شاءاللہ! گفتگو کی محفل میں پہنچا تو مشتاق احمد قریشی صاحب ابن صفی کی برسی کی یاد دلا رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے آمین۔ یہ سطور لکھ رہا ہوں تو

27 رمضان المبارک جمعۃ الوداع ہے۔ ان مبارک گھڑیوں کے صدقے دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ تمام اہل مسلم کو جہاں کہیں بھی بیمار ہیں، گھروں میں اسپتالوں میں بیمار ہیں، ان کو صحت کاملہ عطا فرمائے اور خصوصی طور پر محترم اقبال بھٹی کو اپنے پیارے حبیب ﷺ کے صدقے اور اس جاتے مہمان، رمضان المبارک کے صدقے صحت کاملہ عطا فرمائے آمین ثم آمین! ریاض بٹ صاحب صدارت مبارک، بہت شکریہ آپ نے اپنی محبتوں سے نوازہ۔ جاوید احمد صدیقی بہت شکریہ، محمد رفاقت بہت نوازش، میں پورا رسالہ پڑھتا ہوں تو ظاہری سی بات ہے تبصرہ طویل ہوتا ہے پھر بھی کافی باتیں رہ جاتی ہیں، ہر کہانی پر تبصرہ کیا جائے تو خط نہیں کہانی بن جائے گا۔ صائمہ نور، ریاض حسین قمر آپ کی محبتوں پہ قربان۔ اللہ تعالیٰ خوش حال رکھے آمین! ایم حسن نظامی مختصر خط کے ساتھ حاضر ہوئے، عبدالجبار رومی انصاری بہت شکریہ، پرنس افضل شاہین، اپنا ایڈریس میرے نمبر پر سینڈ کرنا۔ گفتگو کی محفل شاندار رہی۔ اقراء میں (المومن) امن وامان دینے والا، تفصیلی آگاہی ملی۔ عمل سے بنتی ہے زندگی جنت بھی جہنم بھی کے مصدق اللہ تعالیٰ ہمیں عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے آمین! میں اور میرا تخلیقی عمل (دستگیر شہزاد) کے بارے پڑھنے کو ملا۔ ماشاءاللہ اچھا تعارف کرایا ہے اور سو باتوں کی ایک بات خوبصورت پیغام ہے کہ مطالعہ زیادہ سے زیادہ کریں۔ اچھی کتاب ہی انسان کی ناؤ پار لگاتی ہے۔ کتاب سے بڑھ کر سچی دوستی نہیں ہے اور اہم بات یہ کہ کتاب کبھی دھوکہ نہیں دیتی۔ کہانیوں میں تفتیشی کہانی ''اللہ رکھا'' پڑھی، کہانی حسب سابق اچھی تھی۔ ریاض بٹ صاحب (بھتی) کی وضاحت کردیں۔ مجھے اس کا نہیں پتا شاید زبان کا فرق ہے گرداب، عرفان رامے کی بہت خوبصورت تحریر جس کا آغاز شاندار تھا اور عورت کی مکاری کوئی نہیں جان سکتا وہ اپنے مفاد کے لئے کچھ بھی کرسکتی ہے۔ جہاں میں جتنے فساد ہوتے ہیں عورت کے دم سے ہیں۔ تانیہ کی صورت ایک مکار عورت تھی جس نے اپنی خواہش کے لئے اپنے شوہر کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے دھکیل دیا۔ محبت اور نفرت زبردست تحریر تھی۔ اسی طرح مقدر کا لکھا، عشق وشق، بددعا، حاضر غائب اور سلسلہ وار خوبصورت رہیں۔ مرشد نے رولا دیا۔ فن پارے کی تحریریں بھی اعلیٰ تھیں۔ ذوق آگہی اور خوش بوئے سخن نے رونق بحال رکھی۔

صائمہ نور...... ملتان شریف۔ السلام علیکم! ماہنامہ نئے اُفق جولائی کا شمارہ میرے ہاتھوں میں اپنی خوشبو پھیلا رہا ہے۔ تبصرہ کی طرف بعد میں جاؤں گی پہلے مجھے اپنے پیاروں کے لئے دُعائیں مانگنی ہیں۔ پیارے انکل محمد اقبال بھٹی کے شدید علالت کے بارے پڑھا تو دِل کو دھچکا سا لگا۔ لبوں سے فوراً الفاظ ادا ہوئے ''یااللہ! صحت دے''۔ بڑے کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے پیاروں کو امتحان میں ڈال کر آزماتا ہے اور امتحانات میں کامیابی دعاؤں سے ملتی ہے، میں دعا مانگتی ہوں اپنے پیارے رب سے، جس نے ہمیں رزق دیا بے پناہ نعمتیں دی۔ اے میرے پیارے اللہ! اپنے نیک بندوں کے صدقے، لیلۃ القدر کے صدقے، اس پیارے ماہ صیام کے صدقے تمام بیماروں کو صحت عطا کرے، خاص طور پر اقبال بھٹی صاحب کو صحت کی دولت سے مالا مال فرما! اے میرے رب، اہل مسلم جہاں کہیں بھی کسی مصیبت، پریشانی میں مبتلا ہیں، ان سے اُن کو نجات عطا فرما اور اپنے رحمتوں کے صدقے، خوشیوں کی دولت عطا کرے۔ آمین ثم آمین! سرورق بہت پیارا ہے۔ دستک میں انکل مشتاق احمد قریشی سیاسی حوالے سے کالم لکھ رہے ہیں۔ کوئی بھی حکومت آئے ہم (عوام) یونہی پستے رہیں گے۔ جب تک ہم وڈیرہ شاہی، جاگیرداروں کے ڈر سے اپنے ووٹ کا درست استعمال نہیں [illegible] گے۔ اس کے علاوہ الیکشن کے دنوں سیاسی لوگ جھونپڑیوں کی طرف چکر پہ چکر لگاتے ہیں۔ مرگ پہ [illegible] ٹوٹی سڑکیوں پہ آنکلتے ہیں، پھر وہی لمبے لمبے وعدے، وہی جھوٹ اور عوام پھر ان پہ یقین کرکے ان کو

ووٹ دے کر خود کے ساتھ ناانصافی کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ لیاقت علی خان جیسے کوئی لیڈر ہی بھیج دے۔ اپنا نیک بندہ جو عوام پہ ترس کرے۔ عوام کے حالات ابتر سے بہترین بنا دے آمین۔ گفتگو کی رونق عروج پر تھی۔ ریاض بٹ اس بار "افق" محفل کی صدارت کر رہے تھے۔ آپ کی کہانیاں لاجواب ہوتی ہیں، میں جھوٹ نہیں کہتی اور میں [illegible] سچ ہوتا ہے وہی بیان ہوتا ہے۔ اب کی بار "اللہ رکھا" نوراں کی صورت اچھا مخبر ملا ہوا [illegible] کا کردار بہت پسند آیا۔ بلیک میلنگ سے بچنے کے لئے خوبصورت مشورہ ہے۔ ساجن جیسے ناسور [illegible] واضح ہیں۔ کردار و واقعات، مکالمہ بازی، جملوں کا جڑنا ہر لحاظ سے بہترین کہانی تھی۔ جاوید احمد [illegible] محمد رفاقت، مجید احمد جائی، ریاض حسین قمر، ایم حسن نظامی، عبدالجبار رومی انصاری، پرنس افضل [illegible] تمام کا شکریہ، مجھے یاد رکھا۔ آپ سب کے خطوط جاندار تھے اور محبتوں بھرے تھے۔ اقراء میں انکل طاہر [illegible] نے "المومن" کے بارے میں تحقیقی اور مدلل لکھا۔ اللہ تعالیٰ تمام مسلمانوں کو مومن بنائے آمین! میں اور [illegible] ملاقاتی محمل (دستگیر شہزاد) تعارف کا یہ انداز بھی اچھا ہے۔ بہت اچھے مشورے بھی ملے۔ بہت سی دعائیں [illegible] اب، محمد عرفان رامے نے کمال کہانی لکھی۔ تانیہ کا کردار مکاری روپ میں کتنا بھیانک تھا۔ عورت ہی عورت کی دشمن ہے اور معاشرے میں فسادی کردار ادا کرتی ہے اور دین اسلام کی پیروی میں اپنا کردار ادا کرے تو اس جیسا مضبوط اور کوئی نہیں۔ بددعا، سلیم اختر بہت عمدہ۔ زبردست کہانی (آپ کی صحت اب کیسی ہے) اللہ تعالیٰ صحت کے ساتھ سلامت رکھے آمین! محبت اور نفرت، مختصر کہانی میں بہت کچھ کہہ دیا گیا ہے۔ محبت ہوتی ہی ایسی ہے چاہے انسان کے ساتھ ہو حیوان کے ساتھ۔ حاضر غائب زریں قمر عمدہ لکھتی ہیں۔ بہت مطالعہ ہے ان کا۔ مقدر کا لکھا، اور عشق وشق، یادگار محبت، اچھی تھیں۔ سرفروش نے اپنی گرفت میں جکڑ لیا۔ ایک سولہ چاند کی راتیں عمدہ ہے۔ اسی طرح فن پارے کی تمام تحریریں ایک سے بڑھ کر ایک ہیں۔ ذوق آگہی اہل ذوق کے لئے بہت خوبصورتی کے ساتھ سجا گیا۔ خوش بوئے سخن میں بھی سخن ور اپنا اپنا کلام پیش کر رہے ہیں۔ آخری صفحات پر مرشد کا آغاز عمدہ، ایک پڑھنے والی تحریر۔ اگلی قسط کا بے چینی سے انتظار ہے۔ جاتے جاتے تمام لکھاریوں اور نئے افق کی ٹیم کو گزشتہ عید مبارک قبول۔ اور جو قارئین لکھاری غیر حاضر ہیں وہ جلدی سے اس پلیٹ فارم پر حاضر ہوں۔

زرین قمر...... کراچی۔ صبح کے ساڑھے چار بجے ہیں میں عموماً اپنے کام کا آغاز اسی وقت کرتی ہوں آج لکھنے سے پہلے کل کی ڈاک میں آیا ہوا نئے افق اٹھایا تو اپنی کہانی سے پہلے آپ کے انٹرویو پر نظر پڑی چند سطریں پڑھنے پر رسالہ رکھنا بھول کر پڑھتی چلی گئی بہترین تحریر ہے یہ اپنی قسم کا منفرد انٹرویو ہے جس میں متعلقہ شخصیت کی تعریفوں کے بجائے اس کی ادبی تخلیقات کی اہمیت، وسعت، خصوصیت کے بارے میں تحریر نے چپکے سے یہ بھی بتا دیا کہ لکھنے والا صرف لفاظی نہیں کر رہا بلکہ اس انٹرویو میں بیان کردہ تمام باتوں پر پورا اترتا ہے کیونکہ اس نے جو بھی کچھ بیان کیا ہے وہ اس تمام کیفیت اور تجربے سے گزرا ہے اور برساتی لکھاریوں میں سے نہیں آپ کی اس تحریر کا ایک ایک لفظ بلا تردد سچ ہے واقعی یہ حقیقت ہے کہ زندگی کی تمام کیفیتوں سے گزرے بغیر یا انہیں جھیلے بغیر انھیں مؤثر انداز میں ان کی سچائی کے ساتھ بیان نہیں کیا جا سکتا میں اس بات سے بالکل متفق ہوں کہ کسی کہانی کو لکھنے کے لئے اس کے پورے بیک گراؤنڈ پر دسترس بہت ضروری ہوتی ہے ورنہ کہانی بے اثر رہتی ہے آپ یہاں تک کا سفر جن دشواریوں سے طے کر کے یہاں تک پہنچے ہیں ہر اس شخص کے لئے یہ ضروری ہے جو ادب کے آسمان کا ستارہ بننا چاہتا ہے آپ کا کہنا درست ہے کہ کامیابی کے لئے صرف دو چیزوں کی

ہوتی ہے اللہ کا کرم اور محنت دنیا میں اللہ کے کرم سے بڑی کوئی طاقت اور محنت سے بڑا کوئی استاد نہیں
آپ کا یہ انٹرویو روایتی انٹرویو سے ہٹ کر ہے اور اس میں بیان کیئے گئے حقائق کو مشعل راہ بنا کر نئے لکھنے والے
کامیابی حاصل کر سکتے ہیں میں نئے افق کے اقبال بھٹی اور طاہر قریشی کو مبارکباد دیتی ہوں کہ انہوں نے ایسا بے
مثال انٹرویو شائع کیا جو نئے لکھنے والوں کے لیئے کامیابی کی کنجی ثابت ہوسکتا ہے۔ طاہر خوش رہیں کل مجھے نئے
افق ... کا انٹرویو پڑھ کر میں بہت متاثر ہوئی اور بے اختیار اس پر تبصرہ کرنے کو جی چاہا اگر کسی کی
... بات نہ کی جائے تو میں اسے ناانصافی سمجھتی ہوں تبصرہ آپ کو بھیج رہی ہوں اسے نئے افق کی اگلی
... میں شامل کرلیں اگر مناسب سمجھیں۔

پرنس افضل شاہین...... بہاولنگر۔ اس بار جولائی کا نئے افق ملا تو فوراً ہی چھٹیاں شروع
ہوگئیں وہ بھی عید کی اس لیے تبصرہ تھیم جولائی کو بھیج رہا ہوں سرورق دیکھا تو حسینہ ہاتھوں میں خنجر پکڑے ہماری
طرف بڑھ رہی تھی، ہم تو اسے یہی کہہ سکتے ہیں۔

اپنے قاتل کی ذہانت سے پریشان ہوں میں
روز اک موت نئے طرز کی ایجاد کرے

اداریہ تک میں آپ میاں صاحب کو خوب درست سنا رہے تھے واقعی اب ان کی جان چھٹتی نظر نہیں
آ رہی ہے۔ لگتا ہے جب تک میرا یہ خط شائع ہوگا پاناما کیس کا فیصلہ ہو چکا ہوگا اور نئے الیکشن کی تیاری میں
پارٹیاں اپنا پنی جماعتیں زور لگا رہی ہوں گی جیتنے کے لیے گزشتہ دنوں میری ماں جیسی عظیم ہستی میری ساس کا انتقال ہو گیا
ہے نئے افق پڑھنے والے تمام ساتھیوں سے گزارش ہے کہ وہ میری ساس کے لیے دعائے مغفرت ضرور کریں،
اقرا میں طاہر بھائی اللہ تعالیٰ کے صفاتی نام المومن کے بارے میں آگاہ فرما کر ثواب کما رہے تھے میں اور میرا
تخلیقی عمل میں معروف لکھاری دستگیر شہزاد نے اپنے بارے میں تفصیلی تعارف کرایا بہت ہی پسند آیا بھٹی صاحب
آپ کے بارے میں پڑھا کہ آپ ان دنوں شدید علیل ہیں تو ہمیں بہت پریشانی ہوئی ہماری دعا ہے اللہ تعالیٰ
آپ کو مکمل صحت وتندرستی عطا فرمائے، آمین ثم آمین۔ ریاض بٹ بھائی سرورق پر لکھے گئے میرے اشعار آپ کو
پسند آتے ہیں بہت شکریہ۔ آپ کا تبصرہ شاندار ہوتا ہے، محمد رفاقت بھائی جی ہاں آپ نے ٹھیک پہچانا میں ہی
ہوں نام۔ جنگ کے بچوں کا صفحہ میں لکھا کرتا تھا اور آج کل جنگ سنڈے میگزین میں لکھ رہا ہوں مجید احمد جائی،
ساجد نور، ایم حسن نظامی، عبدالجبار رومی انصاری، میری نگارشات پسند فرمانے کا بہت بہت شکریہ، جاوید احمد
صدیقی، ریاض حسین قمر آپ کے خطوط بھی بہت اچھے تھے کہانیوں میں زرین قمر کی حاضر غائب، عرفان رامے کی
انتخاب، سلیم اختر کی بددعا، خلیل جبار کی مقدر کا لکھا پسند آئیں، ذوق آگہی میں ایم حسن نظامی، تہمینہ تبسم، ریاض
حسین قمر... بزم سخن میں سباس گل، علی اصغر انصاری، مدیحہ مدو، سائبہ کنول، صائمہ ناز چھائے رہے آپ اسٹاف
... لیے کہوں گا۔

نہ جانے کون دبے پاؤں خواب میں آیا
کھلی جو آنکھ تو خوش بو سے بس رہا تھا مکان

محمد رفاقت...... نواب آباد۔ محترم ایڈیٹر صاحب۔ السلام علیکم جناب اس دفعہ کا رسالہ
... طرف سے آپ کو اور آپ کی ٹیم کو مبارک باد قبول ہو اور ساتھ ہی عید کی بھی مبارک ہو، اس دفعہ
... ہونا۔ پاراچنار بم دھماکے کوئٹہ میں دشت گردی اور سب سے بڑھ کر احمد پور شرقیہ میں قیمتی

جانیں ضائع ہوئیں اس سے دل خون کے آنسو رو رہا ہے، پورا پاکستان اداس ہے۔ پانامہ کا کیس بھی اپنے انجام کی طرف تیزی سے بڑھ رہا ہے اور جلد ہی اس کا فیصلہ ہو جائے گا اور شاید اگلے شمارے میں یہ فیصلہ ہو چکا ہو، اس سے پاکستان کی سیاست کیا موڑ لیتی ہے یہ تو بعد ہی میں پتا چلے گا صرف ایک بات جو کہ یہ ہے کہ عدلیہ کا بول بالا ہو اور حق اور سچ کی فتح ہو، اس سے ہی پاکستان کے وقار میں اضافہ ہوگا۔ ادھر بھارت اور امریکا کے ایک دوسرے کے بہت قریب آ گئے ہیں اپنے بجٹ میں جنگی سامان زیادہ سے زیادہ خرید رہے ہیں اور جدید جنگی سامان بھارت اپنی فوج میں شامل کر رہا جس سے خطے میں امن کا توازن بگڑ رہا ہے اور حالیہ بیان امریکی صدر کا اس سے مسلمانوں اور خاص کر کشمیری مسلمان میں بہت بے چینی پھیل ہے اب وقت آ گیا ہے کہ حکمران ہوش کے ناخن لیں حالت پر کڑی نظر رکھیں اور سوچ سمجھ کر قدم اٹھائیں، جبکہ قطر کے حالات بھی تیزی سے بدل رہے ہیں اس پر بھی حکومت کو نظر رکھنی چاہیے اور جلد بازی میں کوئی غلط فیصلہ نہ ہو جائے، کلبھوشن کے معاملے میں بھارت عالمی عدالت میں چلا گیا ہے یہ پاکستان کے لیے اچھا نہیں ہوا اس سے معاملہ طول پکڑ گیا ہے اور فیصلہ پاکستان کے خلاف بھی ہو سکتا ہے۔ پاکستان کے لیے بڑی اور خوشی کی خبر بھی اس رمضان میں ملی کہ پاکستان نے بھارت کو کرکٹ میں شکست دے کر چیمپئن ٹرافی حاصل کر لی اور اس سے پاکستانیوں کے دل خوش ہو گئے ہیں میری طرف سے تمام ٹیم کو مبارک قبول ہو۔ اقبال بھٹی صاحب کی بیماری کا سن کر بہت دکھ ہوا میری اللہ سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اقبال بھٹی صاحب کو جلد صحت و تندرستی دے، آمین۔ آتے ہیں رسالے کی طرف عید کی وجہ سے رسالہ دیر سے ملا اور مکمل پڑھ نہ سکا جو پڑھا بہت اچھا تھا اس کے لیے آپ سب لوگ تعریف کے قابل ہیں، ان شاء اللہ پھر ملاقات ہوگی، اجازت، آپ کا خیر اندیش۔

ایم حسن نظامی..... قبولہ شریف۔ سلام مسنون امید ہے آپ اور ہمارے پرچے سے وابستہ سبھی احباب بخیریت ہوں گے پرچہ جنگی جنون سے مزین دوشیزہ سنگ جلوہ گر ہوا اور عید الفطر کی مسرتوں کو بھی دوبالا کر گیا آپ نے سیاست دانوں کے دلوں پر دستک دے کر کامیاب و کامران ایڈیٹر ہونے کا ثبوت پیش کر دیا جو کہ باعث عبرت ہے گفتگو میں بھٹی صاحب کی علالت کا سن کر بے حد دکھ ہوا خداوند کریم انہیں جلد تندرستی کی نعمت سے نوازے آمین۔ کرسی صدارت پر ریاض بٹ صاحب جلوہ افروز پائے انہوں نے بہت سی وضاحتیں اور اصلاحی گفتگو کی جاوید احمد صدیقی عرصہ بعد بزم یاراں میں حاضر ہوئے مگر باتیں اور فقرات پایہ کے کہہ گئے، جی ویلکم محمد رفاقت، صائمہ نور، ریاض حسین قمر، عبدالجبار رومی انصاری اور ہمارے پرنس جی سبھی پرچے پر مدلل تاثرات باریک بینی سے رقم فرما رہے تھے میری نگارشات کی پسندیدگی پر ڈھیروں شکریہ۔ طاہر قریشی صاحب کی ایمان افروز باتیں ہمارے لیے راہ نجات کا درجہ رکھتی ہیں اور خداوند کریم کی قربت بھی اسی میں ہے دستگیر شہزاد نے اپنا تعارف پنگی اور ترجیحات سے ہمارے گوش گزار کیا اور اسی صلاحیت کے جوہر ظاہر کیے زرین قمر صاحبہ نے انگریزی ادب کو زبان دے کر بہت خوب صورتی سے پیش کیا ویلڈن جی اور عرفان رامے کا بھی بہت بڑا نام ہے وہ لفظوں، فقروں اور کرداروں کی کڑیاں ملانا بخوبی جانتے ہیں عشنا کوثر سردار کے قلم سے بھی بے پناہ طاقت اور روانی پائی۔ سر سلیم اختر پر اسرار داستان لائے جو بے حد پسند آئی۔ ریاض بٹ زندگی کے نجی کرداروں کے بے نقاب کرتے نظر آتے، اللہ رکھا اور نوراں کا کردار بلاشبہ سراہنے کے قابل ہے تفسیر عباس بابر کی تحریر کا دوسرا حصہ بے حد اچھا لگا۔ خلیل جبار اور مہتاب خان کا ڈرامائی انداز تحریر بلاشبہ سراہنے کے قابل ہے، فلک شیر ملک اور دستگیر شہزاد دونوں کی تحریریں مقابل ٹھہریں اور من کو بھا گئیں فن پارے کے بھی لکھاری ایک

دوسرے پر سبقت میں تھے تبھی سبھی نے خوب محنت کی۔ ذوق آ گہی اور خوش بوئے سخن کی شاعری پر ہر ایک کے جذبات کی عکاسی پائی۔ ساحل جمیل سید کی 10 ویں کڑی انمول لفظوں کا احاطہ کیے ہوئے پائی ریحانہ سعیدہ کی شاعری دل کو بھا گئی میری طرف سے اس قدر اچھا، معیاری اور منفرد مواد فراہم کرنے پر سبھی احباب کا دلی شکریہ۔

ریاض حسین قمر...... منگلا ڈیم۔ محترم و مکرم جناب مشتاق احمد قریشی صاحب سلام شوق امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوں گے ماہ جولائی 2017ء کا نئے افق پیش نظر ہے، عید سعید کی خوشیوں کی نوید دیتا ٹائٹل بہت خوب صورت لگا آپ نے دستک کے عنوان کے تحت ''کون پہلوان ہے'' کے زیر عنوان جو کچھ لکھا ہے اس سے کسی باشعور کو انکار ہو سکتا ہے آپ ہر ماہ اپنے اداریے میں جس طرح بہت سے ذمہ داروں کو خواب غفلت سے بیدار فرمانے کی کوشش کرتے ہیں وہ صرف آپ ہی کو زیبا ہے مگر کوئی جاگے تو سہی گفتگو کے آغاز میں بہت پیار حدیث بیان ہوئی، ساتھ ہی محترم اقبال بھٹی صاحب کی شدید علالت پڑھ دل کو شدید جھٹکا لگا خدائے لم یزل انہیں اپنے پیارے حبیب ﷺ کے صدقے صحت کاملہ و عاجلہ عطا فرمائے آمین۔ ابن صفی مرحوم کے لیے بھی دل سے دعا نکلی کہ خداوند مقدس انہیں اپنے فضل خاص سے جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے، آمین۔ گفتگو میں اس بار کرسی صدارت میرے پیارے بھائی ریاض بٹ صاحب نے سنبھالی ہے محترم بہت بہت مبارک ریاض بھائی مشیت ایزدی اور قانون قدرت کے آگے ہم سب مجبور محض ہیں ہم انسانوں کے بس میں تو کوئی بات ہے ہی نہیں آپ کی حوصلہ افزا باتوں نے میری بہت ڈھارس بندھائی ہے اس پر اللہ تعالیٰ آپ کو اجر عظیم عطا فرمائے اور آپ کا خط اور تبصرہ بہت خوب صورت ہے اور تفتیشی کہانی اللہ رکھا حسب روایت بہت جاندار ہے اللہ کرے زور قلم اور زیادہ پیارے بھائی جاوید احمد صدیقی صاحب غالباً کافی دیر کے بعد گفتگو میں تشریف لائے ہیں بھائی آپ نے دیر سے تعزیت کی آپ کی باتوں سے دلی دکھ جھلکتا ہے اس پر میں آپ کا شکر گزار ہے، دراصل اپنے قریبی پیارے دوست ہی دوسرے کا دکھ محسوس کرسکتے ہیں آپ نے سچ فرمایا کہ غیر مسلم اپنے تہوار کو اپنے پیغمبر کا دن سمجھ کر اپنے منافع ان کی عظمت پر قربان کردیتے ہیں اور ہم بد بخت مسلمان خالق کائنات کے اس خاص ماہ کو لوٹ مار کا مہینہ بنادیتے ہیں اور برملا کہتے ہیں کہ یہ ایک مہینہ ہی تو ہماری کمائی کا مہینہ ہے باقی گیارہ ماہ تو ہم جھکیں مارتے ہی رب کریم ہمیں سمجھ بوجھ عطا فرمائے اور ہمارے دلوں میں رب کائنات نے اس خاص مہینے کا ادب واحترام کرنے کا جذبہ موجزن فرمادے، محمد رفاقت کا مختصر تبصرہ بھی خوب تھا مجید احمد بھائی صاحب اپنے جاندار خط کے ساتھ گفتگو میں شریک ہوئے انہوں نے بہت خوب صورت بات لکھی ہے خوشیاں بانٹنے سے بڑھتی اور غم بانٹنے سے کم ہوتے ہیں محترمہ صائمہ نور صاحبہ کا خط بڑا مدلل اور جاندار ہے آپ نے میری زوجہ محترمہ مرحومہ مغفورہ کو بھائی جان لکھ کر میرا مان بہت بڑھایا ہے رب کریم آپ کی دعاؤں کو شرف قبولیت عطا فرمائے ہوئے مرحومہ کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے، آمین ثم آمین۔ بھائی ایم حسن نظامی صاحب مختصر مگر جامع تبصرہ کے ساتھ تشریف لائی محترم ہمارے تبصروں کو پسند فرمانے پر ہماری طرف سے قبول فرمائیے گا، محترم جناب عبدالجبار رومی کی تبصرہ خوب صورت ہے پرنس افضل شاہین صاحب کا تبصرہ بھی قابل غور ہے انہوں نے اپنے طور پر کچھ تجاویز دی ہیں بھی ان کی تائید کرتا ہوں امید ہے ادارہ ان پر ضرور غور فرمائے گا گفتگو میں اس بار صرف نو خطوط کا شامل ہونا غالباً محترم اقبال بھٹی کے شدید علیل ہونے کی وجہ سے ہے اللہ انہیں صحت کاملہ و عاجلہ عطا فرمائے، آمین۔ اقرا کا تو جواب ہی نہیں اور محترم طاہر احمد قریشی اسے

جس انداز سے پیش فرمارہے ہیں یہ ان کی ان تھک محنت کو ظاہر کرتا ہے باقی خوش بوئے سخن اور ذوق آگہی کا انتخاب خوب بلکہ خوب تر ہے تمام کہانیاں اپنی اپنی جگہ خوب صورت ہیں اللہ تعالیٰ ہمارے اس جریدے کے معیار کو اسی طرح برقرار رکھے، آمین۔

عمر فاروق ارشد..... فورٹ عباس۔ امید کرتا ہوں کہ مزاج بخیر ہوں گے جولائی کا نئے افق عین عید کے روز ہاتھ میں آیا تو گویا عید کی خوشی دوبالا ہوگئی لیکن سرورق پر اتنی خطرناک حسینہ، دونوں ہاتھوں میں ہتھیار اللہ کرے سب ٹھیک ہو، تیور بھی غضب ناک ہیں بہرحال آنکھیں چراتے ہوئے اندر داخل ہوگئے گفتگو میں محترم اقبال بھٹی صاحب کے علیل ہونے کی خبر ملی، اللہ انہیں جلد از جلد صحت کاملہ عطا فرمائے پرویز بلگرامی صاحب پچھلے دنوں بتارہے تھے کہ اقبال بھٹی صاحب کا شمار اولین دور کے ایڈیٹرز میں ہوتا ہے اور وہ ادب کے میدان میں پرانے کھلاڑی ہیں اللہ انہیں سلامت رکھے، آمین، خطوط کی محفل کا تین دفعہ بغور معائنہ کرنے پر بھی اپنا تبصرہ نظر نہ آیا تو دادا جان کی بڑی شیشوں والی عینک لگا کر دیکھا مگر بے سود یقین کریں اب تو ای میل جیسی خرافات پر ہمارا اعتبار ہی اٹھ گیا ہے وقت میں کمی کے باعث پچھلی مرتبہ تبصرہ میل کر دیا تھا ادارے کی طرف سے جواب بھی موصول ہوا مگر تبصرہ کیوں شامل نہ ہوسکا یہ آپ بہتر بتا سکتے ہیں ریاض بٹ کرسی صدارت پر قبضہ جمائے بیٹھے تھے مبارکاں جاوید صدیقی بھائی بڑے عرصے بعد حاضر ہوئے ہیں کدھر غائب تھے یار، ہم مانتے ہیں کہ ماشاء اللہ آپ بڑے بزنس مین ہیں مگر نئے افق کے لیے بھی ٹائم نکال لیا کریں تو مہربانی ہوگی آپ نے انجینئرز اور قابل وکلوں کے ملک سے باہر جانے کے اعداد و شمار پیش کیے وہ دل دہلا دینے والے ہیں، صرف یہاں نہیں بلکہ ہر شعبے میں یہی صورتحال ہے میڈیکل میری فیلڈ ہے میں گواہ ہوں کہ میرے بڑے ہی قابل اور ذہین دوست ڈاکٹرز حکومتی پالیسیوں سے نالاں اور سرپرستی نہ ہونے کی صورت میں ہمیشہ کے لیے مادر وطن کو الوداع کہہ چکے ہیں ہم یہاں کس طرح اعصاب شکن حالات میں انسانیت کی خدمت کررہے ہیں یہ ہم سے بہتر کوئی نہیں جانتا اللہ آسانیاں پیدا فرمائے ریاض قمر صاحب خاصہ طویل لیکن خوب صورت تبصرے کے ساتھ شامل محفل تھے آپ نے جس طرح تمام دوستوں کو یاد رکھا وہ آپ کا بڑا پن ہے خوش رہیں، حسن نظامی صاحب کیسے ہیں آپ کا تبصرہ مختصر لیکن اچھا ہوتا ہے کوشش کیا کریں کہ پورے رسالے پر سیر حاصل بحث کریں، پرنس افضل شاہین میرے آبائی علاقے سے ہیں اس لیے بہت پیارے لگتے ہیں انہوں نے جو تجویز پیش کی وہ قابل عمل ہے ادارے کو اس پر ضرور غور کرنا چاہیے دستگیر شہزاد بھائی آپ کی تعریف کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں میں سمجھتا ہوں کہ انٹرویو میں شاید آپ کی شخصیت کے وہ گوشے عیاں نہ ہوتے جو آپ نے ایک شاہکار آپ بیتی لکھ کر پورا کر دیا۔ خودنمائی اور خود پرستی سے بہت دور رہ کر آپ نے اپنے متعلق جو بھی لکھا میں سمجھتا ہوں کہ یہ سب حقیقت ہے مجھے اس مضمون میں اتنا کچھ سیکھنے کو ملا ہے کہ بڑی بڑی کتابوں سے بھی یہ حاصل نہ ہوسکتا اللہ آپ کو ترقی سے نوازے اور آپ کے تمام خواب پورے کرے آمین۔ زرین قمر ابتدائی صفحات پر ترجمے کے ساتھ حاضر تھیں مغرب سے ترجمہ شدہ عمدہ کہانیوں کا اپنا ہی ایک نشہ ہوتا ہے ہاں البتہ اگر ترجمہ معیاری ہو زرین قمر میں یہ خوبی بدرجہ اتم موجود ہے کہانیوں کی فہرست میں محترم عرفان رامے کا نام دیکھ کر خوشگوار حیرت ہوئی یقیناً وہ نئے افق میں ایک بہترین اضافہ ثابت ہوں گے عشنا کوثر صاحبہ کا سلسلے وار ناول مسلسل تجسس کی گہرائیوں میں اترتا جارہا ہے بلاشبہ ناول پر عشنا کی گرفت بھرپور ہے میں بڑے عرصے سے ناول کے اختتام کا آئیڈیا لگانے کی تڑائی مار رہا ہوں مگر ہر قسط میں میرے اٹکل پچو غلط ثابت ہوتے ہیں اور یہی عشنا جی کا کمال ہے ریاض بٹ صاحب

ہیں آپ کی تفتیشی کہانی کا بہت بڑا فین ہوں مگر اب مجھے لگنے لگا ہے کہ آپ کو اس سیریز کے بنیادی ڈھانچے میں ...تبدیلی کی ضرورت ہے تفتیش کا وہی صد سالہ انداز بوریت پیدا کرنے لگا ہے اگر کچھ جدید انداز میں اس چیز کو ...ش کیا جائے تو کمال ہو جائے باقی یہ صرف میری ذاتی رائے ہے بڑے ہی پیارے دوست تفسیر بھائی اپنے ...شاہکار ناول کے دوسرے حصے کے ساتھ ہوئے مختلف اتار چڑھاؤ کے ساتھ یہ ناول معاشرے کے ان بے شمار لوگوں کو بے نقاب کرتا جا رہا ہے جنہوں نے اپنی کالی روحوں پر سفید اجلے لبادے پہن رکھے ہیں، امید ہے کہ آگے چل کر مزید انکشافات ہوں گے آخری صفحات پر نیا ناول مرشد، اس کے متعلق ابھی کچھ کہنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں دو چار اقساط پڑھ کر ہی کوئی رائے دینے کے قابل ہوں گا امید ہے کہ ناول عمدہ اٹھان لے گا خوش بو ...ن کی بات کی جائے تو اس دفعہ کافی مختصر ترین تھی غزلیں کم ہوتی ہیں یا پھر ویسے ہی اس سلسلے کو کھڈے لائن لگانے کا نکتہ آغاز ہے۔ گزارش ہے کہ یہ ایک ادبی سلسلہ ہے اس لیے اسے ممکن حد تک وسیع جگہ عنایت فرمائی جائے خیر تمام ساتھیوں کی غزلیں اور نظمیں عمدہ تھیں اللہ کرے زور قلم اور زیادہ دعا ہے کہ نئے افق کو دن دگنی ترقی نصیب ہو، آمین۔

سید محمود حسن......جعفر طیار سوسائٹی، ملیر کراچی۔ محترم پہلی دفعہ آپ کے رسالے میں حاضری کی جسارت کر رہا ہوں، ماہنامہ نئے افق میرا آئیڈیل رسالہ ہے اور بچپن ہی سے اسے پڑھا، اور شدت سے اس کا انتظار رہتا تھا، ویسے تو آپ کی ہر تحریر ہی اعلیٰ درجے کی اور معیاری ہوتی ہے، لیکن خصوصاً آپ کی شاہکار تحریر ٹائیگر آج بھی تر و تازہ ہے اور میں اسے دوبارہ پڑھ رہا ہوں۔ اسکے علاوہ میں مختلف ڈائجسٹ میں کہانیاں بھی لکھ رہا ہوں، جیسے سرگزشت ڈائجسٹ، سچی کہانیاں، ڈر ڈائجسٹ، میں میری کہانیاں شائع ہو چکی ہیں۔ ایک کہانی بنام سیلانی آپ کے رسالے میں ارسال کر رہا ہوں، امید ہے کہ آپ شائع فرما کر شکریہ کا موقع دیں گے، ماہنامہ نئے افق کی ترقی کے لئے دعا گو ہوں۔

مصنفین سے گزارش

- مسودہ صاف اور خوشخط لکھیں۔
- صفحے کے دائیں جانب کم از کم ڈیڑھ انچ کا حاشیہ چھوڑ کر لکھیں۔
- صفحے کے ایک جانب اور ایک سطر چھوڑ کر لکھیں، صرف نیلی یا سیاہ روشنائی کا ہی استعمال کریں
- خوشبوئے سخن کے لیے جن اشعار کا انتخاب کریں ان میں شاعر کا نام ضرور تحریر کریں۔
- ...وق آگہی کے لیے بھیجی جانے والی تمام تحریروں میں کتابی حوالے ضرور تحریر کریں۔
- فوٹو اسٹیٹ کہانی قابل قبول نہیں ہوگی۔ اصل مسودہ ارسال کریں اور فوٹو اسٹیٹ کروا کر اپنے پاس محفوظ رکھیں
- ادارہ نے ناقابل اشاعت کہانیوں کی واپسی کا سلسلہ بند کر دیا ہے۔
- ... آخری صفحہ پر اردو میں اپنا مکمل نام پتا اور موبائل فون نمبر ضرور خوشخط تحریر کریں۔
- ... لیے آپ کے ارسال کردہ خطوط ادارہ کو ہر ماہ کی 3 تاریخ تک مل جانے چاہیے۔
- ... دفتر کے پتا پر رجسٹرڈ ڈاک کے ذریعے ارسال کیجیے۔ 7 فرید چیمبرز عبداللہ ہارون روڈ کراچی۔

اقرأ

ترتیب: طاہر قریشی

المھیمن

(نگہبان)

المھیمن :۔ اسم فاعل واحد مذکر مرفوع۔ یہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا صفاتی نام ہے۔اس کے تین معنی ہیں' ایک نگہبان اور حفاظت کرنے والا' دوسرے شاہد جو دیکھ رہا ہو کہ کون کیا کرتا ہے۔ تیسرے قائم بامورِ الخلق 'یعنی جس نے لوگوں کی ضروریات اور حاجات پوری کرنے کا ذمہ اٹھا رکھا ہو' اللہ تبارک وتعالیٰ جو تمام کائنات اور اس کی تمام مخلوقات کی نگہبانی اور حفاظت کر رہا ہے' سب کے اعمال دیکھ رہا ہے اور کائنات کی تمام مخلوقات کی خبر گیری اور پرورش اور ان کی ضروریات کی فراہمی کر رہا ہے۔اس صفتِ الٰہی سے اس پوری کائنات کے ذرّے ذرّے پر اللہ تبارک وتعالیٰ کی بادشاہی اور اقتدار کی خبر مل رہی ہے۔

ترجمہ:۔دو کاتب اس کے دائیں اور بائیں بیٹھے ہر چیز لکھ رہے ہیں کوئی لفظ اس کی زبان سے نہیں نکلتا کہ جسے محفوظ کرنے کے لئے نگہبان تیار نہ ہوں۔(ق ۱۷۔۱۸)

اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنی ممتاز اور اشرف المخلوقات تخلیق انسان کی نگہبانی کے لئے اس کے دائیں بائیں ایک ایک فرشتہ مقرر کر رکھا ہے' جو انسان کی ہر ہر طرح سے نگرانی ونگہبانی کرتے ہیں یہاں تک کہ اُس کے اچھے برے اعمال کے علاوہ اس کی سوچوں تک کو وہ لکھتے رہتے ہیں' آیت میں لفظ رقیب استعمال ہوا ہے جس کے معنی محافظ ونگران کے ہیں اور انسان کے قول وعمل کا اظہار کرنے

والا اور لفظ ''عتید'' کے معنی حاضر اور تیار کے ہیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے تمام بندوں کی نگہبانی کے لئے ہر انسان کے ساتھ دو فرشتوں کو مقرر کر رکھا ہے۔ جن کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی نگہبانی میں ہر ایک کا ریکارڈ تیار ہوتا رہتا ہے جو قیامت کے روز حساب کتاب کے وقت کام آئے گا' یہ انسان کا اعمال نامہ ہوگا جس میں انسان کا ایک ایک لمحہ ایک ایک پل کا حساب درج ہوگا' وہی ہمارے خلاف یا موافقت میں شہادت ہوگا۔ اگر اس میں انسان کے اچھے ہی اچھے اعمال ہوں گے' گناہ کبیرہ نہ ہوں گے تو وہ نامہ اعمال اُس کی مغفرت میں مددگار ہوگا' ورنہ اس کے خلاف گواہی ہوگا۔

جو شخص غسل کر کے دو رکعت نماز پڑھے اور پورے خلوص نیت وصدق دل سے ایک سو مرتبہ اس صفتِ الٰہی کا ورد کرے تو اللہ تعالیٰ اس کا ظاہر و باطن پاک فرما دیں گے ان شاءاللہ۔

پاکستان ورچوئل لائبریری ڈاٹ کام

دل مشکل

حسین اشرف

Pakistanipoint.com
Waqar Azeem

اس کی زندگی کا دارو مدار دل کی حرکت پر تھا مگر کوئی بھی اسے دل دینے کو تیار نہ تھا۔

ایک خاندان کا المیہ ان کے سامنے ان کا جوان بیٹا لحہ لحہ موت کے قریب ہو رہا تھا۔

اک ماں کا فسانہ وہ بیٹے کی موت کے سامنے چٹان بن کر کھڑی ہو گئی تھی۔

دلوں کے تار چھو لینے والی کہانی، جسے آپ مدتوں یاد رکھیں گے

''السلام وعلیکم امی جان'' وہ کھانے کی میز پر آیا تو امی میز پر کھانا لگا رہی تھیں۔

''وعلیکم السلام کیسا ہے میرا بچہ'' امی نے پیار سے اُس کی پیشانی چومتے ہوئے کہا۔

''امی جان میں بچپن سے دیکھ رہا ہوں آپ صبح سویرے اُٹھتی ہیں اُس کے بعد نماز پڑھتی ہیں اور پھر ہمارے لیے کھانا بنانے میں مصروف ہو جاتی ہیں اُس کے بعد ہم سب تو اپنی اپنی منزلوں کی طرف نکل جاتے ہیں لیکن آپ پھر سے گھر کے کاموں میں مصروف ہو جاتی ہیں لیکن سارا دن کام کرنے کے بعد بھی نہ کبھی آپ کے چہرے پر تھکن کہ کوئی آثار نظر آتے ہیں اور نہ ہی زبان پر کوئی شکوہ جبکہ ہم تو صرف آٹھ گھنٹے کام کرتے ہیں پھر بھی تھک جاتے ہیں''۔

''بیٹا تم لوگ کام کرتے ہو اور میں اپنا فرض نبھاتی ہوں انسان کام کرتے کرتے تو تھک سکتا ہے لیکن فرض کبھی اُسے تھکا تا نہیں بلکہ اُسے اور ہمت دیتا ہے تا کہ وہ مزید اچھے طریقے سے اُسے نبھا سکے۔'' اُنھوں نے جگ سے جوس گلاس میں اُنڈیلا۔

''آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں امی لیکن آپ کو نہیں لگتا کہ اب آپ بزرگ ہو چکی ہیں اور وقت آ گیا ہے کہ آپ اپنا کھانے پکانے کا فرض کسی اور کے حوالے کر دیں''۔

''ہاں تمھارے بابا نے کتنی بار کہا ہے کہ ٹک ہائیر کر لیتے ہیں لیکن میرا دل نہیں مانتا کہ تم لوگوں کے لیے کوئی اور کھانا بنائے''۔

''میری پیاری امی جان میں ٹک کے بارے میں بات نہیں کر رہا بلکہ میں تو.....''۔

سیڑھیوں سے آتے ہوئے عمار نے اُس کی بات کاٹ دی تھی۔

''واٹس اپ برو ..... مجھے تو سمجھ نہیں آتی کہ آپ دونوں ماں بیٹا اتنی جلدی کیسے اُٹھ جاتے ہیں''۔

''لو آ گیا انگریز کہیں کا.....'' امی کو اُس کا انگلش جھاڑنا اچھا نہیں لگتا تھا۔

''سو مسٹر عمار آپ نے آج پھر نماز نہیں پڑھی'' اُس کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔

''یار بھائی کیا کروں لاکھ کوشش کے باوجود فجر کے وقت آنکھ نہیں کھلتی'' اُس نے کندھے اُچکا کر کہا۔

''آنکھ تب کھلے گی نا جب رات کو ٹائم پر سوؤ گے ساری ساری رات تو تم موبائل پر لگے رہتے ہو'' امی کو اُس کی یہ عادت بہت بری لگتی تھی۔

''ماما موبائل پر نہیں لگا رہتا بلکہ پڑھائی میں مصروف رہتا ہوں آپ تو جانتی ہیں کہ اگلے مہینے میرے امتحان شروع ہونے والے ہیں اور رہی بات کل رات کی وہ تو میں مہوش بھابھی سے بات کر رہا تھا''۔

''بیٹا اتنی بات تو تمھارا بھائی بھی اپنی منگیتر سے نہیں کرتا جتنی تم اپنی بھابھی سے کرتے ہو''۔

''ارے ماما میں نے تو ایک اُڑتی اُڑتی خبر سنی تھی بس کنفرم کرنے کے لیے بھابھی کو فون کیا تھا''۔

''کونسی خبر'' محبّ نے سوالیہ نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا۔

''علیزے بتا رہی تھی کہ آج شام ماما اور بابا مہوش بھابھی کے گھر جانے والے ہیں شادی کی تاریخ مقرر کرنے کے لیے''۔

''یہ علیزے بھی نا مجھے میری بیٹی کم اور نیوز کاسٹر زیادہ لگتی ہے''۔

''امی کیا واقعی آپ شادی کی بات کرنے والی ہیں؟'' محبّ نے سوالیہ نگاہوں سے امی کی طرف دیکھا۔

''ہاں بیٹا عون بھائی چاہتے ہیں کہ وہ اب بیٹی کے فرض سے سبکدوش ہو جائیں اور ویسے بھی اب ایک سال ہو گیا ہے تم دونوں کی منگنی کو اس لیے مزید دیر کرنا مناسب نہیں''۔

''ارے امی جان ابھی تو ایک مہینہ ہوا ہے بھائی کو بابا کا بزنس جوائن کیے ہوئے ابھی اُنھیں سیٹ ہو لینے دیں شادی ایک دو سال بعد ہو جائے گی'' عمار نے محبّ کو چڑانے کی کوشش کی۔

''بیٹا کہہ تو تم ٹھیک رہے ہو لیکن وہ کیا ہے کہ اب میں بوڑھی ہو گئی ہوں اور مجھے لگتا ہے کہ مجھے اپنے تمام فرائض کسی اور کے حوالے کر دینے چاہیں۔'' امی نے بھی اُسی انداز میں کہا تو اُس نے شرم سے اپنا بیگ اُٹھایا اور آفس کے لیے نکل گیا۔

☆.....☆.....☆

''ہاں تم صرف پانچ منٹ انتظار کرو میں بس پہنچ رہا ہوں۔'' وہ کان پر موبائل لگائے اپنے کیبن سے نکل کر مرکزی دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا۔

''محبّ بیٹا کہاں جا رہے ہو اندر ہماری اتنی اہم میٹنگ ہونے والی ہے'' بابا نے پیچھے سے آواز دیتے ہوئے کہا۔

''جی بابا مجھے عمار کے کالج کی فیس ادا کرنی ہے ابھی جانا بہت ضروری ہے آپ پلیز میٹنگ اکیلے ہی دیکھ لیں'' اُس نے بہانہ بناتے ہوئے کہا۔

''وہ اب بچہ تو نہیں ہے اپنا کام خود بھی کر سکتا ہے''۔

''اصل میں بابا مجھے اُس کے پرنسپل سے بھی ملنا تھا تا کہ پتا چل سکے کہ وہ کالج میں پڑھائی بھی کرتا ہے یا بس کھیل کود میں ہی مصروف رہتا ہے'' اُس نے پھر سے بہانا بنایا۔

''تو پرنسپل سے ملنے کی کیا ضرورت ہے تم مہوش سے پتا کر لو وہ بھی تو اُسی کالج میں پڑھاتی ہے''۔

''جی بابا مہوش سے بھی پتا کر لوں گا لیکن فی الحال پرنسپل صاحب میرا انتظار کر رہے ہیں اس لیے مجھے اجازت دیں۔'' ایک جھوٹ چھپانے کے لیے کئی جھوٹ بولنے پڑتے ہیں۔

''ٹھیک ہے جاؤ لیکن جلدی واپس آنا مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے'' اُنھوں نے ہدایت دیتے ہوئے کہا

''جی بابا'' وہ جلدی سے اپنی گاڑی کی طرف لپکا۔

☆.....☆.....☆

''سوری سوری دیر سے آنے کے لیے معافی چاہتا ہوں۔'' اُس نے ریسٹورنٹ میں اُس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''اگر اتنے ہی مصروف تھے تو پہلے ہی بتا دیتے میں تھوڑی لیٹ آ جاتی''۔

''میں تو کب کا آفس سے نکلنے کا سوچ رہا تھا لیکن کام کی وجہ سے وقت کا پتا ہی نہیں چلا اور اب جب وقت ملا تو بابا نے روک لیا بڑی مشکل سے بہانہ کر کے آیا ہوں کہ عمار کے کالج کی فیس ادا کرنی ہے''۔

''تو اب آپ کو میری وجہ سے بابا کے سامنے جھوٹ بھی بولنا پڑ رہا ہے۔'' اُسے اُس کا یوں جھوٹ بولنا ناگوار گزرا تھا۔

''تو تمھارا کیا خیال ہے کہ اگر میں اُن سے کہتا کہ میں ایک انتہائی ضروری میٹنگ چھوڑ کر مہوش سے ملنے جا رہا ہوں تو کیا وہ مجھے آنے دیتے''۔

''ہاں وہ بات تو ٹھیک ہے لیکن پھر بھی جھوٹ بولنا بھی تو اچھی بات نہیں۔'' وہ جھوٹ کی وجہ بننے کے لیے افسردہ تھی۔

''تم فکر نہ کرو اب مزید جھوٹ بولنے کی ضرورت نہیں پڑے گی کیونکہ آج شام کو امی اور بابا تمھارے گھر جا رہے ہیں شادی کی تاریخ لینے کے لیے۔'' اُس نے موڈ تبدیل کرنے کی کوشش کی۔

''آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ یہ خبر پہلے ہی مجھ تک پہنچ چکی ہے۔'' اُس نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔

''ہاں بھئی میں تو بھول ہی گیا تھا کہ تم نے تو میرے گھر میں تین تین جاسوس چھوڑے ہوئے ہیں جو تمھیں پل پل کی خبر دیتے رہتے ہیں۔'' اُس نے طنزیہ انداز میں کہا۔

''جاسوس نہیں بہن بھائی ہیں میرے۔''

''آرڈر کیا ہے کچھ مجھے تو بہت بھوک لگ رہی ہے۔'' اُس نے پیٹ پر ہاتھ پھیرا۔

''ہاں کر دیا ہے آتا ہی ہوگا''۔

''اچھا عمار کی کیا صورت حال ہے وہ پڑھتا بھی ہے کچھ یا صرف موج مستی ہی ہو رہی ہے''۔

''ظاہر ہے موج مستی کی عمر ہے تو کرے گا ہی''۔

''Your order sir'' ویٹر نے کھانا میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

''جزاک اللہ۔'' اُس نے شکریہ ادا کیا۔

''اچھا بابا سوچ رہے تھے کہ ایف ایس سی کے بعد عمار اور علیزے کو میڈیکل کی طرف بھیج دیں تمھارا کیا خیال ہے''۔

''اچھا ہے علیزے تو پڑھائی میں کافی انٹرسٹڈ ہے لیکن عمار کا کچھ پتا نہیں میں نے کئی بار پوچھا اُس سے لیکن وہ ہر بار ایک ہی جواب دیتا ہے کہ جو بھی کرنا ہے ایف ایس سی کے بعد ہی سوچوں گا'' اُس نے کھانا پلیٹ میں ڈالتے

ہوئے کہا۔
''مجھے تو سمجھ نہیں آتی کہ وہ چاہتا کیا ہے اپنے مستقبل کی تو اُسے کوئی فکر ہی .....آہ.....'' بات کرتے کرتے اچانک وہ تڑپ اُٹھا تھا۔
''کیا ہوا محب تم ٹھیک تو ہو''۔
''ہاں ٹھیک ہوں پتا نہیں ایک عجیب سا درد اُٹھا تھا دل میں۔'' اُس نے سینے پر ہاتھ رکھ لیا تھا۔
''چلو اُٹھو.....ڈاکٹر کے پاس چلتے ہیں'' وہ اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑی ہوئی تھی۔
نہیں میں ٹھیک ہوں اب.....تم بیٹھو کھانا کھاؤ''۔
''کیا واقعی تم ٹھیک ہو'' اُس نے تسلی کرنے کی کوشش کی۔
''ہاں یار ٹھیک ہوں تم بیٹھو کھانا کھاؤ۔'' اُس نے سینے سے ہاتھ ہٹایا اور کھانا کھانے لگا۔

☆.....☆.....☆

''تو آپ ہی بتایئے عون بھائی آپ کے خیال میں شادی کی کیا تاریخ رکھنی چاہیے'' مسز راحت نے بات بڑھاتے ہوئے کہا۔
''ارے بھابھی میں نے کیا کہنا ہے مہوش آپ ہی کی تو بیٹی ہے آپ جب چاہیں اُسے اپنے گھر لے جائیں مجھے کوئی اعتراض نہیں۔'' اُنھوں نے سامنے پڑی ٹرے میں سے چائے کا کپ اُٹھایا۔
''تو پھر ٹھیک ہے میرے خیال سے اگلے مہینے کی دس تاریخ کو نکاح کی تقریب رکھ لیتے ہیں اور اس جمعہ کے دن چھوٹی سی تقریب کر لیتے ہیں'' راحت صاحب نے اپنا فیصلہ سناتے ہوئے کہا۔
''جیسا آپ مناسب سمجھے راحت بھائی۔'' عون صاحب نے بھی اُن کے فیصلے کو قبول کرتے ہوئے کہا۔
''عون، مہوش کی شادی کے بعد تم بالکل اکیلے ہو جاؤ گے اس لیے میری مانو تو تم بھی ہمارے ساتھ اُسی گھر میں شفٹ ہو جاؤ''۔
''نہیں بھائی میں بھلا اپنی بیٹی کے گھر میں کیسے رہ سکتا ہوں۔'' اُنھیں دنیا والوں کی بھی فکر تھی۔
''وہ تمھارے بھائی کا بھی گھر ہے''۔
''وہ بات تو ٹھیک ہے بھائی لیکن میں یہیں ٹھیک ہوں اور ویسے بھی اس گھر میں مہوش کی ماں کی بہت ساری یادیں ہیں اور میں ان کو چھوڑ کر نہیں جانا چاہتا۔'' اُنھوں نے چائے کا کپ میز پر رکھا اور سامنے والی دیوار پر لگی تصویر کے پاس آ گئے۔
''پندرہ سال گزر چکے ہیں لیکن مریم کے لیے تمھاری یہ چاہت اور تڑپ ذرا بھی کم نہیں ہوئی۔'' راحت صاحب بھی اُٹھ کر اُن کے پاس آ گئے۔
''آپ نہیں جانتے بھائی کیسے گزارے ہیں میں نے یہ پندرہ سال مریم کی موت کے بعد تو ایسا لگتا تھا جیسے سب کچھ ختم ہو گیا ہو وہ تو اللہ کا شکر ہے کہ بھابھی نے مہوش کو سنبھال لیا ورنہ مجھے تو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اپنے آپ کو سنبھالوں یا پھر مہوش کو.....آپ لوگوں نے مشکل وقت میں نہ صرف اُسے سنبھالا بلکہ آج اُسے اپنے گھر کی بہو بھی بنا رہے ہیں اس لیے میں ہمیشہ آپ لوگوں کا احسان مند رہوں گا۔'' اُنھوں نے مشکور نگاہوں سے بھابھی کی طرف دیکھا۔
''کیسی بے وقوفوں والی باتیں کر رہے ہو مہوش تمھاری ہی نہیں بلکہ ہماری بھی بیٹی ہے ہم نے تم پر کوئی احسان نہیں کیا بلکہ یہ تو ہمارا فرض تھا''۔
''عون بھائی آپ ان سب باتوں کو چھوڑیں اور اب مہوش کی شادی کی تیاریاں شروع کر دیں ایک مہینہ کیسے گزر جائے گا پتا بھی نہیں چلے گا''۔
''آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں بھابھی میں کل سے ہی تیاریاں شروع کر دیتا ہوں۔'' اُنھوں نے واپس صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔
''اور ہاں میری بات کو مذاق میں مت اُڑا دینا تم ہمارے ساتھ شفٹ ہو جاؤ'' راحت صاحب نے ایک بار پھر سے اُنھیں منانے کی کوشش کی۔
''جی بھائی آپ فکر نہ کریں میں اس بارے میں ضرور سوچوں گا'' عون صاحب نے سرسری سے انداز میں کہا اور پھر سے کپ اُٹھا کر چائے پینے میں مصروف ہو گئے۔

☆.....☆.....☆

ای بغیر دروازے پر دستک دیئے کمرے میں داخل ہوئیں تو وہ سینے پر ہاتھ رکھے درد سے ہانپ رہا تھا۔
''محب بیٹا کیا ہوا تم اس طرح ہانپ کیوں رہے ہو۔''

[illegible] اس حالت میں دیکھ کر گھبرا گئیں۔

"[illegible] امی [illegible] بے چینی ہو رہی ہے سینے میں [illegible] اٹھ رہی ہے"۔

"[illegible] تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا..... کب سے درد ہو رہا [illegible]"

"[illegible] امی بابا [illegible] درد تو کافی پہلے سے ہوتا تھا لیکن کچھ [illegible] ٹھیک ہو جاتا تھا اس لیے کبھی میں نے [illegible] نہیں لی لیکن آج تو کچھ سمجھ ہی نہیں آ رہی ایسا لگ رہا ہے جیسے میرا دل پھٹنے والا ہے" درد کی شدت کی [illegible] سے اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔

"اللہ نہ کرے بیٹا..... تم فکر مت کرو ہم ابھی اسپتال جاتے ہیں" اُنھوں نے اپنے ڈوپٹے سے اُس کے آنسو صاف کیے۔

"عمار..... عمار" اُنھوں نے بلند آوازیں دیتے ہوئے کہا۔

"مجھے تو تمھارے بابا کہہ گئے تھے کہ محبّ رات کو دیر تک آفس میں کام کرتا رہا ہے اس لیے آج اُسے ڈسٹرب نہ کرنا جب اُٹھے گا تو آفس آ جائے گا اسی لیے میں تمھارے کمرے میں نہیں آئی لیکن مجھے کیا پتا تھا کہ تمھاری اتنی طبیعت خراب ہے" وہ ایک ہی سانس میں کہے جا رہی تھیں۔

"کیا ہوا ماما....." علیزے اور اریشہ بھی بھاگتی ہوئی آئیں۔

"اریشہ، عمار سے کہو گاڑی نکالے محبّ کی طبیعت [illegible] ہے اُسے اسپتال لے کر جانا ہے اور علیزے تم اپنے بابا کو فون کرو کہ وہ بھی جلدی سے اسپتال پہنچ جائیں"۔

"کیا ہوا بھائی آپ ٹھیک تو ہیں" عمار بھاگتا ہوا آیا۔

"فضول باتوں میں وقت ضائع مت کرو جلدی سے اسپتال چلو"۔

"[illegible] امی چلیں" عمار نے اُسے سہارا دیا اور [illegible] اور وہ اسپتال کی طرف چل دیئے۔

☆ ☆ ☆

[illegible] کیسی طبیعت ہے اب محبّ [illegible] بابا بھی اسپتال پہنچ چکے تھے۔

[illegible] کمرے میں گئی تو وہ سینے پر ہاتھ رکھے ہوئے تھا اور بے چینی سی ہو رہی تھی۔" وہ نم آنکھوں سے اُس کا حال بتا رہی تھیں۔

"فکر نہ کرو کچھ اُلٹا سیدھا کھا لیا ہوگا ورنہ یہ کونسی عمر ہے سینے میں درد اٹھنے کی۔" بابا نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"اللہ کرے میرا بچہ جلدی سے صحت یاب ہو جائے"۔

"آپ فکر نہ کریں بھابھی..... انشاء اللہ وہ جلد ٹھیک ہو جائے گا" عون صاحب نے اُن کی ہمت بندھائی۔

ڈاکٹر ایمرجنسی سے باہر آئے تو سب اُن کے اردگرد جمع ہو گئے۔

"اس وقت وہ ٹھیک ہیں ابھی ہم اُنھیں وارڈ میں شفٹ کر رہے ہیں پھر آپ لوگ اُن سے مل سکتے ہیں"۔

"اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے"۔

"جی ڈاکٹر صاحب کوئی پریشانی کی بات تو نہیں ہے" راحت اور عون صاحب ڈاکٹر کے پاس آ گئے۔

"دیکھیں ہم نے تمام ضروری ٹیسٹ کر لیے ہیں انشاء اللہ جلد رپورٹ مل جائے گی جب تک رپورٹس نہیں آ جاتی ہم کچھ نہیں کہہ سکتے لیکن میرے خیال سے محبّ صاحب کو ہارٹ کا ہی مسئلہ ہے" اُنھوں نے اپنے تجربے کی بنا پر اندازہ لگایا۔

"لیکن ڈاکٹر ابھی کل تک تو وہ بالکل ٹھیک تھا پھر اچانک ایک رات میں ہی دل کا مسئلہ کیسے ہو سکتا ہے۔" راحت صاحب کو ڈاکٹر کی باتوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

"اللہ کرے کہ یہ میرا وہم ہی ہو فی الحال باقی رپورٹس آنے کے بعد ہی پتا چلے گا کہ کیا مسئلہ ہے"۔

"جی ٹھیک ہے ہم رپورٹس کا انتظار کر لیتے ہیں۔" عون صاحب نے ڈاکٹر صاحب کو وداع کرتے ہوئے کہا۔

"یہ ڈاکٹر کیا کہہ رہا ہے یار اُس کی عمر ہی کیا ہے۔" ڈاکٹر کے جانے کے بعد وہ عون صاحب کی طرف متوجہ ہوئے۔

"بھائی آپ پریشان نہ ہوں ہو سکتا ہے کہ واقعی ہی ڈاکٹر کو وہم ہوا ہو۔" عون صاحب نے اُن کا حوصلہ بڑھانے کی کوشش کی۔

☆......☆......☆

"جی ڈاکٹر صاحب آپ نے بلایا" اُنھوں نے

دروازے پر دستک دے کر اجازت طلب کی۔

''آیئے راحت صاحب میں نے آپ کو اس لیے بلایا ہے کہ محبت کی رپورٹس آگئی ہیں''۔

''جی ڈاکٹر صاحب سب خیریت تو ہے کوئی مسئلہ تو نہیں''۔

''راحت صاحب مجھے یہ کہتے ہوئے اچھا تو نہیں لگ رہا لیکن کیا کریں حقائق بتانا ہمارا فرض ہے''۔

''آپ کہنا کیا چاہتے ہیں۔'' ڈاکٹر کی باتیں اُن کو پریشان کررہی تھیں۔

''رپورٹس سے پتا چلا ہے کہ محبت کو دل کا ہی مسئلہ ہے coronary artery disease''۔

''کیا..... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں ڈاکٹر.....'' انھیں اپنی سماعت پر یقین نہیں آرہا تھا۔

''معاف کیجیے گا لیکن میں وہی کہہ رہا ہوں جو ان رپورٹس میں ہے۔'' ڈاکٹر نے پھر سے اپنی بات دہرائی۔

''لیکن یہ کیسے ہوسکتا ہے کل تک تو وہ بالکل ٹھیک تھا پھر آج اچانک دل کی بیماری.....''۔

''میں نے آپ کو بتانے سے پہلے کئی بار رپورٹس کو چیک کیا ہے بلکہ دوسرے ڈاکٹرز سے بھی تصدیق کروائی ہے اور اُن کا بھی یہی کہنا ہے''۔

''ڈاکٹر..... محبت..... ٹھیک تو.....؟'' انھوں نے نم آنکھوں سے ڈاکٹر کی طرف دیکھا۔

''اگر اللہ نے چاہا تو ضرور ٹھیک ہوجائے گا''۔

''تو اب کیا حل ہے اس بیماری کا۔'' بالآخر انھوں نے محبت کی بیماری کو قبول کر ہی لیا۔

''راحت صاحب..... اس بیماری کا ٹرانسپلانٹ کے علاوہ کوئی حل نہیں ہے اور ہمیں جتنی جلدی ہوسکے محبت کا ٹرانسپلانٹ کرنا ہوگا ورنہ..... اُس کی جان بھی جاسکتی ہے''۔

''ہارٹ ٹرانسپلانٹ..... لیکن کیسے''۔

ہمیں کسی ایسے ڈونر کو ڈھونڈنا ہوگا جو دماغی طور پر مر چکا ہو پھر اُس کے گھر والوں سے اجازت لے کر ہم اُس کا دل محبت کو لگا سکتے ہیں'' ڈاکٹر نے سارا طریقہ کار سمجھایا۔

''کیا آپ کی نظر میں کوئی ایسا شخص ہے؟''۔

''اس وقت تو نہیں لیکن میں کوشش کررہا ہوں آپ بھی کوشش کریں باقی جو اللہ کو منظور'' ڈاکٹر نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

ڈاکٹر..... کیا میں..... محبت کو گھر لے جاسکتا ہوں'' اُن کی آواز رندھ چکی تھی۔

''جی فی الحال آپ اُسے لے جاسکتے ہیں میں نے کچھ دوائیاں لکھ دی ہیں آپ وہ ٹائم پر دیتے رہیں اور اُسے ریگولر چیک اپ کے لیے بھی آنا ہوگا''۔

''جی..... ٹھیک ہے۔'' وہ اُٹھنے لگے تو قدموں سے لڑکھڑا گئے۔

''راحت صاحب حوصلہ کیجیے آپ کمزور ہوگئے تو محبت کو کون سنبھالے گا'' ڈاکٹر نے آگے بڑھ کر اُنھیں سنبھالنے کی کوشش کی۔

''شکریہ..... میں ٹھیک ہوں۔'' وہ ڈگمگاتے قدموں سے کیبن سے باہر نکل آئے۔

☆.....☆.....☆

''گڈ مارننگ..... تو جناب ابھی تک سو رہے ہیں۔'' وہ کمرے میں آئی تو وہ آنکھیں بند کیے لیٹا ہوا تھا۔

''گڈ مارننگ..... اچھا ہوا مہوش تم آگئی میں تو بور ہوگیا ہوں آرام کر کر کے۔''

''طبیعت کیسی ہے۔'' اُس نے کھڑکی کے سامنے سے پردہ ہٹایا۔

''ٹھیک ہوں چلو نہ کہیں باہر چلتے ہیں۔'' وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

''ناشتا کیا ہے یا نہیں ابھی''۔

''باہر سے ہی کرلیں گے'' اُس نے بستر سے نیچے اُترنے کی کوشش کی۔

''محبت ڈاکٹر نے سختی سے منع کیا ہے کہ باہر سے کوئی چیز نہیں کھانی اس لیے ناشتہ کرلو پھر کچھ دیر کے لیے باہر چلتے ہیں''۔

''یار نہ تم لوگ مجھے باہر جانے دیتے ہو نہ کوئی چیز کھانے دیتے ہو جیسے کوئی بہت بڑی بیماری ہوگئی ہو معمولی سا درد ہی تو ہے سینے میں''۔

''جانتی ہوں معمولی سا درد ہے لیکن ابھی ٹھیک تو نہیں ہوا نا جب ٹھیک ہوجائے گا پھر جو دل کرے وہی کرنا لیکن تب تک ہماری مان لو''۔

''مہوش تم لوگ مجھے ایسے کیوں ٹریٹ کررہے ہو کہیں کوئی ایسی بات تو نہیں ہے۔'' اُس نے سوالیہ نگاہوں سے مہوش کی طرف دیکھا۔

''نہیں..... کوئی سیریس بات نہیں ہے''۔

''تم سچ کہہ رہی ہو'' اُس کی نگاہوں میں بدستور حیرت تھی۔

''پہلے کبھی تم سے جھوٹ بولا ہے..... تم فریش ہو جاؤ میں ناشتا لے کر آتی ہوں۔'' اُس نے بھی کمال مہارت کا مظاہرہ کیا۔

☆.....☆.....☆

راحت صاحب آفس سے آتے ہی صوفے پر گرنے کے سے انداز میں بیٹھ گئے۔

''اب کیسی طبیعت ہے محبّ کی''۔

''بظاہر تو ٹھیک ہے لیکن ہر وقت یہی ڈر لگتا ہے کہیں کچھ ہو نہ جائے اس لیے میں اُسے کہیں باہر بھی نہیں جانے دیتی..... پتا نہیں ہمارا یہ ڈرکب ختم ہوگا'' فاطمہ بیگم بھی اُن کے پاس ہی بیٹھ گئیں۔

''جب تک اُس کا ہارٹ ٹرانسپلانٹ نہیں ہو جاتا''۔

''تو کب ہوگا یہ ٹرانسپلانٹ.....؟''۔

''جب تک کسی ڈونر کا انتظام نہیں ہو جاتا'' راحت صاحب نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔

''آپ نے کہیں پتا بھی کیا ہے یا صرف ڈاکٹروں کے بھروسے ہی بیٹھے ہیں''۔

''کیسی باتیں کررہی ہو فاطمہ کیا مجھے اپنے بیٹے کی زندگی پیاری نہیں ہے۔'' وہ اس بات سے زچ ہو گئے تھے۔

''تو پھر ابھی تک آپ نے کچھ کیا کیوں نہیں''۔

''کیا کروں کچھ سمجھ نہیں آرہا ہر جگہ سے پتا کرلیا ہے کہیں اس وقت کوئی بھی ہارٹ موجود نہیں ہے''۔

''تو..... اس کا مطلب..... اب کچھ نہیں ہو سکتا'' انھوں نے نم آنکھوں سے راحت صاحب کی طرف دیکھا۔

''اللہ تعالیٰ سے دعا کرو انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اُس کی شادی.....''۔

''میں عون سے بات کرلوں گا ابھی کچھ وقت کے لیے شادی والے معاملے کو بھول جانا ہی بہتر ہے۔'' راحت صاحب نے اُن کی بات کاٹ کر اپنا فیصلہ سنایا اور کمرے میں چلے گئے۔

☆.....☆.....☆

''علیزے..... کیا ہوا تم آج سکول نہیں گئیں۔'' عمار اپنے کمرے سے باہر آیا تو وہ ہال میں بیٹھ کر ٹی وی دیکھ رہی تھی۔

''نہیں گھر میں جو حالات ہیں اُن کی وجہ سے آجکل پڑھائی میں دل نہیں لگتا۔'' علیزے نے ریموٹ سے ٹی وی بند کرتے ہوئے کہا۔

''اچھے برے حالات تو زندگی کا حصہ ہوتے ہیں لیکن اُس کا یہ مطلب تو نہیں کہ ہم لوگ اپنے روزمرہ کے کام چھوڑ دیں۔'' عمار نے اُس کے ہاتھ سے ریموٹ چھین کر دوبارہ ٹی وی آن کیا۔

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو عمار لیکن ہمارے دماغ میں ہر وقت محبّ بھائی کا خیال رہتا ہے کتنے خوش تھے ہم لوگ اُن کی شادی کی خبر سن کر مگر اچانک یہ دل کا مرض لاحق ہو گیا ہے''۔

''علیزے..... تمھیں تو یہ سمجھ ہونی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ آزمائشوں کے ذریعے اپنے پیارے بندوں کا امتحان لیتا ہے اور اگر وہ ایک مصیبت میں ڈالتا ہے تو اُس سے نکلنے کے لیے ہزار راستے بھی کھول دیتا ہے اس لیے اب یوں اُداس بیٹھنے کی بجائے پڑھائی پر توجہ دو۔'' عمار نے اُس کا لٹکا ہوا منہ دیکھ کر کہا۔

''عمار بھائی ٹھیک تو ہو جائیں گے.....؟''۔

''انشاء اللہ بہت جلد لیکن جب تک وہ ٹھیک نہیں ہو جاتے تب تک ہمیں اُن کا بہت خیال رکھنا ہے اس لیے تم جاؤ اور محبّ بھائی کے پاس بیٹھو تب تک میں مہوش بھابھی کو اُن کے گھر چھوڑ کر آتا ہوں''۔

''بھائی خوش قسمت ہیں جو اُنھیں مہوش جیسی بیوی مل رہی ہے کتنا خیال رکھتی ہے وہ بھائی کا''۔

''ہاں یہ بات تو ہے وہ واقعی بھائی کا بہت خیال رکھ رہی ہیں۔'' عمار نے اثبات میں سر ہلایا۔

''اللہ اُن کی یہ محبت ہمیشہ سلامت رکھے۔'' علیزے

نے اُن دونوں کو دعا دیتے ہوئے کہا۔
''آمین''۔
☆.....☆.....☆
''مہوش پہلے تو جب ہم اس پارک میں آتے تھے تمھیں بہت اچھا لگتا تھا پھر آج کیا ہوا تم اتنی پریشان کیوں ہو.....؟'' اُس کے چہرے پر چھائی ہوئی اداسی دیکھ کر اُس سے پوچھے بنا رہا نہ گیا۔
''کل بڑے پاپا کا فون آیا تھا بابا کو کہ وہ ہماری شادی ملتوی کررہے ہیں۔''
''ہاں تو یہ تو بہت ہی اچھا ہے.....اس میں پریشان ہونے والی کونسی بات ہے۔'' محبّ نے مسکراتے ہوئے کہا۔
''کیا مطلب.....؟''۔
''مہوش تم اچھی طرح جانتی ہو یار کہ اس وقت مجھے دل کا مسئلہ ہے پتا نہیں میں ٹھیک ہو بھی سکتا ہوں یا.....'' مہوش نے اُس کی بات درمیان میں ہی کاٹ دی۔
''اللہ سے اچھی اُمید رکھو معمولی سا درد ہے تمھارے دل میں اور تم ایسی باتیں کررہے ہو''۔
''اب تم لوگوں کو مزید جھوٹ بولنے کی ضرورت نہیں ہے میں نے اپنی رپورٹس اپنے دوست جو کہ ایک ہارٹ اسپیشلسٹ ہے اُس کو دکھائی ہے اُس نے مجھے بتا دیا ہے کہ میرے دل کے درد کا ٹرانسپلانٹ کے علاوہ کوئی حل نہیں ہے۔'' محبّ کے منہ سے یہ سب سن کر اُس نے اپنا سر شرم سے جھکا دیا۔
''تمھیں تو جھوٹ سے سخت نفرت تھی پھر بھی پچھلے کتنے دنوں سے تم اتنی صفائی سے جھوٹ بول رہی تھیں کیوں.....؟''
''سوری لیکن میں تو یہ سب تمھارے لیے کررہی تھی''۔
''ایک بیمار شخص سے بھی جھوٹ بولنا اُتنی ہی غلط بات ہے جتنی ایک تندرست انسان سے''۔
اُسے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ کیا کہے اس لیے مہوش نے خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا۔
''اگر تم جھوٹ بولنے کی بجائے مجھے یہ کہہ دیتیں کہ میں مرنے والا.....'' اس سے پہلے کہ وہ آگے کچھ کہتا مہوش نے اپنا ہاتھ اُس کے منہ پر رکھ دیا۔
''اللہ نہ کرے کہ تمھیں کچھ ہو.....انشاء اللہ بہت جلد ہارٹ کا ارینج ہو جائے گا''۔
''سچ بتاؤ مجھے کیوں نہیں بتایا'' اُس نے معنی خیز نظروں سے مہوش کی طرف دیکھا۔
''کیونکہ میں یہ جانتی تھی کہ اگر تمھیں یہ سب پتا چل گیا تو پھر تم بھی شادی کی تاریخ کو آگے بڑھانے کا کہو گے''۔
''فرض کرو کہ شادی ہو جاتی ہے پھر اگر ہارٹ کا ارینج نہیں ہوا تو.....''۔
''تم ہمیشہ منفی کیوں سوچتے ہو'' اُس نے جائزہ لینے والی نگاہوں سے محبّ کی طرف دیکھا۔
''میں صرف وہی سوچ رہا ہوں جو نظر آرہا ہے''۔
''تم کیا سوچتے ہو مجھے اس بات سے فرق نہیں پڑتا میں نے تو بابا سے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ شادی مقررہ تاریخ پر ہی ہوگی اور وہ آج شام کو تمھارے گھر آرہے ہیں بڑی امی اور بڑے پاپا سے اسی سلسلے میں بات کرنے۔'' اُس نے اپنا فیصلہ سنایا اور گھر جانے کے لیے اُٹھ کھڑی ہوئی۔
''ٹھیک ہے پھر گھر چلتے ہیں جو ہوگا دیکھا جائے گا'' محبّ بھی اُٹھ کھڑا ہوا اور وہ دونوں گاڑی میں بیٹھ گئے۔
☆.....☆.....☆
''راحت صاحب محبّ کی حالت دن بدن خراب ہوتی جارہی ہے کسی بھی وقت کچھ بھی ہو سکتا ہے''۔
یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ ڈاکٹر''۔
''میں ٹھیک کہہ رہا ہوں راحت صاحب اب ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے جلد سے جلد محبّ کا ٹرانسپلانٹ ہو جانا چاہیے ورنہ ہم اُسے نہیں بچا سکیں گے'' ڈاکٹر نے اپنی بات کو دہراتے ہوئے کہا۔
''میں کیا کروں ڈاکٹر میں ہر جگہ پتا کر چکا ہوں لیکن کوئی ارینج نہیں ہو رہا'' راحت صاحب کے لہجے سے اُن کی بے بسی کا اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔
''میں نے بھی کافی جگہ رابطہ کیا ہے اور میرے ایک دوست کے اسپتال میں ایک ایسا مریض ہے لیکن اُس کے گھر والے نہیں مان رہے''۔
''تو پھر آپ نے کیا سوچا ہے ڈاکٹر کس طریقے سے ہم

اُس کے گھر والوں کو منا سکتے ہیں۔“
”وہ لوگ کافی غریب ہیں اگر ہم اُس کے گھر والوں کو تین لاکھ روپے دے دیں تو اُمید ہے کہ وہ راضی ہو جائیں گے۔“ ڈاکٹر نے اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔
”دو تین لاکھ تو کیا میں دس لاکھ دینے کے لیے بھی تیار ہوں آپ اُنھیں ہر حال میں راضی کریں ڈاکٹر۔“ راحت صاحب نے خوشی سے چہکتے ہوئے کہا۔
”میں اپنی طرف سے پوری کوشش کروں گا راحت صاحب آپ بے فکر رہیے“۔
”السلام وعلیکم۔“ عون صاحب نے گھر میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔
”وعلیکم السلام“ ڈاکٹر اور راحت صاحب نے ایک ساتھ جواب دیا۔
”آؤ عون سب خیریت تو ہے۔“ راحت صاحب نے اس وقت آنے کی وجہ دریافت کی۔
”جی بھائی سب خیریت ہے مجھے آپ سے اور بھابھی سے ایک ضروری بات کرنی ہے اُسی سلسلے میں آیا ہوں“۔
”ہاں ٹھیک ہے میں ڈاکٹر صاحب کو دروازے تک چھوڑ کر آتا ہوں تب تک تم بیٹھو“۔
”نہیں شکریہ راحت صاحب آپ اپنے مہمانوں کو اٹینڈ کریں میں چلتا ہوں“۔
”شکریہ ڈاکٹر صاحب۔“ راحت صاحب نے ڈاکٹر کو رخصت کرتے ہوئے کہا۔
”آؤ بیٹھو عون سب خیریت تو ہے“۔
”جی بھائی سب خیریت ہے آپ یہ بتایئے ہارٹ کا کوئی انتظام ہوا۔“ اُنھوں نے راحت صاحب کے سامنے والے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔
”نہیں ابھی تک تو کچھ نہیں لیکن ڈاکٹر نے ایک جگہ بات کی ہوئی ہے اُمید ہے کہ انشاء اللہ ضرور وہاں سے ڈونر مل جائے گا“۔
”چلیں اللہ کرے کہ سب کچھ جلد سے جلد ٹھیک ہو جائے۔“
”السلام وعلیکم...... عون بھائی۔“ اُنھوں نے سیڑھیوں سے اُترتے ہوئے کہا۔
”وعلیکم السلام بھابھی اچھا ہوا آپ بھی آ گئی اصل میں مجھے آپ دونوں سے محبّ اور مہوش کی شادی کے بارے میں بات کرنی ہے۔“ اُنھوں نے اپنے آنے کی اصل وجہ بیان کی۔
”یار میں نے تم سے کہا بھی تھا کہ جب تک ٹرانسپلانٹ نہیں ہو جاتا شادی نہیں ہوگی“۔
”بھائی بچے چاہتے ہیں کہ شادی اپنے مقررہ وقت پر ہی ہو“۔
”عون تم جانتے ہو کہ اس وقت گھر میں جو ماحول ہے اُس میں کوئی بھی اس شادی کو انجوائے نہیں کر پائے گا اس لیے یہ وقت مناسب نہیں ہے اور فرض کرو کہ اللہ نہ کرے اگر ہارٹ کا ارینج نہ ہوا اور ہم محبّ کو نہ......“ وہ کہتے کہتے رُک گئے تھے۔
”اللہ نہ کرے ...... یہ آپ کیسی بات کر رہے ہیں۔“ اس طرح کی بات سن کر مسز راحت کا دل دہل گیا تھا۔
”بھائی مہوش کا کہنا ہے کہ وہ ہر قسم کی صورت حال کے لیے تیار ہے“۔
”حد ہوتی ہے پاگل پن کی اور مجھے تو اُس سے زیادہ تم پر غصہ آ رہا ہے تم اُسے سمجھانے کی بجائے یہاں آ گئے ہو مجھے اُس کا فیصلہ سنانے۔“ راحت صاحب غصے سے چلا رہے تھے اور عون صاحب خاموشی سے بیٹھے ہوئے تھے۔
”جب میں نے کہہ دیا ہے کہ یہ شادی ٹرانسپلانٹ کے بعد ہی ہوگی تو بس بعد میں ہی ہوگی اور یہ میرا آخری فیصلہ ہے اور جا کر بتا دینا مہوش کو کہ اس گھر میں پہلے بھی فیصلے میں ہی کرتا تھا اور آگے بھی میں ہی کروں گا۔“ راحت صاحب نے سخت لہجے میں کہا اور اُٹھ کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔

☆......☆......☆

وہ ایک ضروری میٹنگ میں موجود تھے لیکن موبائل اسکرین پر چمکتا ہوا نمبر دیکھ کر اُنھوں نے میٹنگ روک دی اور فون کو اپنے کان سے لگا لیا۔
”جی ڈاکٹر صاحب میں آپ کے ہی فون کا انتظار کر رہا تھا“ اُنھوں نے جلدی سے کہا۔
”جی مجھے بہت افسوس ہے راحت صاحب ......لیکن

اُس ڈونر کا انتقال ہوگیا ہے''۔

''تو کیا آپ نے اُس کا .....'' اُنھوں نے اٹکتے ہوئے کہا۔

''جی نہیں راحت صاحب اُس کے گھر والے آپریشن کرنے کے لیے تیار ہی نہیں ہوئے''۔

''تو کیا آپ نے اُنھیں پیسوں کی آفر نہیں کی تھی.....؟''۔

''جی میرے دوست نے پیسوں کی بات کی تھی لیکن اُن لوگوں نے آپریشن کی اجازت نہیں دی اور میت کو دفن کردیا'' ڈاکٹر نے تمام تفصیلات سے آگاہ کرتے ہوئے کہا۔

''تو پھر اب ہم کیا کریں گے ڈاکٹر صاحب.....''۔

''میں معذرت خواہ ہوں راحت صاحب لیکن اب ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے دعا کریں کے جلد سے جلد ہارٹ کا انتظام ہوجائے''۔

''کیا ہوا بھائی آپ کس سے بات کر رہے تھے اور اتنے پریشان کیوں ہیں.....؟'' عون صاحب نے اُن کے چہرے پر پریشانی کے آثار دیکھ کر پوچھا۔

''ڈاکٹر کا فون تھا'' اُنھوں نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

''اچھا تو پھر.....کیا کہا ڈاکٹر نے؟''۔

''وہ کہہ رہا تھا کہ جس شخص کا دل ہم محبّ کو لگانے والے تھے اُس کا انتقال ہوگیا ہے'' اُنھوں نے کرسی پر تھکے ہوئے شخص کی طرح بیٹھتے ہوئے کہا۔

''کیا.....تو اب.....ہم کیا کریں گے؟''۔

''دعا کے علاوہ اور کر ہی کیا سکتے ہیں۔'' اُنھوں نے چہرہ چھت کی طرف کرلیا اور آنکھیں موند لیں۔

☆.....☆.....☆

''السلام وعلیکم'' وہ کمرے میں داخل ہوئی تو بڑی امی الماری سے کپڑے نکال رہی تھیں۔

''وعلیکم السلام.....آؤ مہوش خیریت تو ہے تم اتنی صبح صبح''۔

''جی بڑی امی مجھے آپ سے ضروری بات کرنی ہے''۔

''ہاں تو کہو تمھیں بات کرنے کے لیے کب سے اجازت لینے کی ضرورت پڑ گئی۔'' اُنھوں نے الماری بند کردی اور قریب ہی صوفے پر بیٹھ گئیں۔

''بڑی امی آپ پلیز بڑے پاپا کو ہماری شادی کے لیے راضی کریں'' اُس نے اُن کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیے اور منت سماجت کرنے لگی۔

''مہوش عون بھائی بھی اُن سے اس بارے میں بات کر چکے ہیں لیکن اُنھوں نے صاف صاف منع کردیا ہے کہ جب تک ٹرانسپلانٹ نہیں ہو جاتا یہ شادی نہیں ہوگی'' اُنھوں نے اپنے ہاتھ چھڑاتے ہوئے کہا۔

''میں جانتی ہوں کہ بڑے پاپا نے بابا کی بات نہیں مانی لیکن میں چاہتی ہوں کہ آپ اُنھیں ہر حال میں راضی کریں۔'' اُس نے ایک بار پھر سے منانے کی کوشش کی۔

''مہوش بیٹا تم تو اپنے بڑے پاپا کو جانتی ہو کہ جب وہ کوئی فیصلہ کر لیتے ہیں تو پھر وہ کسی کی نہیں سنتے اور ویسے بھی اب کیا بات کرنی ہے مقررہ وقت میں صرف ایک وقت ہفتہ رہ گیا ہے''۔

''بڑی امی ایک ہفتے میں سارا انتظام ہوجائے گا آپ فکر نہ کریں''۔

''مہوش بیٹا ضد نہ کرو تمھیں اس وقت سمجھ نہیں آرہی لیکن اسی میں تمھاری بہتری ہے''۔

''لیکن جو میں کہہ رہی ہوں اُسی میں میری خوشی ہے اور کیا آپ میری خوشی کے لیے میری اتنی سی بات نہیں مان سکتیں۔'' بالآخر اُس نے جذبات کا سہارا لیتے ہوئے کہا۔

''میں تمھاری خوشی کے لیے تمھاری زندگی برباد نہیں کر سکتی شاید تمھیں پتا نہیں ہے کہ جس ڈونر کا دل ہم محبّ کو لگانے والے تھے اُس کا بھی انتقال ہوگیا ہے اب تو ڈاکٹر نے بھی صاف صاف کہہ دیا ہے کہ اگر اس مہینے میں محبّ کا آپریشن نہ ہوا تو ہم.....'' وہ کہتی کہتی رُک گئی تھیں۔

''میں جانتی ہوں اور میں آپ کو یہی بتانے آئی تھی کہ میں نے محبّ کے لیے ڈونر کا انتظام کرلیا ہے''۔

''کیا تم سچ کہہ رہی ہو کون ہے وہ ڈونر.....؟'' یہ سُن کر اُداس چہرے پر عجیب سی خوشی چھا گئی تھی۔

''یہ میں آپ کو ابھی نہیں بتا سکتی اگر آپ چاہتی ہیں کہ محبّ کو ڈونر ملے تو آپ کو میری بات ماننی ہوگی''۔

''مہوش.....تم''۔

''تم پاگل تو نہیں ہوگئی'' اُنھوں نے اُس کی خاموشی

اندازہ لگالیا تھا۔
''پاگل نہیں ہوں بڑی امی ......دل کے ہاتھوں مجبور ہوں''۔
''مہوش تمھیں ہوش بھی ہے کہ تم کیا کہہ رہی ہو۔'' اُنھوں نے اُس کے بازو پکڑ کر جھنجوڑتے ہوئے کہا۔
''بڑی امی میں اپنے پورے ہوش وحواس میں ہوں، محبّ کے آپریشن میں ایک مہینہ ہے اور میں اس ایک مہینے میں اپنی پوری زندگی اُس کے ساتھ گزارنا چاہتی ہوں اُس کے بعد میں موت کا بھی کوئی غم نہیں۔'' اُس نے دیوانگی کی حد کردی تھی۔
''اگر تم اپنا دل دے کر اُسے بچا بھی لو تو پھر بھی وہ تمھاری موت کی خبر سن کر مر ہی جائے گا''۔
''مجھے یقین ہے کہ آپ اُسے سنبھال لیں گی ویسے بھی میرا دل اُس کے ساتھ ہی ہوگا'' اُس نے اپنی آنکھوں سے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔
''مہوش تم ہمت کیوں ہار رہی ہو انشاء اللہ جلد ہی کچھ ہو جائے گا۔'' بڑی امی کو دیوانگی کی یہ باتیں سمجھ نہیں آرہی تھیں۔
''بڑی امی کب تک آپ جھوٹی آس لگا کر بیٹھی رہیں گی ہر گزرتا ہوا لمحہ محبّ کو موت کے قریب لے جارہا ہے اور میں اُسے یوں اپنی نظروں کے سامنے مرتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی''۔
''کچھ نہیں ہوگا محبّ کو اور نہ ہی تمھیں کچھ ہوگا اگر اللہ نے چاہا تو میرے سب بچے ایک ساتھ خوش حال زندگی گزاریں گے'' اُنھوں نے اُسے گلے سے لگا کر حوصلہ دینے کی کوشش کی۔

☆......☆......☆

''آپ سوئے نہیں ابھی تک''۔
''بس سے کوشش کر رہا ہوں لیکن نیند ہی نہیں آرہی'' اُنھوں نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔
''محبّ کی وجہ سے۔'' اُنھوں نے پریشانی کی وجہ سے اندازہ لگالیا تھا۔
''تم جانتی ہو کہ ایک ماں کی محبت اور ایک باپ کی محبت میں کیا فرق ہوتا ہے؟''۔
''ماں باپ اپنی اولاد سے ایک جیسا ہی پیار کرتے ہیں بھلا فرق کیسے ہوسکتا ہے''۔
''ہوتا ہے بیگم فرق صرف اتنا ہوتا ہے کہ ایک ماں اپنی محبت کا اظہار کر لیتی ہے لیکن باپ اپنی محبت کو اپنے غصے میں چھپائے رہتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اُس کا یہ غصہ ہی ہے جو اُس کی اولاد کو غلط راہ پر چلنے سے بچائے گا۔'' اُنھوں نے اپنے سوال کا جواب خود ہی دے دیا۔
''ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ واقعی جب کوئی بچہ غلطی کرتا ہے تو اُس کی ماں کہتی ہے کہ آلینے دو تمھارے پاپا کو پھر دیکھنا وہ کیسے تمھاری خبر لیتے ہیں۔'' اُنھوں نے بھی اثبات میں سر ہلایا۔
''باپ کا یہی ڈر ہوتا ہے جو بچے کے دماغ میں رہتا ہے اور پھر جب بھی وہ کوئی غلط کام کرنے لگتا تو یہی ڈر اُسے روکتا ہے لیکن افسوس کہ اپنا ڈر قائم رکھتے رکھتے اُسے کبھی اپنی اولاد سے محبت کا اظہار کرنے کا موقع ہی نہیں ملتا اور اُس کے سارے جذبات اُس کے دل میں ہی رہ جاتے ہیں''۔
''آپ نے اظہار نہ بھی کیا ہو لیکن آپ کے بچے پھر بھی جانتے ہیں کہ آپ اُن سے کتنی محبت کرتے ہیں۔'' اُنھوں نے راحت صاحب کا حوصلہ بڑھانے کی کوشش کی۔
''بیگم میں نے بھی یہ سوچا تھا کہ جو وقت میں محبّ کے ساتھ نہیں گزار سکا انشاء اللہ وہ اُس کے بچوں کے ساتھ گزاروں گا لیکن افسوس......'' راحت صاحب کی آنکھوں سے اچانک آنسوؤں کا سیلاب اُمڈ آیا تھا۔
''یہ کیا ہوگیا ہے آپ کو...... جتنا میں آپ کو جانتی ہوں چاہے جیسے بھی حالات آئے ہوں آپ تو ہمیشہ باہمت رہے ہیں پھر آج یوں بچوں کی طرح کیوں رو رہے ہیں۔'' یہ حالت دیکھ کر وہ بھی گھبرا گئی تھیں۔
''بیگم میں نے ساری زندگی بہت سے مشکل حالات دیکھے ہیں اور بہت ہی ہمت سے اُن کا سامنا بھی کیا ہے لیکن اب مجھ میں اتنی ہمت نہیں کہ اس عمر میں اپنے جوان بیٹے کی موت دیکھوں''۔
''انشاء اللہ آپ یہ غم نہیں دیکھیں گے۔ اب یوں رونا بند کیجیے میں آپ کو یہی بتانے آئی تھی کہ محبّ کے لیے

ہارٹ کا ارینج ہو گیا ہے''۔

''کیا یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔'' راحت صاحب کو اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا تھا۔

''جی میں سچ کہہ رہی ہوں میں نے محبّ کے لیے اپنی ایک فرینڈ سے بات کی تھی اُس کے بھائی ایک بڑے اسپتال میں ڈاکٹر ہیں اور وہاں ایک مریض ہے جس کا ہارٹ محبّ کے کام آسکتا ہے۔'' مسز راحت نے تمام تفصیل بتادی تھی جسے سُن کر راحت صاحب کو بھی حوصلہ ملا تھا۔

''بقول ڈاکٹر کے ہمارے پاس زیادہ سے زیادہ ایک مہینے کا وقت ہے''۔

''آپ پریشان نہ ہوں آپ کو ایک مہینے سے پہلے پہلے ہارٹ مل جائے گا بس آپ ڈاکٹر سے کہہ دیں کہ وہ اپنی تیاری پوری رکھے کسی بھی وقت آپریشن کی ضرورت پڑسکتی ہے''۔

''اللہ تیرا شکر ہے۔'' راحت صاحب نے آسمان کی طرف نگاہیں کرکے دعا مانگنے کے سے انداز میں کہا۔

''کیا آپ میری ایک بات مانیں گے''۔

''بیگم تم نے جو خبر آج سنائی ہے اُس کے بدلے چاہے جان مانگ لو۔'' راحت صاحب نے خوشی سے چہکتے ہوئے کہا۔

''اللہ نہ کرے کہ آپ کو کچھ ہو میں تو بس یہ چاہتی ہوں کہ محبّ اور مہوش کی شادی کی جو تاریخ ہم نے رکھی تھی اُسی تاریخ پر اُن دونوں کی شادی کردی جائے۔'' مسز راحت نے بھی موقع کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے اپنی بات منوانی چاہی۔

''یہ بات تو ہم پہلے بھی کر چکے ہیں اور میں نے پہلے بھی کہا ہے کہ جب تک ٹرانسپلانٹ نہیں ہو جاتا یہ شادی نہیں ہوگی'' راحت صاحب اپنی ضد پر قائم تھے۔

''پہلے کی بات اور تھی لیکن اب تو ڈونر بھی مل گیا ہے اور انشاء اللہ بہت جلد محبّ کا ٹرانسپلانٹ بھی ہو جائے گا اور آپریشن کے بعد اُسے کافی ٹائم لگ جائے گا دوبارہ سے صحت مند ہونے میں اور ایسی صورت میں اُس کی بیوی اُس کا بہتر خیال رکھ سکتی ہے''۔

''وہ بات تو ٹھیک ہے لیکن آج تین تاریخ ہے اور دس تاریخ کو شادی اتنی ساری تیاریاں اتنے کم دنوں میں سب کیسے کروگی'' اُنھوں نے سوالیہ نگاہوں سے راحت کی طرف دیکھا۔

''آپ اُس کی فکر نہ کریں آپ اور عون بھائی مہمانوں اور کارڈ وغیرہ کا انتظام کرلیں باقی شاپنگ اور گھر تیاریاں میں اور میرے بچے مل کرلیں گے اور ویسے بھی پچھلے کچھ دنوں سے وہ سب بہت پریشان ہیں اسی بہانے بچے بھی خوش ہو جائیں گے''۔

''ٹھیک ہے اگر آپ سب کرلیں گے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے'' بالآخر اُنھوں نے اجازت دے ہی دی۔

''شکریہ'' مسز راحت نے تشکر بھری نگاہوں سے راحت صاحب کی طرف دیکھا۔

شکریہ تو مجھے تمھارا ادا کرنا چاہیے آج تمھاری وجہ سے میں کتنے دنوں بعد چین کی نیند سوسکوں گا''۔

''ٹھیک ہے پھر ابھی آپ سو جائیں رات کافی ہو گئی ہے صبح جلدی اُٹھنا ہے۔'' اُنھوں نے لائٹ بند کردی اور سونے کے لیے تیار ہو گئے۔

☆.....☆.....☆

''ارے تم دونوں ابھی تک سو رہی ہو گھر میں اتنے سارے کام ہیں کرنے والے''۔

''کیا ہے عمار اتنی صبح صبح کیوں تنگ کر رہے ہو جاؤ یہاں سے سونے دو ہمیں''۔

''کیا بات ہے یہ تو کمال ہو گیا ہمارے گھر کی نیوز کاسٹر جس کو پورے گھر کی خبر سب سے پہلے ہوتی تھی آج اُسے اتنی بڑی خبر کا پتا ہی نہیں چلا''۔

''کونسی خبر.....'' اُس نے آنکھیں ملتے ہوئے پوچھا۔

''گھر میں محبّ بھائی کی شادی کی تیاریاں چل رہی ہیں''۔

''کیا.....'' یہ سُن کر آنکھیں فٹ سے کھل گئی تھیں۔

''لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے بابا نے تو منع کردیا تھا نہ کہ جب تک بھائی کا آپریشن نہیں ہو جاتا شادی بھی نہیں ہوگی اور ابھی تو کوئی ڈونر بھی نہیں ملا'' اُسے عمار کی باتوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔

''ڈونر مل گیا ہے اسی لیے تو بابا نے شادی کی اجازت

دے دی ہے''۔

''کیا تم سچ کہہ رہے ہو کہاں سے ملا ڈونز'' یہ سن کر وہ بھی خوشی سے چہکنے لگی۔

''امی کی کوئی فرینڈ ہے اُن کے بھائی کے اسپتال میں کوئی مریض ہے جس کا ہارٹ بھائی کو لگے گا'' اُس نے تمام تر تفصیل بتادی تھی۔

''لیکن بھائی وہ مریض اپنا دل بھائی کو کیوں دے گا اور اگر دے گا تو خود مر جائے گا'' اریشہ نے بھی معصومیت بھرے انداز میں سوال کیا۔

''اریشہ میری پیاری سی ڈول.....'' اُس نے بستر سے اُٹھا کر اپنی بانہوں میں بھر لیا۔

''ہم سب کو کس نے پیدا کیا ہے''۔

''اللہ تعالیٰ نے''۔

''زندگی اور موت کس کے ہاتھ میں ہے''۔

''اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں۔'' وہ بھی تیز تیز جواب دے رہی تھی۔

''تو بس یوں سمجھ لو کہ اللہ تعالیٰ نے اُس مریض کی موت اور محبّ بھائی کی زندگی کا فیصلہ کیا ہے''۔

''لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنا فیصلہ کسی کو بھی نہیں بتایا پھر آپ کو کیسے پتا کہ اللہ تعالیٰ نے اُس مریض کی موت کا فیصلہ کیا ہے۔'' اس سوال پر تو وہ خود بھی مسکرا دیا تھا۔

''ہاہاہا..... تم اپنے کو سمارٹ سمجھتے ہو نہ اب دو اس کے سوالوں کے جواب۔'' علیز ے نے بھی قہقہہ لگایا۔

''اریشہ بیٹا یہ بات تم ابھی نہیں سمجھو گی جب بڑی ہو جاؤ گی تو پھر بتاؤں گا ابھی تم دونوں فریش ہو کر نیچے آجاؤ امی ناشتے کے لیے تم دونوں کا انتظار کر رہی ہیں''۔

☆.....☆.....☆

''السلام وعلیکم امی جان.....'' اُس نے احتراماً ہاتھ چوم کر کہا۔

''وعلیکم السلام..... آج کتنے دنوں بعد تم سب سے پہلے ناشتے کے لیے آئے ہو''۔

''یہ میں کیا سن رہا ہوں بابا نے شادی کے لیے اجازت دے دی۔'' اُس نے ناشتے کے لیے بیٹھنے سے پہلے ہی سوال داغ دیا۔

''ہاں..... سُن تو تم ٹھیک رہے ہو لیکن لگتا ہے کہ تمھیں یہ جان کر خوشی نہیں ہوئی'' اُنھوں نے سوالیہ نگاہوں سے محبّ کی طرف دیکھا۔

''ایسی بات نہیں ہے لیکن مجھے بس تجسس ہو رہا تھا کہ راتوں رات ایسا کیا ہو گیا کہ بابا نے اپنا فیصلہ ہی تبدیل کر دیا۔'' محبّ نے کرسی پیچھے کی طرف کھینچی اور اُس پر براجمان ہو گیا۔

''بس سمجھ لو کہ میں نے اُن سے درخواست کی اور وہ مان گئے۔'' اُنھوں نے جوس گلاس میں ڈال کر اُسے پیش کیا۔

''اور یقیناً یہ درخواست آپ نے مہوش کے کہنے پر ہی کی ہو گی۔'' اب کی بار سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے کی اُس کی باری تھی۔

''ایسی بات نہیں ہے بیٹا اصل میں پچھلے کچھ دنوں سے گھر کا ماحول کچھ ڈسٹرب تھا اور میرے خیال سے یہ موقع ہے دوبارہ سے خوشیاں بکھیرنے کا''۔

''ٹھیک ہے امی جان اگر آپ کو ایسا لگتا ہے تو یہی سہی۔'' اُس نے جوس کا سپ بھرتے ہوئے کہا۔

''مبارک ہو بھائی جان۔'' اُس نے پیچھے سے آکر اُس کی کمر پر ہاتھ مارا۔

''کیا بات ہے آج تو عمار صاحب بھی اتنی صبح صبح اُٹھ گئے ہیں''۔

''میں ہی کیا آج تو سب جلدی اُٹھ گئے ہیں''۔

''اچھا..... کیوں''؟۔

''کیونکہ آپ کی شادی کی تیاریاں بھی تو کرنی ہیں'' عقب سے آتی ہوئی علیز ے نے جواب دیا۔

''لیکن اُس سے پہلے آج پارٹی ہو گی'' اریشہ نے محبّ کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''کوئی پارٹی نہیں ہو گی..... یہ پارٹی شارٹی بھائی کے آپریشن کے بعد ابھی چپ چاپ ناشتہ کرو اور اسکول جاؤ اور علیز ے تم مہوش کو فون کر دو تم دونوں میرے ساتھ چلو گی بہت ساری شاپنگ کرنی ہے اور عمار تم محبّ کے ساتھ چلے جانا۔'' اُنھوں نے ایک ہی سانس میں سب کو ہدایات دیتے ہوئے کہا۔

''بھائی مجھے اسکول نہیں جانا بلکہ آپ کے ساتھ جانا ہے۔'' اُس نے محبّ کے کان میں سرگوشی کی۔

"امی جان اریشہ کو بھی جانے دیں ہمارے ساتھ وہ بھی شاپنگ کرلے گی"۔
"محبت بیٹا تمھاری پہلے ہی طبیعت خراب ہے اور یہ بہت تنگ کرے گی تمھیں"۔
"نہیں امی جان کوئی مسئلہ نہیں ہے آپ فکر نہ کریں میں اریشہ کو سنبھال لوں گا اور ویسے بھی عمار بھی تو ساتھ ہی ہے"۔
"ٹھیک ہے لیکن زیادہ تنگ نہیں کرنا بھائی کو..... "انھوں نے اریشہ کو ہدایت کرتے ہوئے کہا۔
"نہیں کروں گی....." اس نے خوشی سے چہکتے ہوئے کہا۔
"چلو ابھی باتیں بعد میں کرلینا ناشتہ شروع کرو"۔

☆......☆......☆

آج کے دن سب لوگ پریشانیاں بھول کر شادی کے ماحول سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔محب کی طبیعت ٹھیک تھی لیکن راحت صاحب نے احتیاطاً ڈاکٹر اور ایمبولینس کو بلا لیا تھا۔
شادی کے لیے خوب تیاریاں کی گئی تھیں پورے شہر کے نامور لوگ اس وقت ایک چھت کے نیچے شادی میں شرکت کے لیے موجود تھے۔
"کتنے خوش لگ رہے ہیں دونوں ایک ساتھ۔" امی نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
"وہ تو خوش لگ ہی رہے ہیں لیکن اُن سے زیادہ تو تم خوش لگ رہی ہو" راحت صاحب نے شوخی بھری نگاہوں سے بیگم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
"خوش کیوں نہیں ہونگی میرے بیٹے کی شادی ہے" انھوں نے بھی کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔
"تو کچھ خوشی دوسرے بچوں کے لیے بھی بچا کر رکھو کل کو ان کی بھی شادی کرنی ہے"۔
"آپ جانتے ہیں میں نے اس شادی کے لیے اتنی ساری تیاریاں کیوں کی ہیں وہ اس لیے کے میں اپنے سارے بچوں کی شادیوں کے ارمان آج ہی پورے کرنا چاہتی ہوں کیا پتا کل ہو نہ ہو۔" انھوں نے حسرت بھری نگاہوں سے محبت اور مہوش کی طرف دیکھا۔
"یہ تم کیسی باتیں کر رہی ہو، اگر اللہ نے چاہا تو ہم

AANCHALPK.COM
تازہ شمارہ شائع ہوگیا ہے
آج ہی قریبی بک اسٹال سے طلب فرمائیں
ماہنامہ
آنچل
کراچی
ملک کی مشہور معروف قلمکاروں کے سلسلے وار ناول، ناولٹ اور افسانوں سے آراستہ ایک مکمل جریدہ گھر بھر کی دلچسپی صرف ایک ہی رسالے میں ہے جو آپ کی آسودگی کا باعث ہو سکتا ہے اور وہ ہے اور صرف آنچل۔ آج ہی اپنی کاپی بک کرالیں۔
[redacted]
چاہت و محبت کے موضوع پر لکھی ایسی دلکش تحریر جو آپ کی دل کی دنیا میں جل تھل کردے
[redacted]
معاشرے کے تلخ حقائق کی عکاسی کرتا فاخرہ گل کا ناول جو آپ پر بہت سی حقیقتیں آشکار کردے گا
[redacted]
خاندانی اختلافات و جھگڑوں کے پس منظر میں لکھا اقرا صغیر کا بہترین ناول جو آپ کی سوچ کو ایک نیا رخ عطا کردے
AANCHALNOVEL.COM
پرچہ نہ ملنے کی صورت میں رجوع کریں (021-35620771/2)

دونوں ساتھ مل کر اپنے بچوں کی ہی کیا بلکہ اُن کے بچوں کی بھی خوشیاں دیکھیں گے'' راحت صاحب نے کندھے پر ہاتھ رکھ کر تسلی دیتے ہوئے کہا۔

''امی جان بابا جان چلیں، سٹیج پر سب آپ کا انتظار کر رہے ہیں فیملی فوٹو کے لیے۔'' عقب سے علیزے نے آواز دی۔

''ہاں بھئی چلو.....'' بابا سے اجازت ملنے کی دیر تھی علیزے نے اُن دونوں کے ہاتھ پکڑے اور اسٹیج کی طرف چل دی۔

☆.....☆.....☆

''صبح صبح اتنا تیار ہونے کی کیا ضرورت تھی میں تو پہلے ہی دل کا مریض ہوں اگر مجھے ہارٹ اٹیک ہو جاتا تو۔'' وہ شیشے کے سامنے تیار ہو رہی تھی کہ محبّ نے اُس کی طرف دیکھ کر کہا۔

''اس سے زیادہ تیار تو میں شادی والے دن ہوئی تھی اُس دن اٹیک نہیں ہوا تو اب کیا ہوگا''۔

اچھا تو اس کا مطلب مجھے اٹیک ہونے سے تمھیں خوشی ہوگی۔''

''یہ صبح صبح کس بات پہ بحث چل رہی ہے۔'' امی نے اُن دونوں کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''کچھ نہیں امی ہم نیچے ہی آ رہے تھے''۔

''اچھا ٹھیک ہے آ جاؤ ہم سب تمھارا ہی انتظار کر رہے ہیں۔'' وہ مڑ کر جانے لگیں تو مہوش نے روک لیا۔

''محبّ تم چلو مجھے بڑی امی سے ایک ضروری بات کرنی ہے''۔

''ٹھیک ہے۔'' اُس نے اثبات میں سر ہلایا اور باہر چلا گیا۔

''شکریہ بڑی امی.....آپ نے مجھے زندگی کی سب سے بڑی خوشی دی ہے'' اُس نے احتراماً ہاتھ چوم کر کہا۔

''اس میں شکریہ والی کونسی بات ہے یہ تو ہم سب ہی چاہتے تھے کہ تم ہمارے گھر کی بہو بنو''۔

''محبّ سے شادی میرا خواب تھا جو پورا ہو گیا اب چاہے موت بھی آ جائے کوئی غم نہیں''۔

''موت آئے تمھارے دشمنوں کو.....اللہ تمھیں لمبی زندگی عطا کرے تاکہ تم اپنے شوہر کے ساتھ خوشگوار زندگی گزار سکو'' اُنھوں نے اُس کے چہرے کو اپنے ہاتھ کے پیالے میں بھر لیا۔

''میں صرف دس دن محبّ کے ساتھ خوشی خوشی گزارنا چاہتی ہوں اُس کے بعد آپ جب چاہیں آپریشن کے لیے ڈاکٹر سے بات کر سکتی ہیں۔'' اُس کی آنکھوں کی نمی اُس کے رخسار پر آ گئی تھی۔

''مہوش ایک بات تو بتاؤ؟''۔

''جی پوچھیے بڑی امی۔'' اُس نے اپنی آنکھوں سے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔

''تمھیں یاد ہے تم کتنے سال کی تھی جب مریم کی موت ہوئی تھی.....؟'' اُنھوں نے جائزہ لینے والی نگاہوں سے مہوش کی طرف دیکھا۔

''مجھے تو کچھ یاد نہیں ہے لیکن پاپا بتاتے ہیں تھے کہ میں پانچ سال کی تھی جب ماما کی وفات ہوئی تھی''۔

''تمھاری ماما کی وفات کے بعد تمھاری پرورش کس نے کی تھی.....؟''۔

''آپ نے بڑی امی اور کس نے.....لیکن یہ سب آپ کیوں پوچھ رہی ہیں۔'' اس سوال پر وہ چونک گئی تھی۔

''کیا تمھیں کبھی ایسا محسوس ہوا ہے کہ میں نے تم میں اور علیزے میں کوئی فرق کیا ہو۔'' اُنھوں نے اُس کی بات کاٹ کر اپنے سوالوں کی قطار جاری رکھی تھی۔

''نہیں بڑی امی بلکہ میں تو دس سال کی عمر تک آپ کو ہی اپنی امی سمجھتی رہی تھی وہ تو بعد میں بابا نے بتایا کہ آپ میری امی نہیں بلکہ بڑی امی ہیں''۔

''پھر تم نے کیسے سوچ لیا کہ میں اپنے بیٹے کی زندگی کے لیے اپنی بیٹی کی جان قربان کر دوں گی۔'' اُسے ساری بات کی سمجھ آ گئی تھی اور اس نے شرمندگی سے اپنا سر جھکا لیا۔

''میں جانتی ہوں کہ آپ ایسا نہیں کرنا چاہتیں.....لیکن اس کے علاوہ اور کوئی حل بھی تو نہیں ہے''۔

''ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے ستر ماؤں سے بھی زیادہ پیار کرتا ہے وہ جب اپنے کسی بندے کو ایک مشکل میں ڈالتا ہے تو اُس مشکل کے حل کے سو اسباب بھی پیدا کر دیتا ہے لیکن وہ ہماری نظر کی کمزوری ہوتی ہے کہ ہم اُسے دیکھ نہیں سکتے''۔

''مجھے آپ کی باتوں سے ایسا لگ رہا ہے جیسے محبّ ...ے ہارٹ مل گیا ہے میں تو سمجھ رہی تھی کہ آپ نے ...ں ضد کی وجہ سے یہ بات کہی ہے''۔

''...ے ضد کرتے ہی ہیں لیکن وہ یہ نہیں جانتے کہ اُن ...لیے کیا اچھا ہے اور کیا برا، تم نے چاہے مجھے اپنی ماں ...مجھا ہو یا نہ سمجھا ہو لیکن میں نے ہمیشہ تمھیں اپنی بیٹی مانا ...ہے اور میں کوئی بھی ایسا فیصلہ نہیں کروں گی جس سے تمھیں ...ولی تکلیف ہو۔'' آج پہلی بار وہ اس لہجے میں مہوش سے ...ات کررہی تھیں۔

''ایسی بات نہیں ہے میں نے ہمیشہ آپ کو اپنی امی ہی ...جھا ہے وہ تو میں بس محبّ کی وجہ سے اُس دن پتا نہیں کیا ...ہہ گئی آپ پلیز مجھے معاف کردیں۔'' اُس نے فوراً اپنی ...غلطی کی معافی مانگ لی۔

''جو ہونا تھا سو ہوگیا ابھی ان سب باتوں کے بارے ...یں مت سوچو اور اپنی زندگی کو انجوائے کرو''۔

''آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں بڑی امی آنے والے کل کی ...فکر میں ہمیں اپنا آج ضائع نہیں کرنا چاہیے''۔

''اچھا اب باتیں بہت ہوگئی ہیں جلدی سے نیچے چلو ...ب لوگ کھانے کی میز پر ہمارا انتظار کررہے ہونگے''۔

''جی چلیے......'' اُس نے جلدی سے اپنا حلیہ درست کیا اور ان کے ساتھ چل دی۔

☆......☆......☆

''امی جان آپ نے بلایا تھا۔'' محبّ امی کے کمرے ...یں آیا تو وہ صوفے پر بیٹھ کر پرانی تصویریں دیکھ رہی تھیں۔

''آؤ محبّ بیٹا میں تمھارا ہی انتظار کر رہی تھی۔'' اُنھوں نے البم بند کر کے سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا۔

''امی خیریت تو ہے آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں لگ ...رہی۔'' وہ وہیں اُن کے سامنے دوزانوں ہوگیا۔

''میں ٹھیک ہوں بیٹا بس سر میں تھوڑا سا درد ...ہے۔'' اُنھوں نے پیار سے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

''امی آپ کی آنکھیں دیکھ کر لگتا ہے جیسے آپ رو رہی ...تھیں سب ٹھیک تو ہے'' اُس نے چہرے کا بغور جائزہ لیتے ...ہوئے کہا۔

''ہاں سب ٹھیک ہے وہ بس کل تم لوگ یہاں سے جا ...رہے ہو نا یہی سوچ کر آنکھ بھر آئی''۔

آنچل کی جانب سے ایک اور آنچل

ماہنامہ

حجاب کراچی

شائع ہوگیا ہے

ملک کی مشہور معروف قلمکاروں کے سلسلے وار ناول، ناولٹ اور افسانوں سے آراستہ ایک مکمل جریدہ گھر بھر کی دلچسپی صرف ایک ہی رسالے میں موجود جو آپ کی آسودگی کا باعث بنے گا اور وہ صرف ''حجاب'' آج ہی ہاکر سے کہہ کر اپنی کاپی بک کرالیں۔

اس کے علاوہ

خوب صورت اشعار منتخب غزلوں اور اقتباسات پر مبنی مستقل سلسلے

اور بہت کچھ آپ کی پسند اور آرا کے مطابق

Infoohijab@gmail.com
info@aanchal.com.pk

کسی بھی قسم کی شکایت کی صورت میں

021-35620771/2
0300-8264242

''ہم لوگ کہاں جا رہے ہیں۔'' اُس کے لہجے میں حیرت عیاں تھی۔

''محبّ تم تو جانتے ہو کہ ڈاکٹر کے بقول تمھارا آپریشن اسی مہینے میں ہونا ضروری ہے ورنہ اگلے مہینے سے تمھاری طبیعت خراب ہونا شروع ہو جائیگی اور ویسے بھی میں نے جہاں متبادل دل کے لیے بات کی وہاں سے بھی کسی وقت بھی فون آ سکتا ہے اس لیے کل ہی تم اور مہوش اسلام آباد والے گھر جا رہے ہو۔'' اُنھوں نے ساری تفصیلات سے آگاہ کرتے ہوئے کہا۔

''تو کیا آپ ہمارے ساتھ نہیں چلیں گی؟''

''نہیں بیٹا تم تو جانتے ہو مجھے اسپتال سے ویسے ہی گھبراہٹ ہوتی ہے اس لیے میں تو نہیں آ سکوں گی لیکن دو یا تین دن بعد تمھارے بابا وہاں آ جائیں گے۔''

''امی میری زندگی کا اتنا بڑا آپریشن ہونے جا رہا ہے مجھے وہاں آپ کی ضرورت پڑے گی۔'' اُس نے بچوں کی طرح ضد کرتے ہوئے کہا۔

''تم پریشان نہ ہو میری دعائیں ہر وقت تمھارے ساتھ ہیں۔'' اُنھوں نے پیار سے اُس کا ماتھا چوم کر اُسے حوصلہ دینے کی کوشش کی۔

''لیکن پھر بھی اگر آپ وہاں ہونگی تو مجھے بھی ہمت ملے گی۔''

''محبّ تم تو جانتے ہو کہ عمار کے امتحان ہونے والے ہیں اور علیزے اور اریشہ بھی کافی دنوں سے اسکول نہیں جا رہے ہیں اس لیے میرا یہاں رہنا زیادہ ضروری ہے اس لیے ضد نہ کرو اور جاؤ جا کر تیاری کرو۔''

''ٹھیک ہے امی جیسا آپ کا حکم۔'' اُس نے بحث کرنا مناسب نہ سمجھا اور فرمانبردار بیٹے کی طرح حکم مان لیا۔

☆.....☆.....☆

''محبّ اور مہوش تو اسلام آباد پہنچ گئے ہیں لیکن آپ کب جا رہے ہیں۔'' اُنھوں نے چائے کا کپ پیش کرتے ہوئے کہا۔

''آپ کا کیا مطلب ہے کیا تم نہیں جا رہی میرے ساتھ۔'' راحت صاحب نے سوالیہ نگاہوں سے اُن کی طرف دیکھا۔

''راحت صاحب صرف محبّ ہی نہیں بلکہ یہ تینوں بھی میرے ہی بچے ہیں اور ان کو بھی دیکھ بھال کی ضرورت ہے۔''

''ہاں تو ان کو بھی ساتھ لے چلتے ہیں۔'' راحت صاحب نے ایک آسان سا حل پیش کیا۔

''مجھے پہلے ہی ان کی پڑھائی کا بہت نقصان ہو گیا ہے اب مزید چھٹیاں مناسب نہیں اس لیے آپ چلے جائیں۔''

''اچھا ٹھیک ہے..... بیگم ویسے ابھی تک کسی کا فون نہیں آیا۔'' راحت صاحب نے چائے کا سپ بھرتے ہوئے کہا۔

''آپ پریشان نہ ہوں راحت صاحب آپ بے فکر ہو کر جائیے انشاء اللہ ایک دو دن تک دل آپ کے پاس اسلام آباد پہنچ جائے گا۔'' اُنھوں نے بھی چائے کا سپ بھرا۔

''یہ کونسی سہیلی ہے جس کی بات پر تمھیں اتنا پکا یقین ہے۔''

''میری بچپن کی دوست ہے خود بھی ڈاکٹر ہے اور وہ اسپتال اُسی کے بھائی کا ہے جہاں محبّ کا آپریشن ہوگا۔''

''کیا نام ہے اُس ڈاکٹر کا۔'' راحت صاحب نے ایک اور سپ بھرا۔

''میری سہیلی کا نام تو فریحہ ہے لیکن میرے خیال سے جو ڈاکٹر محبّ کا آپریشن کرے گا اُس کا نام ڈاکٹر جہانگیر ہے۔'' اُنھوں نے تمام تر تفصیل سے آگاہ کرتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے میں کل جاتے ہی اُسے مل لوں گا۔'' اُنھوں نے جواب دیا اور پھر وہ دونوں چائے پینے میں مصروف ہو گئے۔

☆.....☆.....☆

وہ اپنے کمرے میں سو رہی تھیں کہ اچانک فون کی گھنٹی کی آواز سے گھبرا کر اُٹھ گئی۔

''ہیلو.....'' اُنھوں نے فون اپنے کان سے لگایا۔

''بڑی امی میں مہوش'' دوسری طرف سے آواز آئی۔

''ہاں مہوش بولو تم اتنی گھبرائی ہوئی کیوں ہو؟''

''بڑی امی اچانک محبّ کو سینے میں درد شروع ہو گیا ہے ہم اُسے اسپتال لے کر آئے ہیں ڈاکٹر کہہ رہے ہیں کہ

...یر کیے بغیر محبّ کا آپریشن کرنا ہوگا ورنہ اُس کی جان بچانا مشکل ہو جائے گا۔'' اُس نے روتے ہوئے تمام تفصیل بتائی۔

''تم پریشان مت ہو انشاءاللہ کچھ نہیں ہوگا میرے بیٹے کو۔''

''بڑی امی آپ اپنی دوست سے پتا کریں کہ ڈونر کی کیا سورت حال ہے اب زیادہ انتظار نہیں کر سکتے۔''

''ٹھیک ہے تم پریشان مت ہو میں اُس سے رابطہ کرتی ہوں۔'' اُنھوں نے کال بند کی اور پھر سے موبائل سے نمبر ملا کر کان پر لگایا اور جلدی سے اُٹھ کر کمرے سے باہر نکل گئیں۔

☆......☆......☆

''مہوش کیا تمھاری فاطمہ سے بات ہوئی ہے میں کب سے کال کر رہا ہوں لیکن وہ فون ہی نہیں اُٹھا رہی۔''

''جی بڑے پاپا میری رات کو بات ہوئی تھی بڑی امی سے وہ اپنی فرینڈ کے اسپتال جانے والی تھی۔''

''پتا نہیں کب پہنچے گا دل اور کب آپریشن ہوگا۔''

''راحت صاحب مبارک ہو ہارٹ مل گیا ہے ابھی آپ اس پیپر پر اپنے دستخط کر دیں تاکہ ہم جلد سے جلد آپریشن شروع کر سکیں'' ڈاکٹر جہانگیر نے اُن کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''کیا......آپ سچ کہہ رہے ہیں ڈاکٹر صاحب'' اُن کا چہرہ ایک دم سے کھل گیا تھا۔

''جی میں سچ کہہ رہا ہوں آپ جلدی سے سائن کریں تاکہ ہم اپنا کام شروع کریں۔'' ڈاکٹر نے پھر سے اپنی بات دہرائی۔

''لیجیے میں نے سائن کر دیے ہیں۔'' اُنھوں نے سائن کر کے کاغذ لوٹا دیے۔

''بہت شکریہ......اب آپ لوگ دعا کریں انشاءاللہ اللہ نے چاہا تو ہم کامیاب ہوں گے۔''

''انشاءاللہ۔'' ڈاکٹر پہلے سے ہی تیار بیٹھے تھے ہارٹ ملتے ہی وہ آپریشن تھیٹر میں داخل ہو گئے اور آپریشن شروع کر دیا۔

☆......☆......☆

ہر گزرتے ہوئے لمحے کے ساتھ اُن کی سانسیں تیز ہو رہی تھیں پچھلے پانچ گھنٹے سے ڈاکٹر آپریشن تھیٹر میں گھسے ہوئے تھے، انتظار کا ایک ایک لمحہ اُن پر بھاری تھا۔

''مبارک ہو راحت صاحب اللہ تعالیٰ نے ہمیں کامیابی عطا فرمائی اور ہم محبّ کے آپریشن میں کامیاب رہے۔'' ڈاکٹر جہانگیر کے چہرے سے فتح کے تاثرات واضح تھے۔

''بہت شکریہ ڈاکٹر صاحب۔'' اُنھوں نے خوشی سے ڈاکٹر کو گلے لگا لیا۔

''میں ابھی یہ خوشخبری بڑی امی کو سناتی ہوں۔'' اُس نے موبائل سے نمبر ملایا اور کان کے ساتھ لگا کر انتظار کرنے لگی لیکن دوسری طرف سے نمبر بند جا رہا تھا۔

''کیا ہوا......؟''

''پتا نہیں بڑے پاپا ابھی بھی نمبر بند جا رہا ہے۔''

''گھر والے نمبر پر کال کرو۔''

''جی ٹھیک ہے۔'' اُس نے پھر سے نمبر ملایا اور فون کان کے ساتھ لگا لیا۔

''السلام و علیکم......'' دوسری طرف سے آنے والی مردانہ آواز سے صاف پتا چلتا تھا کہ فون عمار نے اُٹھایا تھا۔

''وعلیکم السلام......عمار میں مہوش۔''

''جی بھابھی کیسی ہیں آپ اور محبّ بھائی کی طبیعت کیسی ہے۔''

''تمھارے لیے اچھی خبر ہے محبّ کا آپریشن کامیاب ہو گیا ہے اور وہ اب بالکل ٹھیک ہے۔''

''اللہ کا شکر ہے۔'' اُس نے آسمان کی طرف نگاہیں کر کے بلند آواز میں کہا۔

''اچھا بڑی امی کہاں ہیں میں کب سے اُن کا نمبر ملا رہی ہوں'' مہوش نے دیر کیے بغیر سوال کیا۔

''امی تو کل رات سے ہی اسلام آباد کے لیے نکل گئی تھیں میں نے ساتھ چلنے کو کہا تو کہنے لگیں کہ تم یہیں علیزے اور اریشہ کے پاس رُکو۔''

''کیا......کل رات سے'' اُسے اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا۔

''کیوں کیا ہوا......کیا ابھی تک امی آپ سے نہیں ملیں۔''

''نہیں میں تو کل سے اسپتال میں ہی ہوں، اچھا میں

سمجھ گئی بڑی امی کو اسپتال سے ڈر لگتا ہے نہ اس لیے وہ گھر چلی گئی ہونگی تم پریشان مت ہو میں گھر جا کر اُن سے مل لیتی ہوں۔'' اُس نے بات کو گول کر دیا۔

''ٹھیک ہے جب اُن سے ملیں تو مجھے کال کر لینا اریشہ بار بار امی کے بارے میں پوچھ رہی ہے۔''

''ٹھیک ہے اللہ حافظ'' اُس نے موبائل بند کر کے بڑے پاپا کی طرف دیکھا۔

''میں گھر جا کر دیکھتا ہوں۔''

''بڑے پاپا رُک جائیں بابا گھر پر ہی ہیں میں اُن سے پوچھ لیتی ہوں۔'' جیسے ہی وہ مڑ کر جانے لگے تو۔ مہوش نے پیچھے سے آواز دی۔

''ہاں ٹھیک ہے پھر جلدی سے رابطہ کرو''۔

''جی.....'' اُس نے پھر سے نمبر ملایا اور موبائل کان سے لگا کر انتظار کرنے لگی۔

''السلام وعلیکم.....''۔

''بابا بڑی امی گھر پر ہیں کیا.....'' اُس نے سلام کے جواب کا انتظار کیے بغیر سوال پوچھا۔

''نہیں بیٹا میں تو صبح سے گھر پر ہی ہوں بھابھی تو یہاں نہیں آئیں.....'' دوسری طرف سے آواز آئی۔

''کیا اگر گھر پر بھی نہیں ہیں تو پھر کہاں جا سکتی ہیں۔'' اُس نے پریشانی میں سر پکڑ لیا۔

''کیا ہوا سب خیریت تو ہے۔'' اُس کی بات سُن کر عون صاحب بھی پریشان ہو گئے تھے۔

''جی بابا بڑی امی کل رات سے گھر سے نکلی ہوئی ہیں یہاں اسلام آباد آنے کے لیے لیکن ابھی تک یہاں نہیں پہنچی''۔

''تو بھائی سے کہو کہ ڈرائیور کو کال کریں یقیناً بھابھی ڈرائیور کو ساتھ لے کر ہی گئی ہونگی کیونکہ بھابھی کو تو گاڑی چلانا نہیں آتا۔'' عون صاحب نے اپنے خیال کے مطابق حل پیش کیا۔

''ٹھیک ہے بابا''۔

''بڑے پاپا ڈرائیور کو کال کریں.....'' اُس نے فون بند کیا اور بڑے پاپا کو کال کرنے کا کہا۔

''ہاں ٹھیک ہے رانی ہو تم میں بھی کال کرتا ہوں''۔

''ہیلو..... احمد کہاں ہو تم'' پریشانی میں سلام دعا کی ہوش بھی نہیں تھی۔

''جی سر میں تو گھر پر ہی ہوں''۔

''گھر پر کیا کر رہے ہو تم تو فاطمہ کو لے کر اسلام آباد آنے والے تھے نا''۔

''نہیں سر میں تو گھر پر ہی ہوں اور مجھے کسی نے بھی اسلام آباد جانے کا نہیں کہا اور بیگم صاحبہ کو تو صبح سے میں نے دیکھا ہی نہیں'' ڈرائیور نے ساری صورت حال سے آگاہ کرتے ہوئے کہا۔

''گاڑی کہاں ہے''۔

''سر گاڑی تو یہیں گیراج میں کھڑی ہے''۔

''ٹھیک ہے۔'' اُنھوں نے بے دلی سے فون بند کیا اور وہیں ایک ٹیبل پر بیٹھ گئے۔

''بڑے پاپا کیا کہا ڈرائیور نے؟''۔

''وہ گاڑی لے کر نہیں گئی۔'' اُنھوں نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔

''ہو سکتا ہے بڑی امی نے ڈرائیور کو نہ اُٹھایا ہو اور لوکل ٹرین میں آ گئی ہوں۔''

''ہو سکتا ہے تم یہیں رُکو میں اسٹیشن پر دیکھ کر آتا ہوں۔'' راحت صاحب مڑ کر جانے لگے تو موبائل پر ایک انجان نمبر سے آنے والی کال کو دیکھ کر رُک گئے۔

''ہیلو.....'' اُنھوں نے موبائل کان سے لگایا۔

''کیا میں راحت صاحب سے بات کر سکتی ہوں۔'' دوسری طرف سے آنے والی آواز کسی عورت کی تھی۔

''جی بول رہا ہوں''۔

''راحت صاحب میں ڈاکٹر فریحہ بات کر رہی ہوں ..... فاطمہ کی دوست''۔

''جی ڈاکٹر صاحبہ کہیے۔'' نام سنتے ہی اُنھوں نے پہچان لیا تھا۔

''راحت صاحب مجھے آپ سے فاطمہ کے بارے میں بات کرنی ہے۔'' ڈاکٹر نے بھی مزید تعارف کی بجائے مدعے کی بات کی۔

''کیا فاطمہ کے بارے میں لیکن اُس کا تو کچھ پتا نہیں کہاں ہے وہ.....''۔

''جی میں جانتی ہوں راحت صاحب آپ جتنی جلدی

دینے لاہور آجائیں مجھے آپ سے ضروری بات کرنی ہے''۔

''کیا فاطمہ لاہور میں ہے ہم سب تو اُسے اسلام آباد میں ڈھونڈ رہے ہیں''۔

''جی راحت صاحب فاطمہ یہیں ہے میرے پاس لیکن جتنی جلدی ہو سکے آپ یہاں آجائیں''۔

''سب خیریت تو ہے ڈاکٹر۔'' اُنھیں ڈاکٹر کی باتوں سے پریشانی کا اندازہ ہو گیا تھا۔

جی فی الحال میں آپ کو کچھ نہیں بتا سکتی آپ جتنی جلدی ہو سکے لاہور آجائیں میں اسپتال کا ایڈریس آپ کو سینڈ کر رہی ہوں۔'' ڈاکٹر نے یہ کہہ کر فون بند کر دیا اور راحت صاحب نے موبائل جیب میں رکھا اور جلدی سے گاڑی کی طرف ہو لیے۔

☆......☆......☆

''جی سر کس سے ملنا ہے آپ کو'' جیسے ہی وہ اسپتال کے اندر داخل ہوئے تو ریسپشنسٹ نے اُن سے سوال کیا۔

''مجھے ڈاکٹر فریحہ سے ملنا ہے۔'' بھاگتے ہوئے آنے کی وجہ سے وہ ہانپ رہے تھے۔

''آپ یہاں سے سیدھے چلے جائیں آگے جا کر دائیں طرف مڑتے ہی پہلا آفس ڈاکٹر فریحہ کا ہی ہے۔'' ریسپشنسٹ نے ہاتھ سے اشارہ کر کے راستہ بتایا۔

ریسپشنسٹ کے بتائے ہوئے راستے سے گزرتے ہوئے جیسے ہی دروازے پر پہنچے تو دستک دیئے بغیر ہی اندر چلے گئے۔

''ڈاکٹر، فاطمہ کیسی ہے''۔

''آیئے راحت صاحب میں آپ کا ہی انتظار کر رہی تھی''۔

''فاطمہ کہاں ہے۔'' اُنھوں نے پھر سے اپنی بات کو دہرایا۔

''یہ آپ کی ایک امانت تھی میرے پاس'' ڈاکٹر نے ایک خط دراز سے نکالا اور راحت صاحب کی طرف بڑھا دیا۔

''ڈاکٹر صاحبہ میں آپ سے فاطمہ کے بارے میں پوچھ رہا ہوں اور آپ یہ کیا......''۔

''راحت صاحب آپ کے تمام سوالوں کے جواب

پردہ کیوں اور کیوں کر

''یُدْنِیْنَ'' کے معنی ہیں قریب کر لیں، لپیٹ لیں۔ ''جلباب'' چادر بڑے دوپٹے، مقنعہ یا اوڑھنی کو کہتے ہیں۔ اصل مقصد یہ ہے کہ اوباش اور بدچلن لوگ یہ سمجھ لیں کہ یہ شریف عورتیں ہیں اور ان سے وہ کسی نامناسب فعل میں ہم کاری کی توقع نہ رکھیں اور یہ عورتیں اس لحاظ سے پہچانی جائیں کہ یہ عفت و پرہیز گاری کے بارے میں بے پرواہ نہیں ہیں تاکہ گلی، محلے اور بازار میں کج رو افراد انہیں اذیت نہ دیں۔ لہٰذا یاد رکھنا چاہیے کہ یہاں موضوعیت اسی مقصد کو حاصل ہے نہ کہ چادر اوڑھنے کے اسٹائل کو اور نہ چادر کے کسی خاص رنگ کو۔ بیشتر معاشروں میں آج بھی عورتیں اگر اپنے معاشرے کی مناسبت سے معقول اور شریفانہ لباس پہنیں تو بالعموم ان سے کسی برائی میں شراکت کاری کی توقع نہیں رکھی جاتی۔

آیت چہرہ چھپانے پر دلالت کرتی ہے یا نہیں، اس پر علماء کے مابین خاصی بحث ہے۔ ہماری رائے میں آیت کا ظہور تو اس پر دلالت نہیں کرتا لیکن جہاں اوباش افراد کی ہوس ناک توقعات کے خاتمے کے لیے عورتیں ایسا ضروری سمجھیں وہاں چہرہ چھپالیا کریں، ورنہ اگر اسلام عورت کے معاشرے میں فعال کردار کی اجازت دیتا ہے تو اسے ہر مقام پر ناگزیر قرار نہیں دے سکتا۔ ہاں اصل مقصد کی پاس داری ضروری ہے جس کا ذکر کیا جا چکا ہے۔

(تشریح: سورۂ احزاب (٦) آیت: ٥٩)

انتخاب: احسن جمیل...... کراچی

اسی کے اندر ہیں۔'' راحت صاحب نے کانپتے ہاتھوں سے وہ خط پکڑا اور کھول کر پڑھنے لگے۔

''راحت آپ ایک بہت اچھے بیٹے ایک اچھے بھائی تو تھے ہی لیکن آپ اُس سے بھی اچھے شوہر اور باپ ہیں، آپ نے اپنی فیملی کے لیے ہمیشہ اپنی اوقات سے بڑھ کر کوشش کی ہے میں جانتی ہوں کہ کس طرح آپ نے دن رات ایک کیا ہے محبّ کے لیے ڈونر ڈھونڈنے میں لیکن شاید قسمت کو کچھ اور ہی منظور تھا اس لیے آپ اپنی کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکے۔

یقیناً اس وقت آپ سوچ رہے ہونگے کہ میں نے ایسا کیوں کیا ہے لیکن آپ خود سوچیے کہ جب آپ جوان بیٹے کی موت کا غم برداشت نہیں کر سکتے تو میں تو ماں ہوں میں کیسے یہ سب برداشت کرتی اس لیے ہر روز پل پل مرنے کی بجائے میں نے ایک بار کا ہی مرنا قبول کر لیا۔

میں نے آپ سے کہا تھا نا کہ آپ اپنے بچوں کی خوشیاں ضرور دیکھیں گے لیکن افسوس اب میں نہیں ہونگی لیکن میرے نہ ہونے کی وجہ سے کسی بچے کے ساتھ بھی زیادتی نہیں ہونی چاہیے۔ میں جانتی ہوں کہ آپ کو اس وقت بہت غصہ آ رہا ہوگا کیونکہ آپ نے کبھی کہا ہو یا نہ کہا ہو میں جانتی ہوں کہ آپ مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں اور یقیناً اس وقت آپ اسپتال کے خلاف کیس بھی کرنے کا سوچ رہے ہونگے لیکن اس میں ان کا کوئی قصور نہیں ہے بلکہ میں تو احسان مند ہوں اپنی بچپن کی دوست فریحہ کی جس نے سارے قوانین کو توڑ کر میرے لیے اتنا کچھ کیا۔ شروع میں وہ بھی نہیں مان رہی تھی لیکن پھر میں نے اُسے بڑی مشکل سے راضی کیا ہے اس لیے آپ ایسا کچھ نہ کریے گا جس سے اُسے کوئی تکلیف ہو۔

محبّ کے صحت یاب ہونے کے بعد آپ کام کی تمام ذمہ داریاں اُس پر ڈال دیجیے گا اور عمار کو میڈیکل کی پڑھائی کروا کر اچھا ڈاکٹر بنایئے گا، علیزے جس طرح خبریں پھیلاتی رہتی ہے مجھے لگتا ہے کہ وہ ایک اچھی نیوز کاسٹر بنے گی اور اریشہ وہ تو ابھی بہت چھوٹی ہے میرے بغیر آپ کو بہت تنگ کرے گی لیکن آپ سختی سے نہیں بلکہ نرمی سے اُسے سنبھالنے کی کوشش کیجیے گا'' اُن کی آنکھوں سے نکلنے والے آنسو گال سے ہوتے ہوئے کوٹ پر گر رہے تھے اُنھوں نے اگلا صفحہ کھولا۔

''جب تک محبّ ٹھیک نہیں ہو جاتا اُسے میرے بارے میں پتا نہیں چلنا چاہیے کیونکہ وہ اتنا بڑا صدمہ برداشت نہیں کر پائے گا اگر وہ پوچھے تو کہہ دینا کہ میں اُس کی خالہ کے پاس لندن گئی ہوئی ہوں اور پھر جب وہ ٹھیک ہو جائے تو اُسے میرا خط دے دینا مجھے یقین ہے خط پڑھنے کے بعد وہ سنبھل جائے گا''۔

''اگر اتنے سالوں میں مجھ سے کوئی غلطی ہوئی ہو تو مجھے معاف کر دیجیے گا'' یہ سب پڑھنے کے بعد اُنھیں ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی پہاڑ سا اُن کے اوپر آن گرا ہو اُنھوں نے خط بند کر کے جیب میں ڈالا تو ڈاکٹر نے اُنھیں مزید دو خط دے دیے جو مہوش اور محبّ کے نام تھے۔

''فاطمہ..... کہاں..... ہے'' اُن کے حلق سے بمشکل آواز نکلی۔

''آیئے میرے ساتھ۔'' ڈاکٹر اُنھیں اپنے ساتھ مردہ خانے کی طرف لے گئی جہاں اُن کی بیگم کی لاش رکھی ہوئی تھی۔

☆.....☆.....☆

''ہیلو..... عمار کہاں ہو تم۔'' اُنھوں نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

''جی بابا میں گھر پر ہی ہوں..... لیکن کیا ہوا آپ رو کیوں رہے ہیں'' آواز سن کر وہ بھی پریشان ہو گیا تھا۔

''بیٹا..... تمھاری امی..... وہ اب ہمارے ساتھ نہیں رہی''۔

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں بابا۔'' اتنی بڑی خبر کسی بجلی کے جھٹکے سے کم نہیں تھی۔

''میں ٹھیک کہہ رہا ہوں بیٹا اور میں ابھی اُس کی میت لے کر گھر ہی آ رہا ہوں تم ایسا کرو گے ڈرائیور سے کہو کہ وہ اریشہ کو اسلام آباد لے جائے محبّ اور مہوش کے پاس وہ یہ سب دیکھے گی تو گھبرا جائے گی''۔

''امی.....'' اُس کے ہاتھ سے موبائل نیچے گر گیا اور خود بھی وہیں گھٹنوں کے بل گر گیا اُس کی آنکھوں میں آنسو تھے لیکن آواز کنٹرول میں تھی کیونکہ وہ جانتا تھا کہ رونے کی آواز سن کر اریشہ اور علیزے بھی پریشان ہو جائے گی۔

☆.....☆.....☆

''مہوش میں جا رہی ہوں میرا گھر میرے بچے اب تمھارے حوالے ہے۔ مجھے یقین ہے کہ کوئی سمجھے یا نہ مجھے لیکن تم اچھی طرح سمجھ جاؤ گی کہ میرے پاس اس کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں تھا۔

تم پانچ سال کی تھیں جب تمھاری ماں تمھیں چھوڑ کر چلی گئی تھی پھر میں تمھیں اپنے گھر لے آئی۔ میں نے تمھیں اپنی بیٹی بنا کر پالا ہے کبھی بھی تم میں اور اپنے بچوں میں فرق نہیں کیا اس لیے تم بھی مجھ سے وعدہ کرو کہ تم بھی کبھی اپنے اور میرے بچوں میں فرق نہیں کرو گی، رشتے میں تو تم ان کی بھابھی ہو لیکن مجھے یقین ہے کہ تم ان تینوں کو ماں بن کر ہی پالو گی۔

اللہ تعالیٰ تم سب کو دنیا بھر کی تمام خوشیاں عطا کرے اور غم کو تم سے کوسوں دور رکھے اور تم دونوں کو اپنی اولاد کی خوشیاں دیکھنا نصیب کرے۔''

''میں وعدہ کرتی ہوں بڑی امی کہ میں آپ کو شکایت کا موقع نہیں دوں گی انشاءاللہ روزِ محشر آپ مجھے اپنے وعدہ وفا کرنے والوں میں پائیں گی'' وہ روتی ہوئی خود سے عہد کر رہی تھی۔

''تمھاری بڑی امی نے ثابت کر دیا ہے کہ ماں کی محبت بے لوث ہوتی ہے اور وہ ممتا کے لیے کوئی بھی قربانی دینے سے دریغ نہیں کرتی۔''

☆......☆......☆

''مہوش دو ہفتے ہو گئے ہیں میرے آپریشن کو لیکن ابھی تک اریشہ کے علاوہ گھر سے کوئی بھی مجھے ملنے نہیں آیا سب ٹھیک تو ہیں۔'' اُسے فکر ہونے لگی تھی۔

''ہاں سب ٹھیک ہے میری کچھ دیر پہلے ہی علیزے سے بات ہوئی ہے'' مہوش نے اُسے تسلی دینے کی کوشش کی۔

''اچھا تو تم ہی میری بات کروا دو امی سے میرا بہت دل چاہ رہا ہے اُن سے بات کرنے کا''۔

''امی تو یہاں نہیں ہیں'' نہ چاہتے ہوئے بھی اُس کے منہ سے نکل گیا۔

''کیا مطلب یہاں نہیں ہیں؟'' اُس نے سوالیہ نگاہوں سے مہوش کی طرف دیکھا۔

''میرا مطلب ہے کہ وہ پاکستان میں نہیں ہیں بلکہ لندن گئی ہوئی ہیں خالہ کے پاس''۔

''تو کیا وہ اریشہ کو ساتھ لے کر نہیں گئیں۔'' اُس نے سوالیہ نگاہوں سے مہوش کی طرف دیکھا۔

''نہیں خالہ کی طبیعت زیادہ خراب تھی اس لیے بڑی امی اریشہ کو میرے پاس چھوڑ کر گئی ہیں''۔

''میرے موبائل میں خالہ کا نمبر ہے تم ایسا کرو کہ میرے موبائل سے لندن فون کرو مجھے امی سے بات کرنی ہے۔'' وہ اپنی بات پر بضد تھا۔

''تمھارا موبائل تو کافی دنوں سے گھر پڑا ہوا ہے ابھی میں گھر جاؤں گی تو آتے وقت لے آؤں گی''۔

''مہوش مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ تم مجھ سے کچھ چھپا رہی ہو کیونکہ ایسا ہو ہی نہیں سکتا ہے کہ اتنے دن گزر گئے ہوں اور امی نے مجھ سے ایک بار بھی بات نہ کی ہو''۔

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو محبّ بڑی امی نے تو کافی بار فون کیا ہے لیکن تم سو رہے تھے اور ڈاکٹر نے تمھیں ڈسٹرب کرنے سے منع کیا تھا اس لیے تم سے بات نہیں ہو پائی'' وہ بھی اپنی بات پر ڈھٹائی سے قائم تھی۔

''اگر اب امی کا فون آئے تو بے شک میں سویا بھی ہوا تو مجھے اُٹھا دینا'' بالآخر اُس نے تھک ہار کر مان ہی لیا۔

''اچھا ٹھیک ہے اب زیادہ باتیں نہ کرو اور آرام کرو تمھارے زخم ابھی تازہ ہیں''۔

''ہاں ٹھیک ہے۔'' اُس نے آنکھیں بند کیں اور پھر سے سونے کی کوشش کرنے لگا۔

☆......☆......☆

''اریشہ کہاں ہے۔'' گھر آتے ہی اُس نے اریشہ کے بارے میں پوچھا۔

''کل صبح ڈرائیور آیا تھا تو میں نے اریشہ کو اُس کے ساتھ لاہور بھیج دیا تھا''۔

''اس کا مطلب کہ امی آ گئی ہیں لندن سے اسی لیے تو اُنھوں نے اریشہ کو واپس بلا لیا ہے۔'' اُس نے خود سے ہی اندازہ لگا لیا۔

''ہوں۔'' اُس نے کچھ نہ کہنا ہی مناسب سمجھا۔

''مہوش سامان پیک کرو ہم بھی گھر جا رہے ہیں۔'' اُس نے اچانک سے فیصلہ کیا۔

''اتنی جلدی بھی کیا ہے ابھی تو اسپتال سے آئے

ہیں۔''

''ایک مہینہ ہوگیا ہے مجھے اسپتال میں پڑے ہوئے اور تم کہہ رہی ہو کہ جلدی کیا ہے۔'' وہ زچ ہوگیا تھا۔

''وہی تو کہہ رہی ہوں کہ ایک مہینے سے آپ بستر پر رہے ہیں اس لیے ابھی کچھ دن گھومتے پھرتے ہیں آپ کا موڈ بھی فریش ہوجائیگا''۔

''اس وقت میرا بالکل بھی سیر سپاٹے کرنے کا دل نہیں چاہ رہا میں بس اپنے گھر جانا چاہتا ہوں''۔

''لیکن محبّ.....'' وہ کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن اُس نے مہوش کی بات کاٹ دی تھی۔

''مہوش سمجھنے کی کوشش کرو پچھلے ایک مہینے سے میں نے اپنی فیملی کو نہیں دیکھا میں ترس گیا ہوں اُن کو دیکھنے کے لیے''۔

''اچھا ٹھیک ہے جیسے آپ کی مرضی۔'' وہ جان چکی تھی کہ اب بحث بیکار ہے۔

☆.....☆.....☆

وہ لوگ واپس لاہور آرہے تھے سارے راستے وہ دونوں خاموشی سے بیٹھے رہے، مہوش کو سمجھ نہیں آرہی تھی کہ محبّ سے کیا کہے لیکن وہ یہ بھی جانتی تھی کہ اگر اُسے بعد میں پتا چلا تو اُسے زیادہ دکھ ہوگا۔

''محبّ میں تم سے کچھ کہنا چاہتی ہوں۔'' جیسے ہی ڈرائیور نے گاڑی گھر کے سامنے روکی تو بالآخر اُس نے ہمت جتائی۔

''بعد میں ابھی میں پہلے سب سے ملنا چاہتا ہوں۔'' وہ جلدی سے گاڑی سے اُترا اور مرکزی دروازے کی طرف ہولیا۔

''السلام وعلیکم.....'' وہ مرکزی دروازے سے اندر داخل ہوا تو علیزے کو اپنے سامنے دیکھ کر کہا۔

''محبّ بھائی۔'' علیزے کی نظر اُس پر پڑی تو بھاگتی ہوئی اُس سے لپٹ گئی اُس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

''کیا ہوا علیزے تم رو کیوں رہی ہو'' اُس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر وہ گھبرا گیا۔

''کچھ نہیں بھائی.....بس آپ کو اتنی دیر بعد دیکھا اس لیے''۔

''اتنا ہی مس کر رہی تھی تو مجھے ملنے کیوں نہیں آئی۔'' اُس نے شکایتی انداز میں کہا۔

اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتی اُس نے خود سے ہی اندازہ لگالیا۔

''سمجھ گیا امی نے آنے نہیں دیا ہوگا اُنھیں تم لوگوں کی پڑھائی کی بہت فکر ہے، اچھا باقی سب کہاں ہیں''۔

''اریشہ سکول ہے اور عمار کالج اور بابا اپنے کمرے میں.....''۔

''اور امی؟''۔

''امی تو.....''۔

''ارے محبّ.....بیٹا تم.....کیسی طبیعت ہے تمھاری؟'' عقب سے بابا نے آواز دی۔

''بابا میں ٹھیک ہوں بس آپ لوگوں سے ملنے کا دل کر رہا تھا اس لیے یہاں آگیا.....امی کہاں ہیں''۔

''اچھا اب تمھارے سینے میں درد تو نہیں ہے۔'' اُنھوں نے اُس کے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

''میں بالکل ٹھیک ہوں بابا.....امی کہاں ہیں۔'' اُس نے ایک بار پھر سے امی کے بارے میں پوچھا۔

''میں جانتا ہوں تم ٹھیک ہو لیکن پھر بھی میں ڈاکٹر کو بلا لیتا ہوں وہ تسلی کرلے گا کہ واقعی تم ٹھیک ہو یا نہیں''۔

''بابا میں آپ سے کیا پوچھ رہا ہوں اور آپ کیا کہہ رہے ہیں'' وہ زچ ہوگیا تھا۔

''بیٹا.....وہ یہیں ہے ہمارے ساتھ۔'' بالآخر اُنھوں نے جواب دے ہی دیا تھا۔

''کیا مطلب یہیں ہیں.....اگر یہیں ہیں تو نظر کیوں نہیں آرہیں''۔

''محبّ تم اُسے نہیں دیکھ سکتے لیکن میرا یقین کرو وہ ہمارے ساتھ ہی ہے''۔

''بابا یہ آپ کیسی پہیلیوں میں باتیں کر رہے ہیں مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہا'' وہ پہیلیوں سے تنگ آگیا تھا۔

''علیزے تم بتاؤ ماما کہاں ہیں.....وہ نا ہی مجھ سے ملنے اسلام آباد آئی تھیں ابھی یہاں آیا ہوں تو یہاں بھی نہیں ہیں آخر تم سب کیا چھپا رہے ہو مجھ سے''۔

''بھائی.....امی'' اُس نے پہلے بابا کی طرف دیکھا اور پھر محبّ کی طرف۔

''علیزے میں اس وقت پاگل ہو رہا ہوں مجھے سچ بتادو

...کہ میرا دل پھٹ جائے اور میں......"۔

"بھائی امی اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔" بالآخر اُس ... دیا۔

"کیا......" سچ سُن کر اُسکی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں اور بے سدھ ہو کر گرنے ہی والا تھا کہ مہوش نے اُسے سنبھال لیا۔

"چھوڑ دو مجھے تم سب جانتی تھی لیکن پھر بھی مجھے ..." اُس نے روتے ہوئے مہوش سے کہا۔

"مجھے معاف کر دو محب لیکن یہ بڑی امی کی نصیحت تھی کہ جب تک تم ٹھیک نہیں ہو جاتے ہم تمھیں کچھ نہ بتائیں"۔

"کیسے ہوا یہ سب۔" وہ گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھ گیا تھا اور مہوش بھی اُس کے ساتھ ہی بیٹھ گئی تھی۔

"تمھارے سینے میں جو دل دھڑک رہا ہے وہ بڑی امی کا ہی ہے"۔

"کیا......لیکن کیوں......؟" اُس نے سوالیہ نگاہوں سے مہوش کی طرف دیکھا۔

"کیونکہ وہ ماں تھی بھائی......" علیزے نے بھی اُسے دلاسہ دینے کی کوشش کی۔

"بڑی امی جانتی تھی کہ تم خود کو سنبھال نہیں پاؤ گے اور تمھارے دماغ میں بہت سے سوال بھی ہونگے

اس لیے وہ تمھارے لیے یہ خط چھوڑ گئی ہیں مجھے یقین ہے کہ تمھیں تمھارے سوالات کے جواب مل جائیں گے"۔

اُس نے خط کھولا اور پڑھنا شروع کیا۔

"محبّ میرے بچے مجھے بہت خوشی ہے کہ تم ٹھیک ہو گئے ہو اللہ تمھیں لمبی زندگی عطا کرے اور تمھیں دنیا جہان کی ساری خوشیاں عطا کرے۔ میں جانتی ہوں کہ جب تم ٹھیک ہو جاؤ گے تو مجھے اپنے سامنے نہ دیکھ کر سخت پریشان ہو جاؤ گے اور اُس وقت تمھیں کسی کے بھی سمجھانے سے کوئی بات سمجھ نہیں آئے گی اسی لیے میں خود تمھارے لیے تمھارے سوالوں کے جواب چھوڑ کر جا رہی ہوں۔

تم سوچ رہے ہو گے کہ میں نے ایسا کیوں کیا تو اس سوال کا جواب تمھیں اُس وقت ملے گا جب تم خود باپ بن جاؤ گے۔

بیٹا اللہ تعالیٰ قرآن پاک میں فرماتا ہے کہ تمھارا مال اور تمھاری اولاد تمھارے لیے آزمائش ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیشہ اپنے پیارے بندوں کو ہی آزماتا ہے اور اُس نے مجھے اولاد کے ذریعے آزمایا اور مجھے اس وقت جو ٹھیک لگا میں نے وہی کیا۔ دیکھا جائے تو اس دنیا میں ماں باپ اولاد کے ساتھ ہمیشہ نہیں رہتے کچھ لوگوں کی اولاد ہی اُنھیں خود سے دور کر دیتی ہے اور کچھ کو موت اُن سے جدا کر دیتی ہے لیکن دیکھو میں کتنی خوش قسمت ہوں کہ ہمیشہ تمھارے ساتھ رہوں گی تمھارا دل بن کر۔ ہر انسان اس دنیا میں اپنی ایک محدود مدت کے لیے آیا ہے اور یہ سمجھ لو کہ میری وہ مدت پوری ہو چکی تھی اس لیے مجھے جانا ہی پڑے گا لیکن میرے دوسرے بچوں کی تمام ذمہ داریاں جو میں پوری نہیں کر سکی اب وہ تمھارے ذمہ ہیں اُس نے آنکھوں سے آنسو صاف کیے اور مہوش کی طرف دیکھا جو اُس کے ساتھ وہ خط پڑھ رہی تھی۔

میں جانتی ہوں کہ تمھارے بابا اور مہوش بھی اُن کا بہت خیال رکھیں گے لیکن تم اُن کو زیادہ اچھی طرح سمجھ سکو گے کیونکہ تمھارے سینے میں اُن کی ماں کا دل ہے اس لیے آج سے تم اُن کے لیے بھائی ہی نہیں بلکہ اُن کی ماں بھی ہو۔ اب رونا دھونا چھوڑو اور اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرو مجھے یقین ہے کہ تم مجھے مایوس نہیں کرو گے۔ اللہ تعالیٰ تم سب کا حامی و ناصر ہو" اُس نے خط بند کیا اور اپنے سینے سے لگایا۔

"میں وعدہ کرتا ہوں امی کہ آپ کو شرمندہ نہیں ہونے دوں گا" اُس نے نم آنکھوں سے آسمان کی طرف دیکھ کر عہد کیا۔

سیاناکوا

ریاض بٹ

ایک گھوڑی کی چوری سے شروع ہونے والی کہانی جو آپ کو ہر سطر پر رنگ بدلتی محسوس ہوگی

دلوں کے تار چھو لینے والی کہانی، جسے آپ مدتوں یاد رکھیں گے

امیر لوگوں کے شوق بھی امیرانہ ہوتے ہیں..... اپنے پالتو جانوروں کو وہ' وہ چیزیں کھلاتے ہیں کہ سوچ کر ہی لوگ دانتوں میں انگلیاں داب لیتے ہیں۔ یعنی انگشت بدنداں رہ جاتے ہیں۔ ایک دن زیلدار دوست محمد کانو کر رحمت علی تھانے میں آیا..... اور بتایا کہ زیلدار صاحب کی گھوڑی چوری ہوگئی ہے..... انہوں نے پیغام بھیجا ہے کہ تھانیدار صاحب سے کہنا وہ تھوڑا وقت نکال کر حویلی میں آئیں۔

زیلدار دوست محمد کا تعلق محبت آباد گاؤں سے تھا..... وہ صحیح معنوں میں انسان دوست تھا' اپنے مزارعوں کا بہت خیال رکھتا تھا۔ میری اس کے ساتھ ٹھیک ٹھاک سلام دعا تھی۔

میں نے رحمت علی کو اپنے کمرے میں بلا لیا تھا اور اب وہ میرے سامنے بیٹھا تھا۔

''رحمت علی! کیا گھوڑی بہت زیادہ قیمتی تھی' دو دفعہ میں حویلی میں گیا تھا لیکن مجھ سے تو کسی نے گھوڑی کا کبھی ذکر نہیں کیا۔ آخری بار تقریباً پندرہ دن پہلے حویلی گیا تھا جس کیس کے سلسلے میں گیا تھا اس کا ذکر اگلی کہانی میں آئے گا۔

''تھانیدار صاحب' دراصل یہ گھوڑی زیلدار صاحب کی چہیتی گھوڑی تھی۔ اس کی نگہداشت اور ٹیل سیوا (خدمت) کے لیے دو بندے اکبر اور ثانی مامور تھے اور یہ دونوں زیلدار صاحب کے خاص بندے ہیں۔ باقی رہی بات گھوڑی کا ذکر نہ کرنے کی تو اس بابت عرض ہے کہ گھوڑی تقریباً دس دن پہلی آئی تھی رحمت کا یہ قدرے طویل بیان اختتام پذیر ہوا تو میں چند لمحے غور سے رحمت کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا پھر گویا ہوا۔

''چلو..... یہ تو کوئی ایسی بات نہیں..... جس پر زیادہ غور کیا جائے مجھے تم یہ بتاؤ کہ اکبر یا ثانی میں سے کوئی تمہارے ساتھ کیوں نہیں آیا؟''

''تھانیدار صاحب میں بھی کتنا کملا (بھلا) ہوں' دراصل یہ بات مجھے پہلے بتانی چاہیے تھی..... گھوڑی کے ساتھ وہ دونوں بھی غائب ہیں..... بھی تو زیلدار صاحب نے آپ کو بلایا ہے..... وہ خود اس لیے نہیں آئے کہ ان کی حالت ٹھیک نہیں ہے' یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ان کا کوئی قریبی رشتے دار گم ہوگیا ہو۔''

''دونوں بھی غائب ہیں.....'' میں نے زیر لب دہرایا..... ''اچھا تم باہر بیٹھو ہم ابھی تیاری کر کے تمہارے ساتھ چلتے ہیں۔''

اگر گھوڑی کا معاملہ ہوتا تو میں ہیڈ کانسٹیبل اور کوئی سپاہی بھیج دیتا..... لیکن یہاں مجھے گھوڑی کی چوری میں کسی سازش کی بو آ رہی تھی۔

بہر حال..... ضروری تیاری کے بعد میں ہیڈ کانسٹیبل اکبر خان اور سپاہی عارف کے ساتھ زیلدار کی بھیجی ہوئی جیپ میں بیٹھ کر اس کی حویلی پہنچ گیا۔

زیلدار کی حویلی ایسی ہی تھی جیسی اس جیسے زیلداروں اور جاگیرداروں کی ہوتی ہیں۔

اس میں صرف یہ بات منفرد تھی کہ اس کی تعمیر اور

آرائش میں پرانی طرز کے میٹریل کے ساتھ جدید میٹریل (اب وقت کا) بھی استعمال ہوا تھا نوکر ہمیں چند لمحوں کی دائمی مفارقت دے کر چلا گیا۔

اور جب وہ واپس آیا تو مجھے سیدھا زیلدار کی خواب گاہ میں لے گیا۔ ہیڈ کانسٹیبل اور سپاہی میرے کہنے پر باہر ہی رہ گئے تھے۔

زیلدار نے اپنے بیڈ سے اٹھ کر میرا استقبال کیا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کا جسم ہولے ہولے لرز رہا ہے۔

اس نے مجھے اپنے ساتھ ہی کنگ سائز کے بیڈ پر بٹھالیا۔

''دوست محمد صاحب آپ نے تو شاید گھوڑی کی چوری کو دل پر ہی لے لیا ہے۔'' میں نے مزاح کے رنگ میں کہا۔

''تھانیدار صاحب...... ایک تو گھوڑی مجھے بہت عزیز تھی' دوسرے......'' چند لمحے اس نے توقف کیا پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

''مجھے صرف گھوڑی چرانے کا واقعہ نہیں لگتا' بلکہ مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے میرے اردگرد کسی سازش کا جال بنا جا رہا ہو۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''فی الحال میں اتنا ہی کہہ سکتا ہوں......زیلدار نے مردہ سی آواز میں کہا۔

'مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے زیلدار جو کچھ کہنا چاہ رہا ہو اس کے لیے اسے مناسب الفاظ نہ مل رہے ہوں...... یا وہ کچھ چھپانا چاہ رہا ہو۔

''دوست محمد صاحب ذرا کھل کر بات کریں۔''

''جناب...... یہ گھوڑی بڑی اڑن پھس (ضد میں) خریدی گئی تھی۔ ذرا لمبی ہے میں ذرا تفصیل سے بتاتا ہوں' تب بات آپ کے پلے پڑے گی۔''

ہمارے گاؤں اور شہر کے درمیان ایک وسیع قطعہ خالی ہے وہاں ہر جمعہ کو مویشیوں کی منڈی لگتی ہے۔ وہاں یہ گھوڑی برائے فروخت آئی تھی۔ میں منڈی میں شاذو نادر ہی جاتا ہوں' سارے کام (مویشیوں کی خرید و فروخت) میرے نوکر ہی کرتے ہیں۔ آج سے تقریباً دس دن پہلے بیٹھے بیٹھے میرے دل میں خیال آیا کہ چلو آج منڈی کا ہی ایک چکر لگا لیتے ہیں۔

میں اکبر اور زمرد کو ساتھ لے کر گیا تھا۔

وہاں میری اس گھوڑی پر نظر پڑ گئی...... تھانیدار صاحب' میں آپ کو کیا بتاؤں؟ کتنی خوبصورت گھوڑی تھی۔ اس کے مالک خیر دین نے بتایا تھا کہ یہ اس کی چہیتی گھوڑی ہے' اس کی ماں گل گھوٹو کی بیماری کی وجہ سے اس وقت مر گئی تھی جب یہ گھوڑی ابھی صرف چند دن کی تھی پھر اس نے بڑی جان جوکھم سے اسے پالا تھا......

یہ باتیں کرتے ہوئے خیر دین کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے...... اتنی پیاری اور چہیتی گھوڑی کو بیچنے کی وجہ خیر دین نے یہ بتائی کہ اس کی بیوی سخت بیمار ہے اسے شہر میں علاج کے لیے لے جانا ہے۔

بہرحال ابھی ہم اس کے ساتھ بھاؤ تاؤ کر ہی رہے تھے کہ ایک کڑیل جوان آیا اور گھوڑی کو ٹھوک بجا کر دیکھنے لگا۔ پھر ہمیں نظر انداز کرتے ہوئے خیر دین سے بولا۔

''چاچا......اس گھوڑی کے کیا دام ہیں؟'' اس کے لہجے سے فرعونیت ٹپکتی تھی۔

خیر دین نے چند لمحے پلکیں جھپکا کر ہم دونوں کو دیکھا پھر نرم لہجے میں بولا۔

''بیٹا......سب سے پہلے گھوڑی خریدنے کا ان کا حق ہے۔ خیر دین نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا اگر ان کے ساتھ میرا سودا نہ بنا تو تمہارے ساتھ بات ہوگی۔''

یہاں اس بات کی وضاحت کر دوں کہ خیر دین کی عمر پچپن اور ساٹھ سال کے درمیان تھی۔ وہ شکل سے بھلا مانس لگتا تھا۔

''دیکھو...... چاچا' یہ گھوڑی مجھے پسند آ گئی ہے' اس لیے میں اسے خرید کر رہوں گا۔ ابھی تمہاری بات چیت چل رہی ہے نہ سودا فائنل تو نہیں ہوا۔''

''بات اصول کی ہے بیٹا' خیر دین کچھ اور بھی کہنا

...تھا ایلن جوان نے اس کی بات کاٹتے ہوئے انتہائی ...ی سے کہا۔

"زیادہ ...... ایمانداری دکھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے کہہ دیا کہ گھوڑی میں ہی خریدوں گا' ورنہ "

میں نے دیکھا...... کہ جوان کے ساتھ تین آدمی اور بھی ہیں...... جو کینہ توز اور غصیلی نظروں سے خیر دین کو ...یکھنے لگے تھے۔

میں نے یہاں دخل دینا مناسب سمجھا...... اور جوان کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

"جوان تم کون ہو...... اور بے جا ضد کیوں کر رہے ہو۔"

"میرا نام چوہدری ماجد ہے' اور میں مراد آباد کے......" میں نے اس کی بات درمیان سے اچکتے ہوئے کہا۔

"تو گویا چوہدری ساجد کے فرزند ارجمند ہو۔"

"بالکل...... تو آپ انہیں جانتے ہیں؟"

"بس...... اب تم چلتے پھرتے نظر آؤ' تو بہتر ہے۔ ...یہ گھوڑی میں نے خرید لی ہے۔"

اس نے میری بات کو نظر انداز کرتے ہوئے خیر دین کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"میں تمہیں اس گھوڑی کے تیس ہزار روپے دے ...تا ہوں۔"

آگے بڑھنے سے پہلے اس کی بات کی وضاحت ...دوں کہ جس زمانے کی یہ بات ہے' تیس ہزار روپے ...ت بڑی رقم تھی اور یہ بتانا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا ...اس وقت گھوڑی کی قیمت بیس پچیس ہزار سے زیادہ ...تھی۔

...دین نے میری طرف دیکھا...... اس کی آنکھوں ...سوال تھا کہ اس معاملے میں آپ کیا کہتے ہیں؟

...تھانیدار صاحب ایک تو خیر دین اتنا مجبور تھا کہ اپنی ...گھوڑی بیچنے آ گیا تھا دوسرے ماجد کی ضد میں' ...دین نے کہا۔

...ہزار روپے لو اور گھوڑی ہمارے حوالے کرو۔"

اس سے پہلے کہ ماجد کوئی بات کرتا...... خیر دین نے گھوڑی اکبر کے حوالے کر دی' زمرد نے اسے بتیس ہزار روپیہ گن کر دے دیا۔

میں نے محسوس کیا کہ ماجد انگاروں پر لوٹ رہا ہے۔ اس نے میری طرف خشمگیں نگاہوں سے دیکھا' اور پیر پٹختا ہوا چلا گیا۔

یہ ہے ساری کہانی...... یہ بات بھی بتا دوں کہ سارا حساب کتاب زمرد کے پاس ہی ہوتا ہے۔"

"ہوں" میں نے ہنکارا بھرا۔ چند لمحے دوست محمد کی طرف دیکھتا رہا پھر بولا۔

"اب آپ کا خیال یہ ہے کہ گھوڑی چوہدری ساجد کے بیٹے ماجد نے چوری کروائی ہے۔"

"جناب اس شک کو ایک اور بات بھی تقویت دیتی ہے۔"

"کونسی بات؟"

"ہمارے خاندان کی چوہدری ساجد کے خاندان کے ساتھ پرانی عداوت چلی آ رہی ہے۔"

"یہ سب باتیں تو اپنی جگہ ہیں لیکن ایک بات کی مجھے سمجھ نہیں آ رہی۔"

"کونسی بات...... تھانیدار صاحب؟" زیلدار دوست محمد نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"آپ کے خاندان کی' چوہدری ساجد کے ساتھ دشمنی چلی آ رہی ہے' اور ماجد آپ کو جانتا تک نہیں۔"

"اوہ...... آپ یہ بات کہہ سکتے ہیں' کیونکہ آپ سارے حالات سے واقف نہیں ہیں۔ اصل میں ماجد اپنی پھوپھی کے پاس پلا بڑھا ہے' وہ سندھ میں رہتی ہے...... اس کی کوئی اولاد نہیں ہے...... اس لیے بچپن میں ہی وہ اسے لے گئی تھی۔ میں نے اسے بچپن کا دیکھا ہوا تھا...... اور اب وہ ایک گھبرو جوان کے روپ میں میرے سامنے آیا تھا...... سترہ اٹھارہ سال عمر ہوگی۔"

بہر حال اس بات پر زیادہ مغز کھپائی کی ضرورت نہیں ہے' آپ بالکل بے فکر ہو جائیں اور ہر قسم کے وہموں کو

دل سے نکال دیں' ایک بات کا ذکر کرنا میں پہلے بھول گیا تھا اب کر دیتا ہوں۔

حویلی میں آنے کے بعد میں نے سب سے پہلے گھوڑی کے لیے مخصوص جگہ کا معائنہ کیا تھا۔

تقریباً دو مرلے قطعہ اراضی کے درمیان ایک کمرہ بنا ہوا تھا' جو 8x6 فٹ کا تھا..... اس کے چہار سو تقریباً پانچ پانچ فٹ اونچی چار دیواری تھی۔ کمرے کا فرش اینٹوں کا بنا ہوا تھا' جبکہ صحن کچا تھا۔ وہاں ایک بیری کا درخت تھا۔

وہاں پر مجھے دھینگا مستی کے کسی قسم کے آثار نظر نہیں آئے تھے۔ جہاں پر گھوڑی بندھی ہوئی تھی۔ وہاں رسی نہیں تھی' یوں محسوس ہوتا تھا جیسے جو کوئی بھی گھوڑی کو لے گیا تھا اس نے نہایت اطمینان سے گھوڑی کو کھولا تھا' اور لے کر رفو چکر ہو گیا تھا۔

لیکن.....!

ایک بات حیرانگی اور اچھنبے کی تھی کہ اکبر اور ثانی کدھر تھے' ان کے متعلق یہ بات پتہ چلی تھی کہ وہ چونکہ گرمیوں کے دن تھے اس لیے چار دیواری کے اندر یعنی صحن میں ہی سوتے تھے۔ جیسا کہ ذکر آ چکا ہے کمرے کا فرش اینٹوں کا تھا' اس لیے وہاں کسی قسم کے کھرے ملنے کا امکان نہیں تھا' البتہ صحن میں کھرے موجود تھے جو گڈمڈ تھے..... اس لیے وہاں کھرے اٹھانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا..... دوسرے لفظوں میں لوگوں نے کھردں کا ستیاناس کر دیا تھا۔

صرف ایک سراغ ملا تھا..... ڈیرے کے باہر کسی گاڑی کے پہیوں کے نشان موجود تھے..... جو آگے جا کر بڑی سڑک تک چلے گئے تھے۔

تھانے میں واپس آ کر میں نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اے ایس آئی آفاق کو اپنے کمرے میں بلا لیا..... اور ساری صورت حال اس کے سامنے رکھ دی۔

''سر..... سب سے پہلے تو ہمیں اکبر اور ثانی کا سراغ لگانا ہے۔ بالکل معقول بات ہے' زیلدار نے میرے پوچھنے پر یہ بتایا تھا کہ دونوں میرے بھروسے کے آدمی تھے لیکن میں نے چند لمحے توقف کیا پھر اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''انسان کی فطرت عجیب ہے..... اسے میر جعفر اور میر صادق بنتے ہوئے دیر کتنی لگتی ہے؟''

''یہ بات تو ہے..... سر ہو سکتا ہے کسی گھر بھیدی نے ہی لنکا ڈھا دی ہو۔''

اس کے بعد اے ایس آئی چلا گیا تھا اور..... میں میز پر رکھی ڈاک کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔

ویسے ہم نے زیلدار کے کہنے پر گھوڑی کے ساتھ اکبر اور ثانی کی گمشدگی کی رپورٹ بھی درج کر لی تھی۔

ابھی ہم نے ایک دم چھوٹے چوہدری ماجد کو نہیں بلانا تھا' اور نہ ہی بڑے چوہدری ساجد کو چھیڑنا تھا۔

میں نے یہ اندازہ لگایا تھا کہ زیلدار کچھ باتیں چھپا رہا ہے' چوہدری ساجد کے خاندان کے ساتھ اپنی دشمنی کی وجہ وہ گول کر گیا تھا۔ میرا تجربہ یہ کہتا تھا کہ دشمنی کی وجہ گہری ہے' یہ کوئی چھوٹی وجہ نہیں ہے۔

ایسے معاملات' کی گہرائی میں جانے کے لیے مخبر ہمارے لیے بہت کارآمد ہوتے ہیں' گاؤں کا نمبردار بھی کام کا بندہ ہوتا ہے۔

لیکن کچھ نمبردار ایسے ہوتے ہیں جو کام دکھا بھی دیتے ہیں یعنی پولیس کو بھٹکا بھی دیتے ہیں۔

اے ایس آئی نے مخبر نوید کو استعمال کرنا تھا۔

ویسے ایک بات اور بھی ہو سکتی تھی' جانوروں کے متعلق آپ نے بھی اکثر سنا ہو گا' کہ اگر انہیں موقع ملے تو وہ اپنے سابقہ مالکوں کے پاس واپس بھی چلے جاتے ہیں..... پھر گھوڑی تو خیر دین کے ہاتھوں میں جوان ہوئی تھی' زیلدار نے باتوں باتوں میں خیر دین سے اس کے گاؤں کا پتہ پوچھ لیا تھا۔ میں نے سپاہی عارف کو بلا کر خیر دین کے گاؤں جانے کا حکم دے دیا تھا۔ گاؤں ہمارے تھانے کی حدود میں آتا تھا۔

اسے پتہ تھا کہ اس نے کیا کرنا ہے؟ اور کیسے کرنا ہے؟ عارف میں جاسوسی کی صلاحیت بدرجہ اتم موجود تھی اور وہ کسی جاسوس کی طرح ہی پھرتیلا بھی تھا۔

دو دن اس کیس کے سلسلے میں کوئی پیش رفت نہیں

ولی تھانے میں اور بھی جھمیلے ہوتے ہیں...... ان کو تھانے میں دو دن گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا۔

...ے دن اچانک موسم خوشگوار ہوگیا...... جب تیز گرمی پڑ رہی ہو اور اچانک گھٹائیں امڈ کر آئیں تو موسم خوشگوار ہونے کے ساتھ ساتھ انسان کا جی یہ گنگنانے کو چاہتا ہے کہ

رم جھم، رم جھم پڑے پھوار......

اور پھر واقعی پھوار پڑنی شروع ہوگئی...... جو بتدریج تیز بارش میں تبدیل ہوگئی۔

پھر بارش رک گئی......اور تیز ہوائیں چلنے لگیں۔

میں یہ سارا منظر اپنے کمرے کی کھڑکی سے دیکھ دیکھ کر لطف اندوز ہونے کے بعد اب اپنی کرسی پر بیٹھ چکا تھا۔

اچانک سپاہی عظمت کی شکل دروازے میں نظر آئی۔

''سر...... خیر دین آیا ہے۔''

''خیر دین......'' میں اچھل پڑا۔

''جی سر۔''

''بھیج دو۔'' میرے لیے یہ بالکل غیر متوقع تھا۔

چند لمحوں کے بعد وہ میرے سامنے تھا۔

خیر دین کی عمر ساٹھ سال کے آس پاس ہوگی۔ قد درمیانہ، اور رنگ گندمی تھا۔ آنکھیں چندھیائی ہوئی سی لگتی تھیں، ویسے خیر دین کی عمر کے متعلق آپ پہلے بھی جان چکے ہیں، وہ کچھ پریشان سا لگتا تھا...... اسے اچانک اور اس حال میں اپنے سامنے دیکھ کر میرے ذہن میں ایک خیال بجلی کی طرح کوندا۔

وہ خیال لفظوں کی صورت میں، جب میں نے اس کے کانوں میں انڈیلا تو اس نے اور ہی کہانی سنادی...... لیجیے اس کی زبانی سنیے۔

''تھانیدار صاحب آپ نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ ...یں چھوٹے چوہدری ماجد نے کوئی ٹیڑھی ...ی (دھمکی) تو نہیں لگائی ...... ایسی تو کوئی بات نہیں ...ی البتہ کل رات ایک حیرت انگیز واقع ضرور ہوا۔

آج کل مویشیوں کی چوری کے بہت واقعات ہو رہے ہیں، اس لیے میں مویشیوں کے پاس ہی سوتا ہوں...... مویشی بھی اب کیا رہے ہیں...... دو بھینسیں اور ایک گائے ہی رہ گئی ہے۔

اچانک میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا...... یوں محسوس ہوا جیسے داخلی دروازہ کوئی ہلا رہا ہو۔

میں نے چارپائی سے اٹھ کر پاؤں نیچے لٹکائے اور چپل ڈھونڈنے لگا...... صحن میں ملگجی روشنی والا بلب جلتا رہتا ہے......چپل پاؤں میں ڈال کر میں دروازے کے پاس جا کھڑا ہوا......اور پوچھا۔

''کون ہے بھئی؟''

''خیر دین تمہارا ہی نام ہے ......'' باہر سے ایک بھاری بھرکم آواز آئی۔

''میں ہی خیر دین ہوں......آپ کون ہیں اور رات کے اس پہر آپ کو مجھ سے کیا کام ہے؟'' میں ڈر رہا تھا اور میں نے واضح طور پر محسوس کیا کہ میری آواز میں کپکپاہٹ ہے۔

''تم بلاخوف و فکر دروازہ کھول دو......ہمیں چھوٹے چوہدری ماجد نے بھیجا ہے۔''

''بھائی صبح آنا...... اس وقت......'' میں باقاعدہ خوف سے کانپنے لگا۔

''چوہدری ماجد کا نام سن کر میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے تھے۔

کیونکہ منڈی میں چھوٹے چوہدری ماجد کی آنکھوں میں مجھے اپنے لیے شعلے نکلتے محسوس ہوئے تھے۔ اور اب یہ خوف دامن گیر ہوگیا تھا کہ یہ لوگ مجھے یا تو قتل کرنے آئے ہیں یا کوئی اور نقصان پہنچانے۔

''تم دراوزہ کھولتے ہو......یا ہم دروازہ توڑ کر اندر آجائیں۔''

ساتھ ہی مجھے اپنی گھوڑی کے ہنہنانے کی مخصوص آواز سنائی دی۔ میں نے اس طرح دروازہ کھول دیا......جیسے کسی جن نے مجھ سے یہ کام کروا دیا ہو۔

وہ تین سیاہ پوش تھے......اور انہوں نے اپنے چہروں کو کالی چادروں سے ڈھانپا ہوا تھا......سب سے آگے تھا وہ دراز قد تھا، اس نے گھوڑی کی رسی پکڑی ہوئی تھی۔

''دراز قامت شخص نے منمناتی ہوئی آواز میں کہا۔

''یہ لو اپنی گھوڑی..... اور آئندہ چوہدری ماجد صاحب کے ساتھ پھڈہ نہیں ڈالنا..... ورنہ.....''

پھر وہ خاموشی سے چلے گئے تھے۔

میں کافی دیر بت بنا اپنی جگہ پر کھڑا رہا..... پھر جیسے مجھے یہ احساس ہوا کہ طوفان تو گزر چکا ہے۔

میں نے محسوس کیا کہ گھوڑی میرا ہاتھ چاٹ رہی ہے۔ مجھے ندامت ہوئی کہ میں نے جس ہاتھ سے اس کی رسی غیر کے حوالے کی تھی یہ بے زبان میرا وہی ہاتھ چاٹ رہی ہے۔

میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ جیسے میری محبت اور بے بسی کے وہ آنسو جو کافی دیر سے میری آنکھوں میں تیر رہے تھے ٹپک کر اس کی گردن پر گر چکے ہیں۔

میں نے اسے اس کی مخصوص جگہ پر باندھا۔

اور داخلی دروازہ جو اب تک کھلا ہوا تھا بند کر کے چارپائی پر آ کر بیٹھ گیا۔

میری نیند اڑ چکی تھی۔

باقی رات میں نے آنکھوں میں کاٹی' صبح میں نے سارا ماجرہ گھر والی کو جا سنایا.....!

اس نیک بخت نے مجھے آپ کے پاس آنے کا مشورہ دیا..... اب میں آپ کے سامنے ہوں۔''

وہ خاموش ہوا' تو میں نے نرم لہجے میں کہا۔ خیر دین' ہر وقت اللہ سے خیر کی توقع رکھنی چاہیے' اب تمہاری گھر والی کی طبیعت کیسی ہے؟''

''اب تو بہت بہتر ہے جناب عالی۔''

''اب دو سوالوں کا جواب دے دو..... میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''پوچھیں تھانیدار صاحب۔''

''پہلا سوال یہ ہے کہ جب تمہارے پاس تین سیاہ پوش آئے تو کسی لمحے تمہیں محسوس ہوا کہ تم ان سے پہلے بھی مل چکے ہو..... خاص طور پر اس دراز قد سیاہ پوش سے جو بولا تھا..... اور جس نے گھوڑی کی رسی تمہیں تھمائی تھی۔

''بالکل نہیں ..... البتہ یہ محسوس ضرور ہوا تھا کہ وہ آواز بدل کر بولنے کی کوشش کر رہا ہے..... پھر وہ اس طرح میری طرف دیکھنے لگا جیسے میرے دوسرے سوال کا منتظر ہو۔

''اچھا اب تم کیا چاہتے ہو؟''

''جناب میں نے کیا چاہنا ہے؟ اب جو کچھ کریں گے آپ کریں گے۔'' خیر دین نے آہ بھر کر کہا۔

''خیر دین..... میں تمہاری بات سمجھ گیا ہوں' گھوڑی تو تم بیچ چکے ہو' یعنی اسکے حقوق سے دستبردار ہو چکے ہو' اب تم چاہتے ہو کہ تمہیں تحفظ دیا جائے' تم گھوڑی واپس کرنے کو تیار ہو۔''

''بالکل..... تھانیدار صاحب اللہ آپ کو مزید ترقی دے..... اور ہمیشہ خوش وخرم رہیں۔'' خیر وین نے گویا دل کی گہرائیوں سے مجھے دعا میں دیتے ہوئے کہا۔

''دیکھو..... تم بالکل نہ گھبراؤ اور نہ ہی کسی قسم کی فکر کرو..... پھر میں نے کانسٹیبل اکبر خان کو بلا کر خیر دین کو اس کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

''اکبر خان..... خیر دین کو لے جاؤ' اپنی بیرک میں اس کے لیے مجھی بستر ے اور کھانے پینے کا بندوبست کرو..... اور ہاں دیکھو یہ ہمارا مہمان ہے۔''

''میں بالکل اور سو فیصد سمجھ گیا ہوں سر..... آپ بالکل بے فکر ہو جائیں۔''

اور میں واقعی خیر دین کی طرف سے بے فکر ہو گیا۔

''مجھے اب بہت سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا تھا۔

یہ تو آپ نے بھی سن رکھا ہو گا کہ ہاتھیوں کی لڑائی میں چیونٹیوں کی شامت آ جاتی ہے اس لیے میں نے خیر دین کو فی الحال تھانہ میں ہی روکنا مناسب سمجھا۔ یہاں بھی مجھے ایسا ہی معاملہ نظر آ رہا تھا۔

ابھی میں زیلدار دوست محمد کو بلانے کے متعلق سوچ ہی رہا تھا کہ.....

سپاہی شہباز کی شکل دروازے میں نظر آئی۔

''شہباز آ جاؤ..... خیر تو ہے۔''

''سر..... زیلدار دوست محمد کو کسی نے قتل کر دیا ہے۔ ان کے ساتھ ایک عورت کی لاش بھی ہے۔ لگتا ہے وہ بھی وہیں قتل ہوئی ہے۔''

''ایا مطلب.....'' میں اچھل پڑا۔
''سر.... دو بندے حویلی سے آئے ہیں یہ اطلاع لائے ہیں۔''
''ان کو بھیج دو فوراً۔''
یہ سب تو بالکل غیر متوقع تھا۔ اس کے متعلق تو میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔
بہر حال دونوں بندوں سے چھوٹا سا انٹرویو کرنے کے بعد میں نے ضروری تیاری کا حکم دے دیا۔
پتہ یہ چلا تھا کہ زیلدار اور عورت کی لاش کھیتوں کے پاس بنے ہوئے ڈیرے میں تھی..... اس ڈیرے میں فتح محمد عرف پھتو اور ظریف رہتے تھے۔
کچھ دیر کے بعد ہم ڈیرے پر پہنچ گئے..... میرے ساتھ سپاہی شہباز اور انور تھے یہ ڈیرہ کم از کم تین مرلے قطعہ زمین پر بنا ہوا تھا..... دو کمرے تھے۔ ایک میں تین چار پائیاں' ایک میز دو کرسیاں تھیں..... جبکہ دوسرے کمرے میں آلات زراعت رکھے ہوئے تھے۔
لاشیں ایک ہی چار پائی پر تھیں اور جس حالت میں تھیں وہ ان کے آپس کے تعلقات کی چیخ چیخ کر گواہی دے رہی تھیں۔
میں زیادہ تفصیل میں نہیں جانا چاہتا..... کیونکہ؟ میں نے بغور لاشوں کا جائزہ لینا شروع کر دیا..... دونوں کو بڑی بے دردی سے کسی چھری یا خنجر کے پے در پے وار کر کے ہلاک کیا گیا تھا۔ تین زخم زیلدار کی چھاتی پر تھے..... ان میں دو زخم یقیناً دل کے مقام پر تھے..... جبکہ تقریباً ایسی ہی حالت عورت کی تھی..... یہ کام مشاق ہاتھوں کا تھا۔
زیلدار کے متعلق اس تھانے میں آنے کے بعد جو کچھ مجھے معلوم ہوا تھا اس کا خلاصہ یہ تھا۔
وہ ایک حساس دل' مہربان اور مزارعوں کے لیے دیوتا سے کم نہیں تھا۔
مگر..... عورت کے معاملے میں کسی مرد کے متعلق کوئی اندازہ لگانا ناممکن کی حد تک مشکل ہوتا ہے۔
میں نے ضروری کاغذی کارروائی کے بعد تینوں لاشیں پوسٹ مارٹم کے لیے سپاہی شہباز کی نگرانی میں بھجوا دیں۔
اس دوران محبت آباد کا نمبر دار لیاقت میرے ساتھ ساتھ تھا۔ آگے بڑھنے سے پہلے اس بات کی وضاحت کر دوں کہ لاشوں کی حالت سے یہ بات واضح تھی کہ دونوں کو اسی کمرے اور اسی چار پائی پر قتل کیا گیا ہے۔
نمبر دار نے ہمارے بیٹھنے کا بندوبست اپنے حجرے میں کر دیا تھا' اس حجرے کے کمروں کی چھتیں کچی تھیں' دیواروں پر مٹی کا لیپ تھا..... یہ قدرتی ایئر کنڈیشن کمرے تھے..... اور ان کا اپنا ہی مزہ تھا..... ایسی جگہیں مجھے آج بھی یاد ہیں۔
میں نے سپاہی انور کو حجرے کے باہر ہی رکنے اور اردگرد نظر رکھنے کا حکم دیا..... اور خود نمبر دار کے ساتھ حجرے میں آ کر بیٹھ گیا۔
''دیکھو..... نمبردار صاحب اب تمہاری لیاقت کا امتحان شروع ہوتا ہے۔''
''جناب..... میں تو حکم کا غلام ہوں' آپ جو کہیں گے وہ کروں گا۔''
''لیاقت..... تم میری بات سمجھے نہیں' میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ یہ سب کیا ہے؟''
''ویسے تو زیلدار صاحب بہت مہربان اور انسان دوست تھے لیکن.....'' نمبردار نے بات روک کر میری طرف دیکھا..... میں اس کی نگاہوں کا مفہوم سمجھتے ہوئے تسلی آمیز لہجے میں بولا۔
''تم بالکل بے فکر ہو کر سب کچھ بتاؤ..... میں جب تک اس تھانے میں ہوں تم پر کوئی آنچ نہیں آنے دوں گا۔''
''دراصل باتیں کچھ ایسی ہیں کہ کہتے ہوئے زبان رک جاتی ہے' کسی کی عزت کا سوال ہے۔''
''اب کونسی عزت رہ جاتی ہے۔ لاشوں کی حالت نے سب کچھ عیاں کر دیا ہے اور اب تو دو قتل ہو چکے ہیں۔ اس لیے کوئی چھوٹی سے چھوٹی بات بھی دل میں نہ رکھو۔''
''تھانے دار صاحب..... زیلدار صاحب نسیم عرف نمو کے معاملے میں بالکل بے بس تھے..... بقول ان

کے نسیم نے ان پر جادو سا کیا ہوا تھا..... جس کی وجہ سے وہ صرف دل سے سوچتے تھے..... دماغ کو کام میں نہیں لاتے تھے..... حالانکہ ان کی بیوی نورین لاکھوں میں ایک ہے ..اور انہوں نے نورین کی خاطر مراد آباد کے چوہدری ساجد سے دشمنی مول لی تھی۔''

''اوہ..... تو یہ وجہ ہے دشمنی کی.....'' میں نے زیر لب دہرایا۔

پھر نمبردار نے تفصیل سے ساری باتیں بتائی تھیں..... ان باتوں کا ذکر آگے آئے گا..... اس کے بعد میں نے نمبردار سے جو سوال جواب کیے تھے ان کا ذکر کر دیتا ہوں۔

چلو..... یہ سب تو اپنی جگہ پر ہے..... تم یہ بتاؤ کہ نسیم کا چکر کب سے چل رہا ہے اور نسیم کا گھر کدھر ہے؟''

''تھانیدار صاحب' نسیم مراد آباد کے ایک غریب اور مسکین سے مزارعے تاج محمد عرف تاجو کی بیٹی ہے..... اس کے خاوند عطا محمد نے اسے طلاق دے دی تھی۔''

''خیر..... تم یہ بتاؤ کہ دوست محمد اور نسیم کے تعلقات کے متعلق کتنے لوگ جانتے ہیں؟'' میں نے ایک اور زاویے سے سوال کیا۔

''میرے خیال میں' میرے علاوہ' اس کے دو نوکر پھٹو اور ظریف ہی جانتے تھے۔''

''نسیم کے گھر والے۔''

اس کے متعلق پورے وثوق کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا.....'' نمبردار نے اپنی تھوڑی کھجاتے ہوئے کہا۔

''نسیم کا کوئی جوان بھائی وغیرہ بھی ہے؟''

''اوہ یہ بتانا تو مجھے یاد ہی نہیں رہا' اس کا ایک غنڈہ سا بھائی بھی ہے' نام تو اس کا سجاد ہے..... لیکن اپنے ہم نشینوں میں ساقا کے نام سے مشہور ہے۔'' نمبردار نے چونکتے ہوئے کہا۔

''کیا وہ اس قسم کا غیرت مند اور دلیر ہے کہ بہن کے متعلق کسی سے سن کر اس قسم کی واردات کر دے..... جیسی ہو چکی ہے۔'' میں نے نمبردار کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''بالکل' اتنا جیدار اور غیرت مند ہے۔''

اس کے بعد میں نے ظریف کو بلا لیا..... پھٹو اور ظریف سپاہی انور کی زیر نگرانی تھے۔

میرا ارادہ دونوں سے الگ الگ تفتیش کرنے کا تھا۔

ظریف دبلے پتلے جثے والا بندہ تھا..... رنگ صاف' بال گھنگھریالے اور آنکھیں بے چین سی تھیں ..... جیسے انہیں کسی کی تلاش ہو..... اس کے چہرے کا رنگ یوں اڑا ہوا تھا جیسے اسی نے یہ واردات کی ہو۔

''ظریف..... تم اتنے گھبرائے ہوئے کیوں ہو؟'' میں نے اس کی بے چین آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''جناب..... میں اس لیے گھبرایا ہوا ہوں کہ کہیں آپ مجھ پر ہی نہ شک کریں۔''

''کیا شک کرنے کی وجہ ہے؟'' میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

''وجہ تو کوئی نہیں ہے جناب! لیکن میں نے سنا ہے کہ پولیس والی کھبے سے بھی اقرار جرم کروا لیتے ہیں۔'' اس نے مری مری آواز میں کہا۔

''اچھا..... کس سے سنا ہے۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا تاکہ وہ مجھ سے بے تکلف ہو جائے۔

''بس جناب لوگ کہتے رہتے ہیں۔''

''لوگوں کو چھوڑو..... اپنی بات کرو۔''

''میں اگر سچی بات کروں تو مجھے آپ مختلف لگے ہیں۔''

''اچھا..... یہ بتاؤ زیلدار صاحب اور نسیم کے درمیان رابطے کا کام کون کرتا تھا..... تم یا فتح محمد۔''

''جناب ہم میں سے کوئی نہیں کرتا تھا..... ہمیں صرف اتنا پتہ ہے کہ جس دن نسیم نے آنا ہوتا تھا' زیلدار صاحب ہمیں کہتے تھے کہ آج رات دوسرے کمرے میں گزارو..... ہم چٹائی اور گدے وغیرہ بچھا کر گزارہ کر لیتے تھے۔''

''صبح کی کیا روٹین ہوتی تھی؟''

''صبح ہم سورج نکلنے کے بعد کمرے سے باہر نکلتے تھے' اس وقت نسیم جا چکی ہوتی تھی۔ اور زیلدار صاحب جانے کی تیاری کر رہے ہوتے تھے۔''

''آج صبح کیا ہوا تھا؟''

''جناب ہم رات کو کمرے کا دروازہ بند کر کے سوتے تھے..... کمرے کی دو کھڑکیاں ہیں' آپ نے دیکھی ہی ہوں گی..... ایک سامنے کی طرف اور ایک پچھلی طرف..... کیونکہ گرمیوں کے دن ہیں اس لیے ہم دونوں کھڑکیاں کھول کر سوئے تھے..... چند لمحے ظریف نے کچھ سوچا پھر یوں بولا جیسے اسے کچھ یاد آ گیا ہو۔

''تھانیدار صاحب آج صبح عجیب واقعہ ہوا۔''

''کونسا واقعہ؟'' میں نے پراشتیاق نگاہیں اس کے چہرے پر گاڑ دیں۔

''ایک تو جب ہم سو کر اٹھے تو سورج کافی اوپر آ چکا تھا' دوسرے ہمارا سر بھاری بھاری تھا..... جیسے ہم نے بے ہوشی کی کوئی دوائی پی لی تھی۔''

میں ساری بات سمجھ گیا..... کسی نے سپرے گن سے زیادہ دیرانا غفیل (گہری نیند) لانے والی کوئی دوائی ان کے چہرے پر سپرے کر دی تھی۔

دونوں کھڑکیاں کھلی تھیں.....' میں نے تصدیق کے لیے ظریف سے پوچھا۔

''کل رات جہاں تمہارے بستر تھے کیا وہ کسی کھڑکی کے بالکل نیچے تھے۔

''جی ہاں..... تھانیدار صاحب پچھلی رات کھیتوں کی طرف کھلنے والی کھڑکی کے عین نیچے ہمارے بستر تھے..... کل رات.....'' اس کے بعد..... میں نے اسے فارغ کر کے فتح محمد کو بلا لیا۔

اس نے بھی وہی باتیں بتائیں جو ظریف بتا گیا تھا..... میرے صرف ایک سوال کے جواب میں اس نے ایسی بات بتائی کہ مجھے روشنی کی کرن نظر آ گئی۔ یہ سوال میں نے ظریف سے بھی کیا تھا..... لیکن اس نے لاعلمی ظاہر کی تھی۔

تھانیدار صاحب یہ بڑے لوگ عجیب ہوتے ہیں' اپنے مقصد کے لیے ہمیں استعمال کرتے ہیں..... چونکہ ہم ان کا نمک کھا رہے ہوتے ہیں اس لیے انکار نہیں کر سکتے بعد میں یہی باتیں ہمارے لیے مصیبت بن جاتی ہیں۔ نسیم سے پیغام رسانی کا کام میری بیوی کرتی تھی۔''

''تمہاری بیوی.....'' میں نے زیر لب دہرایا..... اور پھر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''آج کل تمہاری بیوی کہاں رہ رہی ہے؟''

''وہ تو شروع سے گاؤں (مراد آباد) میں رہ رہی ہے۔ میں ہفتے دس دن بعد گاؤں کا چکر لگا آتا ہوں۔''

اب ہمیں سارا فوکس گاؤں مراد آباد پر کرنا تھا۔

میں نے فتح محمد کو بھی فارغ کر دیا۔

تھانے سے گاڑی آ گئی تھی..... میں نے سپاہی انور کو ساتھ لیا اور تھانے میں واپس آ گیا۔

اگلے دن لاشیں پوسٹ مارٹم کے بعد واپس آ گئیں۔

ضروری کاغذی کارروائی کے بعد لاشیں ورثا لے گئے..... اور میں پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کھول کر بیٹھ گیا۔

رپورٹ میں لکھا تھا کہ وار خنجر سے کیے گئے تھے..... زیلدار کے سینے پر جو تین وار تھے ان میں سے دو دل تک چلے گئے تھے۔ تیسرا وار ذرا تر چھا لگا تھا۔ یہی عورت کے ساتھ بھی ہوا تھا..... موت کا وقت رات بارہ بجے سے ایک بجے تھا۔ ابھی میں پوسٹ مارٹم کی رپورٹ پڑھ کر فارغ ہی ہوا تھا کہ اے ایس آئی آفاق میرے کمرے میں داخل ہوا۔

''سر..... ابھی ابھی مجھے پتہ چلا ہے..... کہ گھوڑی واپس خیر دین کے پاس پہنچ چکی ہے اور زیلدار ایک عورت کے ساتھ قتل ہو چکا ہے۔

''بس نہ پوچھو اس کیس میں انہونیاں ہی ہو رہی ہیں' یہ کیس ہمیں چکر در چکر راستوں پر لے جا رہا ہے' اور ہمیں انہی چکروں میں سے راستہ ڈھونڈنا ہے۔'' میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''سر..... نوید رپورٹ لے آیا ہے۔''

''اچھا..... کیا رپورٹ ہے؟'' میں نے دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

''سر..... رپورٹ کا خلاصہ یہ ہے کہ چھوٹا چوہدری واقعی زیادہ تر سندھ میں اپنی پھوپھی کے پاس رہتا ہے' اور کبھی کبھی ہی یہاں آتا ہے' اس لیے دشمنی کی وجہ اس

سے پوشیدہ رہنا کوئی اچھنبے یا حیرانگی والی بات نہیں' دشمنی کی وجہ نورین ہے۔ نورین پہلے چوہدری ساجد کی منگیتر تھی' پھر اچانک پتہ چلا کہ نورین کے والدین نے منگنی توڑ کر رشتہ زیلدار کو دے دیا ہے' دراصل زیلدار چوہدری ساجد سے زیادہ مالدار ہے' سنا ہے زیلدار نے دولت کے بل بوتے پر رشتہ لے لیا تھا' نورین کے والدین غریب اور لالچی ہیں۔ سنا ہے زیلدار نے انہیں کافی نقد روپیہ بھی دیا تھا۔''

''یہ کتنا عرصہ پہلے کی بات ہے؟''

تقریباً دس سال پہلے کی بات ہے۔''

''دس سال پہلے کی..... یہ کیسے ہوسکتا ہے؟''

''کیوں سر..... میں سمجھا نہیں.....'' اے ایس آئی نے حیران نگاہوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''یہ بات ذہن میں رکھو کہ چوہدری ساجد کا بیٹا ماجد (میری معلومات کے مطابق) سترہ اٹھارہ سال کا ہے۔ اس کا مطلب ہے چوہدری ساجد کی شادی کم از کم انیس سال پہلے ہوچکی تھی پھر یہ منگنی وغیرہ کا کیا چکر تھا؟''

''سر..... آپ کا حیران ہونا بالکل بجا ہے' بعض اوقات حالات ایسے ہوتے ہیں کہ انسان سوچنے پر مجبور ہوجاتا ہے' لیکن نوید نے ساری بات واضح کردی ہے اے ایس آئی تھوڑی دیر کے لیے رکا۔

لیکن میں نے اس سے کوئی سوال نہیں کیا۔ اسی کے مزید بولنے کا منتظر رہا۔

''دراصل اس وقت چوہدری ساجد کی بیوی فوت ہوگئی تھی اور اس وقت ماجد کی عمر آٹھ سال ہوگی' اور وہ ویسے بھی اپنی پھوپھی کے پاس رہ رہا تھا اس لیے منگنی نورین سے ہوگئی لیکن جب نورین کے لالچی ماں باپ کو زیلدار جیسا چوہدری ساجس سے بھی موٹا مرغا ملا تو انہوں نے آم کے ساتھ گٹھلیوں کے دام بھی وصول کرلیے۔''

''اوہ..... تو یہ ہے ساری کہانی.....'' میں نے ایک طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔

''اب سر..... کیا کرنا ہے؟' ماجد تو اس دوران سندھ جاچکا ہے۔''

''کب گیا ہے؟''

''تین دن ہوگئے ہیں سر۔''

''تمہارے خیال میں اتنے عرصے بعد چوہدری ساجد زیلدار پر وار کرسکتا ہے۔''

''سر..... اس معاملے میں کوئی حتمی بات نہیں کہی جاسکتی..... کیونکہ کچھ لوگ موقع کی تاک میں رہتے ہیں' وہ کئی لوگوں کے سامنے یہ بات دہرا چکا تھا کہ کبھی نہ کبھی مجھے زیلدار کو عبرت کا نشان بنانے کا موقع ضرور ملے گا۔''

''اچھا..... تم اکبر خان اور سپاہی عارف کو میرے پاس بھیج دو۔''

''ٹھیک ہے سر۔''

آدھے گھنٹے بعد ہم ضروری تیاری کے بعد سرکاری جیپ میں مراد آباد کی طرف جارہے تھے۔

جب چوہدری ساجد کو ہمارے آنے کا پتہ چلا تو وہ خود حویلی کے دروازے پر ہمارے استقبال کے لیے آیا۔

میں اسے پہلی بار دیکھ رہا تھا..... اس کی عمر چوالیس سال کے اریب قریب ہوگی' صحت قابل رشک تھی..... اور مضبوط کاٹھی کا مالک تھا۔ میں نے اکبر خان اور عارف کو گاڑی کے پاس ہی چھوڑا اور خود چوہدری کے ساتھ اس کی حویلی میں آگیا۔

چوہدری ساجد کی حویلی چھوٹی سی تھی..... لیکن سامان سے اس کا اعلیٰ ذوق جھلکتا تھا۔

ایک نوکر ٹائپ بندہ ہمارے ساتھ ہی آگیا تھا..... چوہدری نے میرے منع کرنے کے باوجود اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''دیکھو غفورے..... ٹھنڈا دودھ اور ٹھنڈے آم لے آؤ..... اور ہاں' باہر جیپ میں بھی دو مہمان ہیں۔''

''میں بالکل ہر بات سمجھ گیا ہوں چوہدری صاحب' آپ رتی برابر چنتا (فکر) نہ کریں۔''

''تھانیدار صاحب..... یہ سب انڈیا کی فلمیں دیکھنے کا اثر ہے کہ ہماری زبان میں بھی چنتا' وچن اور پریم

...ہیں۔''

...ی ٹریجڈی ہے چوہدری صاحب' ہندو ...ہمارا دشمن ہے اور ابد تک رہے گا' ہم اس کی ...ذریعے اس کا کلچر اپنے اندر اتار رہے ہیں اور ...ہے جو ہماری نسل کو ڈس رہا ہے۔'' میں نے ...ں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

اس کے بعد یہ بحث لمبی ہوگئی تھی۔ یہ وہی باتیں ہیں ...اکثر پڑھتے رہتے ہیں۔

بہر حال اتنی دیر میں ہم آموں اور دودھ سے مستفید ...چکے تھے۔ اور اب جس مقصد کے لیے ہم آئے تھے ...کے لیے میدان تیار ہو چکا تھا۔

''چوہدری صاحب ...... آپ سے کچھ باتیں کرنی ...''

''مجھے پتہ تھا کہ آپ ضرور آئیں گے۔ اس لیے ...ں تیاری مکمل ہے۔'' چوہدری نے خوشگوار موڈ میں ...

''کیا مطلب......؟'' میں نے مصنوعی حیرت کا اظہا...

''مجھ تک یہ بات پہنچ چکی ہے کہ زیلدار دوست محمد ...کے ساتھ عبرت ناک انجام سے دوچار ...ہے۔''

''اور یہ آپ کی خواہش بھی تھی۔'' میں نے طنزیہ ...میں کہا۔

''کیوں کیا یہ غیر فطری خواہش تھی؟ میرے خیال ...ب باتیں آپ کے علم میں آچکی ہوں گی۔ اس ...ث کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ...... چوہدری ...''

...نہیں نے گھوڑی والا واقعہ اس کے گوش گزار ...سنا۔ یہ سن کر چوہدری نے زوردار قہقہہ لگایا اور پھر ...تے ہوئے بولا۔

...دار صاحب میں اس بات کی وضاحت ...ارے ساتھ دشمنی کے متعلق ماجد کو بالکل ...ان دشمنی کے متعلق پتہ ہوتا تو وہ ...خریدتا ...... اس نے گھر آ کر مجھ سے ذکر کیا تھا' کہ اس حلیے کے بندے نے اس کے ساتھ گھوڑی کے معاملے میں اڑس پھس (ضد) کی تھی۔ میں نے اسے کہا تھا دفعہ کرو...... میں نے اسے پھر بھی زیلدار کے متعلق صرف اتنا کہا تھا کہ وہ میرے جاننے والا ہے۔''

چوہدری صاحب آپ سمجھ دار بندے ہیں۔ ماجد بالکل نوجوان خون ہے اس نے ہوسکتا ہے بات دل میں رکھ لی ہو اور خریدی ہوئی گھوڑی پہلے چوری کروائی اور پھر خیر دین کو واپس کروادی اور اپنا نام استعمال کروایا۔''

چوہدری نے اپنی طرف سے طنز کیا...... کیا یہ بچکانہ حرکت نہیں لگتی تھانیدار صاحب۔

''نوجوان بے وقوفی کی حد تک دلیر ہوتے ہیں وہ اپنی انا کی تسکین کی خاطر اس قسم کے بچکانہ کام کرتے رہتے ہیں۔'' میں نے ایک دلیل دی۔

''جناب...... میری عقل یہ بالکل تسلیم نہیں کرتی...... ویسے تھانیدار صاحب یہ بھی حیرانگی والی بات ہے کہ جس رات گھوڑی واپس کی گئی' اسی رات قتل بھی ہوئے...... اور ماجد اس وقت (رات) سندھ میں پہنچ گیا تھا۔

''پھر آپ کے خیال میں یہ حرکت نسیم کے بھائی کی ہوسکتی ہے۔''

''یہ ممکن تو ہے جناب...... لیکن اس سیٹ اپ میں گھوڑی کی واپسی والا معاملہ کسی طرح فٹ نہیں آرہا......'' چوہدری نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ بہر حال تھانیدار صاحب میں ہر طرح سے حاضر ہوں...... میں اس بات سے البتہ خوش ہوں کہ سانپ بھی مرگیا ہے اور لاٹھی بھی نہیں ٹوٹی۔'' چوہدری نے تقریباً سارے شک رفع کردیے تھے' لیکن میں ابھی اسے مشتبوں کی فہرست سے خارج کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ بہر حال کچھ شک اور تحفظات ابھی میرے ذہن میں تھے۔

ہم جب تھانے میں واپس آئے تو ایک اور حیرت انگیز خبر ہماری منتظر تھی۔

مجھے بتایا گیا کہ اکبر اور ثانی آئے ہیں اور مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔''

مجھے ان دونوں کی تلاش تھی' کیونکہ گھوڑی کے ساتھ

یہ بھی گم ہوگئے تھے پھر چند لمحوں بعد سپاہی شہباز ان دونوں کو لے کر میرے پاس آیا تھا۔

میں نے سپاہی شہباز کو کمرے میں ہی رکنے کا اشارہ کیا اور ان دونوں کو گھورتے ہوئے کہا۔

''تم دونوں اب تک کہاں تھے؟ دیکھو سچ بولنا' ورنہ میں تم دونوں کا بہت برا حشر کروں گا۔''

''جناب..... آپ کے سامنے ہماری اوقات ہی کیا ہے۔ ہم آپ کے سامنے کیسے جھوٹ بول سکتے ہیں۔ دراصل ہم اس رات بے خبر سو رہے تھے کہ اچانک میری چارپائی پر ٹھوکر لگی..... میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا..... میں نے دیکھا کہ تین سیاہ پوش بلب کی ملگجی روشنی میں میرے سامنے کھڑے ہیں' میں نے دوسری چارپائی کی طرف دیکھا کہ ثانی بھی اٹھ بیٹھا ہے اور خوفزدہ نظروں سے سیاہ پوشوں کو دیکھ رہا ہے..... ان میں ایک سیاہ پوش نے بیٹھی ہوئی آواز میں کہا۔

''تم دونوں اٹھ کر باہر گاڑی میں بیٹھ جاؤ دیکھو آواز نہ نکلے..... ورنہ یہیں ختم کردوں گا۔''

میں نے دیکھا کہ اس کے ہاتھ میں پستول یا ریوالور دبا ہوا ہے اور اسکا رخ ہم دونوں کی طرف ہے۔ اس کا لہجہ کہہ رہا تھا کہ وہ اپنی دھمکی کو عملی جامہ پہنا دے گا۔

''تھانیدار صاحب..... یقین کریں ہمارا اس وقت وہی حال تھا' جو اچانک گہری نیند سے اٹھائے گئے بندوں کا ہوتا ہے' ہماری تو گویا گھگھی بندھ گئی تھی۔ ہم نے بے چوں چراں ان کے کہنے پر عمل کیا۔

یہ ایک منی ٹرک تھا..... گاڑی میں لاکر ریوالور یا پستول بردار نے ہمیں وہاں پڑی رسیوں سے باندھ دیا..... اور ہمارے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا۔

''کچھ دیر کے بعد ہم نے دیکھا..... کہ گھوڑی کو بھی گاڑی میں لاکر باندھ دیا گیا ہے..... اکبر کا بیان ابھی جاری تھا کہ میں نے اسے ٹوکتے ہوئے کہا۔

''آگے تم جو کچھ کہنا چاہتے ہو..... میں سمجھ گیا ہوں..... تم یہ بتاؤ کہ پھر یہاں کیسے نظر آرہے ہو؟''

''کل رات ہم اس مکان میں ہی سوئے تھے جس میں ہمیں رکھا گیا تھا..... لیکن آج صبح ہماری آنکھ ایک پارک میں کھلی ہے' ہم زیلدر صاحب کے ساتھ تھا۔ کے پاس سے کئی بار گزرے تھے..... ہم نے آپس میں مشورہ کیا..... اور یہاں آگئے..... ہم نے سوچا زیلدار صاحب ہماری بات کا شاید یقین نہ کریں.....'' اکبر نے جواب دیا۔

''تمہارے زیلدار صاحب..... اب کچھ سمجھنے او کہنے کی حد سے گزر چکے ہیں۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''کیا مطلب.....؟'' وہ یوں اچھلا جیسے جس کرسی پر وہ بیٹھا ہوا ہے اس نے اچانک اسے اچھلنے پر مجبور کردیا ہو.....

میں نے ثانی کی طرف دیکھا' وہ بھی پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

میں نے انہیں حالات سے آگاہ کرنا مناسب سمجھا۔

''تھانیدار صاحب! یہ کیسے ہوا؟ اور کس نے یہ ظلم کیا؟'' دونوں نے یک زبان ہوکر کہا۔

''ابھی قاتل یا قاتلوں کی مجھے تلاش ہے۔ تم اس عورت کے متعلق کچھ جانتے ہو جو زیلدار صاحب کے ساتھ قتل ہوئی ہے۔''

''بالکل نہیں جناب..... ہم صرف اتنا جانتے ہیں کہ زیلدار صاحب نرم دل اور غریبوں مجبوروں کے ہمدرد تھے..... اور ان کے کام آتے رہتے تھے۔ اب وہ اس دنیا میں نہیں رہے ہیں اس لیے میرا اندازہ یہ ہے کہ عورت خود ہی ان کے گلے پڑ گئی ہوگی۔'' اکبر نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

اس کی بات میں وزن تھا۔ سیانے کہتے ہیں کہ نہ اتنے میٹھے بن جاؤ کہ لوگ تمہیں نگل جائیں اور نہ اتنے کڑوے کہ تھوک دیں۔

پھر اگر عورت چاہے تو بڑے بڑے پارساؤں کے دل پر قبضہ کرلے اور انہیں انجام کی طرف سے غافل کردے۔

خیر جو کچھ بھی تھا..... مجھے تو قاتلوں کی تلاش تھی۔

جس بندے نے نسیم (مقتولہ) کو طلاق دی تھی..... میں نے اس کو بھی ذہن میں رکھا ہوا تھا..... نسیم کا بھائی

ہی مشتبہ افراد میں شامل تھا..... اس گھوڑی کی چوری نے تو مجھے ایسے چکر دیئے تھے کہ میرے دماغ کو بھی پھرا آ گئے تھے..... یہاں یہ بات بھی بتادوں کہ خیر دین کو میں نے بھیج دیا تھا۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ اکبر ذہین اور عقلمند ہے' جبکہ ثانی بے وقوف سا لگتا تھا..... اس لیے میں نے اکبر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''تم نے بتایا ہے کہ تین سیاہ پوشوں میں سے ایک دھیمی ہوئی آواز میں بول رہا تھا..... تم نے کیا محسوس کیا تھا..... اس کی آواز کسی وجہ سے بیٹھی ہوئی تھی یا.....؟''

''تھانیدار صاحب..... صرف وہی بول رہا تھا اور میرے اندازے کے مطابق وہ آواز بدل کر بول رہا تھا۔

''بہت خوب تم واقعی ذہین ہو..... اکبر تمہیں کچھ شک ہے کہ یہ بندہ تمہارا جانا پہچانا ہے..... بے شک سوچ لو..... پھر بتاؤ.....''

اکبر چند لمحوں کے لے سوچ کی اتھاہ گہرائیوں میں چلا گیا..... پھر..... بولا۔

''تھانیدار صاحب کچھ سمجھ نہیں آ رہی..... لیکن .....؟''

''لیکن کیا..... اکبر؟ میں نے اشتیاق سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''جو بھی بات' جو بھی خیال یا واہمہ تمہارے ذہن میں آ رہا ہے بتادو۔''

''مجھے موہوم سا خیال آتا ہے کہ وہ سیاہ پوش..... ہوسکتا ہے'' میں اچھل پڑا..... اس کی طرف تو میرا دھیان گیا ہی نہیں تھا۔ پھر تھانے دار صاحب..... ایک بات اور بھی ہے..... زیلدار صاحب کہتے تھے کہ یہ بندہ ٹھیک نہیں ہے..... میرا ایک راز اس کے پاس ہے۔ جس نے میرے پاؤں میں مجبوریوں کی زنجیریں ڈال دی ہیں۔''

میرا دماغ روشن ہو گیا تھا..... ابھی میں اس بندے کا نام نہیں بتاؤں گا' آپ سوچیں اور اندازے لگائیں۔

میں نے اکبر اور ثانی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تم دونوں بے فکر ہو کر جاؤ اور اپنی مالگن (مقتول کی بیوہ) کو ساری رام کہانی سنادو۔ تمہیں کچھ نہیں کہے گی اور اگر کوئی مسئلہ ہو تو میرے پاس آ جانا۔''

ان کو رخصت کرنے کے بعد میں نے سپاہی عظمت اور عارف کو بلا کر انہیں مطلوبہ بندہ لانے کے لیے بھیج دیا۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد بندہ ہمارے سامنے تھا..... بندے کو کمرے میں سپاہی عارف لے کر آیا تھا۔

''عارف تم کمرے کے باہر کھڑے ہو جاؤ' ہوسکتا ہے' گھی سیدھی انگلیوں سے نہ نکلے اور انگلیوں کو ٹیڑھا کرنا پڑے۔''

وہ چلا گیا۔

''ہاں تو جناب..... آپ اتنے گھبرائے ہوئے کیوں ہیں؟'' میں نے تو تمہیں صرف گپ شپ کے لیے بلایا ہے۔''

''گپ شپ کے لیے۔'' اس نے زیر لب دہراتے ہوئے کہا۔

''بالکل..... میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

میں نے دیکھا کہ وہ گھبرایا ہوا ہے۔

''گھوڑی کا کیا قصہ ہے؟''

''وہ تو میری معلومات کے مطابق خیر دین کے پاس.....'' وہ اچانک چپ ہو گیا..... میں نے گرم لوہے پر چوٹ لگاتے ہوئے کہا۔

''تمہاری معلومات کا ذریعہ کیا ہے بھولے بادشاہ۔''

''وہ..... وہ..... میں نے ادھر ادھر سے سنا ہی' وہ مکمل میری گرفت میں آ چکا تھا۔

''تم سنا ہے آواز بڑی اچھی بدل لیتے ہو..... کبھی بیٹھی ہوئی' کبھی ممیائی ہوئی آواز نکالتے ہو۔''

پھر وہ ہو گیا جس کی مجھے توقع تھی۔

مطلوبہ بندے نے دروازے کی طرف دوڑ لگادی۔

وہ اس طرح میری گرفت میں آ چکا تھا کہ اس کے ذہن

سے یہ بات نکل ہی گئی تھی کہ سپاہی دروازے میں کھڑا ہے۔

اس کا احساس اسے اس وقت ہوا جب وہ سپاہی کی لات کھا کر اوندھے منہ فرش پر آ گرا۔

اس کے پیچھے سپاہی بھی آ گیا تھا۔ اس نے اس کی پنڈلی پر اپنے بوٹ کی ٹھوکر لگائی' تو وہ کسی زخمی بیل کی طرح ڈکراتا ہوا پنڈلی پکڑے دہرا ہو گیا۔

پنڈلی کی چوٹ ویسے بھی بڑے بڑے سورماؤں کو چھٹی کا دودھ یاد دلا دیتی ہے۔

میں نے سپاہی کی طرف ایسی نظروں سے دیکھا جیسے کہہ رہا ہوں کہ تم نے بڑا الا جواب جام کیا ہے۔

سپاہی نے میری ہلہ شیری سے مزید شیر ہوتے ہوئے اسے گریبان سے پکڑ کر سیدھا کھڑا کر دیا...... اور اس کا منہ میری طرف کرتے ہوئے کہا۔

''صاحب ...... کے سوالوں کے سیدھے سیدھے جواب دو' ورنہ تمہاری ایک ایک ہڈی بول اٹھے گی۔''

میں نے دیکھا کہ اس کی پیشانی پھٹ گئی ہے اور اس سے خون رس رہا ہے۔ اور اس کے چہرے پر اذیت کے آثار ہیں۔

پھر اس نے ہمیں سب کچھ بتانے میں ہی عافیت سمجھی۔

لیکن جس شخصیت کے کہنے پر اس نے یہ کچھ کیا تھا' اس کا نام سن کر میں بھونچکا رہ گیا۔

یہ سب انسانی نفسیات کا کرشمہ تھا' انا کی تسکین کا مسئلہ تھا' کچلی ہوئی خواہشات کا شاخسانہ تھا۔

سب سے پہلے مطلوبہ بندے کا تعارف کروادوں۔

''یہ زمرد تھا...... جی ہاں...... زیلدار کا منشی...... اسے شراب اور شباب سے رغبت تھی...... اور اکثر زیلدار کے پیسوں میں ہیرا پھیری کر کے اپنے شوق پورے کرتا رہتا تھا۔ کہتے ہیں چوری اور ہیرا پھیری زیادہ دیر تک چھپی نہیں رہ سکتی...... پیسوں کی ہیرا پھیری بھی

ایک دن ظاہر ہو جاتی ہے۔ زیلدار کو بھی پتہ چل گیا...... وہ اس سے باز پرس کرنے لگا...... ادھر شومئی تقدیر زمرد کو نسیم کے متعلق پتہ چل گیا...... اور اس نے زیلدار کو راز افشاں کرنے کی دھمکی دے کر نہ صرف...... خاموش رہنے پر مجبور کر دیا بلکہ اس سے مزید پیسے اینٹھنے لگا۔

پھر زیلدار کی گھوڑی چوری ہو گئی...... زیلدار پریشان ہو گیا' اس نے مجھے بلایا......!

میرے اور اس کے درمیان جو گفتگو ہوئی تھی اور جن خدشات کا اس نے اظہار کیا تھا' وہ آپ نے پڑھ لیا ہے۔

بقول زمرد کے اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ زیلدار کو قتل کرے گا...... لیکن ہونی ہو کر رہتی ہے......

ایک دن زیلدارنی (نورین) نے اسے اپنے پاس بلایا اور کہا۔

''دیکھو...... زمرد مجھے چکر دینے کی کوشش نہ کرنا...... مجھے اپنے شوہر اور تمہارے کرتوتوں کا پتہ چل گیا ہے' تم حساب کتاب میں ہیرا پھیری کر رہے ہو اور تمہارے دوست محمد صاحب نسیم نامی عورت کے ساتھ رنگ رلیاں مناتے ہیں...... ویسے تو یہ کام تم بھی کرتے ہو...... اور یہ بھی ممکن ہے کہ تم نے ہی نسیم کو دوست محمد صاحب سے ملوایا ہو۔

''بی بی جی میں بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں' کہ میں نے نسیم کو زیلدار صاحب سے نہیں ملوایا...... البتہ ......''

''تم نے حساب کتاب میں ہیرا پھیری ضرور کی ہے۔''

''بی بی جی...... بس غلطی ہو گئی ہے اب آئندہ کے لیے میں توبہ کرتا ہوں۔''

''آئندہ کی تو بعد میں سوچیں گے پہلے تم یہ گند تو صاف کرو۔''

نورین نے معنی خیز نظروں سے زمرد کو دیکھتے ہوئے

کہا۔

''کیا مطلب 'بی بی جی.....''

''مجھے دوست محمد صاحب کا اور نسیم کا پتہ صاف چاہیے۔''

''یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟''

''میں نے کسی ایسی زبان میں بات نہیں کی جو تمہاری سمجھ میں نہ آسکے۔ اچھی طرح سوچ لو' ورنہ جیل تو ویسے بھی تمہارا مقدر ہوگی۔''

''بی بی جی اس طرح تو میں سیدھا پھانسی کے تختے تک پہنچ جاؤں گا۔''

''ارے بے وقوف تھوڑی عقل بھی استعمال کرو..... تمہیں پتہ ہے کہ زیلدار صاحب کی مراد آباد کے چوہدری ساجد سے کھٹ پٹ ہے' تم جس رات وہ کمینی بھی دوست محمد کے ساتھ ہو' دونوں کو اس طرح قتل کرنا کہ سارا شک چوہدری ساجد پر جائے..... اب بھی سمجھ میں بات آئی کہ نہیں.....؟''

''اس کے لیے مجھے پہلے میدان بنانا پڑے گا..... بڑے پاپڑ بیلنے پڑیں گے اور خرچہ..... بھی ہوگا۔''

''تم خرچے کی پرواہ نہ کرو' تم یہ کام کردو..... میں تمہیں پچاس ہزار روپیہ دوں گی' یہاں یہ بات بھی بتادوں کہ اس وقت تک گھوڑی آچکی تھی..... اس طرح زمرد نے دو بندوں کو اور اپنے ساتھ ملایا..... اور کام شروع کردیا..... پھر شک کی توپوں کا رخ چوہدری ساجد کی طرف موڑنے کے لیے اس نے گھوڑی چوری کرکے واپس کرنے کا جو ڈرامہ کیا..... وہ بھی آپ پڑھ چکے ہیں..... اور اکبر اور ثانی کو اغوا کرنے کے بعد چھوڑنے والی کہانی بھی آپ کے علم میں آچکی ہے۔

یہ سب میرے خیال میں بچکانہ باتیں تھیں..... یہ سارا سیٹ اپ ہی احمقانہ تھا۔

اصل میں زمرد اپنی طرف سے سیانا کوا بنا تھا۔ اور گندگی میں جا منہ مارا تھا۔

اب جاتے جاتے نورین کے متعلق بھی سن لیجیے..... اس کو میں نے تھانے بلوا کر پوچھ گچھ کی تھی۔

لیجیے مختصراً آپ بھی سن لیجیے' میرا مطلب ہے پڑھ لیجیے۔

''تھانے دار صاحب..... یہ زمرد کمینہ اور خود غرض ہے' میں نے ایسی کوئی بات نہیں کی..... مجھے تو دوست محمد صاحب اور کسی نسیم کے تعلقات کا کوئی علم نہیں تھا اور نہ میں یہ بات جانتی ہوں کہ یہ دوست محمد صاحب کو دونوں ہاتھوں سے لوٹتا رہا ہے۔ آپ اسے پھانسی کی سزا دلوائیں۔''

عدالت نے میرے کہنے پر یا نورین کے کہنے پر سزا نہیں دینی تھی' بلکہ قانون کے مطابق سزا دینی تھی..... میں نے زمرد کے شراکت داروں کو بھی گرفتار کروانے کے بعد چاروں کے نام پرچہ کاٹ کر انہیں حوالہ عدالت کردیا تھا۔ عدالت میں بھی نورین اپنے بیان پر قائم رہی تھی..... زمرد کا وکیل کوئی ایسا گواہ عدالت میں پیش نہیں کرسکا تھا..... جس کے سامنے نورین نے کہا ہو کہ زمرد دوست محمد کو اور نسیم کو دنیا کے تختے سے اٹھادے۔

اس طرح کے کاموں میں اس طرح تو ہوتا ہے۔

عدالت نے زمرد کو عمر قید اور اس کے ساتھیوں کو دس دس سال قید بامشقت کی سزا سنائی تھی۔

نورین کو عدالت نے باعزت بری کردیا تھا۔

بہرحال ایک بات طے تھی..... کہ زمرد نے سیانا کوا بننے کی کوشش کی تھی..... اور جاتے جاتے گھوڑی کے متعلق بھی عرض کردوں' نورین نے گھوڑی خیر دین کے پاس ہی رہنے دی تھی..... اس نے کہا تھا کہ کسی سے اس کی محبوب چیز نہیں چھینی چاہیے..... کسی قیمت پر نہیں..... یہ بھی ایک ذومعنی فقرہ تھا۔

ایک سو سولہ چاند کی راتیں

عشنا کوثر سردار

قسط نمبر 12

یہ ناول 1947ء کے تقسیم ہندوستان کے پس منظر میں ہے، اس کے تمام کردار تقریباً 69 سال قبل کے ہیں جنہوں نے Partition سے ایک سو سولہ دن قبل جنم لیا، انڈو پاک کی تقسیم جب ہونے جارہی تھی اس دوران اپنا سفر شروع کیا، جہاں ایک پاک سرزمین کی تاریخ رقم ہوئی ہمیں ایک آزاد مملکت کا احساس ملا وہیں محبت نے دلوں میں گھر بھی کیا، یہ سفر تب شروع ہوتا ہے جب ناول کے دو کردار پہلی بار 18 اپریل 1947ء کو ملے۔ اس سے آگے کی ایک سو سولہ راتیں ان کی ان کہی محبت کا ایک سفر ہے۔ جب تاریخ رقم ہورہی تھی زمین ٹکڑوں میں تقسیم ہورہی تھی تب خاموشی میں کہیں محبت دلوں کو جوڑ رہی تھی۔ زمین کی تقسیم نے دلوں کو تقسیم نہیں کیا تھا دلوں کو جوڑ دیا تھا اس تقسیم کی جو صعوبتیں ہماری ان نسلوں نے سہی تھیں ان کا اندازہ ہم نہیں کرسکتے مگر میں نے اس تکلیف کو اپنے اندر محسوس کیا ہے۔ میرے ناول کے کردار ان مصائب سے گزرے ہیں اور ان کے ساتھ میں نے بھی ان مصائب کی تکلیف کو محسوس کیا ہے وہ ڈر..... وہ خوف..... تمام احساسات میرے اندر کہیں مجھے محسوس ہوتے رہے ہیں۔

پاکستانی قائداعظم
ڈاٹ کام

عین اپنے ابا جان کے مزاج سے بخوبی واقف تھی اسے علم تھا کہ وہ درگزر سے کام لینے والے انسان ہیں وہ اپنے دشمنوں سے بھی انتہائی رکھ رکھاؤ اور نرمی سے پیش آنے کے قائل تھے وہ ابا کے مزاج سے واقف تھی مگر جانے کیوں اسے لگا تھا کہ اس بار اس کا مرزا چاچا کو اس طور معاف کرنا مناسب اقدام نہیں ہوگا۔

''ابا ہر بار اس طور کوتاہیوں کو نظر انداز کر دینا مناسب اقدام نہیں اس سے غلطیاں کرنے والے اپنا عمل منسوخ نہیں کرتے اور مزید دلیری سے اگلے وقت کی سازشوں میں مصروف ہو جاتے ہیں۔'' عین نے ابا جان کو تنبیہ کیا تھا مگر وہ ملائمت سے مسکرا دیے تھے۔

''کوئی کتنی بار غلط کر سکتا ہے اللہ ساتھ ہو تو بندہ کسی کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا، بندوں کی معاونت اور ہمراہی سے زیادہ ہمیں اللہ کے ساتھ کی تمنا کرنی چاہیے بندے وہی کرتے ہیں جو انہیں کرتا ہے اور اللہ وہی کرتا ہے جو وہ ہمارے لیے بہتر سمجھتا ہے، میں دشمنوں سے خوفزدہ نہیں ہوں کیونکہ میرے ہمراہ میرا اللہ ہے ہماری اچھائی اور برائی کے پیمانے اپنے ہیں۔

ضروری نہیں جو عمل ہم اللہ کی خوشنودی کے لیے جائز سمجھ کر کریں اللہ کو بھی وہ عمل پسند آئے ہمیں زمین پر رہ کر بندوں کی خوشنودی سے زیادہ اللہ کی نگاہ کرم کے بارے میں سوچنا چاہیے وہ جس پر نگاہ کرم کرتا ہے اسے کسی اور کے ساتھ ہی تمنائیں رہتی۔'' ابا نے نرمی سے سمجھایا تھا۔

''بہترین اور صالح عمل اللہ کے نزدیک اس کی رضا کے مطابق چلنا ہے جب ہم اللہ کی بنائی گئی راہ پر چلتے ہیں پھر ہمیں بندوں کے اعمال کے بارے میں سوچ کر فکر کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی انصاف کرنے والی ذات وہ ہے کسی کی اچھائی برائی کی پیمائش کرنے والے یا ناپنے والے ہم کوئی نہیں ہوتے ہمیں ان باتوں کا فیصلہ اللہ پر چھوڑ دینا چاہیے۔'' ابا جان مدبر لہجے میں بولے تھے اور عین نے ان کی طرف دیکھا تھا۔

''ابا جان آپ کا ظرف اور دل یقیناً بہت بڑا ہے مگر۔'' عین کچھ کہتے کہتے رکی تھی ابا جان نے انہیں جانچتی نظروں سے دیکھا تھا۔

''آپ ہماری اولاد ہیں نواب زادی، ہم آپ سے امید رکھ سکتے ہیں کہ آپ کا دل اور ظرف بھی اتنا ہی ہوگا۔''

ابا جان نے جیسے اس کے دل و دماغ میں جاری کشمکش کو پڑھا تھا اور وہ ان کی طرف دیکھ کر رہ گئی تھی۔

''یہ مشکل ہوگا ابا جان ہم آپ کی طرح مرزا چاچا کو معاف نہیں کر پائیں گے ہم جب بھی ان کا چہرہ دیکھیں گے ہمیں یہ بات ہمارے ذہن و دل پر اسی طور برچھیوں کی صورت وار کرے گی کہ انہوں نے ہمارے ابا جان کے ساتھ کیسا رویہ روا رکھا ہم اس سازش کے لیے مرزا اسرار الدولہ کو معاف نہیں کر پائیں گے ہم سے اپنے حیدر میاں کے ساتھ اس تعلق کو نباہنا مشکل ہوگا ہم معذرت چاہتے ہیں مگر ہم..... ہم اس تعلق کو آگے جاری نہیں رکھ سکیں گے اگر ہم مروت یا لحاظ میں مرزا چاچا سے یہ بات نہیں کر سکے تو ہم ان سے اس سلسلہ میں بات کر لیں گے ہم ان کو مطلع کر دیں گے کہ ہم اس رشتے کے لیے خود کو تیار نہیں پاتے۔ ہم ان کے بیٹے سے نکاح نہیں کر پائیں گے معذرت چاہتے ہیں ابا جان ہم آپ کی حکم عدولی کے مرتکب ہو رہے ہیں مگر یہ ضروری ہے۔'' نواب زادی یہ کہہ کر اٹھی تھی اور چلتی ہوئی باہر نکل گئی تھی نواب صاحب بیٹی کو دیکھتے رہ گئے تھے۔

ان کی پیشانی پر فکروں کی لکیریں واضح تھیں جو بھی ہوا تھا وہ اس رشتے کو ختم نہیں کرنا چاہتے تھے مگر نواب زادی شادی اس طور سے نہیں سوچ رہی تھیں۔ جس طور سے وہ سوچ رہے تھے رشتہ ختم کرنے کا مطلب کہا تھا ایوانوں میں بیٹھکوں میں لوگوں کو بات کرنے اور ان معاملات پر بے دریغ بات کرنے کا مواقع فراہم کرنا اور پھر لوگ منہ جوڑ جوڑ کر اس حقیقی مسئلے کو بھول کر کسی اور جانب پیش قدمی کرتے دکھائی دیتے لوگوں کو عادت ہوتی ہے باتوں کو اپنے زاویہ نظر سے دیکھنے اور جانچنے کی ان کو خاندانی وقار کی پروا تھی اور عین کی عزت عزیز تھی وہ نہیں چاہتے تھے کہ کوئی عین کی سمت انگلی اٹھائے، بچپن کا طے شدہ رشتہ ختم ہوتا تو جانے کیا کیا چہ میگوئیاں ہوتیں وہ بیٹی کے کردار پر لوگوں کو بات کرنے کا موقع نہیں دینا چاہتے تھے سو وہ نہیں

تھے ہزار منہ اور ہزار باتیں ہوں وہ اس باعث میانہ ... کا مظاہرہ کررہے تھے مگر عین یہ بات نہیں سمجھ رہی تھی ... بات نے نواب صاحب کو پریشان کرکے رکھ دیا تھا۔

❀.....◈.....❀

''یہ کیا ہے تیمور کیا تم واقعی خوش بخت کو اپنی شریک ... بنانا چاہتے ہو یا یہ محض ایک سزا کے طور پر کررہے ... تم کسی اور کے کیے کی سزا خود کو دینا چاہتے ہو بیٹا اور ... غلطی بھی کسی کی ہے قدرت کی ہم بندوں کو اس میں دخل ... نہیں ہمیں خبر نہیں تھی کہ تمہیں ایسی لڑکی سے محبت ہوگی جو پہلے سے کسی اور کے ساتھ رشتے میں منسلک ہوگی اگر تم کہو تو ہم نواب صاحب سے بات کرسکتے ہیں انہوں نے ہمیں ہمیشہ اپنی ہمیشہ کہا ہے اور سمجھا ہے جتنی عزت وہ ہمیں دیتے ہیں ہمیں یقین ہے کہ وہ عین کا ہاتھ ہمیں سونپ دیں گے۔'' بیگم حکمت نے کہا تھا مگر تیمور نے سرانکار میں ہلا دیا تھا۔

''نہیں ممی ہم ایسے رشتوں کے قائل نہیں یہاں بات صرف عین کا معمول نہیں ہے وہ ذہنی طور پر ایک رشتے سے عرصہ دراز سے منسلک ہیں اور اس رشتے سے جذباتی وابستگی بھی رکھتی ہیں ہم ان کے تعلق کو توڑ کر ان سے اپنا رشتہ استوار کرنا جائز نہیں سمجھتے۔'' تیمور نے پرسکون لہجے میں آہستگی سے کہا تھا بیگم حکمت ان کو دیکھ کر رہ گئی تھیں۔

''کیا تم نے نواب زادی سے کبھی مدعا بیان کیا ہے، کیا انہیں علم ہے کہ تم اس طوران سے وابستہ ہو؟'' ممی نے تیمور کی سمت دیکھا تھا تیموران کی بات پر مبہم سا مسکرایا تھا۔

''ممی کیا محبت کو بیان کردینا ہی محبت ہے میں ظاہری اقرار کرنے اور اقرار سننے کو محبت نہیں سمجھتا محبت اس سے کہیں بڑھ کر ہے۔'' وہ محبت کے متعلق مختلف رائے رکھتے تھے بیگم حکمت ان کو دیکھ کر رہ گئی تھیں۔

''تیمور ایسی محبت کا انجام کیا ہوگا بیٹا ہم تمہیں اس طرح نامراد نہیں دیکھ سکتے تم ہماری اکلوتی اولاد ہو تمہاری خوشی ہمارے لیے بہت معنی رکھتی ہے ہم نہیں چاہتے آپ باقی ماندہ زندگی حسرتوں کی نذر کردیں اور ایک کسک کے ساتھ جئیں ایسی زندگی یقیناً کٹھن اور ادھوری ہوگی ہماری اولاد ایسی ادھوری زندگی جئیں ایسا سوچنا بھی ہمارے لیے سوہان روح ہوگا ہم نواب صاحب کی منت سماجت کرلیں گے۔'' ممی نے کہا تھا مگر تیمور نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

''محبت سیاسی گٹھ جوڑ نہیں ہوتی ممی محبت کو ایسے معاملات سے مماثلت دینا محبت کی قدر گنوا دیتا ہے اگر محبت خود اپنے طور پر آگے بڑھتی ہے تو اس کا ہاتھ تھامنا جائز ہے ورنہ اس دریا کو زبردستی کے چپوؤں سے کسی سمت موڑ کر نتائج برآمد کرنا کوئی کمال نہیں۔'' تیمور کی اپنی سوچ تھی بیگم حکمت گہری سانس لے کر رہ گئی تھیں۔

''تیمور بہادر یار جنگ تم اس خاندان کے سپوت ہو جو بہادری اور دلیری میں اپنا نام منوا چکے ہیں تم یقیناً بہت ہونہار اور دلیر نوجوان ہو مگر مجھے نہیں لگتا تمہیں محبت جیسے معاملات میں پڑنا چاہیے تھا تم محبت نہیں بے وقوفی کررہے ہو ایسی محبت دنیا میں کوئی وجود نہیں رکھتی، بچہ جب تک روتا نہیں ماں بھی اسے دودھ نہیں دیتی کس دنیا میں رہتے ہو میاں؟ کچھ عقل کے ناخن لو مجھے بیگم حکمت کو اپنے سپوت کی اس محبت سے اختلاف ہے اور اگر تم نے جاکر نواب زادی سے اس متعلق بات نہیں کی تو میں خود نواب صاحب سے بات کرنا ضروری خیال کروں گی۔'' بیگم حکمت نے دھمکایا تھا ان کے غصے کے باوجود تیمور مسکرا دیا تھا اور مدہم لہجے میں بولا تھا۔

''اب آپ اکسا رہی ہیں کہ میں زبردستی کسی کی توجہ طلب کروں؟ یہ کافی نامناسب ہوگا ممی جان محبت کسی کو قائل کرلینا نہیں، دلیلوں سے جیتی محبت، محبت نہیں ہوتی ہم کیوں کسی سے کہیں کہ کوئی ضروری ہے کسی کو خود بھی خبر ہونا چاہیے کہ وہ کس قدر ضروری ہے کسی کے لیے ایک طرفہ معاملات محبت پیچیدہ ہوسکتے ہیں مگر اس قدر بھی نہیں کہ ان کے سلجھنے کا گمان باقی نہ رہے محبت کرنے والوں کو خاطر جمع رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے ان کی آمد ان کے یقین کا باعث بنتی ہے۔'' تیمور نے مدہم لہجے میں کہا تھا بیگم حکمت نے گھورا تھا۔

''جانتے تم سب کچھ ہو مگر پھر بھی قدم روکے ہوئے ہو، کیا یہ مناسب ہے تم چاہتے ہو وہ گونجھ سا بندہ مرزا حیدر سراج الدولہ آئے اور اس پری سی لڑکی نواب زادی عین کا

ہاتھ تھام کر لے جائے۔ اس بات کے منتظر ہو تم؟'' ممی نے اسے اکسانا چاہا تھا وہ پرسکون انداز میں سر انکار میں ہلایا تھا۔

''ایسا نہیں ہوگا ممی ایسا نہیں ہوسکتا۔'' اس کے لہجے میں یقین بول رہا تھا۔ بیگم حکمت نے اسے بغور دیکھا تھا۔

''کہیں تم اس بات کو اخذ کیے تو نہیں بیٹھے کہ نواب زادی تمہیں چنا ضروری خیال کریں گی۔''

''میں ایسی خوش فہمیوں کا قائل نہیں امی جان۔'' تیمور نے مدہم لہجے میں کہا تھا۔

''محبت کو خوش فہم ہونا چاہیے تیمور تمہارے ابا جان بلا کے خوش فہم تھے بچپن سے ہمارے گھر آنا جانا تھا کیونکہ رشتے داری تھی سو وہ سر اٹھا کر جب چاہے چلے آتے تھے میری بات ان دنوں چچا جان سے چل رہی تھی مگر تمہارے ابا کو یقین تھا کہ وہ یہ رشتہ نہیں ہونے دیں گے اور اس سے قبل کہ کوئی بات ٹھہرتی تمہارے ابا جان نے خالہ جان کو رشتہ دے کر ہمارے گھر بھجوا دیا تھا اور اماں کو اپنی خواہش بتا دی تھی اماں چونکہ گھر کا اہم رکن تھیں سو ان کے کانوں میں بات ڈال دینا تمہارے ابا کے کام آ گیا تھا اور وہ تمہارے ابا کے رشتے میں کھل کر حمایت کرنے لگی تھیں اور یوں یہ رشتہ طے پا گیا تھا۔'' ممی نے کہا تھا تو تیمور مسکرا دیا تھا اس کثافت بھرے ماحول میں اسے اماں ابا کی شادی کے پس منظر کا تذکرہ سننا دلچسپ لگا تھا۔

''ابا کافی بہادر تھے فریڈم فائٹر خاندان سے تھے ان کا رشتہ کیسے رد ہوسکتا تھا؟'' وہ مسکرایا تھا۔

''تو آپ چاہتی ہیں ہم بھی ابا جان والی ہمت دکھائیں مگر نواب زادی کی اماں جان ہماری خالہ جان ہونے کا شرف نہیں رکھتیں سو ہمیں وہ حمایت نہیں مل سکے گی، افسوس۔'' وہ غیر سنجیدہ انداز میں مسکرایا تھا مگر بیگم حکمت اس کی سمت دیکھنے لگی تھیں۔

''تم واقعی خوش بخت سے شادی کے معاملات شروع کرنا چاہتے ہو بیگم حکمت کے سوال میں بہت سے اندیشے پنہاں تھے اور وہ ان کی سمت سے چہرہ پھیر کر گہری سانس بھرتا ہوا گویا ہوا تھا۔

''خوابوں میں زیادہ دیر قیام پزیر نہیں رہا جاسکتا خوش بخت حقیقت ہیں اور عین النور خوب صورت خواب۔'' تیمور کا لہجہ تھکن زدہ تھا۔

''تم ہار مان رہے ہو تیمور۔'' بیگم حکمت حیران ہوئی تھیں۔

''نہیں میں حقیقت پسند بننے کی کوشش کر رہا ہوں۔'' وہ ہلا تھا اور بیگم حکمت اسے دیکھ کر رہ گئی تھی۔

❀.....◈.....❀

جلال نے گہری سانس لے کر والد محترم کو دیکھا تھا۔

''ہم معذرت چاہتے ہیں ابا جان دانستہ نا دانستہ ہم نے آپ کے متعلق جو سوچا وہ ٹھیک نہیں تھا۔'' وہ کسی قدر شرمندہ دکھائی دیے تھے نواب صاحب نے ان کے شانے پر ہاتھ رکھ کر تھپتھپایا تھا اور مسکرا دیے تھے۔

''اس سے فرق نہیں پڑتا نواب زادے آپ ہماری دنیا کا وہ چراغ ہیں جس کے باعث اس گھر میں اجالا ہے ہمارے سپوت ہیں آپ کو معافی کی ضرورت نہیں ہم اپنے بیٹے کے لیے دل میں کوئی میل نہیں رکھتے۔'' نواب صاحب نے جلال کو تھام کر گلے لگایا تھا۔

جلال ان کی وسعت دل پر حیران ہوا تھا اور شرمندہ بھی۔

''ابا جان والدین کا دل یقیناً بڑا ہوتا ہے مگر ہم نے کئی معاملات میں آپ کی نافرمانی کی ہے معافی طلب کرنا ہمارا حق بنتا ہے۔'' جلال نے سر جھکا کر مدہم لہجے میں کہا تھا اور نواب صاحب نے سر ہلایا تھا۔

''والدین بچوں کی غلطیوں اور خطاؤں کی معافی کیلئے دل کے دروازے ہمیشہ کھلے رکھتے ہیں بچوں کو اس کے لیے درخواست دائر کرنا نہیں پڑتی۔'' نواب صاحب نے کہا تھا اور جلال نے ان کی طرف خاموشی سے دیکھا تھا نواب صاحب نے بیٹے کی الجھن محسوس کر کے تب ان کا شانہ تھپتھپایا تھا اور بیٹے کے ساتھ ہم قدم ہو کر پائیں باغ کا رخ کیا تھا جلال خاموش رہے تھے پھر شرمندہ سے بولے تھے۔

''ہم نے آپ کے علم میں لائے بنا نکاح کیا ہم آپ سے خفا تھے ہمیں غصہ تھا آپ نے جس رشتے کی مخالفت کی ہم نے اسی جگہ نکاح کرنا ضروری خیال کیا ہم آپ کے انکار

لی وجہ سے اس لمحے نہیں چاہتے تھے مگر ہم ہر بات کو اپنی پسند کا جامع پہنا رہے تھے۔ بہت سے معنی فقط تھے جو ہم نے اپنے طور پر اخذ کیے تھے۔'' جلال نے سر جھکا کر کچھ قدر شرمندہ ہو کر کہا تھا نواب صاحب نرمی سے مسکرا دیے تھے۔

''ہم آپ کے نکاح کے مخالف نہیں تھے دراصل ہم فتح النساء کا خیال کر رہے تھے وہ ہمیں عین کی طرح عزیز ہیں اس نکاح کی مخالفت کرنے کا مقصد فقط فتح النساء کی طرف ہماری فکر اور کچھ اندیشے تھے۔'' نواب صاحب کے کہے پر جلال چونکے تھے۔

''کیسے اندیشے کس متعلق بات کر رہے ہیں آپ ابا جان۔'' جلال چونکا تھا۔

ابا نے خاموشی سے اسے دیکھا تھا اور پھر مدھم لہجے میں بولے تھے۔

''ہمیں لگتا تھا آپ ان کے لائق نہیں آپ نواب زادے ہیں آپ کا مزاج مختلف ہے اگر ہم فتح کے والدین کر سوچتے تو ہم متفکر تھے کہیں آپ ان کو خوش نہ رکھ پائے تو؟ ہم نے آپ کے متعلق سن رکھا تھا کہ آپ خاصی سرگرمیوں میں انوالوڈ ہیں آپ کی تعلیم و تربیت بیرون ملک ہوئی ہے اگر چہ سے ہماری روایت رہی ہے مگر آپ کے مزاج پر اس کا اثر دکھائی دیا ہم اس بات کو سمجھتے ہیں یہ نئے دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہونے کے لیے ہے تبدیلیوں کو قبول کرنا پڑتا ہے جو تغیرات کے چل نہیں چلتے پیچھے چھوٹ جاتے ہیں آپ کے آزاد خیال دماغ کو ہم دقیانوسیت کا جامع نہیں پہنانا چاہتے تھے سو ہمیں لگا یہ تضاد ہمیں اس رشتے کو مسخ نہ کر دے، فتح النساء کا مزاج سادہ ہے اور وہ آپ کے ساتھ شاید قدم ملا کر چلنے میں ناکام رہتی مگر اس میں تکلیف بھی ہوتی اور رشتہ اپنا حسن بھی کھو دیتا سو ہم نے اس نکاح کی مخالفت کی۔'' نواب صاحب نے کہا تھا اور جلال نے سر ہلا دیا تھا۔

''آپ کی بات عقل کی سمت اشارہ کرتی ہے مگر ابا جان ہم آپ کا فون ہیں ہم نے آزاد خیال کو اپنایا مانا وقت بدل گیا ہے مگر ہم آپ سے مختلف نہیں ہو سکتے نہ ہم ان روایات سے الگ ہو سکتے ہیں۔'' جلال نے سمجھانا چاہا تھا مگر نواب صاحب نے ہاتھ اٹھا کر ان کو مزید بولنے سے باز رکھا تھا۔

''برخوردار آپ یہ بات اب جس سہولت سے سمجھ رہے ہیں اس لمحے سمجھنے میں شاید زمانے لے لیتے بہر حال اب تو یہ نکاح ہو چکا ہے اور ہمارے پاس اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں کہ ہم اس نکاح کو قبول کریں اور فتح النساء کو اس گھر کی بہو کی حیثیت دیں۔'' نواب صاحب بولے تھے اور جلال خاموش ہو کر انہیں دیکھنے لگا تھا۔

''تم نے یہ نکاح ضد میں کیا جلال تم سمجھتے ہو کہ تم ایک اچھے خاوند بن پاؤ گے؟'' نواب صاحب نے خدشات کے پیش نظر پوچھا تھا اور جلال نے فوری طور پر کوئی جواب نہیں دیا تھا اور شاید نواب صاحب ان کی خاموشی کو جانچ رہے تھے سمجھی گویا ہوئے تھے۔

''دیکھو میاں اس طرح کسی بچی کی زندگی خراب مت کرنا ہمیں یہی خدشہ تھا کہ تم ایسا ہی کوئی اقدام کرو گے اور تم نے وہی کیا پھر کیا فائدہ ہوا اس نکاح کا اگر تم نکاح کے معنی ہی نہیں جانتے، برخوردار ان معاملات کو ہمارے ساتھ ایک دانا دوست سمجھ کر ڈسکس کر دیہ معمولی بات نہیں ہے اس فیصلے سے اس بن ماں باپ کے جو بچی ہے اس کی زندگی جڑی ہے۔'' ابا نے کہا تھا مگر وہ فوری طور پر کچھ نہیں بول پایا تھا۔

❀.....◈.....❀

''بعض اوقات خواہشات کا حصول ممکن ہو جاتا ہے نواب زادی مگر خوشی محسوس نہیں ہوتی۔'' فتح النساء عین النور کے ساتھ راہ داری میں چلتے ہوئے بولی تھیں اور عین ان کی اس بات کے معنی تلاشنے لگی تھیں۔

''آپ اس نکاح سے خوش نہیں ہیں کہیں آپ کو یہ خوف تو لاحق نہیں کہ کوئی آپ کو محل میں قبول نہیں کرے گا اور.....!''

عین دانستہ کچھ کہتے ہوئے رک گئی تھی فتح النساء نے کوئی جواب نہیں دیا تھا بس خاموشی سے اس کی سمت دیکھا تھا تبھی عین نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا تھا اور نرمی سے بولی تھی۔

''ہمیں افسوس ہے ہم نے آپ کے ساتھ اچھا سلوک روا نہیں رکھا مگر ہم اس کا مداوا کرنا چاہیں گے آپ محل کا

حصہ نہیں گی تو ہم ہر ممکن طور پر آپ کا خیال رکھنے کی کوشش کریں گے۔'' عین نے یقین دلایا تھا فتح النساء نے سر انکار میں ہلایا تھا۔

''ہم خوفزدہ نہیں ہیں مگر.....!''

''آپ کو جلال بھائی سے محبت ہے ہمیں یقین ہے یہ محبت جلال بھائی کا دل جیتنے میں ضرور مددگار ہوگی اور بہرطور وہ اتنے برے انسان نہیں ہیں ان کا دل بہت حلیم اور نرم ہے وہ کسی کے متعلق کوئی میل دل میں نہیں رکھ سکتے۔'' عین نے سمجھایا تھا فتح النساء خاموش رہی تھی۔

''دل کے خدشات ختم کر دیجیے ہمیں امید ہے آپ کا نصیب آپ کے ساتھ کچھ برا ہونے نہیں دے گا آپ نواب خاندان کی بہو ہیں اب نواب زادہ جلال الدین پٹوڈی کی بیگم ہیں آپ کی عزت اور توقیر کبھی اس محل میں کم نہیں ہوگی آپ کو ہمیشہ مقدم سمجھا جائے گا۔'' عین نے یقین دلایا تھا۔

''ابا جان اس گھر میں آپ کے حمایتی ہیں اور ہمیں یقین ہے ابا جان اپنی بیٹی فتح النساء کے ساتھ کچھ غلط نہیں ہونے دیں گے۔'' عین نے مسکراتے ہوئے کہا تھا مگر فتح النساء چونکی تھی۔

''نواب زادی آپ کو بھی لگتا ہے کہ.....!'' وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی تھیں۔

''کیا مطلب کیا کہنا چاہتی ہیں آپ؟'' عین نے کہا تھا مگر فتح نے نفی میں سر ہلا دیا تھا اور عین ان کے الجھے ہوئے انداز پر ان کو دیکھ کر رہ گئی تھیں۔

❀.....◈.....❀

''نواب صاحب آپ دوستی کا بھرم بھرتے عمر نکل گئی افسوس لوگوں کی شر پسندی پر وہ اعتبار چکنا چور ہو کر رہ گیا۔'' مرزا سراج الدولہ نے نواب صاحب کے مقابل بیٹھتے ہوئے کمال ڈھٹائی سے شکوہ کیا تھا نواب صاحب مسکرا دیے تھے۔

''جانے دیجیے مرزا صاحب لوگوں کی بات کیا کہنا کہیں اس سے فرق نہیں پڑتا کہ کون کیا کہتا ہے ہم سنی سنائی پر یقین نہیں رکھتے کسی نے کیا کہا کیا سنایا اس بات کو جانے دیجیے اصل مدعا یہ ہے کہ ہم نے اعتبار نہیں کیا بہرحال ان معاملات کو اتھا کر ایک سمت دکھ دینا مناسب ہوگا۔'' نواب صاحب بات سمیٹتے ہوئے بولے تھے مرزا صاحب نے ڈرامائی انداز میں پر افسوس انداز مین نواب صاحب کی سمت دیکھا تھا۔

''نواب صاحب باتیں بڑھتی جا رہی ہیں اس پر موقوف نہیں ہم نے تو یہ بھی سنا ہے کہ نتیجتاً آپ نے حیدر میاں اور نواب زادی کا رشتہ بھی منسوخ کر دیا ہے؟'' نواب صاحب چونکے تھے اور پھر ملائمت سے مسکرا دیے تھے۔

''میاں ہم نے تو سنا تھا دیواروں کے کان ہوتے ہیں اب یقین بھی ہونے لگا کہ دیواروں کے صرف کان نہیں ہوتے آنکھیں بھی ہوتی ہیں۔'' انہوں نے بات کو مذاق میں اڑانا چاہا تھا مرزا صاحب تشویش بھرے انداز میں انہیں دیکھنے لگے تھے نواب صاحب محظوظ ہو کر مسکرائے تھے۔

''کون خبریں پہنچاتا ہے آپ تک، یہ مخبر تو بہت بڑا بھیدی لگتا ہے۔'' وہ پر مزاح انداز میں بولے تھے مرزا صاحب شرمندہ ہو گئے تھے۔

''آپ تو شرمندہ کرتے ہیں نواب صاحب جوتیاں مارتے ہیں اور وہ بھی عطر میں بھگو بھگو کر تا کہ جوتیاں پڑنے کی تاثیر عطر کی خوشبو سے جاتی رہے۔'' مرزا صاحب نے بے عزتی پر برا مانتے ہوئے اظہار افسوس اور اظہار احتجاج کرنا ضروری خیال کیا تھا نواب صاحب نرمی سے مسکرائے تھے۔

''باخدا ہمارا ایسا کوئی مقصد نہیں تھا مرزا صاحب تو یہ کیجیے ہم آپ کے ساتھ ایسا سلوک روا رکھ سکتے ہیں کیا، برسوں کے مراسم ہیں آپ کے ساتھ ہم آپ کی عزت اور توقیر کا مکمل احساس کرتے ہیں ہم آپ کے اس درجہ خلاف نہیں جا سکتے ایک رواداری نواب خاندان کا خاصہ ہے چاہے جو بھی ہو جائے وہ رکھ رکھاؤ باقی رہے گا۔'' نواب صاحب نے یقین دلایا تھا مرزا صاحب نے پر افسوس انداز میں انداز سے دیکھا تھا۔

''گویا وہ چہ میگوئیاں جو ہمارے کانوں تک پہنچیں وہ درست ہیں۔'' مرزا صاحب نے چونکتے ہوئے شکوہ کرنا

یال کیا تھا۔

''ہاں سانس تو لیجیے ایسی بھی کیا قیامت آن پڑی کہ یاں آرائیاں کیے جا رہے ہیں ہمارے ہاں ایسی ات اب تک اس گھر میں نہیں کی۔'' نواب صاحب ین دلایا تھا اور شربت کا گلاس اٹھا کر مرزا صاحب کی ب بڑھایا تھا اور نرمی سے بولے تھے۔

''ضرت جانے دیجیے شکوے گلے تو جیتے جی ختم نہیں تے آپ یہ شربت تو لیجیے۔'' نواب صاحب کے کہنے پر اصاحب نے شربت کا گلاس ان کے ہاتھ سے لیا تھا غٹا غٹ پی گئے تھے۔

''نواب صاحب آپ نے تو خون خشک کر دیا ہم ی میں اس درجہ پریشان نہیں ہوئے باخدا جو ہوا سو ہوا باتوں کی مد میں اس رشتے کو ختم مت کیجیے گا ہماری ت دو کوڑی کی نہیں رہے گی جس کو خبر ہوگی وہی جگ ائی کرنے چلا آئے گا۔ دل کو دکھانے والے پہلے ہی کم ہیں ہیں، اس عمر میں ایسے رسوا مت کیجیے گا بیٹھکوں، والوں میں بہت مذاق بنے گا کانگریس کے رکن کی عزت ی میں ملتے ایک لمحہ نہیں لگے گا ہم مستقبل کو داؤ پر نہیں لگا تے وزارت سنبھالنا ہے ہمیں۔'' اتنا ظلم مت کیجیے گا۔'' رزا سراج الدولہ نے درخواست کی تھی مرزا صاحب نے ہلایا تھا۔

''اس متعلق فی الحال کوئی فکر مت کریں آپ وزرا ی فہرست میں اپنا نام ضرور سنیں گے اور ہم پاکستان کی مین پر قدم رکھ کر ایک سجدہ کر کے اپنے اللہ اور اس کے ول ﷺ کا شکریہ ضرور ادا کریں گے جن کے صدقے یں پاکستان دیکھنا نصیب ہوگا ہم ہر نماز کے بعد اپنی عاؤں میں خصوصی طور پر پاکستان جانے کی دعا کرتے یں۔'' نواب صاحب نے کہا تھا اور مرزا صاحب مسکرائے تھے۔

''اللہ نے کرم کیا تو نواب صاحب آپ اس سرزمین قدم ضرور رکھیں گے ہم تو نیک نیتی سے آپ کے جانے کی دعا کرتے ہیں اللہ آپ کی دعاؤں کو قبول فرمائے، آمین۔''

''ثم آمین۔ بس زندگی کی یہی خواہش ہے کہ اس پاک سرزمین پر قدم رکھیں اور اس سرزمین پاک کو پھلتا پھولتا دیکھیں ہماری نسلوں کو ایک آزاد فضا میں سانس لینے کا موقع فراہم ہو اور وہ اپنی آزادی کی قدر کر سکیں۔'' نواب صاحب نے کہا تھا مرزا صاحب مسکرائے تھے۔

''ان شاء اللہ ایسا ہوگا نواب صاحب ویسے آپ تو ابھی سے اس زمین کے عشق میں دیوانے ہوئے ہیں ہم تو چاہتے تھے آپ یہاں ہندوستان میں ہی رکتے اور کانگریس میں شمولیت اختیار کرتے ارے میاں اس بنجر زمین میں ایسا کیا ہے آباد ہوتے صدیاں نکل جائیں گی ہندوؤں کا دماغ چلتا ہے ایک پہلے سے آباد شدہ دیس ان کے حصے میں آنے والا ہے ان کے لیے ترقی کا سفر آسان ہوگا پاکستان کو ویسی ترقی کرتے صدیاں لگ گیں، ملک چلانا آسان نہیں نواب صاحب جناح صاحب تو دیوانے کا جواب دیکھ رہے ہیں اپنی جسامت سے بڑی بھڑکیں مارنا پسندیدہ مشغلہ ہے ان کا ملک آباد ایسے نہیں ہوتے جناح صاحب تو گویا گڈے گڑیا کا کھیل کھیل رہے ہیں کانگریس والوں کو سنیے کبھی ان کی گیدڑ بھبکیوں پر خوب ہنسی اڑاتے ہیں اور......!''

''پلیز مرزا صاحب اس گفتگو کو یہیں برخاست کر دیجیے آپ کو ایک محترم ہستی کی تضحیک کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں جن کا مذاق آپ اڑا رہے ہین ان کی لیڈر شپ کو انگریز سرکار تک تسلیم کرتی ہے اور آپ کی کانگریس بھی ہم وہ قوم ہیں جو اپنی قدروں پر خود آپ شرمندہ ہیں اپنی صلاحیتوں کو کمزوری بنانا ہمیں ہی آتا ہے دوسروں کے مقابلے میں خود کو کمتر بنانا اور کم تر باور کرنا صرف ہماری خاصیت ہے ہم میں سے میر جعفر نکلتے رہیں اور نکلتے رہیں گے میاں وہ سہانے ٹھیک کہتے ہیں گھر کا بھیدی ہی لنکا ڈھاتا ہے اب یہی دیکھ لیں آپ بھی مسلمان ہیں مگر آپ کانگریس کا دم بھرتے دکھائی دیتے ہیں اگرچہ یہ شرمناک حد تک شرمناک بات سمجھی جانا چاہیے آپ کانگریس کی صلاحیتوں کے قائل ہیں مگر آپ کو جناح صاحب کی اخلاقی برتری ہضم نہیں ہوتی، جناح صاحب اس کانگریس کا حصہ رہے ہیں جس کے ساتھ آپ آج مل کر کھڑے ہیں جناح صاحب نے اس کانگریس کو کس بنا پر خیر باد کہا یہ بات د

معلوم ہی ہوگی نا آپ کو؟ اگر آپ اسے دیوانے کا خواب سمجھتے ہیں تو سمجھا کیجیے ہم دھڑوں میں بٹی قوم ہیں اور مزید دھڑوں میں بٹتے جائیں گے اور ہماری بربادی تو ہم خود آپ دیکھتے جائیں گے مگر ہم اس دھڑلے بازی کے بارے میں سوچنا ضروری خیال نہیں کریں گے کہ یہ سازشوں کے جال کون بن رہا ہے جب جس دن ہم نے ان سازشوں کی جانچ پڑتال کرلی اس دن ہم اپنی مضبوطی کو سمجھ جائیں گے مگر یہ قوم بہادر ہے اور کبھی ہارے گی نہیں فتح تو بہر حال ہوگی اور اب بھی فتح دور نہیں جناح کا پاکستان ہم بھی دیکھیں گے اور آپ بھی جس زمین کو آپ بنجر کہہ رہے ہیں وہ زمین سونا اگلے گی۔'' نواب صاحب نے باور کرایا تھا مرزا سراج الدولہ مسکرا دیے تھے۔

''چلیے خوشی کی بات ہے اس بات پر آپ کو گڈ لک وش کیے دیتے ہیں ہم نہرو صاحب کی قیادت میں امیدیں لگائے کھڑے ہیں اور آپ جناح صاحب کی ہوگا کیا یہ تو آنے والا وقت ہی بتائے گا وعدے تو ہر لیڈر کرتا ہے سیاست چمکانے کا موقع ملتا ہے تو ہر لیڈر وعدوں کی ڈھیریاں لگاتا جاتا ہے۔'' مرزا صاحب نے کہا تھا اور نواب صاحب ان کو دیکھ کر رہ گئے تھے۔

''سو آپ کا نکاح ایک بدلہ تھا اور اب کیا جواز بچتا ہے اس بدلے کا؟'' فتح النساء نے جلال کی سمت سے پیٹھ موڑے بیٹھے دریافت کیا تھا اور جلال خاموشی سے ان کی پشت کو دیکھنے لگا تھا۔

''ہم آپ کے سوالوں کے جواب دینے کے پابند نہیں ہیں اس متعلق آپ کی کوئی بھی باز پرس بے فائدہ ہوگی۔'' جلال نے بے نیاز انداز اختیار کیا تھا اور وہ گردن موڑ کر ان کی بے رخی کے موسموں کو دیکھنے لگی تھی وہ انداز بے واسطہ تھا اور نگاہ سرد مہری لیے ہوئے تھی فتح النساء کو اپنے اس کے درمیان رشتے کی اہمیت اور حیثیت کا بھرپور اندازہ ہوا تھا مگر وہ خاموش رہی تھی تب جلال نے جانے کیا سوچ کر اس کی سمت پیش قدمی کی تھی اور اس کے سامنے آن رکا تھا فتح النساء خاموشی سے انہیں دیکھنے لگی تھی۔ یقین نہ ہوا تھا یہ وہ شخص تھا جس کی محبت ان کے اندر ہمیشہ موجود رہی تھی اب کے اسے دیکھا تھا تو اپنا اندر کسی قدر ویران لگا تھا۔

''فتح النساء ہم نہیں جانتے آپ ہم سے کیا کیا توقعات رکھتی ہیں مگر ہم نہیں جانتے اس رشتے کی حقیقت کیا ہوگی ہم آپ سے محبت نہیں کرتے ہمیں خوشنما سے عشق ہے خوش نما کی محبت کے ساتھ جی رہے ہیں۔ ہم چاہتے تھے ہم اس کے ساتھ اپنی زندگی کا آغاز کریں مگر......!'' وہ کہہ کر خاموش ہوئے تھے اور فتح النساء نے ان کی سفاکی پر انہیں دیکھا تھا وہ اتنی بڑی بات ایسے کہہ گئے تھے جیسے کوئی معمولی بات ہو۔

بات ایک رشتے کی تھی ایک تعلق خاص کی تھی اور......

وہ لہجہ کس قدر سرد تھا۔

اور جلال نے اس کا ہاتھ کیوں تھاما تھا کیا سوچ کر؟ وہ اپنے اندر کے خالی پن کر ایسی ساکت ہوئی تھی کہ جلال الدین سے پوچھ ہی نہیں سکی تھی اور وہ نواب زادہ عجیب تنی ہوئی گردن کے ساتھ کھڑا تھا فتح النساء کا دل سلگنے لگا تھا۔

جلال نے اسے تختہ مشق بنایا تھا اب جب عین نے تمام معاملات بنا کر اسے ایک احساس پشیمان سے نکال لیا تھا کہ وہ نواب صاحب کی بیٹی نہیں تو وہ جانے اپنے طور پر جلال کے ساتھ کتنی توقعات وابستہ کر چکی تھی مگر جلال ان توقعات پر پورا اترنے کے بارے میں جیسے کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا۔

''آپ نے یہ رشتہ کیوں بنایا اس رشتے کے استوار کرنے میں کسی کی کیا بھلائی تھی فتح نے پوچھا تھا اور وہ فتح النساء کا چہرہ بغور دیکھتے ہوئے مسکرا دیا تھا۔

''آپ عجیب ہیں فتح النساء عجیب باتیں کرتی ہیں افسوس میرے پاس آپ کے سوالوں کے جوابات فی الحال نہیں ہیں اور مجھے اندازہ اگر میں آپ کے ان سوالوں کے جوابات کبھی دے بھی سکوں گا کہ نہیں۔'' وہ شانے اچکا کر گویا ہوا تھا فتح النساء نے اس شخص کو خاموشی سے دیکھا تھا جس کے ساتھ اس کے سارے موسم اور زمانے جڑے تھے مگر وہ اسے اپنے ساتھ جڑا محسوس نہیں کر رہی تھی۔

''کیا سوچ رہی ہیں آپ فتح النساء؟'' جلال الدین نے پوچھا تھا۔

''آپ کو اپنی محبت کی طرف واپس جانا ہے۔'' فتح

ا ما نے پوچھا تھا۔ جلال نے شانے اچکا دیے تھے۔
''ہم الاعلم ہیں فتح النساء فی الحال طے نہیں کیا۔''
''اور آپ کو خوش نما سے محبت ہے؟'' فتح النساء نے جانے کیوں دریافت کیا تھا۔
''محبت کے لیے جواز درکار نہیں ہوتے فتح النساء۔'' وہ بے فکر تھا اور فتح النساء کے دل پر جیسے کسی نے برچھیوں سے وار کیا تھا۔
''محبت کے لیے ہی تو جواز درکار نہیں ہوتے نواب زادہ جلال الدین ورنہ نفرتوں کے لیے تو بے شمار جواز ڈھونڈے جاتے ہیں۔'' وہ مدہم لہجے میں بولی تھی۔
''آپ ہم سے اس درجہ نفرت کرتی ہیں؟'' جانے کیوں جلال کو جیسے پروا ہوئی تھی فتح النساء نے اس کی سمت دیکھا تھا اور پلٹ کر آگے کی سمت بڑھنے لگی تھی اسے دیکھ کر جانے کیوں پکارا تھا۔
''آپ نے جواب نہیں دیا۔'' فتح النساء کو جیسے اس آواز نے باندھ لیا تھا۔
''ہم جاننا چاہتے ہیں فتح النساء آپ ہم سے کتنی نفرت کرتی ہیں۔'' جلال الدین کے لیے یہ بات اہم کیوں تھی وہ جان نہیں پائی تھی مگر اس کے لیے جلال کی سمت پلٹ کر دیکھنا جیسے ناگزیر ہو گیا تھا۔
''آپ کو جاننے کی لگن کیوں ہے جلال الدین نفرت کے کوئی معنی نہیں ہوتے نفرت کرنے والے کتنے بھی ہوں اور چاہے وہ کتنی بھی نفرت کرتے ہوں یہ بات اہم نہیں ہوتی آپ ان باتوں کو بھول کر محبت کی گنتی شمار کیجیے۔'' فتح النساء نے کہا تھا اور پلٹ کر اندر کی ہمت بڑھنے لگی تھی جلال اسے دیکھتا رہ گیا تھا۔

❀.....◈.....❀

''نواب صاحب آپ کو محتاط رہنے کی ضرورت ہے کوئی آپ کی ساکھ کو نقصان پہنچا سکتا ہے مجھے اس مرزا صاحب والے واقعے کا ہونا کوئی معمول بات نہیں لگتا۔'' سلمت صاحب نے کہا تھا اور نواب صاحب مسکرا دیے تھے۔
''حکمت صاحب برائی کتنی بھی طاقت ور کیوں نہ ہو وہ اچھائی کا مقابلہ نہیں کر سکتی اپنے نیک اور صالح بندوں کی رہنمائی اللہ آپ کرتا ہے دیکھیے مرزا صاحب کی سازش بھی بہر حال بے نقاب ہو گئی۔'' نواب صاحب نے شطرنج کی چال چلتے ہوئے قہوے کی چسکیاں لی تھیں حکمت صاحب نے انہیں بے چینی سے دیکھا تھا۔
''ہم تو یہ سوچ کر ہی بے چین ہو جاتے ہیں کہ اگر مرزا صاحب کی سازش کامیاب ہو جاتی تو کیا ہوتا وہ بہت شاطر دشمن ہیں ان سے محتاط رہنا ہو گا ایسے دشمن چھپ کر وار کرنے کے عادی ہوتے ہیں ایسا نہ ہو ہم پلک جھپکیں اور محترم مرزا سراج الدولہ اپنا کام کر جائیں۔'' حکمت صاحب نے صلاح دی تھی اور نواب صاحب نے سر ہلایا تھا۔
''آپ کے محترم سپوت اور آپ کا بہت شکریہ حکمت بہادر یار جنگ صاحب۔'' آپ کے خاص تعاون سے معاملات نمٹ پائے ورنہ جانے کیا سے کیا ہو جاتا۔'' سیف صاحب نے کہا تھا تو حکمت صاحب بولے تھے۔
''ارے نواب صاحب شکریہ کی کیا ضرورت ہے ہم کوئی غیر ہیں آپ کے بچپن کے دوست ہیں اور وہ دوستی ہی کیا جو وقت پڑنے پر کام نہ آئے ہمیں خوشی ہے ہماری دوستی بچوں میں بھی منتقل ہوئی نواب زادہ جلال اور تیمور میں بھی یہ مراسم اسی قدر مضبوط ہیں جس طور ہم ہیں تھے۔'' حکمت صاحب نے کہا تھا اور نواب صاحب پر خیال انداز میں سر ہلانے لگے تھے۔
''تیمور خاصے ہونہار نوجوان ہیں ہمیں ان کا مثبت رویہ بہت بھاتا ہے آپ کا پرتو ہیں وہ اب تو جماعت کا بھی اہم رکن بن گئے ہیں حالیہ ہونے والے ایک اجلاس میں ان کی تقریر سننے کا اتفاق ہوا ماشاء اللہ کیا شعلہ بیانی ہے کیا جوش ہے وہ تو بنے بنائے لیڈر ہیں قائدانہ صلاحیت صاف دکھائی دیتی ہے آپ کے صاحبزادے میں اور نڈر بھی بلا کے ہیں جوانی میں ایک جوش اور ولولہ تو خیر ہوتا ہے مگر آپ کے صاحبزادے میں ایک خاص وصف ہے۔'' نواب صاحب کے سراہنے پر حکمت صاحب نے مسکراتے ہوئے انہیں دیکھا تھا۔
''تشکرات نواب صاحب بچہ آپ کی صحبت میں پلا بڑھا ہے آپ کا خاص سایہ رہا ہے اس کے سر پر کچھ اثر

آ گیا ہوگا ہم مشکور ہیں چلیے آپ کی دوستی سے کچھ تو ہاتھ آیا۔'' انہوں ازراہ مذاق کہا تھا اور نواب صاحب ہنس پڑے تھے پھر سر ہلاتے ہوئے بولے تھے۔

''چلیے بہرطور آپ نے کچھ تو قبول کیا تیمور میاں کو ہمارا آداب کہیے گا کہیے گا ہماری طرف چکر لگالیں ہم شکریہ تو کہہ سکیں اب برخوردار یہ نہ کہیں کہ ہم نے بلا بھیجا اور پھر شکریہ کہا۔'' نواب صاحب مسکرائے تھے۔

''ارے نواب صاحب کیسی باتیں کرتے ہیں آپ۔ آپ کا اپنا بچہ ہے آپ کے کہنے پر اسے حاضر ہونا کیا برا لگے گا؟ ہم تو چاہتے تھے نواب صاحب ہم اس دوستی کو رشتے داری میں بدل لیں، مگر.....!''

حکمت صاحب کچھ کہتے کہتے رک گئے تھے اور نواب صاحب چپ چاپ قہوے کے سپ لینے لگے تھے پھر مدہم لہجے میں گویا ہوئے تھے۔

''قسمت کی بات ہے حکمت صاحب اللہ جوڑ بناتا ہے بہرطور ہماری دوستی مضبوط تو ہے اور تیمور ایک بہترین انسان ہیں ہمارے لیے تو وہ جلال جیسے ہیں بچپن سے اب تک ہم نے کبھی جلال میں اور اس میں کوئی تفریق نہیں رکھی اللہ کے کام اللہ جانے اگر لکھا ہوتا تو ضرور ہوتا۔'' نواب صاحب کی آواز میں جانے کیا حسرت تھی کہ حکمت صاحب نے انہیں بغور دیکھا تھا۔

''نواب صاحب آپ کی آواز میں یہ ایک حسرت کس بات کی غماز ہے کیا آپ کو نواب زادی عین کا رشتہ حیدر میاں سے کرنے کا افسوس ہے کیا؟'' حکمت صاحب کے پوچھنے پر نواب صاحب غمزدہ سے ان کی طرف دیکھنے لگے تھے۔

''حکمت صاحب بیٹی بہت بڑی ذمہ داری ہوتی ہے ہمیں نواب زادی کا بچپن سے میں ان کا رشتہ لمحے طے کرنے کا افسوس ہے۔''

''کیا آپ کو لگتا ہے کہ وہ فیصلہ غلط ہے۔'' حکمت صاحب نے کہا تھا نواب صاحب سر جھکا کر بولے تھے۔

''ہم اپنی بیٹی سے شرمندہ ہیں ہم نے ان کے لیے اس شخص کے بیٹے کا انتخاب کیا جو اچھے انسان کہلانے کے لائق بھی نہیں حیدر میاں اگرچہ اس بات کے لیے ذمہ دار نہیں ہیں مگر ہم یہ بات نظرانداز نہیں کر سکتے کہ حیدر میاں مرزا سراج الدولہ کے صاحب زادے ہیں۔'' ان کا اشارہ پچھتاؤں میں گھرا بہت کچھ کہہ رہا تھا حکمت صاحب انہیں دیکھ کر رہ گئے تھے۔

❀.....◈.....❀

''تیمور جانے کیا ہے یہ سب ہم خود کو بہت نیم جاں سا محسوس کر رہے ہیں ہم نے ابا جان کو کہہ دیا ہے ہم حیدر میاں سے نکاح نہیں کر سکتے۔'' نواب زادی بولی تھیں تیمور چونک گیا تھا۔

''آپ ایسا فیصلہ کیسے لے سکتی ہیں نواب زادی، آپ کو تو اس رشتے اور اس رشتے کے احساس سے خاصی انسیت رہی ہے نا؟'' تیمور نے جتایا تھا اور نواب زادی جھک گئی تھی۔

''ہم ابا کے ساتھ اتنا کچھ ہونے کے بعد اس طور خود رضامند نہیں کر سکتے جو خاندان ابا جان کے خلاف سازشوں کا جال بن رہا ہے ہم اس خاندان کی بہو بن کر کیسے ان حویلی میں جا سکتے ہیں؟ بیٹی کا مطلب کمزور ہو سمجھا جاتا ہے تیمور ہم ابا جان کی کمزوری نہیں بننا چاہتے مرزا چاہا بہت شاطر اور چالاک انسان ہیں وہ ہمیں ابا جان کی کمزوری سمجھ کر استعمال کریں گے ہم اپنا مان تو کھو ہی گے ہی ہم ابا جان کو بھی کمزور کر دیں گے ہم ان کا سر جھکا ہوا نہیں دیکھ سکتے ہم نے بہت سوچا ہم کشمکش میں رہے مگر ہمیں مناسب ترین فیصلہ یہ لگا کہ ہم اس رشتے سے انکار کر دیں۔'' نواب زادی بولی تھیں اور تیمور ان کے جھکے سر کو دیکھ کر رہ گیا تھا۔

وہ بہترین بیٹی تھیں انہوں نے ثابت کر دیا تھا وہ نواب صاحب کی عزت کو اہم جان کر حیدر میاں کے لیے انکار کر رہی تھیں حالانکہ کچھ دن قبل وہ اپنی عزیز ترین دوست سے انہی حیدر میاں کے لیے ڈٹ گئی تھیں انہوں نے فتح النساء سے اپنی بچپن کی دوستی کی بھی پروا نہیں کی تھی اور اب وہ نواب صاحب کے لیے قدم واپس لینے کو تیار کھڑی تھیں تیمور نے انہیں بغور دیکھا تھا پھر مدہم لہجے میں گویا ہوئے تھے۔

''نواب زادی بہتر ہوگا آپ اپنے فیصلے پر نظر ثانی

سوچ لیجیے آپ کو اس تعلق سے انسیت ہے اور اس لیے آپ نے فتح النساء کے ساتھ کے لیے اپنا برسوں پرانا رشتہ خطرے میں ڈال لیا تھا۔'' تیمور ... تھے تو وہ مضبوط لہجے میں گویا ہوئی تھیں۔

''ہم بچے نہیں ہیں تیمور کیا تم بار بار جتا رہے ہو ہمیں ... ہم ایک بار سوچ کر نظر ثانی کر لیں۔ ابا جان کی عزت سے زیادہ کیا اہم ہوگا ہمارے لیے ہم اس قدر میں جا کر ابا کا سر کیا جھکانا چاہیں گے؟'' مرزا چاچا کو کون نہیں جانتا، وہ دل سے بات نکالنے کے قائل نہیں یہ بات ان کے دل میں گرہ بن کر ہمیشہ کھٹکتی رہے گی اور وہ ابا جان کو نیچا دکھانے سے باز نہیں آئیں گے اور ہم اس نکاح سے ابا جان کو کمزور نہیں کر سکتے ایک رشتہ جڑے تو دوسرا رشتہ خطرے میں پڑ جائے یہ رشتہ کیا نبھانے کے قابل ہوگا؟'' عین نے مضبوط لہجے میں کہتے ہوئے تیمور کی سمت دیکھا تھا تو تیمور خاموشی سے انہیں دیکھنے لگا تھا۔

''ایک دوست ہونے کے ناطے تمہیں کیا لگتا ہے تیمور، ہم کیا ٹھیک فیصلہ نہیں کر رہے؟'' عین نے دریافت کیا تھا تبھی تیمور گویا ہوئے تھے۔

''آپ کا دل کیا کہتا ہے نواب زادی، آپ کو لگتا ہے کہ یہی مناسب فیصلہ ہے۔'' تیمور نے پوچھا تھا عین نے سر ہلایا تھا۔

''آپ بھی جانتے ہیں تیمور اس سے زیادہ بہتر فیصلہ کوئی اور نہیں ہو سکتا۔'' وہ اسے غیر جانبدار دیکھ کر بولی تھیں تیمور نے گہری سانس لی تھی۔

''ایک بات بتانا چاہتے ہیں آپ کو عین النور آپ جو اتنا سہل جان رہی ہیں نا یہ اس قدر سہل نہیں ہوگا مرزا سراج الدولہ ایک کائیاں ہیں وہ اس رشتے کو ختم نہیں ہونے دیں گے نواب صاحب کے خاندان سے جڑ کر جو مراعات ان کے ہاتھ لگ رہی ہیں وہ اس سے دست بردار نہیں ہونا چاہیں گے کئی معاملات میں وہ نواب صاحب کا نام اور حوالہ استعمال کرتے پائے گئے ہیں وہ اس ساکھ سے جو فائدہ اٹھا رہے ہیں اور سیاسی یا معاشرتی فوائد حاصل کر رہے ہیں وہ اس سے دستبردار نہیں ہونا چاہیں گے سو وہ اس رشتے کو بچانے کے لیے کئی ہتھکنڈے استعمال کریں گے یہ بات نواب صاحب بھی جانتے ہیں کہ مرزا سراج الدوین گلے میں انکی پھانس ہیں ان سے چھٹکارا ممکن نہیں۔'' تیمور نے کہا تھا تو عین حیرت سے انہیں دیکھنے لگی تھی۔

''کیا ابا جان اس بات سے واقف ہیں کیا یہ بات ابا جان کے علم میں ہے کہ مرزا چاچا ان کے نام پر لوگوں سے کام نکلواتے ہیں؟'' عین حیران ہوئی تھیں تیمور نے شانے اچکا دیے تھے۔

''یہ بات کون نہیں جانتا عین کانگریس میں شمولیت ان کے لیے ان قدر آسان کیوں تھی؟ اگر نواب چاچا کا حوالہ نہ ہوتا تو کانگریس میں ان کا شامل ہونا ناممکن تھا ہندوؤں کے ہاتھ ملانا آسان نہیں وہ فائدے لینے والی قوم ہے ضرور مرزا سراج ان کا حصہ بن کر کئی غیر قانونی کاموں میں ملوث رہے ہوں گے۔'' تیمور نے کہا تھا اور عین حیرت سے انہیں دیکھنے لگی تھی۔

''ابا جان اس بات سے واقف ہو کر بھی اس قدر آسانی سے لیتے ہیں انہیں اب بھی ان کی دوستی کا دم بھرتے ہیں اور اب بھی ان کو معاف کر رہے ہیں اس کی وجہ کیا رہی ہوگی تیمور؟'' عین نے پوچھا تھا تو تیمور خاموش ہو گیا تھا اور نگاہ پھیر کر دوسری سمت دیکھنے لگا تھا اور تب عین نے کسی قدر حیرت سے اسے دیکھا تھا۔

''تیمور آپ ایسا کچھ جانتے ہیں جو ہم نہیں جانتے؟'' عین نے کہا تھا اور تیمور نے نفی میں سر ہلایا تھا وہ اس پس و پیش پر ان کو دیکھ کر رہ گئی تھیں۔

''تیمور، ہم جاننا چاہتے ہیں۔'' عین کا نادز بارعب تھا اور تیمور ان کی طرف دیکھنے لگا تھا۔

''نواب صاحب اگر ایسے شخص کو جھیلتے ہیں تو اس کی کوئی وجہ تو رہی ہوگی نا کیا یہ بات سمجھنا اس قدر دشوار ہے؟'' تیمور نے کہا تھا تو عین چونکی تھیں۔

''ابا کی کوئی کمزوری مرزا چاچا کے پاس ہے مگر ایسی کیا کمزوری ہو سکتی ہے؟ ابا جان نے کبھی اس کا ذکر کیوں نہیں کیا؟'' وہ حیرت زدہ تھیں تیمور نے سر انکار میں ہلایا تھا۔

''آپ نواب چاچا سے پوچھیے گا اس بات کا جواب یقیناً ان کے پاس ہوگا۔'' عین ساکت سی اسے دیکھنے لگی تھی

یقیناً اس کے پاس کوئی گہرا راز تھا جیسے وہ نہیں جانتی تھیں تیمور اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

''جلال کب تک سوئے گا؟ مجھے اس سے ملنا تھا۔'' تیمور نے کہا تھا عین نے گہری سانس لی تھی۔

''بھائی ضروری کام سے گئے ہیں بتا کر نہیں گئے کب لوٹیں گے ابا نے ان کو کسی ضروری کام سے حیدرآباد بھیجا ہے بہرحال آپ ایک راز دبا چھوڑ کر جا رہے ہیں جو کہ مناسب نہیں آپ نے بتانے کا قصد کیوں کیا اگر آپ کا ارادہ ہو راز کھولنے کا نہیں تھا؟'' عین نے خفگی سے کہا تھا عین رک کر پلٹ کر ان کی سمت دیکھنے لگا تھا۔

''ایسا کوئی گہرا راز نہیں ہے نواب زادی آپ کے ابا جان کا کردار بے داغ ہے آپ جو قیاس کر رہی ہیں یقیناً نہیں چاہیں گے۔'' عین نے صاف گوئی سے کہا تھا۔

''چلتا ہوں چچا جان سے ملنا تھا مگر وہ آرام کر رہے ہوں گے سو پھر کبھی سہی۔'' وہ کہہ کر پلٹا تھا چلتے ہوئے وہاں سے نکل گیا تھا عین نے گہری سانس لی تھی اور پلٹ کر اپنے کمرے کی طرف بڑھنے لگی تھی اس کا ذہن بہت الجھ گیا تھا۔

❁.....◈.....❁

نواب صاحب نے فتح النساء کے سر پر ہاتھ رکھا تھا اور فتح النساء خاموشی سے ان کی طرف دیکھنے لگی تھی۔

''بیٹی اللہ گواہ ہے ہم نے آج تک آپ کو اپنے گھر کی بیٹی سمجھا ہے اور عین سے کم کبھی نہیں جانا آپ کی اہمیت عین سے کم ہرگز نہیں آپ ہمارے مرحوم دوست کی صاحبزادی ہیں اور ہم نے آپ کی جو ذمہ داری آپ کے والدین کی وفات پر لی تھی ہم اس ذمہ داری کو نبھانے میں کامیاب رہے ہیں کہ نہیں اس کا فیصلہ اللہ کرے گا مگر ہم جب تک زندہ ہیں ہم آپ کے ساتھ کبھی کوئی ناانصافی نہیں ہونے دیں گے۔'' نواب سیف الدین پٹودی نے فتح النساء کے سر پر ہاتھ رکھ کر یقین دلایا تھا اور وہ ان کی پدرانہ شفقت پر بھیگی آنکھوں سے ان کی سمت دیکھنے لگی تھی نواب صاحب کو لگا تھا وہ خوش نہیں ہیں تبھی پوچھنے لگے تھے۔

''کیا آپ اس نکاح سے خوش نہیں ہیں۔ کیا یہ نکاح آپ پر زبردستی مسلط کیا گیا ہے؟ ہم جاننا چاہتے ہیں بیٹی ہم نہیں چاہتے آپ کے ساتھ کوئی ناانصافی ہو ہم اس رشتے کے حق میں نہیں تھے ورنہ دھوم دھام سے آپ کو نواب خاندان کی بہو بناتے ہم نواب زادہ جلال الدین پٹودی کو آپ کے لائق نہیں سمجھتے ہیں وہ نالائق نوجوان ہیں ہمیں لگا وہ آپ کی اہمیت اور توقیر کو سمجھ نہیں پائیں گے ان کا مزاج مختلف ہے وہ ذمہ داریاں لینے میں ہچکچاہٹ محسوس کرتے ہیں مغربی ماحول نے ان پر خاص اثر ڈالا ہے کچھ آزاد طبیعت کے ہیں۔'' نواب صاحب مدہم بردبار لہجے میں گویا تھے فتح نے ان کو خاموشی سے سنا تھا۔

''بہرحال اب جب یہ رشتہ قائم ہو چکا ہے ہم آپ کو ایک بات کا یقین دلاتے ہیں کہ آپ کو اس گھر میں وہی عزت ملے گی جو ایک بہو کو ملنا چاہیے اس عزت و مرتبے میں کبھی کوئی کمی نہیں آئے گی۔'' وہ یقین دلا رہے تھے ان کی پدرانہ شفقت پر وہ ان کے ساتھ لپٹ کر رونے لگی تھی اور وہ شفقت سے فتح النساء کا سر تھپکنے لگے تھے۔

''فتح بیٹی آپ کو اس نالائق کے مزاج کے ساتھ کسی قدر کمپرومائز کرنا پڑے گا دل کا برا نہیں ہے اور سب سے بڑی بات وہ غصے میں جو کہتا ہے اس کی کوئی حقیقت ہوتی نہیں ہم بچپن میں جب ڈانٹ دیا کرتے تھے تو وہ اترا کر غصے سے کہتے تھے ہم گھر چھوڑ کر جا رہے ہیں مگر یہ کہہ کر وہ اپنے کمرے میں چلے جاتے تھے اور پھر جب رات کے کھانے پر ٹیبل پر سامنا ہوتا تھا تو احسان کرنے والے انداز میں کہتے تھے۔

''ہم آپ کی وجہ سے چھوڑ کر نہیں گئے لوگ کیا کہیں گے نواب صاحب کی تربیت کیسی ہے بیٹا گھر چھوڑ کر چلا گیا اور پھر یہ بات بھی ہمیں پشیمان کر رہی تھی کہ بڑھاپے میں آپ کا سہارا کون بنے گا ابھی تو آپ توانا ہیں مگر بڑھاپے میں آپ کو جب ضرورت پڑے تو مجھے آپ کے ساتھ ہونا چاہیے نا؟'' یہ کہہ کر وہ مجھ سے لپٹ جاتے تھے اور ہم مسکرا دیتے تھے تھوڑے ضدی ہیں مگر سمجھ دار بھی ہیں اب نواب کے اوصاف میں نوابی نہیں آئے گی تو حیرت ہوگی۔'' وہ مسکرائے تھے فتح کی آنکھوں کو پونچھتے ہوئے انہوں نے سر چوما تھا اور بولے تھے۔

''بیٹی پھر کبھی اداس مت ہونا ہم آپ کو ہمیشہ مسکراتے

ملنا چاہتے ہیں بہت جلد ہم آپ کو رخصت کرا کر آپ کے اپنے گھر لے جائیں گے جلال کی فکر مت کیجیے جلال کی من مانیاں اب نہیں چلیں گی ہم ان کے کان کھینچیں گے آپ کو ان سے جو بھی شکایت ہو آپ ہمیں مطلع کیجیے گا۔“ نواب صاحب نے یقین دلایا تھا اور فتح النساء نے سر ہلایا تھا۔

❀ ...... ❀ ...... ❀

”جانتے ہیں آپ آپ کے ہونہار سپوت کیا چاہتے ہیں؟“ بیگم حکمت نے حکمت صاحب کے سامنے پڑی پلیٹ میں کھانا نکالتے ہوئے کہا تھا حکمت صاحب نے چونکتے ہوئے بیگم کو دیکھا تھا۔

”تیمور کسی معاملے میں کیا چاہتے ہیں وہ ہونہار اولاد ہیں ان کے متعلق کچھ شکایت رکھنا عجیب ہے بیگم۔“ حکمت صاحب مسکرائے تھے۔

”نئی گاڑی چاہیے ان کو لے دیں گے بیگم اس میں پریشانی کی کیا بات ہے یوں بھی انہوں نے کبھی ضد کر کے ہم سے کچھ نہیں مانگا ان کا مزاج بہت سلجھا ہوا ہے وہ بہت پرسکون مزاج رکھتے ہیں۔“ حکمت صاحب نے بیٹے کی بھرپور طرفداری کی تھی بیگم نے ان کو نرمی سے دیکھا تھا پھر گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولی تھیں۔

”وہ عین سے محبت کرتے ہیں۔“

”کیا؟“ بیگم حکمت کی بات پر وہ حیران رہ گئے تھے۔

”یہ بات آپ سے تیمور نے کہی؟“ حکمت صاحب نے پوچھا تھا۔

”جس نے بھی کہی بہرحال یہ بات حقیقت ہے۔“ بیگم حکمت نے کہا تھا۔

”اوہ، مگر نواب زادی کا رشتہ تو ان کے بچپن سے طے ہے اور آپ تو تیمور کے لیے خوش بخت کے بارے میں سوچ رہی ہیں؟“ حکمت صاحب نے کہا تھا ان کے لہجے مین فکر در آئی تھی بیگم حکمت تبھی گویا ہوئی تھیں۔

”ہم اپنے بچے کو ایسی سمجھوتوں کی زندگی نہیں جینے دیں گے ہم نے سوچا ہے کہ ہم نواب صاحب سے بات کریں گے ہمیں بہن مانتے ہیں تو پھر اس رشتے کے لیے ہاں کرنا ہوگی۔“ بیگم حکمت نے ٹھان کر کہا تھا۔

”بچوں جیسی بات مت کریں بیگم رشتے بچوں کا کھیل

آنچل کی جانب سے ایک اور آنچل

ماہنامہ

حجاب کراچی

شائع ہوگیا ہے

ملک کی مشہور معروف قلمکاروں کے سلسلے وار ناول، ناولٹ اور افسانوں سے آراستہ ایک مکمل جریدہ گھر بھر کی دلچسپی صرف ایک ہی رسالے میں موجود جو آپ کی آسودگی کا باعث بنے گا اور وہ صرف ”**حجاب**“ آج ہی ہاکر سے کہہ کر اپنی کاپی بک کرالیں۔

اس کے علاوہ

خوب صورت اشعار منتخب غزلوں اور اقتباسات پر مبنی مستقل سلسلے

اور بہت کچھ آپ کی پسند اور آرا کے مطابق

Infoohijab@gmail.com
info@aanchal.com.pk

کسی بھی قسم کی شکایت کی صورت میں

021-35620771/2
0300-8264242

نہیں ہیں۔'' نواب صاحب ان معاملے میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر پائیں گے بیٹی ہے خیرات نہیں ہے کہ اٹھا کر کسی کی بھی جھولی میں ڈال دیں۔'' حکمت صاحب نے کھانا نوش فرماتے ہوئے کہا تھا بیگم حکمت ان کو دیکھ کر رہ گئی تھیں۔

''کچھ تو حل ہوگا کیا آپ اس مدعے پر بات نہیں کر سکتے۔'' بیگم نے اکسایا تھا۔

''بیگم ہم بات کیسے کریں؟ نواب صاحب کہیں گے جب آپ پہلے سے واقف ہیں کہ نواب زادی کی بات طے ہے تو یہ رشتہ مانگنے کی بات کیا معنی رکھتی ہے؟'' حکمت صاحب نے کہا تھا اور بیگم دیکھ کر رہ گئی تھیں۔

❁.....◈.....❁

نواب زادی کی آنکھ کھلی تھی اور پیاس کا شدید ترین احساس محسوس ہوا تھا ان کا حلق سوکھا ہوا تھا ٹرین کے چلنے کی وہی آواز تھی اور ان کے برابر میں وہ نرم مزاج خاتون بیٹھی تھیں ان کا جسم بخار سے پھنک رہا تھا ان میں اٹھنے کی ہمت نہیں تھی۔

''پا..... پا..... نی.....!'' ان کے منہ سے بامشکل آواز برآمد ہوئی تھی۔ خاتون نے فوراً ان کی طرف دیکھا تھا۔

''کیا ہوا بیٹی تمہیں پیاس لگی ہے مگر ہمارے پاس پانی ختم ہوچکا ہے۔'' خاتون نے مایوس لہجے میں مطلع کرتے ہوئے دائیں بائیں دیکھا تھا پانی کے حصول کی تلاش میں وہ برابر کی سیٹ کے مسافر کو دیکھنے لگی تھیں مگر پانی کسی کے پاس نہ تھا خاتون نے خالی بوتل کا ڈھکن کھول کر عین کا سر اٹھایا تھا اور خالی بوتل کا منہ ان کے لبوں سے لگایا تھا عین کے جلتے لبوں پر بوتل کی سطح پر موجود رکے ٹھہرے چند قطرے ان کی خشک زبان کو چھو کر تر کر گئے تھے انہیں جیسے بے حد راحت ملی تھی وہ مشکور سی ان خاتون کی سمت دیکھنے لگی تھیں۔

''شکریہ، آپ نے اس سفر میں بہت ساتھ دیا خالہ جان۔'' عین نے نقاہت بھری آواز میں کہا تھا۔

''تمہیں تو بہت تیز بخار ہے بیٹی اس سفر میں اب اس کا کیا سدباب کریں ایک تو آپ بیمار ہیں اور دوسرے پانی بھی نہیں میں ٹرین میں موجود دوسرے مسافروں سے پوچھتی ہوں اگر کسی کے پاس سے پانی برآمد ہوتا ہے۔'' خاتون کہہ کر اٹھی تھیں اور آگے بڑھنے کو تھیں جب عین نے ان کا ہاتھ تھام لیا تھا خاتون نے پلٹ کر دیکھا تھا عین نے آہستگی سے سر نفی میں ہلایا تھا اور ان کو دوبارہ بیٹھنے کا اشارہ کرتی ہوئی بولی تھیں۔

''اس کی ضرورت نہیں ہے خالہ جان برائے کرم آپ زحمت نہ کریں۔'' لیکن بیٹی تمہارا جسم تیز بخار سے تپ رہا ہے کہیں سے پانی دستیاب ہو تو آپ کی پیشانی کی پٹیاں بھی کر سکوں گی بخار کی تاثیر کسی قدر کم ہوگی اب آپ کو سفر میں اس طرح بیمار تو نہیں چھوڑا جا سکتا بخار سر کو آجاتا ہے اپ کا جسم جیسے جل رہا ہے ہمیں آپ کی فکر ہو رہی ہے۔'' خاتون نے ان کا خیال کر کے کہا تھا۔

عین نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے انہیں بیٹھنے کا اشارہ کیا تھا وہ ناچار بیٹھ گئی تھیں اور عین کا سر اپنی گود میں رکھ کر اسے دبانے لگی تھیں عین آنکھیں موند گئی تھی اور اس کی آنکھوں سے آنسو ٹوٹ کر اس کے بارے میں جذب ہوگئے تھے۔

''اماں جان کی یاد دلا دی آپ نے خالہ جان ہم نے ضرور کوئی نیکی کی ہوگی جس کے عوض سفر میں آپ جس محبت کرنے والی ہستی مل گئی۔''

عین نے ان کی اچھائی کا اعتراف کیا تھا۔

''بیٹی میں ماں ہوں اور تمام مائیں ایسی ہی ہوتی ہیں ماؤں کے چہرے بدلتے ہیں دل نہیں جس ماں کو بھی دیکھو گی اس کا دل اس قدر موم پاؤ گی۔'' خاتون نے کہا تھا عین ان کو آنکھیں کھول کر دیکھنے لگی تھی ان کا چہرہ ہو بہو اماں جان جیسا لگا تھا دل میں ایک راحت اترنے لگی تھی۔

''اماں جان۔'' عین نے پکارا تھا ان کا لہجہ بے چین تھا۔

خاتون نے انہیں چونک کر دیکھا تھا عین ہاتھ بڑھا کر ان خاتون کا چہرہ چھونے لگی تھیں۔

''اماں جان بہت بہت محبت کرتے ہیں ہم آپ سے ہمارے ساتھ رہیے آپ کے بنا بہت ادھورا محسوس کرتے ہیں ابا جان اور آپ کے بنا جینے کی عادت نہیں ہے کبھی

ایک قدم بھی آپ کی اجازت اور ہمراہی کے بنا نہیں اٹھایا آپ ساتھ رہیے آپ کے آنچل کی خوشبو کو ہم محسوس کرنا چاہتے ہیں اس مامتا سے بھرے لمس کو محسوس کرنا چاہتے ہیں ہم آپ کی گود میں سر رکھ کر سونا چاہتے ہیں ہم اماں جان۔'' وہ بولی تھیں اور خاتون کو تشویش لاحق ہوئی تھی۔

''آپ کو بہت تیز بخار ہے اور وہی ہو رہا ہے جس کا میں اندیشہ تھا آپ کا بخار سر کو چڑھ رہا ہے کیا کریں ہم کیا مدباب کریں یا اللہ مدد فرما اس سفر میں کون مداوا بنے گا۔'' وہ فکرمندی سے اِدھر اُدھر مدد کے لیے دیکھنے لگی تھیں عین کو بہت تیز بخار تھا اور وہ اس تیز بخار میں بڑبڑاتے جا رہی تھیں۔

❁ .... ❁ .... ❁

برستی تیز بارش میں اچانک بجلی گرنے سے جو آگ بھڑکی تھی تو اردگرد کے لوگ بھاگ کر وہاں جمع ہونا شروع ہوگئے تھے۔

''یا اللہ سب سیاہ ہوگیا جل کر سب بھسم، بے شک اللہ انصاف کرنے والا ہے جو منظر دیکھ رہا تھا کانوں کو ہاتھ لگا رہا تھا۔

''میں وہاں دکان پر بیٹھا تھا سامنے میں نے دیکھا ایک لڑکی سرپٹ بھاگ رہی تھی اور ایک ہجوم اس کے پیچھے دوڑ رہا تھا، غالباً وہ بلوائی تھی اس لڑکی کا پیچھا کر رہے تھے اور دیکھیے خدا کی قدرت ہے یہ۔'' کسی نے ہجوم میں سے کہا تھا۔

''بے شک اللہ کی ذات انصاف کرنے والی ہے۔'' ایک بزرگ نے کہا تھا۔

''بے چاری معصوم بچی چلو اللہ نے بہترین سزا تجویز کی اللہ بہترین منصف ہے۔'' کسی بزرگ عورت نے کہا تھا۔

''اللہ کا انصاف ہے یہ بے شک اللہ کسی کے ساتھ ناحق نہیں کرتا اللہ کی لاٹھی بے آواز ہے۔'' کسی نے کہا تھا۔

''زمین پر کئی وجود جلی ہوئی لاشوں کی صورت پڑے تھے اچانک بجلی نے اس جگہ پر گر کر ان کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا اور پل میں سب راکھ تھا سیاہ جلی ہوئی لاشیں زمین پر ڈھیر تھیں یقیناً وہ بچی نیک تھی کسی نے دیکھا اسے۔'' کسی بزرگ نے کہا تھا اور ہر کوئی اپنے طور پر ہجوم میں خوش نما کو تلاشنے لگا تھا خوشنما جو ان آوازوں کو سن رہی تھی اس نے دوپٹے سے چہرے کو کپیٹا تھا اور آہستگی سے وہاں سے نکلنے لگی تھی۔

''بے شک اللہ اپنے نیک بندوں کی مدد فرماتا ہے۔'' کسی نے کہا تھا خوش نما نے آہستگی سے چلتے ہوئے اس ہجوم سے باہر کی راہ لی تھی اس کی دھڑکنوں میں ایک سکون کی لہر محسوس ہوئی تھی اس نے اپنے رب سے مدد چاہی تھی اور اس کے رب نے اس کی دعا سن کر بروقت مدد فرمائی تھی۔

خوش نما نے آسمان کی طرف دیکھا تھا اور دل ہی دل میں شکر کیا تھا اس کے وجود پر اگرچہ تھکن تھی مگر وہ چلتی ہوئی اس ہجوم سے دور نکلنے لگی تھی تیز بارش میں بھیگتی ہوئی وہ بہرحال اب اپنے حواسوں میں واپس آرہی تھی۔

قدرت کے انصاف پر اس کے اندر مطمئن اتر رہا تھا مگر وہ اپنی منزل نہیں جانتی تھی بے سمت چلتے ہوئے آگے بڑھ رہی تھی جب ایک خاتون نے اس کا بازو تھاما تھا وہ پلٹ کر حیرت سے دیکھنے لگی تھی، ایک بزرگ خاتون تھیں سفید لباس میں حلیم چہرے کے ساتھ اس نے خوشنما کو دیکھا تھا۔

''تم بچ گئی ہو اللہ نے تمہاری مدد کی ہے نا، اب کہاں جا رہی ہو؟'' ان بزرگ خاتون کی آواز نرم تھی اور لہجہ دھیما وہ چونکی تھی۔

''آپ کیسے جانتی ہیں کہ وہ میں تھی جس کی مدد اللہ نے کی۔'' خوش نما چونکی تھی۔

''میں یہاں سامنے رہتی ہوں میں کسی کام سے باہر نکلی تھی جب میں نے تمہیں سرپٹ بھاگتے دیکھا اور ان بلائیوں کو تمہارا پیچھا کرتے دیکھا اور پھر اچانک بجلی کڑکی اور تب خاک بن گیا میں تمہیں دور سے دیکھ رہی تھی۔'' بزرگ خاتون نے کہا تھا اور وہ حیران ہوئی تھی۔

''آپ سے کس نے کہا کہ وہ بلوائی تھے۔''

''تقسیم کے اعلان کو سن کر بلوائیوں کی جیسے عید ہوگئی ہے، پرائے مال اور بچیوں کی عزتوں پر ہاتھ ڈالنا اپنا حق سمجھ لیا ہے انہوں نے مگر اللہ کا انصاف دیکھ کر رونگٹے

کھڑے ہوتے ہیں۔'' ان بزرگ خاتون نے کہا تھا اور خوشنما نے اپنی کلائی پر ان کی مضبوط گرفت دیکھی تھی۔

''ہم بھی پاکستان جانے والے تھے مگر پھر ہم نے ارادہ بدل دیا تم اتنی تیز بارش میں اب کہاں جاؤں گی کوئی خاندان یا رشتے دار ہے تمہارا، کہیں انہوں نے تمہارے خاندان کو ختم تو نہیں کر دیا؟'' بزرگ خاتون نے پوچھا تھا وہ فوری طور پر کچھ نہیں بول پائی تھی اس کے چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے غالباً بزرگ عورت بہت کچھ جان گئی تھی تبھی نرمی سے بولی تھی۔

''اگر تم اعتبار کر سکتی ہو تو میں اپنے گھر کے دروازے تمہارے لیے کھولنے کو تیار ہوں تم میرے گھر قیام کر سکتی ہو میرے جاننے والے بہت سے خاندان پاکستان کی سر زمین کو روانہ ہو رہے ہیں۔ تم کہو تو میں ان سے تذکرہ کر کے تمہیں بھی بحفاظت ان کے ساتھ روانہ کر سکتی ہوں تم شکل وصورت سے بہت شریف گھر کی لگتی ہو میں نہیں چاہتی تم اس طرح اس طوفانی موسم میں در بدر بھٹکو جوان لڑکی کو خطرہ صرف بلوائیوں سے نہیں ہوتا عزت کے لٹیرے کم نہیں ہیں۔'' عورت نے اس نرمی سے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا تھا اور خوش نما کے لیے اس وقت ان کی مدد غنیمت تھی تبھی اس نے سر ہلا دیا تھا۔

بزرگ خاتون نے اسے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا تھا اور چلتے ہوئے آگے بڑھنے لگی تھی تب خوشنما ان کے پیچھے قدم اٹھانے لگی تھی۔

❀.....◈.....❀

''پورا گھر جل گیا اللہ کرے کچھ نہ بچے بلوائیوں کا۔'' بوا نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے افسوس کیا تھا فتح النساء نے خاموشی سے انہیں دیکھا تھا۔

''مجھے تو یہاں سے نکلنا ناممکن دکھائی دیتا ہے بیٹا، بلوائیوں کی پھیلائی ہوئی تباہی کو دیکھو مسلمانوں سے جانے کس جنم کا بدلا لے رہے ہیں ان پر برسوں حکمرانی کی تو کیا غلط کیا ان لوگوں کے اندر کس قدر نفرت ہے۔'' بوا نے کہا تھا تبھی فتح النساء بولی تھی۔

''نفرت کی کوئی حد نہیں ہوتی بوا نفرت بذات خود ایک الاؤ ہے جو جلا کر سب خاکستر کرتی جاتی ہے۔'' فتح النساء نے پر افسوس انداز میں کہا تھا گاڑی تیزی سے محل کی سمت بڑھ رہی تھی۔

''جلال نے ڈرائیور کو ہمیں محل لے جانے کا کیوں کہا جلال کہیں پاکستان جانے کا ارادہ تو نہیں باندھ رہے؟'' بوا نے کہا تھا فتح النساء نے سر نفی میں ہلایا تھا۔

''ہم نہیں جانتے کہ جلال پاکستان جانتا چاہتے ہیں کہ نہیں مگر ان کی موجودہ صورت حال کے بارے میں سنا تھا جیسے وہ چاروں سمت سے دشمنوں کے نرغے میں گھیرے جا رہے ہیں نواب چاچا کے بعد وہ بہت کمزور پڑ گئے ہیں۔'' فتح النساء نے کہا تھا۔

''نواب زادے جلال الدین کو ایسی صورتحال میں یقیناً آپ کی ضرورت زیادہ تھی مگر آپ ان سے خفا رہیں۔'' بوا نے جتایا تھا۔

''بعض زخم بھرنے میں دیر لگتی ہے بوا ان کے دیے گئے زخم گہرے تھے ان کو مندمل ہونے میں وقت درکار تھا احسانات ہیں کہ ہم رہ نہیں سکے۔'' فتح النساء بولی تھیں اور بوا نے سر ہلایا تھا۔

''آپس کی مخالفتیں جتنی بھی ہوں مگر جب کسی کو سب سے زیادہ ضرورت ہو تو کوئی مخالفت معنی نہیں رکھتی اس وقت جلال تنہا ہیں غم و درد سے نڈھال ہیں بلوائیوں نے جو ان کے خاندان کے ساتھ کیا وہی کم نہیں تھا کہ اب جب وہ یہاں رہنے کا قصد کر رہے تھے مخالفین نے ان کو پھنسانا شروع کر دیا۔'' بوا نے افسوس کیا تھا۔

''فتح النساء جو بھی ہے مخالفت چاہے کتنی بھی ہو وہ آپ کے شوہر ہیں اور غلط فہمیاں رشتوں میں واقع ہو جاتی ہیں مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ ان غلط فہمیوں کو لے کر رشتوں میں اتنی طویل دیواریں اٹھا دی جائیں کہ رشتے ان کے نیچے کہیں دب جائیں رشتوں کو دفن کرنا سب سے بڑی حماقت ہے فتح النساء آپ ایک عقلمند لڑکی ہیں اور آپ سے یہ توقع نہیں کی کہ آپ ایسی بے وقوفی کا مظاہر کریں گی آپ کی پرورش اور تربیت ایسی نہیں ہوئی۔'' بوا نے انہیں ڈپٹا تھا اور فتح النساء نے سر ہلایا تھا۔

''ہم جانتے ہیں بوا اس لیے ہم جلال کی سمت پیش قدمی کر رہے ہیں۔'' بوا نے سر ہلایا تھا۔

''یہ بہترین فیصلہ تھا فتح مجھے اچھا لگا تم نے بروقت ایک اچھا فیصلہ لیا۔'' بوا نے کہا تھا اور اس نے خاموشی سادھ لی تھی۔

❀.....◉.....❀

حکمت صاحب نے جلال کے شانے پر ہاتھ رکھا تھا۔

''آپ فکر کیوں کرتے ہیں نواب زادے، ہم آپ کے ساتھ ہیں نا، آپ کو کسی مشکل میں پڑنے نہیں دیں گے ہم نے اپنے اثر و رسوخ استعمال شروع کر دیے ہیں آپ کے تمام ضروری کاغذات تیار ہو جائیں گے اور آپ کو اس جائیداد سے کوئی دستبردار نہیں کرپائے گا مگر آپ کو بھی ہماری ایک بات ماننا ہوگی۔'' حکمت صاحب نے کہا تھا تو جلال نے چونکتے ہوئے ان کی طرف دیکھا تھا۔

''کیا چچا جان کہنا کیا چاہتے ہیں آپ؟'' جلال چہرے سے بہت متفکر لگ رہے تھے۔

''آپ کانگریس میں شمولیت اختیار کر لیجیے کبھی کبھی دشمن سے نمٹنے کے لیے اس کا ہتھیار اٹھانا پڑتا ہے ہم جانتے ہیں آپ نواب صاحب کی روح کو تکلیف پہنچانا نہیں چاہتے وہ پاکستان کے لیے ایک خاص توقیر رکھتے تھے مگر اب جب نواب صاحب نہیں رہے تو ان کی یادوں اور املاک کو بچانا ضروری ہے اس طرح اگر یہ لوگ اپنے مقصد میں پورے ہو گئے تو آپ کو خالی ہاتھ ذلیل خوار ہونا پڑے گا اور یہ آپ کا پاکستان جانے کا ارادہ بھی ملیا میٹ کر دیں گے آپ کو اس ناکامی سے بچنے کے لیے ان کا لبادہ اوڑھنا ہوگا اس وقت کی مصلحت یہی ہے کہ آپ اس راہ پر چلیں نواب صاحب کی اور جگ ہنسائی مت ہونے دیں ان کا سر فخر سے بلند تھا اور وہ سربلندی ہی رہنا ضروری ہے انسان باقی نہیں رہتا مگر جب انسان کی باقیات اہم ہونے لگیں تو قول سے منحرف ہونا پڑتا ہے یہ وقتی ہے اس کمزوری کو طاقت میں بدلنے کے لیے یہ اقدام کرنا ہوگا آپ کے پاس طاقت ہوگی تو آپ بہت سی مشکلات کا حل تلاش سکیں گے آپ کو اپنے فیصلوں پر نظر ثانی کرنا پڑے گی جلال، ہم آپ کے ساتھ کھڑے ہیں مگر ہم بھی اگر نہ رہے تو؟ دشمن کا کچھ پتا نہیں الگی چال کیا چل دے میرے بچے ہم آپ کو محفوظ دیکھنے کے خواہش ہیں۔'' حکمت صاحب نے کہا تھا اور جلال اس کی سمت خاموشی سے دیکھنے لگے تھے تبھی حکمت صاحب بولے تھے۔

''آپ اچھی طرح سوچ لیں جلال مگر ہم آپ کے خیر خواہ ہیں اور آپ کو کسی خطرے میں نہیں دیکھ سکتے اس وقت کی ہماری پہلی ترجیح آپ کو محفوظ کرنا ہے ہم آپ کو کسی مشکل میں مزید پھنستا ہوا نہیں دیکھ سکیں گے آپ کا ایک فیصلہ ان تمام مخالفتوں کو ختم کر دے گا اور آپ کا ایک اعلان تمام زبانیں بند کر دے گا وہ آپ کو کمزور سمجھ کر حملہ آور ہونے کے درپے ہیں جب ان کو خبر ہوگی کہ آپ کمزور نہیں رہے تو وہ ڈر کر دم دبا کر بھاگ جائیں گے وہ کمزور ہیں ایسے ہی جیسے جنگل کے کمزور جانور جو شیر کو نڈھال اور کمزور دیکھ کر گھیر لیتے ہیں مگر وہی جنگل کا شیر جب دھارتا ہے تو تمام چھوٹے جانور اپنے بلوں میں جا گھستے ہیں۔'' حکمت صاحب کی باتوں میں کئی پہلو نکلتے تھے سو جلال کے لیے ان کی باتوں پر غور کرنا ضروری تھا مگر ان کے چہرے سے ظاہر نہیں تھا کہ وہ کیا فیصلہ لیں گے سو حکمت صاحب کو ان کی مزید فکر ہو رہی تھی مگر بہرحال وہ جلال کو اس کے لیے مجبور نہیں کر سکتے تھے سو وہ خاموش ہو گئے تھے۔

''ہم سوچ کر آپ کو مطلع کریں گے چچا جان۔'' ان کا ایک جملہ حکمت صاحب کو بڑی تسلی دے گیا تھا۔ ان کی فکر آدھی رہ گئی تھی۔

''ہمیں یقین ہے جلال آپ ایک مثبت فیصلہ کریں گے۔'' حکمت صاحب نے کہا تھا اور تبھی وہ مدھم لہجے میں گویا ہوا تھا۔

''چچا جان ہم نے فتح النساء کو یہاں بلوا لیا تھا وہ راستے میں ہوں گے ہم فکرمند ہیں کہ نہیں بلوائی یا مخالفین بھپر کر پھر کہیں اس محل پر حملہ آور نہ ہو جائیں کیا آپ فتح النساء کو اپنے ساتھ رکھنا سکیں گے۔'' جلال نے مدد چاہی تھی حکمت صاحب نے سر ہلایا تھا۔

''فتح النساء بہو نہیں بیٹی ہیں ہماری ہم انہیں ضرور اپنے گھر رکھنا چاہیں گے ہم تو مشورہ دیں گے آپ بھی ہماری طرف منتقل ہو جائیں مگر پھر خیال آیا کہ آپ کا اس محل میں موجود رہنا ضروری ہے مگر آپ کا فیصلہ جلد آنا چاہیے۔'' حکمت صاحب نے کہا تھا۔ جلال نے سر ہلایا تھا۔

''شکریہ چچا جان میں احسان مند رہوں گا۔'' فتح النساء کے متعلق جلال بہت فکر مند سو بولے تھے حکمت صاحب نے انہیں گھورا تھا۔

''ایسی باتیں کر کے پھر ایامت کریں جلال ایک طرف چچا جان بھی کہتے ہیں اور دوسری طرف شکریہ بھی کہتے ہیں چچا جان پر بہت مان ہوتا ہے جو کہنا ہے حق اور مان سے کہیے۔'' حکمت صاحب نے کہا تھا اور جلال نے سر ہلا دیا تھا۔

❀.....◈.....❀

مرزا سراج الدولہ ڈرنک کے سپ لیتے ہوئے مسکرائے تھے۔

''کھیل بہت دلچسپ ہو گیا ہے پیارے صاحب جلال کی صورتحال اتنی ہنگامہ خیزی لیے ہوئے ہے کہ ہم متجسس ہیں اگلا موڑ کہانی میں آیا تو کیا ہوگا؟ باپ کے سر پر بہت عیش کی اس نوجوان نے اب پتا چلے گا دنیا فتح کرنا آسان نہیں اپنے ہی محل میں خوفزدہ ہو رہے ہیں جب تک ہندوستان کی زمین پر سانس لیں گے ایک خوف سے جئیں گے محترم مخالفین نے ان کو چاروں سمت سے گھیر لیا ہے اور بے چارے پیچھے بیٹھے ہیں۔'' وہ ہنسے تھے پیارے صاحب نے ان کو دیکھا تھا۔

''آپ کی خوشی دیدنی ہے مرزا صاحب مگر اتنا مت بولیے نواب صاحب کے خاص دوست ان کے ساتھ ہیں اور وہ ان کو مشکلات میں زیادہ دیر پھنسے رہنے نہیں دیں گے۔'' پیارے صاحب مسکرائے تھے مرزا صاحب ہنسے تھے۔

''حکمت صاحب کیا کر لیں گے، نواب صاحب کے بعد ان کے اتنے اثر و رسوخ رہے نہیں اور جلال کو منہ کی کھانا پڑے گی ذلیل و خوار ہو کر اس کوچے سے نکلنا پڑے گا انہیں ساری نوابی دھری رہ جائے گی۔'' وہ مسکرائے تھے پیارے صاحب نے سر ہلایا تھا۔

''آپ کی ان کے خاندان سے رشتے داری اور گہرے مراسم تھے خبر نہیں تھی در پردہ آپ ان کے اتنے مخالف ہیں ہم کانگریسی تھے مگر نواب صاحب کی رعب دار شخصیت کی دل سے عزت کرتے تھے مرحوم واقعی بہت نیک انسان تھے۔'' پیارے صاحب نے سراہا تھا مرزا صاحب ڈرنک کے سپ لیتے ہوئے مسکرائے تھے۔

''عجیب ایک لطف آتا ہے اس خاندان کو مشکل میں دیکھ کر نواب صاحب کے ایک بھائی صاحب تھے جن کا رشتہ ہماری ہمشیرہ سے طے ہوا تھا نواب صاحب کے بھائی صاحب بہت عیاش تھے۔ ہر بری عادت ان میں تھی انہوں نے ہماری ہمشیرہ کو بہت تکلیفیں دیں اور بالآخر ہماری ہمشیرہ نے زہر کھا کر خودکشی کر لی نواب صاحب نے ان کی موت کو دبا دیا تھا اپنے بھائی صاحب کو بچانے کے لیے انہوں نے کہا اس خودکشی کی وجہ ان کے بھائی صاحب نہیں بعد میں ان بھائی صاحب کی موت ایک حادثے میں ہو گئی تھی جو برا کرنا ہے وہ دنیا میں اپنا بویا کاٹ کر جاتا ہے یہ نظام قدرت ہے۔'' وہ ہنسے تھے پیارے کو ان کی ذہنی کیفیت کا اندازہ ہوا تھا۔

''میں سمجھ سکتا ہوں مرزا صاحب مگر دشمنی کتنی طویل چل سکتی ہے، نواب صاحب کے بھائی صاحب کی حادثے میں موت واقع ہو گئی تھی اگر آپ سمجھتے ہیں کہ انہوں نے اپنا کیا بھگت لیا تو پھر کیا جواز ہوتا ہے اب دشمنی نبھانے کا؟'' پیارے صاحب نے افسوس ظاہر کیا تھا۔ مرزا صاحب مسکرائے تھے۔

''ہم نے کیا کہا ہم نے کچھ نہیں کیا پیارے صاحب مخالفین خود نوچ رہے ہیں انہیں ہم نے کب کو اقدام کیا۔'' وہ مسکرائے تھے اور پیارے مسکرا دیے تھے ان کی مسکراہٹ گہری تھی۔

''جانے دیجیے مرزا صاحب چہ میگوئیاں عام ہیں کہ نواب صاحب کے گھر پر حملہ آور ہونے کے لیے بھی آپ نے بلوائیوں کو اکسایا؟'' پیارے بولے تھے اور مرزا نے لبوں پر انگلی رکھ کر چپ رہنے کی تلقین کی تھی۔

''شش..... دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں میاں کیوں مروانا ہے ہم نے کچھ نہیں کیا۔'' وہ ہنسے تھے۔

''بلوائی خود پاگل ہو رہے تھے انہوں نے حملہ کرنا تھا سو کر دیا۔''

''ایسا نہیں ہوتا مرزا صاحب اگر بلوائیوں نے حملہ آور ہونا ہوتا تو آپ بھی موجود تھے اور کئی اور لوگ بھی بلوائی اتنی

...ی شخصیت کے گھر حملہ آور ہوئے نواب صاحب کوئی "دلی بندے نہیں تھے اس بات پر تو ایوانوں میں بحث ہوتی رہی ہے بہر حال یہ آپ کا اور نواب صاحب کا نجی معاملہ تھا ہم کون ہوتے ہیں بات کرنے والے نگران نوجوان کی حالت واقعی دگرگوں ہے ہمیں افسوس ہے ایسا عموماً ہوتا دکھائی نہیں دیا کہ کسی کو اپنی ہی جائیداد اور اثاثوں کے لیے خود کو اہل صاحب پڑے اتنی ریاستیں ہیں کتنے نوابوں نے اپنے علاقے اس طور سنبھال رکھے ہیں اس بے چارے نوجوان جلال الدین پٹوڈی کی ہی شامت کیوں آئی ہے اس پر بہت سے سوال اٹھ رہے ہیں۔" پیارے صاحب غیر جانبداری سے بولے تھے اور مرزا صاحب مسکرائے تھے، پھر سپ لیتے ہوئے بولے تھے۔

"مناسب ہے یا غیر مناسب اب جو صورت حال درپیش ہے اس سے نبرد آزما تو ہونا پڑے گا جلال میاں کو۔" نواب زادے کو بھی تو خبر ہونا چاہیے کہ زندہ رہنے کے لیے کتنے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔" وہ ہنسنے لگے تھے اور پیارے صاحب ان کو دیکھ کر رہ گئے تھے۔

❀ ... ❀ ... ❀

بزرگ خاتون کے دیے گئے کپڑے پہن کر وہ انگیٹھی کے پاس آن بیٹھی تھی بزرگ خاتون نے اسے قہوہ پیش کیا تھا۔

"آپ اکیلی رہتی ہیں اتنے بڑے گھر میں خوشنما نے پوچھا تھا۔

"ہاں بس میں ہی ہوں یہاں کبھی کبھی میرے جیٹھ کے بچے آجاتے ہیں تو گھر میں رونق ہو جاتی ہے، ورنہ یوں ہی سناٹا سا رہتا ہے۔" بزرگ خاتون نے کہا تھا تو خوشنما قہوے کے سپ لینے لگی تھی تبھی بزرگ خاتون نے پوچھا تھا۔

"تمہارے ساتھ کیا ہوا، بلوائیوں نے تمہارے خاندان کو مار دیا؟" بزرگ خاتون نے قیاس کیا تھا خوشنما کیوں کہ اپنی سچائی ان کو نہیں بتانا چاہتی تھی تبھی ان کے قیاس پر سر ہلایا تھا۔

"بلوائیوں کو خدا غرق کرے جانے کتنے گھر اجاڑ دیے یہ مذہبی تفریق جانے اور کتنے گھر اجاڑے گی خاندان کے خاندان پاکستان جانے کو بے قرار ہیں مگر یہاں یہ موئے ایک قیامت بپا کیے ہوتے ہیں۔" انہوں نے کوسا تھا خوشنما سر جھکائے قہوے کے سپ لیتی رہی تھی۔

"تم نے کیا سوچا ہے اکیلی پاکستان کیسے جاؤ گی میری مانو تو یہیں رہ جاؤ اکیلی ہو تو آگے جا کر کیسے سب کرو گی؟ یہاں ایسا ماحول ہو رہا ہے کہ اکیلی لڑکی گھر سے باہر نہیں نکل سکتی کہاں ملک سے باہر جانے کی بات ہے اور اس ملک کی سرزمین بھی فرشتوں سے تو آباد نہ ہوگی، انسان بہر حال انسان ہیں اور مرد کا نفس انتہائی برا ہے وہ اپنی خواہشات کو دبانا نہیں چاہتا جہاں موقع دیکھتا ہے منہ مار لیتا ہے تمام مرد ایک جیسے نہیں مگر کچھ ایسے بھی ہیں سو بیٹی میں مشورہ دوں گی اپنی حفاظت آپ کرو ممکن ہو تو پاکستان جانے کا ارادہ ترک کردو اکیلی ہو تمہارے لیے یہ ممکن نہیں ہوگا عورت کمزور ہوتی ہے سہارے کا ہونا ضروری ہے اب یہ مت سمجھنا کہ میں پرانے خیالات کی ہوں بیٹا خیالات پرانے نئے نہیں ہوتے معاشرہ وہی رہتا ہے اور ہم اسی معاشرے کا حصہ رہتے ہیں سو چاروں سمت سے آنکھیں کھول کر چلنا پڑتا ہے۔" خوشنما نے سر ہلایا تھا تبھی بزرگ خاتون بولی تھیں۔

"ماشاء اللہ بہت خوب صورت ہو اور شکل وصورت سے پڑھی لکھی بھی لگتی ہو زمانے کی اونچ نیچ تو معلوم ہی ہوگی تمہیں اللہ تمہارے نصیب اچھے کرے۔" بزرگ خاتون نے دل سے دعا دی تھی تبھی خوشنما بولی تھی۔

"آپ بھلے دل کی معلوم ہوتی ہیں میں احسان مند ہوں آپ نے مجھے اپنے گھر میں پناہ دی اور ٹھکانہ دیا اس مہمان نوازی کا شکریہ آپ کی سمجھ بوجھ یقیناً بہت زیادہ ہے اور زمانے کا تجربہ بھی میں آپ کی کی گئی نصیحتوں پر عمل کرنے کی کوشش کروں گی آج کل کوئی خیر خواہی نہیں کرتا کوئی راہ رہنمائی تو تیار نہیں ہوتا مجھے سمجھ نہیں آتا کس الفاظ میں آپ کا شکریہ ادا کروں۔" خوشنما ان بزرگ خاتون کی مشکور ہوئی تھی بزرگ خاتون خوشنما کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے نرمی سے مسکرائی تھیں۔

"نام کیا ہے تمہارا کہاں کی ہو؟"

"خوشنما، جی یہیں کی ہوں۔" وہ نہیں چاہتی تھی زیادہ جوابات دے کر مشکل میں پڑے سو اس نے قصداً خود کو اسی

علاقے کا ظاہر کیا تھا۔

''خدوخال اور لہجہ تو تمہارا لکھنو والا لگتا ہے رکھ رکھاؤ سے کسی امرا کی اولاد لگتی ہو۔'' وہ بزرگ خاتون بہت جہاندیدہ تھیں خوشنما چونک پڑی تھیں۔

''نن..... نہیں..... لکھنو تو کبھی نہیں گئے ہماری اماں وہ لکھنو سے تھیں۔'' اس نے بہانہ کیا تھا بزرگ خاتون مسکرا دی تھیں اور نرمی سے گویا ہوئی تھیں۔

''چلو..... جہاں کی بھی ہو خدا تمہیں ہر شر اور برائی سے محفوظ رکھے رات بہت ہوگئی ہے تم اب سو جاؤ میں نے ساتھ والے کمرے میں بستر لگا دیا ہے۔ میں خود تو صحن میں سوتی ہوں۔''

''آپ اتنے بڑے گھر کے ہوتے ہوئے صحن میں کیوں سوتی ہیں؟'' خوشنما نے پوچھا تھا خاتون مسکرا دی تھیں۔

''بیٹا کمروں میں سوتے ہیں جن کو سکون کی نیند سونا ہو اس عمر میں میں کیا سکون کی نیند چاہوں گی۔ اس عمر میں تو یوں بھی نیند کم ہی آتی ہے نوعمری میں خواب سونے نہیں دیتے اور بزرگ میں آگے کا خوف۔'' وہ بڑبڑاتی ہوئی اٹھ گئی تھیں خوشنما نے اٹھ کر دوسرے کمرے کی راہ لی تھی وہ بہت تھکی ہوئی تھی مگر رات گئے تک اسے نیند نہیں آئی تھی۔

وہ کروٹیں بدلتی رہی تھی ایک تو نئی جگہ ایک خوف جانے آگے کیا ہونا تھا وہ آگے کا لائحہ عمل اختیار کرنا چاہتی تھی مگر ذہن بہت خالی تھا۔

❀.....◈.....❀

جلال کے کافی کے سپ لیتے ہوئے ریسیو اٹھا کر کان سے لگایا تھا اور حکمت چاچا کا نمبر ملایا تھا۔

''کیا ہوا بیٹا، سب خیریت ہے؟'' حکمت چاچا جلال کی کال پر پریشان ہوگئے تھے۔

''سب خیریت ہے چچا جان ہم آپ کو اپنے فیصلے سے آگاہ کرنا چاہتے تھے۔'' وہ فیصلہ کن انداز میں بولے تھے اور حکمت چاچا نے تائید کی تھی۔

''ہمیں یقین ہے بیٹا آپ نے جو بھی فیصلہ لیا ہے وہ بروقت ہے اور بہترین ہے۔'' حکمت چاچا نے کہا تھا اور تبھی وہ بولے تھے۔

''ہم کانگریس میں شمولیت اختیار کرنے کے لیے تیار ہیں۔'' وہ مضبوط لہجے میں بولے تھے۔

''ہمیں خوشی ہے بیٹا آپ نے اہم فیصلہ لیا جو اس وقت کی ضرورت تھا۔'' حکمت چاچا بولے تھے۔

''آپ تمام ضروری دستاویزات تیار کروا دیں اور ساتھ ہی کانگریس میں ہماری راہ ہموار کریں ہم نہیں جانتے اس مصلحت کی راہ کو چننے کے لیے اللہ ہمیں معاف کرے گا کہ نہیں یا ابا جان کی روح ہمیں بخشے گی کہ نہیں مگر ہمیں اپنے ابا کی املاک اور اثاثے بچانے ہیں۔ جو ہمارے اباؤ اجداد کی نشانیاں ہیں ابا کا سر فخر سے اٹھانا چاہتے ہیں ہم اس کے لیے چاہے ہمیں کانگریس کا حصہ بننا پڑے یا جو بھی۔'' وہ مضبوط لہجے میں بولے تھے دوسری طرف سے حکمت چاچا گویا ہوئے تھے۔

''اس بارے میں فکر مت کرو جلال آپ نے بہترین فیصلہ لیا ہے میں نے وکیل سے بات کرلی تھی آپ کی جائیداد کے تمام کاغذات تیار ہو جائیں گے اور کانگریس میں آپ کی شمولیت کا معاملہ بھی طے پا جائے گا ہم موجود ہیں آپ فکر نہ کریں۔'' حکمت صاحب نے کہا تھا۔

''فتح النساء کیسں ہیں خیریت سے ہیں ہم نے سنا ان کی حویلی پر بلوائیوں نے حملہ کیا تھا ہماری ان سے بات نہیں ہوئی۔'' جلال نے پوچھا تھا۔

''فتح بیٹی خیریت سے ہیں ان کے بارے میں فکر نہ کریں بوا کچھ زخمی ہوئی تھیں ان کا علاج معالجہ کرا دیا ہے آپ اپنے آپ کو اس ذہنی دباؤ میں مبتلا نہ کریں۔'' حکمت چاچا نے مشورہ دیا تھا۔

''ہم فون رکھتے ہیں شام میں ملتے ہیں آپ سے۔'' جلال نے کہا تھا اور ریسیور کریڈل پر رکھ کر محل سے باہر نکلنے لگے تھے۔

❀.....◈.....❀

ہنستے ہنستے درختوں کے اداس پرندے
ہجرت باندھ کر قدموں سے جو گھر سے نکلے
تو سفر کی دھوپ سے پر جلنے لگے
راکھ ہونے لگے آنکھوں کے خواب سبھی
کتنے موسم سے جو گھر کے بند کمروں میں

چھوڑ آئے دن
کتنے وعدے تھے جو بند آنکھوں میں
دفن کر آئے
کتنے آنسو تھے جو دل میں چھپا رکھے ہیں
کتنے شعلے ہیں جو سینے میں دبا رکھے ہیں
جل رہے ہیں کفن بے خواب پرندوں کے
کہ چھوڑ آئے تھے وہ کھلے گھر سمیت مکینوں کے
رشتے باقی تھے وہاں کتنے یاد بھی نہیں
کتنے اپنے تھے اور اب لہجے بھی یاد نہیں
وہ سرسبز شاخیں
وہ سرسبز لہلاتے ہوئے کھیت
وہ اپنے گھر کی سونے کی دوپہریں
وہ کھیلتے بچوں کے صحن
اپنے گھر میں کوئی لوگ تھے دعائیں تھیں
وہ ضعیف ہاتھ جو شفقت سے بھرے
کانپتے ہوئے سر پر رکھے جاتے تھے جو سکون ملتا تھا
ان کو دعاؤں کو چھوڑ آئے ہیں
وہ سبز شاخ کے پرندے اپنے پیچھے
اونچی شاخوں پر جھولتے خواب بھول آئے ہیں
بے سوچے سمجھے راستوں کو چلنے والے
اپنے پیچھے کیا کیا چھوڑ آئے ہیں
ہجرتوں کے مسافر بے سمت چلتے ہوئے
اپنے پیچھے زمانے چھوڑ آئے ہیں
ہنستے بستے درختوں کے پرندے اداس ہیں
ہجرت باندھ کر قدموں سے گھر سے نکلے تھے
اور اب اڑتے اڑتے تھک گئے ہیں
تمازتیں سہہ کر بڑھتی جاتی ہیں
اور پر جو اڑنے کو پر جوش تھے اب جلتے جاتے ہیں
ہنستے بستے درختوں کے اداس پرندے
چہچہانا بھول گئے ہیں

عین نے تپتے وجود کے ساتھ بہت زور سے پکارا تھا۔
''اماں.....! مجھے اپنی آغوش میں لے لو، ابا جان کہاں ہیں آپ قریب آئیے آپ کی عین تنہا ہے اسے آپ کی ضرورت ہے۔'' وہ بے قرار ہو رہی تھی خاتون نے بے چین ہو کر اسے دیکھا تھا اور پھر اٹھ کر ڈبے میں موجود ہر فرد سے اس کے لیے پانی مانگنے لگی تھیں۔
''اللہ کے واسطے کوئی پانی دے دے اس بچی کا جسم بخار سے پھنک رہا ہے کوئی پانی دے دے۔'' وہ خاتون منت کر رہی تھیں عین کی حالت غیر تھی وہ آنکھیں میچیں پکارے جا رہی تھیں۔
''ابا جان، پاس آئیے ہمارے قریب بیٹھیے ہمارے سر پر اپنا دست شفقت رکھیے ہاں وہ لوری سنا دیجیے اچھا وہ نہیں تو وہ کہانی سنا دیجیے وہ بہادر شہزادی والی اپ کی عین بہت بے ہمت ہو رہی ہے۔'' اس کی بند آنکھوں کے کناروں سے آنسو بہہ رہے تھے اس کے برابر بیٹھی اس نوجوان دوشیزہ نے اسے سنبھالنا چاہا تھا مگر اس نے ہاتھ جھٹک دیا تھا۔
''اماں جان آپ کی آواز کیوں سنائی نہیں دیتی کوئی ڈانٹ کوئی میٹھی بات آپ کا لہجہ پرسکوت کیوں ہے اماں جان؟ میں آپ کی آواز ڈھونڈتے ڈھونڈتے تھکنے کیوں لگی ہوں؟'' اس نے تھک کر آنکھیں کھولی تھیں، سامنے شہاب کھڑا دکھائی دیا تھا اور وہ خوف سے ساکت نظروں سے ان کو دیکھنے لگی تھیں۔
''تم..... تم..... یہاں کیسے..... تم تو.....!'' عین نے بامشکل اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی تھی اس کا لہجہ خوف سے بھر گیا تھا۔
''ایسے کیا دیکھ رہے ہو ہمیں ہم آپ کی پول کھول دیں گے پورے ڈبے کو بتا دیں گے چلے جائیں یہاں سے ورنہ۔'' عین نے اسے دھمکانا چاہا تھا مگر شہاب چلتے ہوئے آگے بڑھنے لگا تھا عین اور زیادہ خوف زدہ ہو گئی تھی۔
''یہ مت سمجھو کہ ہم آپ سے خوفزدہ ہیں یا خوفزدہ ہو جائیں گے ہم آپ سے ڈرنے والے نہیں۔'' وہ مضبوط لہجے میں بولی تھی مگر اس کا پورا وجود کانپ رہا تھا اور اس سے محسوس کیا تھا وہ پسینے سے شرابور تھیں جب ان کی نظر تیمور پر پڑی تھی تیمور شہاب کے پیچھے آن رکا تھا اور عین حیرت سے اسے دیکھنے لگی تھی۔

(ان شاء اللہ باقی آئندہ ماہ)

سنہرے لوگ

محمد سلیم اختر

دنیا کی بھول بھلیوں میں بھٹکنے والی ایک معصوم روح کی روداد
اس کی زندگی میں اندھیرے اتر آئے تھے اور اس نے اندھیروں کو
مقدر سمجھ کر ان سے سمجھوتہ بھی کرلیا تھا۔

اپنے آپ سے لڑنے والی اک دوشیزہ کا فسانہ

ان دنوں میں ایف اے کررہی تھی۔ اکلوتی ہونے کی وجہ سے امی ابو مجھے بے حد پیار کرتے تھے' ابا جان ایک نیم سرکاری ادارے میں کام کرتے تھے..... مجھے بچپن ہی سے ڈاکٹر بننے کا شوق تھا۔ اسکول کے دنوں میں ایک مرتبہ میڈیکل کالج دیکھنے کا اتفاق ہوا..... وہاں لڑکیاں سفید سفید اجلے کوٹ پہنے اور گلے میں سیٹھی سکوپ ڈالے گھوم رہی تھیں۔ مجھے وہ بہت اچھی لگیں..... یہی وجہ تھی کہ کالج میں داخلہ لیتے وقت میں نے میڈیکل کے مضامین منتخب کیے۔ فرسٹ ایئر کا امتحان میں نے امتیازی نمبروں سے پاس کیا۔ ٹیچر کہتی تھیں کہ میں بورڈ کے امتحان میں پوزیشن لے کر کالج کا نام روشن کروں گی..... لیکن وقت بدلتے دیر نہیں لگتی..... یہ بادشاہوں کو گداؤں اور گداؤں کو بادشاہ بنادیتا ہے..... میرے امتحان سے چند ماہ قبل ابا جان بیمار پڑ گئے..... گھر میں امی کے سوا کوئی خبر گیری کرنے والا نہ تھا۔ ابا جان دو ماہ دفتر نہ جاسکے تو فرم نے نوکری سے جواب دے دیا تھا..... بیماری تھی کہ ختم ہونے کا نام ہی نہ لے رہی تھی..... اس کے ساتھ ہماری مالی حالت بھی پتلی ہوتی چلی گئی..... ادھر امتحان سر پہ تھا..... میں پڑھنے کی بہت کوشش کرتی..... مگر گھریلو پریشانیوں نے ذہن مفلوج کرکے رکھ دیا..... کچھ بھی پلے نہ پڑتا' بدقسمتی سے ہمارا کوئی قریبی عزیز بھی نہ تھا..... جو اس برے وقت میں ہمارا ساتھ دیتا..... نتیجہ یہ کہ گھر چلانے کی ذمہ داری امی پر آن پڑی..... امی بڑے دل گردے کی مالک تھیں..... ان کی تعلیم کچھ زیادہ نہ تھی لیکن سلائی کڑھائی کا کام بخوبی جانتی تھیں..... انہوں نے ایک سلائی اسکول میں ملازمت کرلی اور ہمیں دو وقت کی روٹی ملنے لگی..... میں نے کئی بار امی سے کہا کہ مجھے بھی ملازمت کی اجازت دے دیں مگر ہر بار انہوں نے سختی سے جھڑک دیا..... ابا جان فالج کے باعث ہلنے جلنے سے معذور تھے..... کالج سے آکر میں ان کی دیکھ بھال میں مصروف ہوجاتی' امی شام ڈھلے گھر لوٹتیں' تو انہیں کھانا تیار ملتا..... رات کو سب سوجاتے تو میں کتابیں لے کر بیٹھ جاتی اور بارہ ایک بجے تک پڑھتی رہتی..... میرا خیال تھا' ایف ایس سی کرنے کے بعد ملازمت کرلوں گی تاکہ امی کا بوجھ کم ہوسکے..... لیکن تقدیر کا لکھا کون مٹا سکتا ہے..... یہ میری دکھی زندگی میں ایک اور خطرناک موڑ آیا اور ایک حادثے نے میری زندگی اور بھی تلخ بنادی۔

☆

اس روز ابا جان کو قدرے افاقہ تھا اور امید تھی کہ وہ جلد صحت یاب ہوجائیں گے۔ صبح سویرے صحن میں انہیں چھڑی کے سہارے چلتا دیکھ کر میں بہت خوش ہوئی۔ کالج میں بھی سہیلیوں کو یہ خبر سنائی تو سب نے مبارک باد دی..... پیریڈ ختم ہونے پر کیمسٹری کا پریکٹیکل شروع ہوا..... میں بڑے انہماک سے تجربے میں مصروف تھی۔ اچانک ساتھ والی میز پر ایک دھماکا ہوا..... اسپرٹ لیمپ پھٹ گیا تھا۔ ایک لڑکی ڈر کر پیچھے ہٹی اور بے خبری میں

مجھ سے ٹکرا گئی..... میرے ہاتھ میں تیزاب کی بوتل تھی ..... دھکا لگنے سے میں فرش پر گر پڑی اور اس سے پہلے کہ بوتل سنبھالتی..... کھولتا ہوا تیزاب میرے چہرے پر اپنا کام کر گیا..... درد کی شدت سے میری چیخیں نکل گئیں..... سب سے زیادہ تکلیف آنکھوں میں تھی..... یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کسی نے آنکھوں میں دہکتے ہوئے انگارے بھر دیئے ہوں..... مجھے کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا..... دفعتاً پروفیسر کی آواز سنائی دی۔

''یہ روزی کو کیا ہوا؟'' یہ آخری الفاظ تھے جو میں سن سکی تھی..... اس کے بعد تکلیف کی شدت سے میں نیم پاگل ہوگئی اور اپنے بال نوچنے لگی۔ کسی نے میرے سر پر پانی کی بالٹی انڈیل دی۔ اگلے ہی ثانیے مجھ پر بے ہوشی طاری ہو چکی تھی۔

آنکھ کھلی تو خود کو اسپتال میں پایا۔ ڈاکٹر اور نرسیں مجھ پر جھکی ہوئی تھیں۔ میں نے اٹھنے کی کوشش کی مگر انہوں نے اشارے سے منع کر دیا..... جلد ہی میں دوبارہ بے ہوش ہوگئی۔ جانے کب تک میں بے ہوش رہی..... اوسان بحال ہوئے تو بائیں آنکھ اور ماتھے میں شدید درد کا احساس ہوا..... میں نے ہاتھ لگا کر دیکھا..... پتہ چلا کہ دائیں آنکھ کے سوا سارے چہرے پر پٹیاں بندھی ہوئی ہیں..... تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر کا مہربان اور شفیق چہرہ دکھائی دیا۔

''روزی! تم بہت خوش قسمت ہو..... بائیں آنکھ بال بال بچ گئی..... لڑکیوں نے عقل مندی سے کام لیا جو تمہارا چہرہ دھو ڈالا۔ اچھا یہ بتاؤ..... تکلیف تو نہیں ہو رہی؟''

''بائیں آنکھ میں درد ہو رہا ہے۔''

''چند روز تک ٹھیک ہو جاؤ گی۔ جہاں تک ہو سکے

خوش رہنے کی کوشش کرو..... خدا کا شکر ادا کرو کہ تم اس حادثے سے بچ نکلیں۔''

یہ کہہ کر ڈاکٹر مسکراتا ہوا آگے بڑھ گیا..... میں ایک بار پھر تفکرات کی دنیا میں گھر گئی..... گھر کی حالت جانے کیا ہوگی؟ ابا بے چارے یہاں نہیں آسکتے..... امی بھی مصروف ہوں گی' لڑکیاں امتحان کی تیاری کررہی ہوں گی اور میں اسپتال میں مجبور و بے بس پڑی ہوں۔ میں پڑھنا چاہتی تھی تاکہ امتحان کے بعد گھر کا بوجھ اٹھا سکوں..... مگر اس حادثے نے مجھے کہیں کا نہ چھوڑا' چہرے پر بندھی ہوئی پٹیوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ ابھی مجھے خاصے دن یہیں رہنا ہوگا..... میں نے داہنی آنکھ بند کرلی اور آنسوؤں کا سیلاب روکنے کی ناکام کوشش کرنے لگی۔

دن گزرتے چلے گئے ..... امی بے چاری ہر شام وقت نکال کر آتیں اور پاس بیٹھ کر تسلیاں دیتیں..... ایک بار ابا بھی آئے..... پڑوس کے دولڑکے انہیں سہارا دے کر لائے تھے..... مجھے آزردہ دیکھ کر بولے۔

''میری بچی ..... میں تمہارے غم سے واقف ہوں..... لیکن دنیا میں سکھی کون ہے ..... غم اور خوشی تو زندگی کے ساتھ ساتھ ہیں' کامیاب لوگ وہی ہیں جو مستقل مزاجی سے غم سہتے ہیں اور مستقبل سے مایوس نہیں ہوتے..... یاد رکھو اس ظالم آسمان کے اوپر ایک مہربان ہستی بھی ہے جو سب کچھ دیکھتی اور سنتی ہے..... اس کے ہاں دیر ہے..... اندھیر نہیں' وہ اپنے بندوں کا امتحان لیتی ہے..... میری طرف دیکھو..... آٹھ ماہ سے گھر میں اپاہج پڑا ہوں' جانتا ہوں میری وجہ سے تمہیں اور تمہاری امی کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑا' اس کے باوجود کبھی میری زبان پر حرف شکایت نہیں آیا..... حوصلہ رکھو..... دس پندرہ روز تک تم صحت یاب ہوجاؤ گی..... ابھی امتحان میں ڈیڑھ ماہ باقی ہے..... تم ایک مہینہ پڑھ کر بھی امتحان دے سکتی ہو۔''

ابو کی باتیں سن کر مجھے کچھ تسلی ہوئی۔ روز بروز میری تکلیف کم ہوتی جارہی تھی..... اسپتال میں رہتے ہوئے دو ہفتے گزر گئے تھے۔ ایک ڈاکٹر نیازی میرے پاس آئے اور بڑی شفقت سے بولے۔

''دیکھو بیٹی..... تمہیں کل اسپتال سے چھٹی مل جائے گی' میں آج تم سے چند ضروری باتیں کہنا چاہتا ہوں۔''

''فرمایئے۔'' میں نے ہمہ تن گوش ہوکر کہا..... بیماری کے دوران انہوں نے بڑی محبت سے میرا علاج کیا تھا..... اس لیے میرے دل میں ان کے لیے بدرجہ اتم احترام موجود تھا۔

''تم یہاں آئیں تو ہم سب تمہاری آنکھ کے بارے میں فکرمند تھے' اس لیے چہرے کی طرف زیادہ دھیان نہ دے سکے۔ تین دن بعد آنکھ کی طرف سے اطمینان ہوا تو پتہ چلا کہ چہرے پر گھاؤ پڑ گئے ہیں اور کنپٹی سے ٹھوڑی تک بایاں رخسار جل کر سیاہ ہوگیا ہے۔''

''آپ کا مطلب ہے میرے چہرے پر ہمیشہ گھاؤ رہیں گے؟'' میں نے جلدی سے کہا۔

جواب میں ڈاکٹر نے اثبات میں سر ہلایا۔

''ڈاکٹر صاحب! میں اپنی صورت دیکھنا چاہتی ہوں۔''

''سردست..... یہ بہت مشکل ہے' ایک دن اور انتظار کرلو..... کل صبح تمہارے چہرے کی پٹیاں کھول دی جائیں گی۔'' اس رات مجھے بڑے خوفناک خواب دکھائی دیئے..... کئی بار ڈر کر اٹھ کر بیٹھ گئی..... ایک بھیانک چڑیل قہقہے لگاتی ہوئی میرا تعاقب کررہی تھی..... غور سے دیکھا تو وہ چڑیل میں خود تھی..... اف میرے خدا! سارا بدن وحشت سے کانپ اٹھا۔ جوں توں کرکے رات کٹی۔ صبح ناشتے کے بعد دل ڈوبنے لگا..... وقت گزرنے کا نام نہ لے رہا تھا۔ زندگی میں پہلی بار پتہ چلا کہ انتظار کیسے کہتے ہیں۔ ڈاکٹر کو دس بجے آنا تھا۔ جب بھی دروازہ کھلتا میں اٹھ بیٹھتی..... میں نے ایک نرس سے کہہ کر اپنے سامان میں سے آئینہ نکلوالیا تھا۔ کئی بار چہرہ دیکھنے کی کوشش کی مگر سفید سفید پٹیوں کے سوا کچھ نظر نہ آیا..... آخر بہت سے قدموں کی چاپ سنائی دی..... شاید ڈاکٹر صاحب آگئے تھے ..... نرسوں کے تیز تیز بولنے کی آوازیں مریضوں کی دبی دبی سرگوشیاں..... ڈاکٹر صاحب باری باری ہر مریض کا حال پوچھ رہے تھے..... جانے میری باری کب آئے گی؟ میں نے آئینہ نکال کر

سامنے رکھ لیا تھا۔ مجھے زیادہ دیر انتظار نہ کرنا پڑا' ایک نرس نے قریب آ کر اٹھنے کا اشارہ کیا...... اور بولی۔ ''پٹی دوسرے کمرے میں کھلے گی۔''

میں اٹھ کر اس کے ساتھ ہولی۔ تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر بھی آ گئے۔ پٹیاں کھل رہی تھیں اور میرا اشتیاق بڑھ رہا تھا کہ ڈاکٹر نیازی کی آواز کان میں پڑی۔

''لو بیٹی...... اب تم گھر جا سکتی ہو۔''

''ڈاکٹر صاحب! میں آئینہ دیکھنا چاہتی ہوں''

''ضرور دیکھو...... مگر میری ایک بات غور سے سن لو...... زندگی اللہ کی دی ہوئی ایک نعمت ہے' ہمیں ہر حال میں قادر مطلق کا شکر گزار رہنا چاہیے...... ہمارے اردگرد بیسیوں لوگ ہیں جن کی آنکھیں نہیں ہیں' ہاتھ پاؤں بھی نہیں' یا وہ جسم کے کسی اور حصے سے محروم ہیں آخر وہ لوگ بھی تو زندگی بسر کر رہے ہیں...... اگر چہرے پر زخم کا نشان رہ گیا ہے تو کیا ہوا...... تمہیں دل چھوٹا نہیں کرنا چاہیے...... خوبصورتی انسان کے دل میں ہوتی ہے جسم میں نہیں...... دوسروں کے ساتھ خوش اخلاقی سے پیش آؤ گی تو کوئی یہ نہ کہے گا کہ تمہارے رخسار پر زخم کیسا ہے ......لیکن اگر تم خود ہی پژمردہ اور سوگوار رہیں تو ہر شخص تم سے کنی کترائے گا...... خواہ تم جسمانی طور پر کتنی ہی خوبصورت کیوں نہ بن جاؤ...... لو اب آئینہ دیکھ لو۔''

میں نے لرزتے ہاتھوں سے آئینہ اٹھایا اور آنکھوں کے سامنے کیا...... خوف کی ایک لہر میرے سارے بدن میں دوڑ گئی...... یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے مجھے بلندیوں سے انتہائی پستی میں دھکیل دیا ہو...... جی چاہا زور زور سے چلاؤں' سر پیٹوں اور بال نوچ ڈالوں' پیشانی سے تھوڑی تک بایاں رخسار بری طرح جل گیا تھا' جلد پر جا بجا گہرے گھاؤ تھے' بائیں کنپٹی پر ایسا زخم آیا تھا' جس نے آنکھ سے ملحق گوشت اپنی طرف کھینچ لیا تھا...... نتیجتاً بائیں آنکھ دائیں کی نسبت لمبی نظر آتی تھی۔ میں نے آئینہ فرش پر دے مارا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

☆

''روزی! دل میلا نہ کرو' تمہارا چہرہ آہستہ آہستہ ٹھیک ہو جائے گا۔ درحقیقت زخم ابھی پوری طرح نہیں بھرے۔''

''ڈاکٹر صاحب! یہ سب کچھ مجھ سے نہیں دیکھا جاتا' اپنے آپ سے ڈر لگ رہا ہے...... خدا کے لیے میرا چہرہ درست کر دیں' میں یہ منہ لے کر کہاں جاؤں' لوگ مجھ سے خوف کھائیں گے...... ایسی زندگی سے تو موت بہتر ہے۔''

''میں نے تمہیں پہلے بھی سمجھایا تھا کہ زندگی اللہ تعالیٰ کی امانت ہے' تمہیں ہر حال میں اس کی حفاظت کرنی چاہیے۔ ویسے تمہارے زخم لاعلاج نہیں ہیں ہمارے ہاں پلاسٹک سرجری پوری طرح متعارف نہیں یورپ اور امریکا میں یہ سرجری اپنے عروج پر ہے' اگر کسی طرح وہاں جا سکو تو تمہارا چہرہ درست ہو سکتا ہے مجھے علم ہے تمہارے والد صاحب فراش ہیں اور زیادہ اخراجات کے متحمل نہیں ہو سکتے' تمہیں کچھ عرصہ صبر سے کام لینا چاہیے جوں ہی گھر کے حالات بہتر ہوں' علاج کے لیے باہر چلی جانا۔''

ڈاکٹر صاحب نے میرا کندھا تھپتھپایا اور باہر نکل گئے۔

☆

میں بت بنی بیٹھی رہی ایک نرس نے ہاتھ سے پکڑ کر اٹھایا اور وارڈ میں لے آئی۔ وارڈ میں آ کر یوں محسوس ہوا کہ جیسے سب لوگ میری طرف دیکھ رہے ہیں...... میں نے چہرہ دوپٹے میں چھپا لیا اور جلدی جلدی چیزیں اکٹھی کرنے لگی۔ تھوڑی دیر بعد امی آ گئیں...... وہ مجھے حسب معمول تسلیاں دینے لگیں...... لیکن میرے ضبط کے بندھن ٹوٹ گئے اور میں اسپتال کے برآمدے میں ہی رونے لگی۔

گھر پہنچی تو ہر شے بدلی بدلی دکھائی دے رہی تھی۔ ماں کی محبت اور باپ کی شفقت بھی مجھے نہ آسودگی دے سکی۔ میں اندر ہی اندر خاموش چتا کی مانند جل رہی تھی۔ دوسروں کا سامنا کرنے سے گریزاں اور زندگی کی تمام خوشیوں سے دستبردار ہو چکی تھی۔ اسپتال سے لوٹنے پر امی نے بہت زور دیا کہ میں اگلے روز کالج جاؤں مگر میں نے کوئی جواب نہ دیا...... ایسا خوفناک چہرہ لے کر [illegible] جانے کی ہمت نہ پڑتی تھی...... اسپتال میں چند [illegible]یلیاں ملنے آئی تھیں لیکن اس وقت میرے چہرے [illegible]ٹیاں بندھی

ہوئی تھیں..... گھر پہنچ کر میں نے ارادہ مصمم کرلیا کہ اگر کوئی ملنے آیا تو صاف انکار کردوں گی..... پھر جلد ہی ایک ایسا واقعہ پیش آ گیا جس نے ایک بار پھر میری روح کو زخمی اور بے چین کردیا۔

اس شام میں حسب معمول اپنے کمرے میں کھڑی کے پاس کرسی ڈالے بیٹھی تھی' کمرہ دوسری منزل پر تھا اور کھڑکی میں سے سڑک کا منظر دکھائی دیتا تھا..... سڑک پر خوب چہل پہل تھی۔ میں اپنے خیالات میں گم تھی کہ اچانک کمرے کا دروازہ کھلا اور میری چند سہیلیاں اندر آ گئیں..... میں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا مسخ چہرہ چھپانے کی کوشش کی مگر وہ سب کچھ دیکھ چکی تھیں۔

''روزی! یہ تمہیں کیا ہوا؟'' وہ یک زبان ہو کر بولیں۔

میں خوف اور شرم کے مارے زمین میں گڑ گئی۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ انہیں کیا جواب دوں۔ وہ بار بار میری طرف دیکھ رہی تھیں۔

''اب درد تو نہیں ہوتا؟''

''نہیں۔'' میں نے آنسو ضبط کرتے ہوئے کہا۔

''ذرا ہاتھ اوپر اٹھانا۔''

بادل نخواستہ مجھے چہرہ کھولنا پڑا۔

''چچ چچ..... یہ تو بہت برا ہوا تمہارا چہرہ تو دیکھا نہیں جاتا۔''

میں نے لپک کر دوپٹہ اٹھایا اور منہ چھپا کر رونے لگی۔ کچھ دیر وہ خاموش رہیں پھر کالج کی باتیں کرنے لگیں۔ انہوں نے مجھے بھی باتوں میں شریک کرنا چاہا لیکن میں کوشش کے باوجود کوئی بات نہ کرسکی۔ سورج غروب ہونے کو تھا اس لیے وہ زیادہ دیر نہ ٹھہر سکیں..... جاتے جاتے راحیلہ بولی۔

''روزی..... کالج آؤ گی نا؟''

میں نے جواب دینا مناسب نہ سمجھا۔ انہوں نے بھی اٹھنے کی زحمت گوارہ نہ کی اور تیزی سے سیڑھیاں اترنے لگیں۔ اچانک سعدیہ کی آواز سنائی دی۔

''تم لوگ بھی بڑی بدھو ہو..... بھلا اس مسخ شدہ چہرے کے ساتھ وہ کالج کیسے آسکتی ہے..... اف میرے خدا' بالکل چڑیل لگتی ہے' مجھے تو اسے دیکھ کر خوف ہی آ گیا تھا۔''

میں نے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں اور بستر پر اوندھے منہ گر پڑی۔

☆

ایک ماہ گزر گیا..... میں نے گھر سے باہر قدم تک نہ رکھا..... صبح سے شام تک کمرے کے دروازے بند کرکے بیٹھی رہتی' امی سلائی کے اسکول سے واپس آ کر کھانا تیار کرتیں تو میں دو چار لقمے زہر مار کرلیتی..... کبھی کبھی ابا مجھے اپنے پاس بلاتے اور حوصلے سے کام لینے کی نصیحت کرتے..... لیکن مجھ پر کسی بات کا اثر نہ ہوتا..... میں نے اپنی سب تصویریں دیواروں سے اتار کر ٹرنک میں بند کردیں' ہنستی کھیلتی' جیتی جاگتی تصویریں دیکھ کر میرا دکھ تازہ ہوجاتا تھا۔ میں دنیا سے کٹ کر رہ گئی تھی۔ مگر ڈاکٹر نیازی نے ایک بار پھر مجھے لوگوں کے سامنے آنے پر مجبور کردیا..... ایک شام امی گھر لوٹیں تو ڈاکٹر نیازی ان کے ہمراہ تھے..... میرے کمرے میں آتے ہی بولے۔

''روزی! سنا ہے تم کالج نہیں جاتیں''

میں نے کوئی جواب نہ دیا..... امی ان کے لیے چائے بنانے باورچی خانے میں چلی گئیں۔

''بیٹی! میں نے تمہیں پہلے بھی کہا تھا کہ اپنے آپ کو سزا نہ دو..... تمہاری امی سے معلوم ہوا ہے کہ تم ہر وقت گھر میں پڑی رہتی ہو۔ یہ صورت حال تشویش ناک ہے اس طرح تمہاری صحت مزید خراب ہوجائے گی..... میں چاہتا ہوں تم کمرے سے باہر نکلو اور گھومو پھرو..... اپنے چہرے کا داغ چھپانے کے بجائے حقیقت کا سامنا کرو..... کالج جانے کے لیے تم تیار نہیں..... ہم نے بہت سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا ہے کہ تمہیں ملازمت کرلینی چاہیے۔''

''یہ..... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں ڈاکٹر صاحب؟''

''میں ٹھیک کہہ رہا ہوں ہم تمہاری ملازمت کی بات کرچکے ہیں۔ عادل صاحب میرے دوستوں میں سے ہیں..... بہت شریف اور نیک آدمی ہیں۔ گزشتہ سال ان کی بیگم کا انتقال ہوگیا تھا..... بچوں کی نگہداشت کے لیے

ا مت نہیں...... خود عادل صاحب بہت مصروف
ا صبح دفتر جاتے ہیں اور رات گئے گھر لوٹتے
ہاورچی اور بوڑھے مالی کے سوا اور کوئی نہیں ہے
نہیں...... تم کل صبح وہاں پہنچ جانا میں عادل صاحب
ے تمہارے آنے کی اطلاع کردوں گا۔''
''یان میں ملازمت نہیں کرنا چاہتی۔''
''دیکھو بیٹی! تمہارے ابا بیمار ہیں اور امی دن بھر سلائی
ملول میں سر کھپاتی ہیں...... ایک تم ہو کہ صبح سے شام
کمرے میں پڑی رہتی ہو...... تمہاری امی عمر کی اس
ل میں ہیں جہاں انسان کو آرام کی ضرورت ہوتی ہے'
تمہارا فرض نہیں کہ روز افزوں اخراجات میں ماں
ہاتھ بٹاؤ۔''
''مگر...... مگر باہر کیسے نکل سکتی ہوں' ڈاکٹر صاحب؟
چہرہ۔''
''وہاں زیادہ لوگ نہیں ہیں۔''
طوعاً و کرہاً وعدہ کرلیا کہ میں مقررہ وقت پر عادل
صاحب کے ہاں پہنچ جاؤں گی...... لیکن جوں ہی ڈاکٹر
صاحب کمرے سے نکلے میں نے اندر سے چٹخنی لگالی۔ صبح
ملول جانے سے پہلے امی نے کئی بار دروازہ کھٹکھٹایا'
ن میں زور زور سے رونے لگی اور دروازہ نہیں کھولا......
ر وہ مایوس ہوکر چلی گئیں...... پانچ چھ دن گزر گئے' ایک
ن امی اسکول سے آئیں تو ان کا چہرہ اترا ہوا تھا' میں نے
پوچھی تو انہوں نے ایک کاغذ میرے سامنے رکھ
...... میرے پاؤں تلے سے زمین کھسک گئی' امی
اسکول سے برطرفی کا نوٹس مل گیا تھا۔
اگلے روز میں نے بڑے سے مفلر سے چہرہ چھپایا اور
ں سے پتا پوچھ کر عادل صاحب کے ہاں پہنچ گئی۔ کوٹھی
ں داخل ہوتے ہی ایک چوکیدار دکھائی دیا...... میں نے
ے اپنا نام بتایا' وہ مجھے ڈرائنگ روم میں بٹھا کر اندر
ا گیا...... تھوڑی دیر بعد عادل صاحب کمرے میں داخل
ئے' پچاس سال کے لگ بھگ عمر' سنہری فریم کی عینک
ئے سر کے بال کھچڑی' گفتگو میں نرمی اور شائستگی......
ی شفقت سے ملے' میں نے چہرہ اسی طرح چھپا رکھا تھا
لہ صرف آنکھیں نظر آتی تھیں...... ڈر تھا کہیں وہ چہرہ

AANCHALPK.COM
تازہ شمارہ شائع ہوگیا ھے
آج ہی قریبی بک اسٹال سے طلب فرمائیں
ماہنامہ آنچل کراچی
ملک کی مشہور معروف قلمکاروں کے سلسلے وار ناول'
ناولٹ اور افسانوں سے آراستہ ایک مکمل جریدہ
گھر بھر کی دلچسپی صرف ایک ہی رسالے میں ہے
جو آپ کی آسودگی کا باعث ہوسکتا ہے اور وہ ہے اور
صرف آنچل۔ آج ہی اپنی کاپی بک کرالیں۔
چاہت و محبت کے موضوع پر لکھی ایسی دلکش تحریر
جو آپ کی دل کی دنیا میں جل تھل کردے
معاشرے کے تلخ حقائق کی عکاسی کرتا فاخرہ گل کا ناول
جو آپ پر بہت سی حقیقتیں آشکار کردے گا
خاندانی اختلافات و جھگڑوں کے پس منظر میں لکھا اقرأ صغیر کا
بہترین ناول جو آپ کی سوچ کو ایک نیا رخ عطا کردے
AANCHALNOVEL.COM
پرچہ نہ ملنے کی صورت میں رجوع کریں (021-35620771/2

چھپانے کی وجہ نہ پوچھ لیں..... مگر انہوں نے کچھ نہ کہا۔

''ڈاکٹر نیازی نے آپ کی بہت تعریف کی ہے..... بچے ناشتہ کر رہے ہیں' ابھی حاضر ہوتے ہیں۔''

عادل صاحب کی دو بچیاں تھیں..... ایک پانچ سال کی اور دوسری سات برس کی..... ایک دس سالہ بیٹا بھی تھا..... بڑے ہی خوبصورت بچے تھے' عادل صاحب چھوٹی بچی میرے سپرد کرتے ہوئے بولے۔

''آپ میری بیٹی کے برابر ہیں..... بچوں کا بڑی بہن کی طرح خیال رکھیں گی تو جلد آپ سے گھل مل جائیں گے۔ کوئی دقت پیش آئے تو مجھے فون کر دینا..... لیجیے سنبھالیے انہیں..... مجھے اب دفتر جانا ہے۔''

کچھ دیر تو بچے جھجکتے رہے' پھر مجھ سے مانوس ہو گئے..... اس ڈر سے کہ کہیں وہ میرا چہرہ نہ دیکھ لیں' میں نے ابھی تک مفلر نہیں اتارا تھا۔ سب سے پہلے بڑے بچے نے محسوس کیا اور بڑی معصومیت سے بولا۔

''آپ کو زکام لگا ہے کیا؟''

میں نے جواب میں صرف مسکرانے پر اکتفا کیا۔

''میرے پاس زکام کی بڑی اچھی دوا ہے۔ آپ کہیں تو لاؤں؟''

''لاؤ۔'' میں نے اثبات میں سر کو جنبش دی۔

وہ جلد ہی سفید سفید گولیاں لے آیا۔ میں نے اس کا دل رکھنے کے لیے ایک گولی منہ میں ڈال لی۔ دوپہر سے پہلے بچوں کے کپڑے تبدیل کروائے..... باورچی خانی کی نگرانی کی اور پھر تینوں کو پڑھانے بیٹھ گئی..... پڑھتے پڑھتے اچانک چھوٹی بچی رونے لگی..... شاید اس کی بڑی بہن نے چٹکی لی تھی..... میں نے اسے گود میں لے لیا..... اچانک اس نے ایک ہاتھ مارا اور میرا مفلر زمین پر آ رہا..... میں گھبرا کر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی اور بچی کو کرسی پر بٹھا دیا..... تینوں بچے بڑے غور سے میری طرف دیکھ رہے تھے..... چند لمحے خاموشی رہی..... پھر بڑی بچی بولی۔

''باجی! آپ کو یہ چوٹ کیسے لگی؟''

اس سوال کا جواب دینا میرے لیے ممکن نہ تھا..... میری آنکھوں میں آنسو آ گئے بڑے لڑکے نے میرے قریب آ کر پوچھا۔

''آپ کے زخموں میں درد تو نہیں ہوتا؟''

''نہیں۔''

''ایک منٹ انتظار کریں میں ابھی امی کی الماری سے مرہم لے کر آتا ہوں۔''

میں نے مرہم لگایا دوبارہ پڑھانے لگی۔ بچوں نے میرے چہرے کے زخم قبول کر لیے تھے..... انہوں نے اس پر زیادہ توجہ نہ دی۔ مصروفیت کی وجہ سے میں کچھ دیر کے لیے سارے دکھ درد بھول گئی..... شام کو گھر جاتے وقت مفلر چہرے پر لپیٹا اور گھر آ گئی۔ آتے وقت بچوں سے یہ وعدہ کرنا پڑا کہ اگلے روز صبح سویرے آ جاؤں گی..... میں بہت خوش تھی' گھر کے سارے مسائل حل ہو چکے تھے اور عادل صاحب کے ہاں بھی کوئی دشواری پیش نہ آئی تھی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ دن بھر مجھے اپنے چہرے کا خیال نہ آتا تھا..... امی سے ذکر کیا تو وہ بہت خوش ہوئیں..... اب میں باقاعدگی کے ساتھ عادل صاحب کے گھر جانے لگی۔ ان کا رویہ بے حد مشفقانہ تھا..... ہمیشہ بیٹی کہہ کر مخاطب کرتے..... مجھے تنخواہ کے طور پر جتنی رقم ملتی..... وہ گھر کے اخراجات کے لیے کافی تھی..... آہستہ آہستہ میں نئے ماحول کی عادی ہوتی چلی گئی..... دن بھر بچوں کے سامنے کھلے منہ پھرتی لیکن جوں ہی کوئی ملنے والا آتا' جھٹ اندر بھاگ جاتی..... صبح منہ اندھیرے گھر سے نکلتی اور رات گئے گھر لوٹتی..... اندھیرے میں لوگ مجھے اچھی طرح نہ دیکھ سکتے تھے..... اپنے گھر کے بعد عادل صاحب کا بنگلہ میرے لیے ایک حفاظت گاہ بن گیا' بچے بھی مجھ سے مانوس ہو چکے تھے۔ ساتھ پڑھتے' کھیلتے اور گپیں مارتے..... لیکن شاید قدرت کو میری یہ خوشی ایک آنکھ نہ بھائی..... ایک دن عادل صاحب کے ہاں پہنچی تو ملازم نے ایک لفافہ دیا..... ایک سادہ سے کاغذ پر لکھا تھا۔

''بعض وجود کی بنا پر' میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ بچوں کی تعلیم و تربیت کا کام آپ سے واپس لے لیا جائے۔ آپ کی جگہ ایک نئی خاتون یہاں آ جائیں گی۔''

میری آنکھوں میں آنسو آ گئے..... سوچا شاید مجھ سے

لوٹی بھول ہوئی ہے..... میں نے عادل صاحب سے یافت کیا وہ حسب معمول بڑی شفقت سے پیش آئے رمحبت بھرے لہجے میں بولے۔

''آپ غلط سمجھیں..... مجھے آپ کی خدمات کا تہہ ال سے اعتراف ہے..... معذرت تو مجھے کرنی چاہیے ں جانتا ہوں بچے آپ کے بغیر اداس ہو جائیں گے۔''

''تو پھر آپ نے یہ فیصلہ کیوں کیا ہے؟''

''یہ سب کچھ آپ کی بہتری کے لیے ہے..... آج آپ میری بات نہیں سمجھ سکتیں لیکن ایک وقت ایسا آئے گا جب آپ محسوس کریں گی کہ میں نے کوئی زیادتی نہیں ی..... ویسے کہیں اور کام کرنے کا ارادہ ہو تو مجھے تا دینا..... میں اس کا بندوبست کردوں گا۔''

بوجھل دل سے گھر لوٹی..... امی سے بات کرنے کی ہمت نہ پڑی..... اپنے کمرے میں جا کر اندر سے دروازہ بند کرلیا اور اپنی بدقسمتی پر آنسو بہانے لگی..... زندگی سے کوئی دلچسپی نہ رہی تھی..... جی میں آیا کہ خودکشی کرلوں مگر امی اور ابا کی مصیبتوں کا خیال آ گیا..... کلیجہ مسوس کر رہ گئی..... ایک ہفتہ گزر گیا..... میں پھر کمرے میں بند ہو کر رہ گئی تھی۔ کبھی کبھار ابا بلا بھیجتے..... انہیں دیکھ کر اور تکلیف ہوتی..... امی صبح و شام کھانا کمرے میں لے آتیں اور میں تھوڑا بہت کھا لیتی..... ایک شام وہ دیر تک کھانا نہ لائیں..... یہ سوچ کر کہ کہیں بیمار نہ ہوں' کمرے سے نکلی اور باورچی خانے میں چلی گئی..... وہ فرش پر سر جھکائے بیٹھی تھیں..... میں نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں اور پھر کچھ کہے سنے بغیر اندازہ ہو گیا کہ کھانا کیوں نہیں پکا..... رات بھر نیند نہ آئی..... گھر کی حالت پریشانی میں اضافہ کر رہی تھی..... صبح اٹھتے ہی میں عادل صاحب کے گھر پہنچ گئی..... وہ بہت اچھی طرح ملے..... میں نے ملازمت کی خواہش ظاہر کی تو بولے۔

''ٹھیک ہے آپ کل صبح مل لیں' کوئی نہ کوئی بندوبست ہو جائے گا۔''

میں نے شکریہ ادا کیا اور گھر لوٹ آئی..... لوٹی تو امی نہیں گئی ہوئی تھیں..... ابا حسب معمول اپنے بستر لیٹے ہوئے تھے مجھے دیکھتے ہی بولے۔

''روزی! ذرا بات سننا۔'' میں ان کے قریب بیٹھ گئی۔

''میرا خیال ہے یہ مکان فروخت کر دیا جائے' مگر تمہاری امی نہیں مانتی۔''

''ابا جی! وہ ٹھیک کہتی ہیں مکان بیچ کر ہم کہاں جائیں گے؟''

''کوئی چھوٹا موٹا مکان کرایہ پر لیا جا سکتا ہے..... چند ماہ تو آسانی سے گزر جائیں گے..... تب تک میں ٹھیک ہو جاؤں گا اور دوبارہ ملازمت بھی کر سکوں گا۔''

''نہیں ابا جان..... خدا کے لیے یوں مت سوچیے..... میں نے ملازمت کر لی ہے ہم مکان فروخت نہیں کریں گے۔''

اگلی صبح میں اور امی عادل صاحب کے ہاں کھڑے تھے' میں بچوں سے ملنا نہیں چاہتی تھی اس لیے برآمدے میں بیٹھ گئی۔

تھوڑی دیر بعد عادل صاحب تیار ہو کر نکلے۔ ان کی گاڑی میں بیٹھ کر ہم منزل مقصود تک پہنچے۔ گاڑی سے باہر قدم رکھتے ہی میں کانپ اٹھی..... ہم بچوں کے اسکول کے سامنے کھڑے تھے۔

''آؤ..... آؤ رک کیوں گئیں؟''

''مجھے اسکول میں پڑھانا ہوگا کیا؟''

''ہاں۔''

میرے قدم رک گئے..... اسکول میں سیکڑوں بچیاں بچے ہوں گے..... ''نہیں..... نہیں میں بچوں کو نہیں پڑھا سکتی..... مجھے ایسا کام چاہیے جس میں زیادہ لوگوں سے ملنا نہ پڑے۔''

''روزی بیٹی! یہ گونگے اور بہرے بچوں کا اسکول ہے..... یہ بچے تمہاری محبت کے مستحق ہیں۔ انہیں پیار دو گی تو تم اپنا غم بھول جاؤ گی۔''

میں اب بھی ہچکچا رہی تھی۔ امی بولیں۔ ''عادل صاحب! روزی ملازمت نہیں کرنا چاہتی تو نہ سہی۔ آپ مجھے یہاں رکھوا دیں۔''

میں نے امی کی طرف دیکھا۔ ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

''میں ملازمت کروں گی۔'' میں نے کہا اور ہم اسکول

میں داخل ہوگئے۔

عادل صاحب نے ٹھیک کہا تھا..... گونگے اور بہرے بچوں کے اسکول میں کسی نے میرے چہرے کے زخم پر زیادہ توجہ نہ دی۔ یہاں بچے بھی تھے اور بچیاں بھی..... لیکن کھوئے کھوئے سے، بہت کم بچوں میں شوخی اور چلبلا پن تھا..... جو عام اسکول کے بچوں میں ہوتا ہے..... میں نے پرنسپل سے مل کر کھیلوں کا بندوبست کرایا..... پڑھائی کے دوران وقفہ منظور ہوا، سب بچے گراؤنڈ میں جا کر کھیلتے..... جلد ہی میں نے محسوس کرلیا کہ بچے مجھ سے محبت کرتے ہیں..... ان میں سے بیشتر بول نہیں سکتے تھے لیکن ان کی آنکھوں میں میرے لیے محبت اور احترام کے جذبات تھے..... میں بھی اپنا دکھ بھول کر ان میں کھوگئی..... یہ ایک نرالی دنیا تھی..... یہ وہ بچے تھے جنہیں معاشرے نے دھتکار دیا تھا اور جنہیں عام بچے نفرت اور حقارت کی نگاہ سے دیکھتے تھے..... لیکن یہ اندازہ کرنا مشکل نہ تھا کہ ان کے دلوں میں بھی خواہشات اور امنگوں کا ایک بحر بیکراں موجزن ہے..... وہ بھی چاہتے تھے کہ لوگ ان سے محبت کریں، اسکول میں میرے علاوہ اور استانیاں بھی تھیں لیکن میں نے ان سے زیادہ راہ و رسم نہ رکھی تھی..... میں ابھی تک عام لوگوں سے کتراتی تھی..... اب یہ بچے میری دنیا تھے اور میں اس دنیا میں مگن تھی..... جو لوگ یہاں آتے میری طرف عجیب عجیب نظروں سے دیکھتے..... مگر اب مجھے ان کی پروا نہ تھی..... وقت گزرتا چلا گیا..... مجھے اس اسکول میں پڑھاتے ہوئے چھ ماہ ہو چکے تھے کہ اچانک بیٹھے بٹھائے ایک مصیبت آن پڑی..... اسکول کا انتظام ایک انجمن کے سپرد تھا جس میں شہر کے مخیر لوگ شامل تھے..... حکومت بھی مالی امداد دیتی تھی..... پرنسپل میرے کام سے بہت خوش تھی اس نے میری سالانہ کارکردگی کی رپورٹ بھیجی، جو اے پلس تھی..... اس رپورٹ پر کمیٹی نے فیصلہ کیا کہ مجھے ترقی دے کر دوسرے اسکول میں بھیج دیا جائے..... جہاں صحت مند بچے پڑھتے ہیں..... میں نے بہت احتجاج کیا کہ میری تبدیلی نہ کریں مگر پرنسپل نے میری ایک نہ سنی۔

''مس روزی! فیصلہ ہو چکا ہے، آپ کو دوسرے اسکول میں جانا ہی ہوگا۔ آپ کو تو خوش ہونا چاہیے کہ آپ جلدی ترقی مل گئی۔'' میں نے عادل صاحب سے کہا چاہی تو انہوں نے معذوری ظاہر کی..... اسی سے ذکر کیا وہ خاموش رہیں..... میں کسی قیمت پر ملازمت چھوڑ نہیں چاہتی تھی..... اس لیے ہر طرف سے مجبور ہو دوسرے اسکول جانے کا فیصلہ کرلیا۔

نئے اسکول میں لوگوں کی نگاہیں میرا تعاقب کرتیں..... بچے بری طرح خوف کھاتے..... اسٹاف روم میں استانیاں بالکل الگ تھلگ رہتیں..... اس سلوک سے میرا دل ڈوبنے لگا، کئی بار جی چاہا نوکری چھوڑ دوں مگر گھر کی حالت دیکھ کر ارادہ ترک کرنا پڑا، شروع میں..... میں خود بھی خوفزدہ سی رہتی، ایک دن سب استانیاں مل کر پکنک کا پروگرام بنا رہی تھیں، میں پاس بیٹھی مطالعے میں مصروف تھی اور معمول کے مطابق چہرہ مفلر میں چھپا ہوا تھا..... استانیوں میں سے ایک کی پشت میری طرف تھی..... شاید وہ میری موجودگی سے بے خبر تھی..... ناموں کی فہرست تیار کرتے ہوئے بولی۔

''اس منہ جلی کو ساتھ لے جانا ہے؟''

میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔

''نہ بابا..... وہ تو بالکل ڈریکولا لگتی ہے اسے ساتھ لے جا کر اچھی بھلی تفریح کیوں خراب کریں۔'' میں کرسی پر بت بنی بیٹھی رہی..... آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا..... سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ سب میرے پیچھے کیوں پڑ گئی ہیں..... میں نے ان کا کیا بگاڑا ہے..... ان میں سے کسی کو مجھ سے کوئی تکلیف نہ پہنچی تھی..... پھر وہ مجھ سے نفرت کیوں کرتی ہیں؟ جی چاہا بلک بلک کر روؤں..... مگر اس خیال سے خاموش رہی کہ ان کو میری موجودگی کا علم ہو جائے گا۔

''شکیلہ! تمہیں یہ کہتے ہوئے شرم نہیں آتی؟ آخر اس نے تمہارا کیا بگاڑا ہے..... وہ بھی کبھی تمہاری طرح تھی ایک حادثے میں اس کے چہرے پر تیزاب گر گیا تھا..... خدا سے ڈرو جانتی ہو کسی کا مذاق اڑانا کتنا بڑا گناہ ہے۔'' یہ مس نورین کی آواز تھی۔

ان کی باتیں سن کر میں اپنی سسکیاں ضبط نہ کرسکی.....

اور بلند آواز میں رونے لگی..... وہ سب اٹھ کھڑی ہوئیں اور میری طرف حیرت سے دیکھنے لگیں..... مس نورین اور کئی دوسری استانیاں مجھے چپ کرانے کی کوشش کر رہی تھیں مگر آنسو تھے کہ تھمنے کا نام نہ لیتے تھے..... آخر میں امی اور اسٹاف روم سے باہر نکل آئی..... اور سیدھی گھر آ گئی۔ کمرے میں بند ہو کر بے تحاشا روئی..... آنکھوں کے آنسو بھی خشک ہو گئے مگر دل کا غبار نہ چھٹ سکا..... شام تک تیز بخار نے آلیا۔

آنکھ کھلی..... تو سورج سر پر تھا..... امی میرے سرہانے بیٹھی تھیں..... میز پر کچھ دوائیں پڑی تھیں' اچانک دروازے پر دستک ہوئی اور اگلے ہی لمحے ہماری پرنسپل' مس نورین اور دوسری استانیوں کے ہمراہ کمرے میں داخل ہوئیں' میں نے اٹھنے کی کوشش کی مگر انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے منع کر دیا..... سب استانیاں مجھ سے معافی مانگ رہی تھیں اور میرا یہ حال تھا کہ روتے روتے میرا تکیہ بھیگ چکا تھا۔ اگلے روز میرا بخار اتر گیا اور میں دوبارہ اسکول جانے لگی..... دن یوں ہی گزرنے لگے..... سات سال کا عرصہ گزر گیا..... اس دوران میں نے پہلے ایف۔ ایس۔ سی پھر بی۔ اے اور بی ایڈ کر لیا۔ میں نے ہر امتحان میں امتیازی پوزیشن حاصل کی۔ اس دوران میں ماں کی ممتا اور باپ کی شفقت سے محروم ہو گئی..... بی ایڈ کرنے کے بعد مجھے دوبارہ گونگے اور بہرے بچوں کے اسکول میں پرنسپل بنا کر بھیجا گیا..... یہ سب میری محنت اور لگن کا پھل تھا۔

اسی دوران میری ملاقات جواد صاحب سے ہوئی ان کا بیٹا گونگا تھا اور اسی اسکول میں پڑھتا تھا' اس لیے وہ اسکول آتے جاتے رہتے تھے۔ ایک روز ان کا فون آیا تو انہوں نے مجھے شادی کی پیشکش کر ڈالی..... ان کی بیوی فوت ہو چکی تھی اور اس گونگے بچے کے سوا ان کا کوئی نہ تھا..... ان کا امپورٹ ایکسپورٹ کا کاروبار تھا..... ان کا بچہ علی مجھ سے بہت مانوس تھا..... میں حیران اور پریشان ہو کر رہ گئی..... اور ان سے سوچنے کی مہلت مانگی..... سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ میں ان کو کیا جواب دوں۔ وہ مجھ جیسی منہ جلی کو کیسے بیوی کے طور پر قبول کریں گے.....

میں نے اس سلسلے میں ڈاکٹر نیازی صاحب سے مشورہ کیا' کیونکہ اب وہی میرے ہمدرد اور غم خوار تھے۔ انہوں نے جواد صاحب کے حق میں فیصلہ دے دیا اور یوں ایک سادہ اور مختصر تقریب میں..... میں مسز جواد بن گئی۔ انہوں نے مجھے بھرپور پیار دیا اور میرا بہت زیادہ خیال رکھا..... کہ میں ماضی کا ہر دکھ اور غم بھول گئی..... پھر وہ مجھے اپنے ساتھ امریکا لے گئے..... جہاں انہوں نے میری پلاسٹک سرجری کرائی..... تو میرا حسن اور جوانی لوٹ آئی..... میں اب بھی اسی سکول میں پرنسپل ہوں..... دو بچوں کی ماں ہوں..... جواد نے مجھے بہت پیار اور مان دیا ہے وہ بہت ہی عظیم ہیں..... جنہوں نے مجھے ذرے سے آفتاب بنا دیا ہے۔

ڈاکٹر نیازی اور عادل صاحب سے ہمارے گھریلو تعلقات ہیں اور کبھی کبھی ملنے آتے رہتے ہیں۔ ڈاکٹر نیازی صاحب عادل صاحب اور جواد..... سنہرے لوگ ہیں..... احترام کے قابل ہیں مجھے تو بعد میں معلوم ہوا تھا کہ مجھے اپنے پیروں پر کھڑا کرنے کے لیے امی اور ڈاکٹر صاحب نے کتنی کوششیں کی تھیں۔ عادل صاحب نے ڈاکٹر نیازی کے کہنے پر مجھے ملازمت سے جواب دیا تھا..... اسکول کی ملازمت بھی انہوں نے امی کے مشورے سے تجویز کی تھی تاکہ میں اپنے اندر دوسرے لوگوں سے ملنے کی ہمت پیدا کروں اور آخر میں صحت مند بچوں کے اسکول میں میرا تبادلہ بھی ڈاکٹر نیازی صاحب نے ہی کرایا تھا..... وہ خود اس کمیٹی کے ممبر ہیں جو اسکول کا نظام سنبھالتی ہے..... امی نے دیدہ دانستہ سلائی کے اسکول میں جانا ترک کر دیا تھا تاکہ مجھے گھر سے باہر نکلنے پر مجبور کر سکیں..... میں ڈاکٹر نیازی اور عادل صاحب کی احسان مند ہوں کہ انہوں نے مجھے جینے کا سلیقہ دیا..... مجھے زندگی نے جو سبق دیا ہے وہ یہی ہے کہ انسان زندگی کے کسی بھی موڑ پر حوصلہ ہار کر نہ بیٹھ جائے بلکہ مستقل مزاجی اور نرمی سے کام لے تو بڑی سے بڑی مشکل بھی آسان ہو جاتی ہے۔

سرفروش

تفسیر عباس بابر

آخری حصہ

کالی بھیڑوں اور خونی بھیڑیوں کا ایکا ہو جائے تو امن مفقود ہو جاتا ہے فرقہ واریت اور گروہ بندی عام ہو جاتی ہے گھر کے چراغ ہی غداری پر تل جائیں تو سب کچھ جل کر خاکستر ہو جاتا ہے تفسیر عباس بابر کا یہ ناول ''سرفروش'' ایسے ہی حالات پر مبنی ہے وطن عزیز میں اسلام اور امن کے دشمنوں کی ریشہ دوانیاں، مکروہ و قبیح سازشیں آئے دن بم بلاسٹ خودکش حملے، ہر شہری احساس عدم تحفظ کا شکار ہے ایسے غیر یقینی حالات میں بے یقینی اور خوف کا احساف فزوں تر ہونا جز و لازم ہے، مسجدیں، امام بارگاہیں، علمی مراکز، دشن کی نظر کی زد میں ہیں حتیٰ کہ اب دینی مدارس بھی محفوظ نہیں رہے ایک خوف ہے جو اذہان و قبول کے نہاں خانوں میں رچ بس گیا ہے ہمارے دینی مراکز کو بدنام اور سادہ لوح عام کو گمراہ و خوفزدہ کرنے میں غیر ملکی طاقتیں کس حد تک ملوث ہیں زیر نظر ناول کا بنیادی خیال یہی ہے ذہن منتشر اور دل خوفزدہ ہیں آئیدن کوئی ایسا سانحہ گزر جاتا ہے کہ روح تک لرز جاتی ہے حادثہ ایک دم نہیں ہوتا اس کے محرکات و وجوہات ہوتی ہیں کئی دن اس کے پرورش ہوتی ہے مقام فکر یہ ہے کہ ان حادثات کی پرورش میں ہمارے اپنے بھی اہم کردار ادا کرتے ہیں موجودہ ملکی حالات کے تناظر میں یہ ناول بطور خاص پیش کیا جا رہا ہے مختصر کہانیوں کے بعد نئے افق میں مصنف کا یہ پہلا ویل ناول بطور خاص پیش کیا جا رہا ہے۔ مختصر کہانیوں کے بعد نئے افق میں مصنف کا یہ پہلا طویل ناول ہے اس سے پہلے ان کا ایک ناول ''سنگریزے'' کتابی شکل میں چھپ چکا ہے، کوئی بھی قلمکار ہو وہ قلم کی دھار سے دشمن کا سر قلم کر سکتا ہے یہ ہر لکھنے والے پر فرض ہے کہ مٹی سے وفا کے تقاضوں کو ملحوظ نگاہ رکھے۔

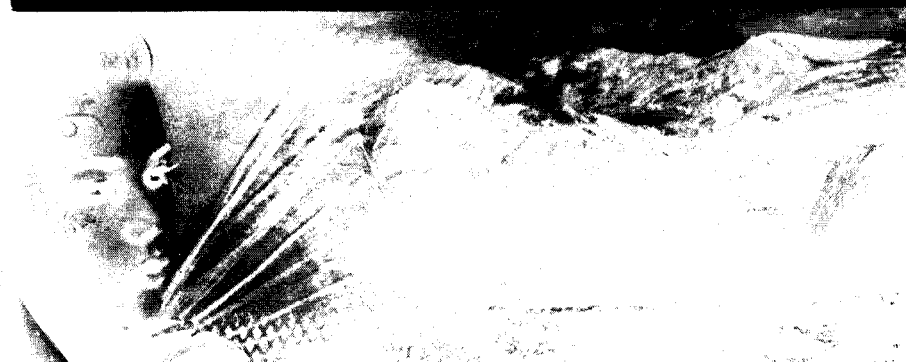

دوسرے ہی لمحے اس نے اس کا بازو پکڑا اور انجکشن اس کے کاندھے کے گوشت میں انجیکٹ کردیا۔ایک سفاک اور پراسرار مسکراہٹ کے ساتھ اس نے سرنج واپس کھینچی اور کیپ چڑھا کر اسے دوبارہ جیب میں رکھ لیا۔

''اب آپ مکمل آرام کیلئے تیار ہوجائیں''

اس نے جذبات سے عاری لہجے میں کہا اور تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔ٹھیک پندرہ سیکنڈ بعد اسے اپنا جسم مفلوج سا ہوتا ہوا محسوس ہوا۔اس کے سینے میں درد کی شدید لہر اٹھی۔اپنے منہ میں اسے نمکین سی رطوبت کا احساس ہوا۔دوسرے ہی لمحے اس کا منہ خون سے بھر گیا،اور بیڈ کی سفید چادر اور تکیے کو رنگین کرگیا۔اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا پھیلنے لگا۔اس نے کسی کو پکارنے کیلئے منہ کھولا،لیکن قوت گویائی نے ساتھ نہیں دیا۔ڈوبتی نبضوں کے ساتھ اس نے سوچا کہ اسے زہر کا انجکشن دیا گیا ہے،لیکن اب دیر ہوچکی تھی۔مہلک زہر اس کے رگ وپئے میں سرایت کرچکا تھا۔عین آخری لمحے اس کی آنکھوں کے سامنے سرتاپا سفید کفن میں ملفوف محمد حیات نمودار ہوا۔وہ حیرت انگیز نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔اچانک وہ منظر سے غائب ہوگیا،اور پھر سارے منظر اس کی آنکھوں سے اوجھل ہوگئے۔اس کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔محمد حیات کے بعد اکرام بھٹی بھی مرچکا تھا۔اسپتال کی راہداری میں وہی نرس پاشا کو فون کررہی تھی۔

''آپ کا کام ہوگیا ہے۔''

''اوکے شام سے پہلے تمہارا کام بھی ہوجائے گا سمیرا'' پاشا نے عجلت میں کہا اور کال منقطع کردی۔

❀……۞……❀

اگرچہ کہ وہ کبھی ملے نہیں تھے لیکن ایک دوسرے کے نام اور عہدے سے واقف ضرور تھے۔رسمی حال احوال کے بعد وہ موجودہ ملکی صورتِ حالات پر گفتگو کرنے لگے۔

''شاہ جی مجھے خوشی بلکہ فخر محسوس ہورہا ہے کہ آپ جیسے نڈر اور فرض شناس آفیسر محکمہ پولیس میں اب بھی موجود ہیں۔'' کیپٹن ارباز نے خلوص دل سے کہا۔

''یہ بات تو میں آپ کے لیے کہنا چاہ رہا تھا'' زوارشاہ خوشگوار لہجے میں بولا۔''کالی بھیڑیں ہر محکمے میں پائی جاتی ہیں۔ایک دو برے آدمیوں کی وجہ سے پورا محکمہ بدنام ہوجاتا ہے۔بالکل جیسے ایک گندی مچھلی پورے تالاب کوخراب کردیتی ہے۔''

''جی یہ تو آپ بجا کہہ رہے ہیں۔ہمارا المیہ یہ ہے کہ کوئی بھی شریف آدمی پولیس کو دیکھ کر راستہ بدل لیتا ہے،جبکہ پولیس ان کی محافظ ہے۔'' کیپٹن نے اپنے مخصوص دھیمے لہجے میں کہا۔

''جی یہ تو واقعی ایک تلخ سچائی ہے۔ہونا تو یوں چاہیے کہ پولیس اور عوام ایک دوسرے سے تعاون کریں۔تب ہی کہیں جرائم کی روک تھام ممکن ہے۔بہرحال سارا سسٹم ہی خراب ہے۔آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہے خان صاحب۔'' زوارشاہ نے مدلل لہجے میں کہا۔

''اس میں کوئی شک نہیں شاہ جی۔'' وہ تائیدی لہجے میں بولا۔''بااثر افراد اور سیاستدان تو ایک طرف ایک کیلے بیچنے والا بھی اپنے کاروبار سے مخلص نہیں ہے یہ عوام جو بڑے لوگوں کی نشاندہی کرتی ہے خود بھی برائی لالچ بے ایمانی سے مبرا نہیں ہے۔''

''درست کہا'' زوارشاہ نے اس کی گفتگو سے متاثر ہوتے ہوئے کہا۔''یہ گفتگو انتہائی اہم ہے،اس کیلئے کچھ وقت مختص کرکے ملاقات طے کرلیتے ہیں۔آپ حکم فرمائیں۔خاکسار کو کیسے یاد کیا؟''

''اوہ۔۔شاہ جی اب آپ شرمندہ کررہے ہیں۔ٹھیک ہے انشااللہ جونہی فرصت ملتی ہے۔ضرور ملتے ہیں۔''

''جی خان صاحب اب بتائیں کہ کیسے یاد کیا؟''

زوارشاہ کے لہجے میں اصرار تھا۔

''شاہ جی۔۔۔ایک بہت بڑی کالی بھیڑ ہے،جو آپ کے زیر سایہ رہ رہی ہے۔اگرچہ کہ اثبات وشواہد نہیں ہیں،لیکن اس سے متعلق تسلی بخش خبریں نہیں مل رہیں۔'' کیپٹن نے مقصدِ گفتگو بیان کرتے ہوئے کہا۔

''خان صاحب عمر گزری ہے اسی دشت کی سیاحی میں''

زوارشاہ اس کی بات کی تہہ تک پہنچتے ہوئے بولا۔

''جہاں تک میرا اندازہ ہے آپ انسپکٹر داؤد پاشا کی بابت کہہ رہے ہیں۔میں آپ کے شکوک سے متفق ہوں اور کئی دن سے محسوس بھی کررہا ہوں کہ وہ ہیں کوا کب کچھ

طرآتے ہیں کچھ کے مصداق ہے، لیکن مجھے ثبوت کی تلاش ہے۔ جونہی موقع ملتا ہے اسے چھاپ لیتا ہوں۔''

''بہت خوب ویلڈن شاہ جی'' وہ اس کی ذہانت کا قائل ہوتے ہوئے بولا۔ ''اور رہ گئی ثبوت کی بات تو اس کیلئے یہی کافی ہے کہ مدرسہ راہبر انسانیت کے تہہ خانے کا اسے الہام ہوا، اس نے دریافت کیا یا وہ پہلے سے جانتا تھا اور پھر اس نے حقی کو بھی چھوڑ دیا۔''

''ہمم گڈ پوائنٹس کیپٹن صاحب'' اس نے گرمجوشی سے کہا۔

''لیکن وہ اس کی کوئی بھی توجیہہ پیش کرسکتا ہے۔ مثلاً وہ یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ اس نے تہہ خانے کا راستہ خود دریافت کیا، بہرحال اس کا یہ ویک پوائنٹ ہے اور قابلِ گرفت ہے۔ دوسرا پوائنٹ یہ کہ اس نے حقی کو کیوں چھوڑا۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ اس کا حکم بہت اوپر سے ملا تھا۔''

''شاہ جی یہی تو المیہ ہے کہ پولیس مجرم کو سر توڑ کوشش کے بعد پکڑتی ہے، اور فوراً کالر آنا شروع ہوجاتی ہیں۔'' اس نے تاسف سے کہا۔

''جی بالکل ایسا ہی ہوتا ہے۔ پاشا کا کہنا ہے کہ "سر" نے فون کیا تھا ازاں بعد میں نے تصدیق بھی کی تھی۔''

''کیا ستم ہے کہ اب خر..... بھی سر کہلانے لگے ہیں۔ سر سے مراد یقیناً ہاشم لنگڑیال ہے۔'' کیپٹن نے امکان ظاہر کیا۔

''جی جناب اور اس نے کہا تھا کہ اوپر والے خفا ہو رہے ہیں کہ تم نے ایک عالمِ دین اور مذہبی اسکالر کو گرفتار کرلیا ہے۔''

''شاہ جی اب وہی مذہبی رہنما انڈر گراؤنڈ ہے۔ مدرسوں میں مارے جانے والے دہشت گردوں میں سب کے سب غیر مسلم تھے۔ بہرحال آپ سے گزارش ہے کہ قیصر فوزیہ اور ارشی کو ہمارے حوالے کردیں۔''

''او کے خان صاحب، یہ کام آج ہی ہوجائے گا آپ مجھے شام تک کا وقت دے دیں۔'' ایس پی نے حامی بھرتے ہوئے کہا۔

''شاہ جی چرچ کا پادری ڈیوڈ جونسن بھی روپوش ہوگیا ہے'' کیپٹن نے اسے مطلع کیا۔ ''اور اس کے ساتھ دیکھی جانے والی غیر ملکی لڑکی بھی منظر سے غائب ہے۔''

''جی وہ بہت خطرناک لوگ ہیں۔ اب وہ کسی نئی جگہ پر اپنا نیٹ ورک چلائیں گے۔ تب تک امید ہے ہم ان شاءاللہ ان تک پہنچ جائیں گے۔''

''جی زوار شاہ جی۔۔۔ اور اس سلسلے میں وہ تین بے گناہ لوگ جو پاشا کی تحویل میں ہیں بہت کام آئیں گے۔''

کیپٹن نے واضح کردیا کہ مذکورہ تین افراد۔۔۔ قیصر ارشی اور فوزیہ مجرم نہیں ہیں۔ مزید چند منٹ کی گفتگو کے بعد کال منقطع ہوگئی۔

❀.....◈.....❀

چند ہفتوں میں ہی ڈاکٹر صادق صدیقی کا اسپتال ٹاپ پر پہنچ گیا تھا۔ وہ کچھ ماہ پہلے ہی انگلینڈ سے پاکستان آیا تھا اور اس نے اپنا ذاتی اسپتال بنالیا تھا۔ جس میں غربا و مساکین اور مستحق افراد کو مفت علاج کی سہولیات دی جارہی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ مریض جوق در جوق آرہے تھے۔ سارا دن تل دھرنے کی جگہ نہیں ہوتی تھی۔ شہر کے وسط میں ایک ایکڑ زمین پر مشتمل یہ خوبصورت اسپتال لوگوں کی توجہات کا مرکز بن گیا تھا۔ ڈاکٹر صدیقی کا خلیق لہجہ اور شفیق چہرہ عوام میں مقبول ہو رہا تھا۔ وہ ادھیڑ عمر کا بہ ظاہر ایک خوش شکل اور پرخلوص انسان تھا۔ پانچ وقت کا نمازی اور ملنسار شخصیت کا حامل۔ اس کی اسسٹنٹ ڈاکٹر ماہا بخاری بھی ایک انتہائی دلکش اور ملنسار لڑکی تھی۔ وہ مریضوں میں گھل مل جاتی۔ ان کے مسائل توجہ سے سنتی اور انہیں حل کرنے کیلئے سر توڑ کوشش کرتی۔ وہ ڈاکٹر صدیقی کے کمرے سے ملحق خوبصورت کمرے میں بیٹھتی تھی۔ وہ شعبہ خواتین کی انچارج بھی تھی اور خواتین کی مخصوص و خفیہ امراض کی ماہر بھی، وہ دونوں یہی چاہتے تھے عوام میں مقبولیت شہر کے بااثر افراد کا اعتماد اور ان سے تعلقات اور وہ اس میں کامیاب بھی تھے۔ انہوں نے نہایت مہارت اور بہترین منصوبہ بندی سے یہ نیٹ ورک بنایا تھا۔ حالیہ حادثات و واقعات کے تناظر میں جتنے بھی خطرات پیدا ہوئے تھے اب وہ قصہ پارینہ بن چکے تھے۔ وہ مطمئن تھے اور نہایت اطمینان سے اپنی خفیہ سرگرمیوں میں مصروفِ عمل تھے۔

اس ضمن میں ملک کے چند بااثر افراد ان کے سہولت کار کے فرائض بصد خلوص سرانجام دے رہے تھے، جن میں ایک اہم اور معتبر نام ہاشم لنگڑیال کا تھا۔ وہ انہیں ہر لحاظ سے سپورٹ کر رہا تھا۔ سانحہ جہان پور اور احمد مارکیٹ میں خودکش حملہ، وقت کی گرد کے نیچے دب گیا تھا۔ خفیہ ادارے سرگرم عمل تھے، لیکن وہ اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مار رہے تھے۔

معمول کے مطابق سہ پہر دو بجے کھانے کی ٹیبل پر ڈاکٹر ماہا، ڈاکٹر صدیقی کے سامنے کرسی پر براجمان تھی۔ کھانے کی اشتہا انگیز خوشبو نے ان کی بھوک کو جلا دیدی تھی۔ وہ کھانے کے ساتھ انصاف بھی کر رہے تھے اور دیگر امور پر محو گفتگو بھی تھے، لیکن اس گفتگو کا میڈیکل ایکٹیویٹیز سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

ماہا بخاری تربیت یافتہ ایجنٹ کیتھی برنارڈ تھی، جبکہ ڈاکٹر صدیقی عیسائیت کا معروف نام نہاد رہنما اور چرچ کا پادری ڈیوڈ جونسن تھا جو کہ سفاک اسرائیلی ٹیررسٹ ڈین نیلسن تھا۔ جہان پور اور احمد مارکیٹ میں رونما ہونے والے خونی واقعات کا ماسٹر مائنڈ، مولانا حقی ٹیررسٹ ایکٹیویٹیز کے سلسلے میں کسی اور جگہ پر مصروف عمل تھا، ان تینوں مذکورہ افراد نے نہایت مہارت و مشاقی سے اپنے حلیے تبدیل کر لیے تھے اور پاکستانی عوام میں گھل مل کر ان کی جڑیں کاٹنے میں مصروف عمل تھے۔ اس بار ان کی پلاننگ بہت خطرناک تھی۔ وہ بہت بڑی کارروائی کرنے جا رہے تھے۔ تمام انتظامات مکمل تھے، بس مناسب موقع کا انتظار تھا اور مناسب موقع دور نہیں تھا۔ ایک بار پھر وہ کشت وخون کا بازار سجانے کا منصوبہ ترتیب دے چکے تھے۔

''تم کچھ سوچ رہے ہو مسٹر صدیقی''

ڈاکٹر ماہا نے اسے گہری سوچ میں مستغرق دیکھ کر استفسار کیا۔ ''کوئی اہم بات ہے تو تم مجھ سے شیئر کر سکتے ہو۔''

وہ ایکدم چونک کر اسے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''تم ٹھیک سمجھ رہی ہو۔ دراصل ہاشم لنگڑیال خفیہ ایجنسیز کی نظر میں ہے، لیکن اس کے بغیر ہم یہاں کچھ کر بھی نہیں سکتے۔ یہ سب کچھ اسی کے تعاون کا مرہون منت ہے۔

''ڈونٹ وری مسٹر ڈین'' وہ اسے اس کے اصل نام سے پکارتے ہوئے آہستگی سے بولی۔ ''اس سے کچھ دن لاتعلق ہو جائیں یا اسے کچھ دنوں کیلئے بیرون ملک بھیج دیتے ہیں اور اگر زیادہ خطرہ ہے تو..... اوپر.....''

اس نے سفاک لہجے میں ہونٹ سکیڑتے ہوئے آسمان کی طرف اشارہ کیا۔

اس کی پرکشش آنکھوں میں ایک دم سفاکی عود کر آئی تھی۔ ڈین نیلسن نے اسے گہری نظر سے دیکھا اور آہستہ سے بولا۔

''اتنا ایموشنل ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہ پاکستان ہے۔ رقم کا ایک صفر بڑھا دیا تو ہاشم کا بگ باس بھی مان جائے گا۔ میں نے فی الوقت محض امکان ظاہر کیا ہے۔''

''ہمم اٹس اوکے۔'' وہ لقمہ توڑتے ہوئے اسے دیکھے بغیر بولی۔ ''لیکن ہمیں چھوٹی سے چھوٹی بات کو بھی اہم سمجھنا چاہیے۔''

''بالکل ایسا ہی ہوگا''

وہ سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''مدرسہ راہبر انسانیت والا واقعہ ناقابل فراموش ہے۔ ہم نے اس سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ اس لیے ارجن "مولانا حقی" کو منظر عام سے ہٹا لیا ہے۔''

''کہاں ہے وہ؟''

وہ چونکتے ہوئے بولی۔

''وہی تو میں کہوں وہ کافی دنوں سے نظر نہیں آیا''

''وہ ہمارے ساتھ نہیں ہے لیکن کنیکٹ میں ہے اور ٹھیک جا رہا ہے۔ اسے ایک دور افتادہ گاؤں میں بھیج دیا گیا ہے۔ واضح رہے تمہارے زیادہ تر مریض وہی بھیجتا ہے۔''

''دیٹس گڈ'' وہ کرسی چھوڑتے ہوئے بولی نیلسن اس سے پہلے اٹھ چکا تھا۔

''ایک تو یہ کم بخت مریض آج بھی بہت زیادہ ہیں''

''کول ڈاؤن مائی بے بی''

وہ اس کی جھنجھلاہٹ کے جواب میں زیر لب مسکراتے ہوئے بولا۔

''یہ ہمارے پلان کی کامیابی کیلئے بہت اہم ہے۔ مجھے تو خوشی ہوئی جب پتہ چلا کہ تم پریکٹس بھی کر لیتی ہو۔ خیر میں نے تو باقاعدہ کورس کیا ہے۔ ہمیں ہر قسم کے

اور حالات کیلئے ریڈی ہونا چاہیے۔''

چند لمحوں بعد وہ اپنے آفس کی طرف بڑھ گیا۔ ریسیپشن پر مریضوں کی قطار میں ایک سادہ سی انتہائی خوبرو لڑکی کو دیکھ کر اس کی رال ٹپک پڑی تھی۔ سادہ سی بلیک شلوار قمیض میں ملبوس وہ بھرپور اور صحت مند جسم کی حامل طویل قامت لڑکی اسے بے ساختہ اپنی جانب متوجہ کر رہی تھی۔ اس لڑکی نے گردن اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کی گہری سیاہ آنکھیں سحر پھونک رہی تھیں۔ دوسرے ہی لمحے وہ نظریں جھکا کر بیٹھ گئی۔ اس نے اپنے ساتھ چلتی ہوئی ڈاکٹر ماہا کو ذومعنی نظروں سے دیکھا اور زیرِ لب مسکراتا ہوا اپنے آفس میں داخل ہو گیا۔

❁ ...... ۞ ...... ❁

اسلام پورہ میں پیرنقاب پوش کا چرچا عام ہو رہا تھا۔ اسے یہاں آئے محض چند مہینے ہی ہوئے تھے لیکن وہ ہردلعزیز اور یہاں کے لوگوں کی نظروں میں معزز و معتبر ہو گیا تھا۔ ضعیف الاعتقاد سادہ مزاج لوگ اسے اپنی دعاؤں کی قبولیت کا باعث اور امیدوں کی تکمیل کا سبب سمجھ کر اندھی تقلید میں محوِ عمل ہو گئے۔

جہان پور سے پینتیس کلومیٹر کے فاصلے پر واقع اسلام پورہ نامی قصبہ ہر لحاظ سے ترقی یافتہ کہا جا سکتا تھا۔ سرکاری اسپتال پولیس چوکی طلبا و طالبات کیلئے ہائر سیکنڈری سکولز، یونین کونسل پختہ بازار بلند، قطار در قطار پختہ مکانات اسلام پورہ کے ترقی یافتہ ہونے کی دلیل تھے کم و بیش پندرہ ہزار نفوس پر مشتمل یہ قصبہ مین روڈ سے تین کلومیٹر کے فاصلے پر واقع تھا۔ یہاں متعدد سیاسی شخصیات بھی سکونت پذیر تھیں۔ گاؤں کے ستر فیصد لوگ تعلیم یافتہ اور بزنس مین تھے، لیکن اس کے باوجود بھی متعدد لوگ ضعیف الاعتقادی اور اندھی عقیدت سے سرشار پیرنقاب پوش کے آستانہ عالیہ پر باقاعدہ حاضری دیتے تھے۔ نذرانے نذر نیاز بھی روزانہ تقسیم کیے جاتے۔ مذکورہ آستانہ آبادی سے قدرے ہٹ کر درختوں کے جھنڈ میں واقع تھا۔ بلند و بالا پختہ چار دیواری، مرکزی گیٹ پر مسلح گارڈز، گیٹ کے سامنے عقیدت مندوں کی گاڑیاں موٹر سائیکلیں اور مختلف سواریاں ہر وقت کھڑی نظر آتیں۔ سخت سیکیورٹی کیمرا ہال سے گزرنے کے بعد گیٹ عبور کرتے ہی سامنے لمبی قطار میں پختہ کمرے نظر آتے تھے۔ جن کے آگے برآمدہ اور صحن میں تاحدِ نگاہ سولنگ تھی۔ مرد و زن کی آمد و جامد کا سلسلہ جاری و ساری رہتا تھا۔ جن میں نوجوان لڑکیاں اور بچے بھی شامل ہوتے۔ دائیں جانب ایک پرشکوہ دربار بھی تھا، جس کا مینار دور ہی سے نظر آتا تھا۔ جہاں ہر وقت عقیدت مندوں کا میلہ لگا رہتا تھا۔

یہ ہمارے معاشرے کا ایک تاریک ترین پہلو ہے، جس سے انکار و انحراف قطعی ممکن نہیں۔ ڈبہ پیروں نے جا بجا اپنی اندھی عقیدت کے ٹھیلے لگا رکھے ہیں اور دونوں ہاتھوں سے سادہ لوح عوام کو لوٹ رہے ہیں، لیکن پیرنقاب پوش سے متعلق سب کا اعتقاد تھا کہ یہ اللہ کے برگزیدہ اور باعلم و عمل آدمی ہیں۔ مذکورہ آستانہ مدتوں سے اسی جگہ پر واقع تھا۔

اس سے پہلے یہاں کے گدی نشین پیر غلام علی شاہ تھے، جو کہ گزشتہ چند ماہ قبل اپنی فیملی سمیت ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں جاں بحق ہو گئے تھے۔ ان کی مرگِ ناگہانی کے فوراً بعد آستانہ عالیہ کا نظم و نسق پیرنقاب پوش کو دے دیا گیا۔ سننے میں آیا تھا کہ اس سلسلے میں محکمہ اوقاف کے بااثر افراد نے بھی اثر و رسوخ استعمال کیا تھا، نیز پیر صاحب کے حکامِ بالا تک بھی تعلقات تھے، لیکن اس سارے سیٹ اپ میں پیرنقاب پوش کے کردار علم اور عمل نے اہم کردار ادا کیا، اور وہ کچھ ہی دنوں میں عوام کے دلوں پر قابض ہو کر رہ گئے۔

ان سے متعلق یہی معلوم ہوا تھا کہ وہ انتہائی بزرگ ضعیف العمر اور خلیق و شفیق انسان ہیں۔ ہمہ وقت عبادتِ الٰہی اور وظائف میں مشغول رہتے ہیں' آج تک ان کا چہرہ کسی نے نہیں دیکھا تھا کیونکہ وہ سرتاپا سبز چغہ اور نقاب میں ملفوف رہتے تھے۔ ایک مرید خاص نے اتفاق سے ان کی ایک جھلک دیکھی تھی، اور کئی دن تک جلوہ دیدار سے سرشار رہا تھا۔ اس کے مطابق پیر صاحب انتہائی معمر، نورانی چہرہ سر اور داڑھی کے بال سفید اور لمبے، بڑی بڑی سیاہ آنکھیں، دیکھنے والے کو مسحور کر کے رکھ دیتی تھیں۔

اس دن سے ان کا وقار مزید بلند و معتبر ہوگیا تھا۔ وہ لوگوں سے بہت کم ملتے تھے۔ غربا و مساکین اور ضرورت مند افراد سے ان کا مرید خاص ثناءاللہ ملتا تھا۔ وہی پیر صاحب کے تعویذات و وظائف معتقدین تک پہنچاتا تھا۔ وہ ایک ادھیڑ عمر باریش اور صحت مند آدمی تھا۔ سر پر سبز جالی دار ٹوپی اور ہاتھ میں ہر وقت تسبیح ہوتی تھی، جس پر وہ کوئی ورد پڑھتا رہتا تھا۔ وہ پیر صاحب کے حجرہ خاص کے سامنے کشادہ برآمدے میں بیٹھتا تھا۔ آج بھی معمول کے مطابق عقیدت مندوں کا ہجوم تھا۔ برآمدے کے سامنے سولنگ پر متعدد مرد و زن قطار بنائے بیٹھے ثناءاللہ کی طرف پرامید اور عقیدت بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

ضرورت مند مرد و زن باری باری اس کے سامنے پیش ہوتے، اس کے زانو پر ہاتھ رکھتے، غرض و غایت بیان کرتے، اور نذر نذرانہ پیش کر کے چلے جاتے۔ صرف انتہائی اہم اور خاص ضرورت مند کو ہی پیر صاحب کے حجرہ خاص میں جانے کی اجازت دی جاتی تھی۔

وہ ایک بڑی سی چارپائی پر تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھا تسبیح پر کچھ پڑھتے ہوئے مراقبے میں مستغرق ہوجاتا تھا۔ ایک دم وہ اچانک اپنی سحر انگیز آنکھیں کھولتا اور سامنے بیٹھے کسی سائل پر مرکوز کر دیتا۔

اس بار اس کی مخمور سی آنکھیں سامنے بیٹھی ایک جواں سال خوبرو لڑکی پر مرکوز تھیں۔ وہ گلابی رنگ کے سادہ سے کپڑوں میں اسی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ سرخ و سفید رنگت فربہی مائل جسم اور بڑی بڑی آنکھوں میں کسی درد نارواکے سائے لہرا رہے تھے۔

''تم آگے آؤ، تم مجھے زیادہ مشکل میں لگ رہی ہو''

اس نے لڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے گمبھیر لہجے میں کہا۔

لڑکی کے چہرے پر خوشی اور امید کے رنگ بکھر گئے۔ وہ جلدی سے اٹھ کر کھڑی ہوئی۔ اب وہ بغور اس کے سراپا کا جائزہ لے رہا تھا۔ درمیانہ قامت لڑکی قدرے تیز قدموں سے چلتی ہوئی اس کے سامنے آکر کھڑی ہوگئی۔ اچانک وہ مودبانہ انداز میں جھکی اور اپنے دونوں ہاتھ اس کے زانو پر رکھ دیے۔

''سامنے بیٹھ جاؤ اور بتاؤ کیا مسئلہ ہے؟''

وہ آنکھیں بند کرتے ہوئے آہستگی سے بولا۔

وہ چارپائی کے سامنے بچھی چٹائی پر بیٹھ گئی۔

''پپ۔۔۔پیر جی۔۔۔'' وہ ہکلاتے ہوئے بمشکل بولی۔

''مجھے یقین ہے کہ میرا راز، راز ہی رہے گا اور کام بھی ہوجائے گا۔''

وہ اسے گہری نظر سے دیکھتے ہوئے سرگوشی نما آواز میں بولا۔

''لڑکی فضول باتوں میں وقت ضائع مت کرو۔ مدعا بیان کرو۔ یہاں سے کبھی کوئی مایوس نہیں لوٹا۔''

''پیر جی میرا نام نادیہ ہے۔ میں اس گاؤں کے زمیندار نور الٰہی کی اکلوتی بیٹی ہوں۔ میں اپنی پسند کی شادی کرنا چاہتی ہوں پر میرا ابا نہیں مان رہا۔ آپ کچھ ایسا کریں کہ۔۔۔''

''بس آگے کچھ نہ کہو۔ تمہارا کام ہوجائے گا، لیکن اس کیلئے تمہیں ایک عمل کرنا ہوگا۔''

''میں کچھ بھی کرنے کو تیار ہوں پیر جی۔ بس میرا محبوب مجھے مل جائے۔'' وہ بے تابی سے بولی۔

''ٹھیک ہے۔ تم بڑے پیر کے حجرے میں چلی جاؤ۔ ایک ہفتے میں تمہارا کام ہوجائے گا۔''

وہ پیر کے حجرۂ خاص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

چند لمحوں بعد وہ حجرہ خاص پر دستک دے رہی تھی۔

''اندر آجاؤ یہ در ہر کسی کیلئے ہر وقت کھلا ہے''

ایک گونج دار آواز سنائی دی۔

دوسرے ہی لمحے وہ حجرے میں داخل ہوگئی۔ مختصر سا حجرہ دنیاوی آرائش و ضروریات سے مبرا نظر آرہا تھا۔ فرش پر ایک منقش چٹائی بچھی ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ کوئی سامان نظر نہیں آیا۔ ایک کونے میں پیر صاحب نقاب میں مضمر آلتی پالتی مارے بیٹھا سیاہ رنگ کی تسبیح کے متحرک دانوں پر پس نقاب یقیناً کچھ نہیں پڑھ رہا تھا۔ کمرے میں اگربتی کی مخصوص بو پھیلی ہوئی

وہ آہستگی سے چلتی ہوئی اس کے سامنے پہنچ گئی۔اس نے اپنے دونوں ہاتھ اس کے زانو پر رکھے۔وہ سبز رنگ کے باریک نقاب میں سے اسے بغور دیکھ رہا تھا۔

"بیٹھ جاؤ نادیہ بی بی، تمہیں تمہارا محبوب ضرور ملے گا" اس نے ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے نرم لہجے میں کہا۔

وہ حیرت زدہ ہوکر اسے دیکھنے لگی۔پیر صاحب اس کے دل کا حال جان گئے تھے۔اس کی عقیدت فزوں تر ہو رہی تھی۔وہ تنویمی انداز میں اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے مودب لہجے میں بولی۔

"پیر مرشد۔۔آپ تو میرے دل کی تہہ تک پہنچ گئے ہیں۔مجھے کچھ بتانے کی ضرورت ہی نہیں رہی۔بس میرا یہ کام کردیں۔میں اس کے بغیر جی نہیں پاؤں گی،مرجاؤں گی۔"

پیر صاحب نے سیاہ دستانے میں ملفوف اپنا ہاتھ اس کے سر پر رکھ دیا،اور دھیمے لہجے میں بولا۔

"تمہیں مرنے کی ضرورت نہیں ،لیکن محبت قربانیاں مانگتی ہے۔اپنے محبوب کو پانے کیلئے اگر کچھ کھونا پڑا تو کیا ایسا کر پاؤ گی۔۔۔؟"

فرطِ عقیدت میں اس نے پیر صاحب کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں مضبوطی سے پکڑا اور آنکھوں سے لگالیا اور پرجوش لہجے میں بولی۔

"پیر جی میں زیادہ پڑھی لکھی تو نہیں پر مجھے اتنا معلوم ہے کہ محبت قربانیاں مانگتی ہے اور میں کسی بھی قربانی سے انکار نہیں کروں گی۔"

پس نقاب اس کے ہونٹوں پر مکارانہ مسکراہٹ پھیل گئی۔اب اس کا ہاتھ لڑکی کی پشت پر متحرک تھا۔وہ آنکھیں بند کیے اپنی قسمت کو بدلتا دیکھ رہی تھی۔پیر صاحب نے تپائی کے نیچے ہاتھ ڈالا۔دوسرے ہی لمحے اس کے ہاتھ میں ایک تہہ شدہ تعویذ نظر آرہا تھا۔وہ اس کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے آہستگی سے بولا۔

"یہ تعویذ پانی میں گھول کر تین دن اپنے باپ کو پلاؤ۔وہ مان جائیگا اور ہاں جاتے ہوئے ثنا اللہ سے پانی کی بوتل بھی لیتی جانا۔آج پیر ہے،جمعرات کو عشا کی اذان کے بعد آنا۔تمہارا کام ہوجائیگا اور کسی کو بتانا مت ورنہ نامراد رہ جاؤ گی۔"

وہ تعویذ پکڑ کر تفہیمی انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔

"پر۔۔پیر جی رات کو اکیلے آنا تو مشکل ہے۔"

پیر نے اس کی طرف رخ کیا اور قدرے درشت لہجے میں کہا۔"نہ آسکو تو مت آنا،لیکن تمہارا کام ادھورا رہ جائے گا۔ہو سکے تو اپنے محبوب کو بھی ساتھ لیکر آنا۔"

وہ کچھ سوچتے ہوئے تیزی سے کہنے لگی۔

"پیر جی میں ضرور آؤں گی اور افضل تو بھاگا چلا آئے گا جی۔وہ تو آپ کا بہت بڑا عقیدت مند ہے۔"

"ٹھیک ہے اللہ بہتر کرنے والا ہے۔اب تم جاؤ اور زبان بند رکھنا،ورنہ مشکلات بڑھ جائیں گی۔"

پیر صاحب نے مخصوص لہجے میں کہا اور اسے باہر جانے کا اشارہ کردیا۔چند لمحوں بعد وہ ثنا اللہ سے پانی کی بوتل لے کر اپنے گھر کی طرف بڑھ رہی تھی۔

❀ ...... ❀ ...... ❀

"ایک المیہ یہ بھی ہے کہ بڑے مگرمچھ روپوش ہوجاتے ہیں۔بھاری رشوت اور وسیع تعلقات کی طاقت سے آزاد ہوجاتے ہیں۔چھوٹی مچھلیاں پکڑی جاتی ہیں اور ان سے اقرار نا کردہ جرم بھی کروالیا جاتا ہے۔جس کی لاٹھی اس کی بھینس کے مصداق سب چلتا ہے،چل رہا ہے۔"

کیپٹن ارباشیر خان نے کٹیلے لہجے میں کہا اور اپنے سامنے کرسی پر براجمان قیصر کو دیکھنے لگا۔

محافظ سینٹر کے آفس میں سرفروشوں کے گروہ کے اہم ارکان ملک کی گمبھیر صورت حال پر اظہارِ خیالات کررہے تھے۔ارشی قیصر اور فوزیہ کو کیپٹن کے پرزور اصرار پر ان کے حوالے کردیا گیا تھا،تاہم وہ زیرِ حراست نہیں تھے۔اب وہ "محافظ" کا حصہ تھے اور کیپٹن کے ساتھ مل کر دشمن کی سرکوبی کیلئے کوشاں تھے۔تاحال کوئی سرا ہاتھ نہیں آپارہا تھا۔وہ ہنوز اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مار رہے تھے۔

"سر۔۔اگر انسپکٹر پاشا کو تحویل میں لے لیا جائے تو یہ گتھی سلجھنے کا امکان ہے۔"

قیصر نے امکان ظاہر کیا۔کیپٹن اسے سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

''اس ضمن میں ایس پی زوار شاہ سے مفصل بات چیت ہوئی ہے ان کا بھی یہی کہنا ہے کہ ثبوت وشواہد کے بغیر کسی پر ہاتھ ڈالنا خلاف قانون ہے، اور اس میں کامیابی کے امکانات بھی نہیں ہیں۔''

ٹیبل پر چائے کے بھاپ اڑاتے کپ رکھ دیے گئے تھے۔

صبح کا وقت تھا اور وہ ابھی ناشتے سے فارغ ہوئے تھے۔ ارشی نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور کیپٹن کی طرف دیکھتے ہوئے دھیمے لہجے میں بولی۔

''اس طرح تو یہ معاملہ طویل ہو کر التوا کا شکار ہو جائے گا۔ فی الوقت ہم ہاشم لنگڑیال پر ہاتھ نہیں ڈال سکتے، لیکن انسپکٹر داؤد پاشا کو تو اٹھا سکتے ہیں۔ یہاں آ کر وہ فرفر بولنے لگے گا۔''

''دیٹس گڈ آئیڈیا کیپٹن''

فوزیہ نے اپنی چہرے پر بکھری ہوئی لٹ کو ہاتھ سے پیچھے کرتے ہوئے کہا۔

''اتنے بااختیار تو آپ ہیں، آج خاموشی سے اس غدار وطن کو اٹھا لیتے ہیں۔ اس سے ہمیں ان تینوں مطلوبہ مجرموں کا کوئی نہ کوئی سراغ ضرور ملے گا۔''

ارشی نے توصیفی نظروں سے فوزیہ کو دیکھا اور چائے کی چسکی لیتے ہوئے بولی۔

''اکرام بھٹی کی پراسرار موت بھی اپنی جگہ بدستور معمہ ہے، اور اس کے ساتھ جولڑکی تھی حور پری۔۔۔ وہ بھی منظر عام سے غائب ہے۔''

اس بار کیپٹن نے تیزی سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ ریسٹ واچ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''حور پری کے متعلق زوار شاہ نے بتایا ہے کہ وہ اس کے پاس ہے، لیکن فی الوقت وہ کسی خفیہ مشن پر ہے۔ امید ہے کہ اس کی طرف سے کوئی اچھی رپورٹ ملے گی۔''

قیصر بولا ''سر آپ بالکل ٹینشن نہ لیں۔ ہمیں فخر ہے کہ ہم آپ کے ساتھ وطن کیلئے کام کر رہے ہیں۔ آپ اجازت دیں انسپکٹر پاشا تین گھنٹے میں محافظ سینٹر میں ہوگا۔''

''او کے۔۔۔ ڈن''

کیپٹن پرجوش لہجے میں بولا۔ ''مجھے کرنل صاحب نے طلب کیا ہے۔ ان سے کچھ ضروری معاملات پر ڈسکس کرنی ہے۔ یہ مشن میں تم لوگوں کو سونپ رہا ہوں، لیکن ارشی کو ابھی آرام کی ضرورت ہے۔ اس کے زخم ابھی مکمل طور پر مندمل نہیں ہوئے۔''

ارشی نے اس کی طرف دیکھا۔ اس کے زرد سے چہرے پر اذیت کے سائے لہرا رہے تھے۔ دوسرے ہی لمحے اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ اس نے چائے کا خالی کپ ٹیبل پر رکھتے ہوئے لرزیدہ لہجے میں کہا۔

''کیپٹن میں اب بالکل ٹھیک ہوں۔ یہ زخم تو مندمل ہو ہی جائیں گے، لیکن میری روح کے زخموں کا مداوا تبھی ممکن ہے کہ میں دھرتی کے دشمنوں کو اپنے ہاتھوں سے کچل کے رکھ دوں۔''

کیپٹن کی آنکھوں میں تفاخر کا احساس ہلکورے لینے لگا۔ بے ساختہ وہ کرسی سے اٹھا اور اس کے پاس پہنچ کر اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

''ارشی ہمیں احساس ہے کہ تمہارے ساتھ بہت غلط ہوا ہے'' اس نے پرخلوص لہجے میں کہا۔ ''تم نے اس جنگ میں بہت کچھ کھویا ہے۔ تمہارا عزم ہمارے متزلزل حوصلوں کو مہمیز دیتا ہے۔ مجھے فخر ہے کہ مجھے تم جیسے سرفروش محب وطن دوست ملے ہیں۔ اس مشن میں قیصر فوزیہ اور تم جاؤ گے۔''

چند لمحوں بعد لائحہ عمل ترتیب پا چکا تھا۔ غازی خان ارشی کو تحسین آمیز نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ پندرہ منٹ بعد وہ جدید اسلحے سے کیس بلیک پراڈو میں اپنے ہدف کی جانب بڑھ رہے تھے۔ ڈرائیونگ سیٹ پر قیصر اور اس کے ساتھ والی سیٹ پر فوزیہ تھی۔ عقبی نشست پر ارشی براجمان تھی۔ وہ تینوں تبدیل شدہ حلیوں میں تھے لہٰذا پہچانے جانے کا امکان نہیں تھا۔ قیصر نے سر کے بال اور داڑھی کافی بڑھا رکھی تھی۔ آنکھوں پر سیاہ چشمہ اور سادہ مگر قیمتی شلوار قمیض میں وہ ایک مہذب اور معزز بزنس مین لگ رہا تھا۔ فوزیہ نے بلیک جینز کے ساتھ ریڈ شرٹ پہن رکھی تھی۔ ارشی پنک کلر شلوار قمیض میں حسب معمول قیامت

ابھار رہی تھی۔ کھلے سیاہ گھنے بال اور سیاہ چشمہ اسے مزید دو ممتاز کر رہا تھا۔ مختلف انواع واقسام کی گاڑیوں کے ہوم کو چیرتی ہوئی بلیک پراڈو برق رفتاری سے ڈاکٹر فیروزہ کلینک کی طرف جا رہی تھی۔ مذکورہ کلینک میں خواتین لطیفہ امراض کا علاج کیا جاتا تھا۔ ڈاکٹر فیروزہ شہر کی سب بہترین اور قابل ڈاکٹر تھیں۔ نکلتے وقت کیپٹن نے ہیں خفیہ ذرائع سے معلوم کر کے انفارمیشن دی تھی کہ پکٹر داؤد پاشا دس بجے اپنی بیوی کے چیک اپ کیلئے اکٹر فیروزہ کے کلینک پر پہنچ رہا ہے۔ یہ سنہری موقع تھا آپ اپنے دام میں صیاد آ رہا تھا۔ دس بجنے میں سات ٹ باقی تھے جب ان کی گاڑی فیروزہ کلینک کے سامنے ک گئی۔

''کام خون خرابے کے بغیر ہو جائے تو زیادہ بہتر ہے''

عقبی نشست سے ارشی نے آہستگی سے کہا۔

''یہ کام میں کر سکتی ہوں۔ تم دونوں گاڑی کے اندر بیٹھنا اور فوراً نکلنے کیلئے تیار رہنا۔''

فوزیہ گردن گھما کر پیچھے دیکھتے ہوئے بولی۔

''ارشی کسی مصیبت میں نہ پڑ جانا۔ میرا خیال ہے ہم دونوں کو چلنا چاہیے۔''

قیصر نے فوراً گفتگو میں مداخلت کرتے ہوئے کہا۔

''میں جانتا ہوں یہ کام ارشی کیلئے مشکل نہیں۔ پھر بھی ہم محتاط رہیں گے اور تمہیں نظر میں رکھیں گے۔ اپنا پستول ساتھ لیتی جانا۔''

ٹھیک پانچ منٹ بعد ایک وائٹ کلر جی ایل آئی کلینک کے سامنے آ کر رکی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر انسپکٹر پاشا اور اس کے ساتھ والی سیٹ پر ایک فربہی مائل دلکش خدوخال کی حامل عورت بیٹھی تھی۔ وہ کسی بات پر زیر لب مسکرا رہے تھے۔ اسی لمحے ارشی گاڑی سے اتر گئی۔ پاشا اور اس کی بیوی بھی گاڑی سے اتر کر کلینک کی طرف بڑھ رہے تھے۔ پاشا سادہ لباس میں تھا، اس نے سرمئی شلوار قمیض اور اسی رنگ کی واسکٹ پہن رکھی تھی۔ وہ اپنی بیوی کا ہاتھ پکڑ کر آہستگی سے آگے بڑھ رہا تھا۔ اس کی درمیانہ قامت بیوی کشادہ سی بلیک شلوار قمیض میں بمشکل چل رہی تھی۔ شاید وہ زچگی کے آخری ایام میں تھی۔ سانولی سی رنگت اور گول چہرے کی حامل مجموعی طور پر وہ خاصی خوبرو عورت تھی۔

ارشی دبے پاؤں ان کے عقب میں چلنے لگی۔ دس بجتے ہی مریضوں کی آمدورفت بڑھ گئی تھی۔ مختصر سا ہسپتال نما کلینک پختہ روسڑک کے کنارے واقع تھا۔ راہداری میں آمنے سامنے متعدد کمرے تھے۔ انہی کمروں میں سے ایک کمرے کی پیشانی پر "آفس" لکھا ہوا تھا۔ اس کے نیچے ڈاکٹر فیروزہ کا نام بھی نظر آ رہا تھا۔ ایک طرف ایکسرے روم اور اس کے ساتھ ہی ہسپتال کا متعلقہ میڈیکل اسٹور تھا۔ مین دروازے سے اندر داخل ہوتے ہی ہال نما کمرہ تھا۔ جس میں دیوار پر آویزاں بڑی سی ایل ای ڈی پر کرکٹ میچ دکھایا جا رہا تھا۔ ہال میں ایستادہ کرسیوں پر مریض اور ان کے لواحقین بیٹھے بور ہو رہے تھے۔ ڈاکٹر فیروزہ اپنے آفس میں پہنچ کر باری باری مریضوں کو دیکھ رہی تھیں۔

ارشی نے انسپکٹر پاشا کو اس کی بیوی کے ساتھ آفس میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا۔ وہ ہال میں ایک کرسی پر بیٹھی بظاہر میچ دیکھ رہی تھی، لیکن اس کی تمام تر توجہات پاشا کی جانب مبذول تھیں۔ ٹھیک پانچ منٹ بعد وہ جھنجلایا ہوا ڈاکٹر آفس سے باہر نکلا، اور زیر لب بڑبڑاتا ہوا مین گیٹ کی طرف بڑھنے لگا۔ وہ بھی آہستگی سے اٹھ کر اس کے پیچھے چلنے لگی۔

''ایک تو یہ احمق عورتیں۔۔۔ کوئی کام ڈھنگ سے نہیں کرتیں۔ کتنی مشکل سے اپوائنٹمنٹ لیا تھا۔ محترمہ اپنی رپورٹس ہی لانا بھول گئیں۔''

وہ بڑبڑاتا ہوا اپنی گاڑی کی طرف بڑھ رہا تھا۔

''آپ نے مجھ سے کچھ کہا؟''

ارشی نے آہستگی سے کہا جو کہ اس کے ساتھ ہی چل رہی تھی۔

''جی جی نہیں میں تو اپنی بیگم کو کوس رہا ہوں، جس کی وجہ سے مجھے دوبارہ گھر جانا پڑ رہا ہے۔''

اس نے بیزار لہجے میں کہا اور گاڑی کا دروازہ کھول کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔

''کیا آپ مجھے لفٹ دے سکتے ہیں؟''

وہ ایک دم اس کے شیشے کے پاس جھکتے ہوئے بولی۔
''میں زیادہ دور نہیں جاؤں گی۔ بس تھوڑا سا آگے مین بازار کے پاس۔''
''او کے او کے بیٹھ جائیں مجھے خوشی ہوگی۔ آپ کی مدد کرکے، ویسے بھی میں پولیس آفیسر ہوں۔''
وہ اسے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔
''اوہ رئیلی؟ بہت خوشی ہوئی۔''
وہ اس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے بولی۔
کچھ ہی دیر بعد گاڑی پختہ روسڑک پر پہنچ گئی۔ بیک ویومرر سے ارشی نے دیکھا، بلیک پراڈو ان کے پیچھے تھی۔
''مجھے لگتا ہے کہ میں نے آپ کو کہیں دیکھا ہے''
پاشا نے اسے ایک لمحے کیلئے دیکھا، اور پھر اپنی توجہ ڈرائیونگ پر مرکوز کردی۔ اس کا دل دھڑکا۔ لیکن اس نے فوراً اپنی کیفیت پر قابو پالیا۔
''جی ضرور دیکھا ہوگا۔ میں دراصل ماڈل ہوں۔''
اس نے ایک ادا سے بکھری ہوئی لٹ کو پیشانی سے ہٹاتے ہوئے کہا اور اپنے ٹچ اسکرین سیل فون کو دیکھنے لگی۔
''ویری گڈ۔'' وہ امپریس ہوکر بولا۔
''ویسے مجھے کوئی ایسا میریل یاد نہیں آرہا جس میں میں نے آپ کو دیکھا ہو۔'' اس کے لہجے میں تشکیک کا پہلو نمایاں تھا۔
''دیکھو محترمہ میرے دن رات مجرموں کے ساتھ گزرتے ہیں۔ گھاٹ گھاٹ کا پانی پی رکھا ہے میں نے۔ تمہیں بتا تا چلوں کہ تم جتنا بھی میک اپ کرلو میں نے تمہیں پہچان لیا ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ تم تو کیپٹن کی تحویل میں تھیں۔ وہاں سے بھاگنے میں کیسے کامیاب ہوئیں اور تمہارے ساتھی''
اس نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑا اور ایکسیلیٹر پر پیر کا دباؤ بڑھا دیا۔
دوسرے ہی لمحے گاڑی ہوا سے باتیں کرنے لگی۔ چند لمحوں کیلئے ارشی متذبذب ہوئی، لیکن پھر اس نے عزم کا دامن تھام لیا۔
''گاڑی روکیں یہ آپ کیا بے سروپا باتیں کررہے ہیں، اور اپنی بیوی کی فکر کریں وہ وہاں رپورٹ کا انتظار کررہی ہوگی۔''
''گاڑی تو اب تھانے جا کر ہی رکے گی'' وہ مکارانہ لہجے میں بولا۔ ''اور میری بیوی کی فکر نہ کرو۔ وہ تو گھر بھی جا چکی ہوگی۔ دراصل تمہیں دیکھتے ہی مجھے شک ہوگیا تھا۔ اسی لیے میں نے یہ سارا کھٹ راگ کیا اور دیکھ لو میرا شک درست نکلا۔ تم انتہائی خطرناک ٹیررسٹ ارشی ہو۔''
یہی وہ لمحہ تھا جب ارشی نے پستول نکال کر اس کے پہلو سے لگا دیا۔ دوسرے ہی لمحے بلیک پراڈو نے انہیں برق رفتاری سے اوورٹیک کیا اور پاشا کی گاڑی کے آگے چلنے لگی۔ مجبوراً اسے سپیڈ سلو کرنا پڑی۔
''تم ہماری سوچ سے بھی زیادہ چالاک اور خطرناک ہو پاشا'' وہ غراتے ہوئے سفاک لہجے میں بولی۔ ''گاڑی روکو اور خبردار پستول کی طرف ہاتھ مت بڑھانا ورنہ......''
اسی لمحے ان کے آگے چلتی ہوئی بلیک پراڈو کے بریک چرچرائے۔ پاشا نے عجلت میں بریک پر پیر رکھا۔ ایک ہلکے سے جھٹکے کے ساتھ جی ایل آئی پراڈو کے عقبی حصے سے ٹکرا کر رک گئی۔
اس سے پہلے کہ پاشا سنبھلتا یا کچھ سمجھتا۔ ارشی نے نہایت مہارت سے پستول کا دستہ اس کی کنپٹی پر مارا۔ وہ حیرت زدہ آنکھوں کے ساتھ اسے دیکھتا ہوا بیہوش ہو گیا۔ دو منٹ بعد بلیک پراڈو محافظ سینٹر کی طرف دوڑ رہی تھی۔ ارشی کی برمائی ہوئی نظریں گاڑی کے فرش پر بے سدھ پڑے پاشا کو گھور رہی تھیں۔

❀......❁......❀

نور الٰہی کو اپنی بیٹی جان سے عزیز تھی، لیکن وہ قدرے سخت مزاج اور ضدی واقع ہوا تھا۔ جو بات کہہ دیتا اس پر ڈٹ جاتا تھا۔ پھر کوئی دلیل منت سماجت اسے موم نہیں کرسکتی تھی۔ وہ پچپن سال کا صحت منداور لمبا تڑنگا آدمی تھا۔ کھردرے نقوش اور سخت ہاتھ پیر اس کے محنت کش ہونے کی دلیل تھے۔ اسلام پورہ میں ہی ایک زمین کا ٹکڑا اس کا ذریعہ معاش تھا۔ وہ دل جمعی سے محنت کرتا اور زمین کے اسی ٹکڑے سے سونا کشید کرتا تھا۔ اس

گاؤں میں اس کی بیوی ہاجرہ اس کا ہاتھ بٹاتی تھی۔ وہ سادہ سی عورت تھی۔ اسے نئی دنیا کے تقاضوں کی سوجھ بوجھ نہیں تھی۔ اگرچہ کہ وہ نورالٰہی سے چھ سات سال چھوٹی تھی، لیکن وقت کی دھول نے اس کے نقوش بھی دھندلے کردیے تھے۔ پانچ مرلے کا چھوٹا سا مکان ان کے کل اثاثوں میں شمار ہوتا تھا۔ پختہ چار دیواری دو کمرے جو کہ پلستر نہیں ہوئے تھے۔ کمروں کے آگے برآمدہ دائیں طرف کچن اور سامنے مرکزی دروازے سے اندر داخل ہوتے ہی باتھ روم تھا۔ کچے صحن کے وسط میں بیری کا درخت تھا، جس کی چھاؤں تو اتنی گھنی نہیں تھی لیکن اس کے بیر بہت میٹھے تھے۔ محلے کے بچوں کا ہجوم اکثر لگا رہتا تھا۔

ہاجرہ کے میکے میں صرف اس کا بھائی ہی تھا۔ اس سے بھی مدتوں بعد ملاقات ہوتی تھی، جبکہ نورالٰہی کے کافی سے زیادہ رشتے دار اسی گاؤں میں سکونت پذیر تھے، لیکن اس کے سخت رویے کے باعث آہستہ آہستہ سب نے مراسم ختم کرلیے تھے۔ نادیہ نورالٰہی اسی گھر کے آنگن میں کھیلتی کودتی نازنخرے کرتی جوانی کی دہلیز تک پہنچی تھی۔ اس نے خوب رنگ روپ نکالا اور دیکھتے ہی دیکھتے ماں کے قدوقامت سے تجاوز کرگئی۔ تب سے نورالٰہی کی نیند میں خلل پڑنے لگا تھا۔ وہ ساری رات حقہ گڑگڑاتا اور سوچوں کے گھمسان میں پھنسا رہتا تھا۔ ایسی ہی ایک سرد رات تھی، جب وہ باتھ روم کی طرف جاتے ہوئے ٹھٹک کر رک گیا۔ نادیہ کے کمرے سے باتوں کی آواز نے اسے چونکنے پر مجبور کردیا تھا۔ وہ دبے پاؤں آگے بڑھا اور دروازے کے ساتھ کان لگا کر کھڑا ہوگیا۔

وہ دبی دبی آواز میں کہہ رہی تھی۔

''تم سمجھتے کیوں نہیں ہو افضال ابا کسی صورت نہیں مانے گا۔ تمہیں پتہ ہے جب وہ ضد پر اڑ جاتا ہے تو پتھر کا پہاڑ بن جاتا ہے۔''

اس کا خون کھول رہا تھا۔ وہ جسے جان سے عزیز سمجھتا تھا، وہ بیٹی جو اس کی عزت اور غیرت کی محافظ تھی۔ اس کی ناک کے عین نیچے کیا گل کھلا رہی تھی۔ باتوں کی آواز دھیمی پڑھ گئی تھی۔ وہ کچھ سننے اور سمجھنے سے قاصر تھا۔ اسے اپنا فشارِ خون تیز ہوتا محسوس ہونے لگا۔ لرزتے ہوئے جسم کے ساتھ اس نے غیر ارادی طور پر اپنے عقب میں دیکھا۔ ہاجرہ پتھر کا بت بنے اس کے پیچھے کھڑی تھی۔ وہ غراتے ہوئے آہستگی سے بولا۔

''ہاجرہ! آج میں اسے مار ڈالوں گا۔ اس نے موبائل فون بھی رکھا ہوا ہے، اور چوری چوری باتیں کرتی ہے۔ تم کہاں ہوتی ہو؟ تمہیں نہیں پتہ تمہاری بیٹی کیا "چن" چڑھا رہی ہے۔''

وہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں کے مصداق چپ چاپ بند دروازے کو گھور رہی تھی۔ اندر سے باتوں کی آواز بند ہوگئی تھی۔ شاید نادیہ کو دروازے پر کسی کی موجودگی کا احساس ہوگیا تھا۔ ہاجرہ نے دونوں ہاتھ نورالٰہی کے آگے جوڑ دیے اور گڑگڑا کر کہا۔

''نورالٰہی تینوں رب رسول دا واسطہ، اس بات کو یہیں ختم کردے، ورنہ ہم جہان سے اٹھ جائیں گے۔ جوان دھی ہے۔ میں نے تم سے آج تک کچھ نہیں مانگا۔ بس آج میری مان لے۔ تو اپنے کمرے میں چلا جا۔ میں اس سے بات کرتی ہوں۔''

نہ جانے قبولیت کا کون سا لمحہ تھا، جب وہ پتھر کا پہاڑ موم ہوگیا۔ ایک باپ کی حیثیت سے اس نے کسی مصلحت کو پیشِ نظر رکھا، اور مفاہمت پر آمادہ ہوگیا۔ چند لمحوں بعد وہ اپنی چارپائی پر پڑا چھت کو گھور رہا تھا۔

ہاجرہ کی ہلکی سی دستک نے نادیہ کو دہلا کے رکھ دیا تھا۔ وہ تھرتھر کانپتی ہوئی دروازے سے کان لگائے کھڑی تھی۔ رات کا پچھلا پہر جب لوگ گہری نیند کے مزے لوٹ رہے تھے۔ باپ کمرے میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے چھت کو گھور رہا تھا۔ چشمِ افلاک ایسے ان گنت واقعات کی چشم دید گواہ، گھور اندھیری رات ایسے ہزارہا رازوں کی امین، سب محوِ تماشہ تھے۔ خاموشی کے قفل توڑنا ان کی سرشت میں نہیں تھا۔

اسی لمحے اچانک آہستگی سے دروازے کا ایک پٹ وا ہوا۔

سردی سے ٹھٹھرتے وجود اور بھیگی آنکھوں کے ساتھ وہ

بیٹی کے کمرے میں داخل ہوگئی۔زیرو پاور بلب کی کمزور سی روشنی میں وہ کسی مجرم کی طرح سر جھکائے، اس کے سامنے کھڑی تھی۔کمرے میں پرانا فرنیچر ترتیب سے رکھا ہوا تھا۔خستہ سا بیڈ، شوکیس اور پیٹی سیٹ کے اوپر دو صندوق، بیڈ پر بچھے ہوئے بستر میں شاید کوئی اور بھی تھا جسے ہاجرہ کی بوڑھی آنکھیں اندھیرے میں دیکھنے کی کوشش کررہی تھیں۔ایک دم بیٹی ماں کے قدموں میں گر کر گڑگڑانے لگی۔

''اماں مجھے معاف کردے۔بس مجھے ایک موقع دیدے۔میں تمہیں کبھی شکایت کا موقع نہیں دوں گی۔''

ماں کی آنکھیں بیڈ پر پڑی رضائی پر مرکوز تھیں۔اس نے قدموں میں گری بیٹی کو بازو سے پکڑا اور اٹھا کر اپنے سامنے کھڑا کردیا۔وہ اسے شکوہ کناں نظروں سے دیکھتے ہوئی بولی۔

''کیا کمی تھی ہمارے لاڈ پیار میں کہ تم نے ہمیں اتنی بڑی سزا دی۔ہماری غیرت اور اعتبار کا جنازہ نکال دیا۔میں تو تیری ماں ہوں، ماں سہیلی ہوتی ہے۔تو نے مجھے تو کچھ بتایا ہوتا۔نادیہ یہ کون ہے؟''

اس نے بیڈ کی طرف اشارہ کیا۔

''اماں۔۔۔اماں۔۔۔''

وہ بمشکل بول پائی۔

''یہ افضال ہے اماں۔اسے جانے دو۔میں تمہیں سب کچھ سچ سچ بتادوں گی۔''

اس نے ماں کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے۔ماں بے بس تھی۔ممتا کے ہاتھوں مجبور تھی۔وہ آنکھیں بند کرکے ایک طرف ہٹ کر کھڑی ہوگئی۔چند ہی لمحوں بعد اندھیری رات کے سناٹے میں چور بن کر آنیوالا چور کی طرح غائب ہو چکا تھا۔

وہ اسے تشکیک آمیز نظروں سے دیکھ رہی تھی۔اس کی آنکھوں میں نفرت اور کراہیت تھی۔وہ ماں کی نظروں کی تاب نہ لاسکی۔اس نے آنکھیں جھکا کر آہستگی سے کہا۔

''اماں میں اس سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔ہم ایک دوسرے سے بہت پیار کرتے ہیں۔وہ بہت اچھا ہے کماتا ہے اماں تو جانتی ہوگی اپنے ماسٹر شریف کا بیٹا ہے۔ہمارے ہی محلے میں رہتا ہے۔''

ماں نے کوئی جواب نہیں دیا۔وہ اسے قہر بار نظروں سے گھور رہی تھی۔اپنے بوسیدہ دوپٹے کے پلو سے آنکھیں پونچھتے ہوئے اس نے کہا۔

''میں تمہارے باپ کو کیا جواب دوں گی۔وہ تو سمجھ رہا ہے، تمہارے پاس موبائل فون ہے۔مجھے فون دیدو میں اسے مطمئن کرلوں گی، اور رہی شادی کی بات تو تم جانتی ہو اب وہ کسی صورت نہیں مانے گا۔''

ایک جھٹکے سے اس نے ماں کے دونوں ہاتھ دوبارہ پکڑ لیے اور بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''اماں مجھے تیری قسم، اللہ رسول کی قسم میرے پاس موبائل فون نہیں ہے، اور اماں تو میرا ساتھ دے تو ابا مان جائے گا۔''

ماں ایک جھٹکے سے ہاتھ چھڑوا کر پیچھے ہٹ گئی۔وہ اپنے ہاتھوں کو عجیب سی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔سلگتے ہوئے لہجے میں اس نے گویا بیٹی کے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ انڈیل دیا۔

''تمہارے ابے کو میں جانتی ہوں۔میں نے اس کے ساتھ آدھی صدی گزاری ہے۔وہ مرجائے گا، تمہیں ماردے گا مگر مانے گا نہیں۔تم نے جو چن چڑھانا تھا چڑھا لیا۔اب میں اسے کیا بتاؤں گی کہ تم کس سے بات کررہی تھیں۔''

وہ سرخ آنکھوں سے اسے دیکھتی ہوئی ایک قدم آگے بڑھی۔ماں پیچھے ہٹی اور دیوار سے لگ گئی۔اس نے کراہیت آمیز لہجے میں کہا۔

''مجھے تم سے گھن آرہی ہے۔اب مجھے ہاتھ مت لگانا۔تم نے ہماری عزت کا سرمایہ لٹا دیا ہے۔ہمیں زندہ درگور کردیا ہے۔''

''اماں تیری قسم میں اب بھی پاک دامن ہوں۔اگر تجھے یقین نہ آیا اور تو نے میرا ساتھ نہ دیا تو آج کی صبح مجھے زندہ نہیں دیکھو گی۔''

بیٹی کے لفظوں نے اسے سرتاپا لرزا کے رکھ دیا۔وہ قلزمِ ہستی میں ٹوٹ کر بکھر رہی تھی۔جو بھی تھا۔جیسے بھی حالات تھے۔وہ اس کی اکلوتی اولاد تھی۔

جگر کا ٹکڑا تھی۔ سیدھی سادی ممتا بیٹی کی باتوں میں آگئی۔ اس نے اسے سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔

''دیکھیے۔۔۔ وہ لڑکا تو پورے پینڈ میں بدنام ہے۔ آوارہ ہے، یہ تم نے کیا کیا۔ میں تمہارا ساتھ کیسے دوں گی۔ ہمارے پاس کوئی راستہ نہیں ہے۔ بس جو ہوا اسے ڈراؤنا خواب سمجھ کر بھول جا۔''

''رستہ ہے اماں۔۔۔''

اس نے ماں کی نمناک آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''کیا رستہ ہے؟ مجھے بتا'' ماں کے لہجے میں بے تابی عود کر آئی۔

''پیر نقاب پوش'' اس نے آہستگی سے کہا۔

''اماں وہ اللہ کے برگزیدہ بندے ہیں۔ ہماری مشکل آسان ہوجائے گی۔ ابا مان جائے گا۔''

ماں تفہیمی انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔

''دیکھیے۔۔۔ یہ کام تو پہلے کرنا تھا۔ چل اب سو جا۔ اللہ بہتر کرے گا۔''

ماں کے جاتے ہی اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ رقص کرنے لگی۔ وہ جو چور بن کر آیا تھا اس کی دوشیزگی کا سرمایہ لوٹ کر جا چکا تھا۔ اس نے اپنے گریبان میں ہاتھ ڈالا۔ دوسرے ہی لمحے ایک چھوٹا سا موبائل فون اس کے ہاتھ میں نظر آرہا تھا۔ اس نے دروازے کی طرف دیکھا، اور مطمئن ہوکر نمبر ڈائل کرنے لگی۔

پہلی ہی بیل پر کال ریسیو کرلی گئی۔

''افضال! میں نے اماں سے بات کرلی ہے۔ تو بے فکر ہوجا کل میں پیر نقاب پوش کے آستانے پر جاؤں گی۔''

اس نے سرگوشی کی اور جلدی سے سیل فون آف کرکے مخصوص جگہ پر چھپالیا۔

دوسری ہی شام وہ پیر نقاب پوش کے آستانے پر جا پہنچی تھی۔ اس کا دیا ہوا تعویذ اور پانی وہ اپنے باپ کو تین دن سے پلا رہی تھی۔ حیرت انگیز طور پر وہ ایک دم نرم ہوگیا تھا۔ اس کا غصہ ناراضی اور ضد ختم ہورہی تھی۔ آج ثمرات عشا کے بعد وہ دوبارہ آستانے پر جانے کیلئے تیار ہورہی تھی۔

افضال بھی پیر نقاب پوش سے ملنے کیلئے بے تاب تھا۔

❀.....◉.....❀

''جی ڈاکٹر صاحبہ جیسا کہ میں آپ کو بتا چکی ہوں میرا نام مہرین ہے۔ میں ان میرڈ ہوں۔ میرے ماں باپ اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ میں ایک پرائیویٹ اسکول میں پڑھاتی ہوں۔ بس یہ ہیں میری مختصر سی مصروفیات۔''

ڈاکٹر ماہا بخاری کے سامنے بیٹھی ہوئی دلکش لڑکی نے عامیانہ سے لہجے میں کہا اور اس کی طرف دیکھنے لگی۔

''اوہ آئی ایم سوری، آپ کے حالات زندگی سن کر افسوس ہوا۔ آپ تنہائی کی وجہ سے ڈپریشن کا شکار بھی رہتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کا بی پی لو ہوجاتا ہے۔ میں کچھ دوائیں لکھ کر دے رہی ہوں۔ انہیں ایک ہفتہ استعمال کریں۔ ان شاءاللہ افاقہ ہوگا۔''

ڈاکٹر ماہا'' کیتھی برنارڈ'' نے سلپ پر میڈیسن لکھتے ہوئے نرم لہجے میں کہا۔

''فروٹ بکثرت کھایا کریں، آپ کو وٹامنز کی کمی بھی ہے۔ بھوک کا نہ لگنا معدے کی خرابی کی وجہ سے ہے۔ اس کی میڈیسن بھی لکھ دی ہے۔''

وہ بھرپور نظروں سے ڈاکٹر ماہا کو دیکھ رہی تھی۔ بہ ظاہر وہ ایک عام سی بے ضرر اور جذبہ خدمت خلق سے سرشار انتہائی دردمند ڈاکٹر نظر آرہی تھی، لیکن ایس پی زوار شاہ کے شکوک کے پس منظر میں وہ ایک مشکوک شخصیت تھی۔ بہت زیادہ تحقیق و تفتیش کے باوجود بھی انہیں اس کے مکمل کوائف دستیاب نہیں ہو پائے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ایس پی نے اپنی ایما پر اور حور پری کے اصرار پر اسے یہ مشن سونپ دیا تھا۔ وہ اکرام بھٹی کی موت کے بعد سے زوار شاہ کے گھر ہی میں رہ رہی تھی۔ ازاں بعد اس کی ماں کو بھی وہیں بلوالیا گیا تھا۔ یہ سارا کام خفیہ طور پر ہوا تھا، اور اب وہ اسی مشن کے سلسلے میں ڈاکٹر ماہا کے اسپتال میں موجود تھی۔ وہ مختلف حلیے کے ساتھ نام بدل کر اب اس کے سامنے بیٹھی تھی۔

اس نے سلپ پکڑتے ہوئے مستفسرانہ انداز میں کہا۔

''تھینکس ڈاکٹر یعنی مجھے ایک ہفتے بعد پھر چیک اپ کروانا ہوگا؟''

''جی یہ بہت ضروری ہے۔''

اس نے پیشہ ورانہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

وہ کرسی سے اٹھتے ہوئے اچانک لڑکھڑا کر دوبارہ کرسی پر ڈھے سے گئی۔اس نے اپنا سر دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا۔ چند ہی لمحوں بعد اس کا سر ایک طرف ڈھلک گیا وہ بیہوش ہو چکی تھی۔

''اوہ اسے کیا ہوا۔''

ڈاکٹر زیر لب بڑبڑاتی ہوئی کرسی سے اٹھ کر اس کی طرف لپکی۔

''ثمینہ!''

اس نے آفس کے دروازے کی طرف منہ کر کے کسی کو پکارا۔ دوسرے ہی لمحے نرس کے یونیفارم میں ایک خوش شکل لڑکی اندر داخل ہوئی۔

پانچ منٹ بعد اسے زنانہ وارڈ کے ایک بیڈ پر منتقل کیا جا چکا تھا۔ چیک اپ کیلئے ڈاکٹر صدیقی کو بھی بلا لیا گیا تھا۔

''بہت زیادہ ویکنیس ہے۔اسے نروس بریک ڈاؤن ہوا ہے۔ڈرپ لگائیں اور ایڈمٹ کر لیں۔'' ڈاکٹر صدیقی نے تشویش زدہ لہجے میں کہا۔''اس کے ساتھ کوئی ہے؟''

''نہیں سر یہ اکیلی ہی آئی ہے''

ثمینہ نے اسے انجکشن دیتے ہوئے بتایا۔

''اوکے اسے ٹریٹمنٹ اور مکمل آرام کی ضرورت ہے۔ہوش میں آجائے تو اسے کہیں کہ اپنے کسی عزیز کو انفارم کر دے۔''

وہ اسے سرتاپا گھورتا ہوا آہستگی سے بولا۔

وہ دل ہی میں مسکرا رہی تھی۔بیہوشی کا ڈرامہ اور اس کے پلان کا پہلا مرحلہ کامیاب رہا تھا۔وہ یہاں چند روز رہنا چاہتی تھی، تاکہ ہاسپٹل کی سیکرٹ ایکٹیویٹیز سے متعلق کچھ معلومات حاصل کر سکے۔ماہا نے اس کے کندھے میں لٹکا ہوا بیگ اتار کر اسے دیکھ لیا تھا۔ بیگ میں کچھ نقدی ذاتی اشیا اور ایک سادہ سا سیل فون تھا، جو کہ آف تھا۔اس نے فی الوقت اسے آن کرنا مناسب نہیں سمجھا، اور اپنے آفس میں آکر مریضوں میں مصروف ہو گئی۔

نصف گھنٹے بعد اس نے کسمساتے ہوئے آہستگی سے آنکھیں کھول دیں۔تھوڑی دیر بعد ثمینہ نے ڈاکٹر ماہا کو اطلاع دے دی کہ مریضہ ہوش میں آچکی ہے۔ہوش میں آنے کے بعد وہ کمرے کا جائزہ لے رہی تھی۔سنگل بیڈ کے ساتھ چھوٹا سا ٹیبل پڑا ہوا تھا۔جس پر اس کی میڈیسن فائل پڑی تھی۔بیڈ سے کچھ فاصلے پر اسٹول نظر آرہا تھا، جس پر تین چار لوگ با آسانی بیٹھ سکتے تھے۔کمرے میں اٹیچ باتھ کی سہولت بھی تھی۔شیشے کی کھڑکی سے دھوپ اندر جھانک رہی تھی۔اپنا بیگ اسے سرہانے کے نیچے پڑا مل گیا تھا۔اسی دوران ڈاکٹر ماہا بھی پہنچ گئی۔

''اب کیسا فیل کر رہی ہیں آپ؟''

وہ اس کی نبض دیکھتے ہوئے نرم لہجے میں بولی۔

''میں آپ کو بتاتی چلوں آپ کا نروس بریک ڈاؤن ہوا ہے۔یہ ویکنیس کی لاسٹ اسٹیج ہوتی ہے۔اس کے بعد کچھ بھی ہو سکتا ہے، اینی وے تھینکس گارڈ کہ آپ یہاں موجود تھیں اور آپ کو بروقت طبی امداد مل گئی۔''

وہ ڈاکٹر ماہا کو کھوجتی نظروں سے دیکھنے لگی۔نہ جانے کیوں اسے گماں گزرا کہ اس کا ہیئر اینڈ اسکن کلر اور نیچرل نہیں ہے۔خوبصورت گداز ہونٹ تنا ہوا شفاف بدن اور انتہائی خلیق لہجہ، لیکن اسے اس کا لہجہ بھی مصنوعی لگ رہا تھا۔

''یقیناً ایس پی صاحب کے شبہات درست ہیں''

اس نے ماہا کی طرف دیکھتے ہوئے سوچا۔

وہ بدستور اسے دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔حسبِ عادت اس نے نرم لہجے میں کہا۔

''مہرین۔۔۔ میں نے کچھ پوچھا ہے۔اب کیا فیل کر رہی ہیں؟''

وہ ایک دم چونکتے ہوئے کمزور سے لہجے میں بمشکل بولی۔

''جی کچھ بہتر محسوس کر رہی ہوں، لیکن ٹانگیں بے جان سی لگ رہی ہیں اور دل بھی۔۔۔''

''آپ بے فکر ہو جائیں اور ذہن کو آزاد چھوڑ دیں''

وہ اس کی بات کاٹتے ہوئے بولی۔

''آپ کو انجکشن دے دیے ہیں، اور اس ڈرپ کے ختم ہونے تک آپ بہت بہتر محسوس کریں گی اور ہاں اپنے کسی عزیز کو بلوا لو تو اچھا ہو گا۔''

وہ بمشکل آہستگی سے مسکرائی تو اس کے گداز لبوں کے ے شفاف موتی جھلملانے لگے۔اس نے دھیرے سے کہا۔

''تھینکس ڈاکٹر آپ بہت اچھی ہیں اور میں کال کر کے اپنے ماموں زاد بھائی کو بلا لیتی ہوں۔''

ڈاکٹر کے ساتھ ثمینہ بھی جا چکی تھی۔اس نے سرہانے کے نیچے سے اپنا بیگ نکالا۔تمام چیزوں کو چیک کیا اور سیل فون آن کر دیا۔

کچھ ہی دیر بعد وہ کسی سے بات کر رہی تھی۔

اس نے آہستگی سے کہا۔

''ہیلو سب کچھ پلان کے مطابق ہوا ہے۔آپ جلدی سے آجائیں۔ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ پیشنٹ کے کسی عزیز کا پاس ہونا ضروری ہے۔''

''اوکے میں ابھی نکل رہا ہوں''

دوسری طرف سے گمبھیر لہجے میں کہہ کر کال منقطع کر دی گئی۔اس نے زیرلب مسکراتے ہوئے آنکھیں بند کر لیں۔ڈرپ کا محلول قطرہ قطرہ اس کے جسم میں منتقل ہو رہا تھا۔اب اسے بھوک بھی محسوس ہو رہی تھی۔مراد نے فوراً نکلنے کا کہا تھا۔زیادہ سے زیادہ وہ پونے گھنٹے میں اس کے پاس پہنچ سکتا تھا۔

اس مشن کیلئے اسے کافی محنت کرنا پڑی تھی۔وہ کئی دن سے بھوکی پیاسی تھی۔بس انسانی ضرورت کے مطابق ایک آدھ لقمہ اور دو گھونٹ پانی پی لیتی تھی۔کچھ ہی دنوں میں اس کی صحت بہت زیادہ متاثر ہوئی تھی۔آنکھوں کے گرد حلقے، خشک ہونٹ، لاغر وجود، یہ سب اس پلان کا حصہ تھا، جو کہ ایس پی زوار شاہ نے ترتیب دیا تھا۔اس کے علاوہ دو تین ہفتے اسے انسانی نفسیات اور مارشل آرٹ سے متعلق بھی سمجھایا گیا تھا۔وہ اپنے وطن کے معصوم لوگوں، اپنے باپ محمد حیات اور فرض شناس پولیس آفیسر اکرام بھٹی کے قاتلوں سے انتقام لینے کیلئے سربکف ہو چکی تھی۔اور یہی جذبہ تھا جو ایک عام سی لڑکی کو موت کے ہرکاروں کے مقابل لے آیا تھا۔ایک گھنٹے بعد پلان کے مطابق نوجوان پولیس آفیسر مراد ملک اس کے پاس پہنچ گیا، لیکن وہ خالص دیہاتی حلیے میں تھا۔اس نے لمبے سے کشادہ کرتے کے ساتھ نیلی دھوتی باندھ رکھی تھی۔پاؤں میں موچیوں والے چمڑے کے جوتے تھے۔سر اور داڑھی کے بال اس نے بڑھا لیے تھے۔وہ کچھ فروٹ اور کھانے پینے کی اشیا بھی لایا تھا۔

انہوں نے غیر ضروری گفتگو سے پرہیز کیا اور ایک دوسرے سے عام سا رویہ رکھا۔وہی رویہ جو ایک تیماردار یا کسی عزیز کا مریض کے ساتھ ہوتا ہے۔

ڈاکٹر صدیقی اور ماہا اسے دوبارہ چیک کر کے جا چکے تھے۔مراد نے بتایا کہ وہ پنڈ سے آیا ہے اور مہرین کا رشتے دار ہے۔وہ سادہ سا دیہاتی ان دونوں کو بے ضرر سا محسوس ہوا۔وہ اس کی موجودگی میں کچھ بھی کر سکتے تھے۔

ڈاکٹر کی اجازت سے اس نے ہلکا پھلکا کھانا کھا کر چائے بھی پی تھی۔اب اس کی طبیعت قدرے بہتر تھی لیکن مزید دو گھنٹے بعد وہ اچانک پھر بیہوش ہو گئی۔

اس بار مراد نے ایک مخصوص نشہ آور دوا کا ایک قطرہ اس کے منہ میں ڈال دیا تھا۔وہ زیرلب مسکراتی ہوئی بے سدھ ہو گئی تھی۔

کچھ دیر بعد دونوں ڈاکٹر اس کے پاس موجود تھے۔

ڈاکٹر صدیقی نے اس کی نبض دیکھتے ہوئے تشویش سے کہا۔

''ویکنس بہت زیادہ ہے۔بار بار نروس بریک ڈاؤن سے پیشنٹ کی موت بھی ہو سکتی ہے۔اسے فوراً ایمرجنسی وارڈ میں شفٹ کیا جائے۔''

پانچ منٹ بعد اسے ہاسپٹل کے ایمرجنسی وارڈ میں پہنچا دیا گیا۔مشن کا پہلا مرحلہ کامیابی سے ہمکنار ہو گیا تھا۔

❁ ...... ❁ ...... ❁

محب الوطن سرفروشوں کا محافظ سینٹر یہاں سے بیس منٹ کی مسافت پر واقع تھا۔بلیک پراڈو برق رفتاری سے دوڑتی چلی جا رہی تھی، تاہم بعض جگہوں پر ٹریفک کے رش کے باعث سپیڈ سلو بھی کرنا پڑ رہی تھی۔قیصر ماہر و مشاق ڈرائیور ثابت ہو رہا تھا، لیکن فی الوقت مقدر کے ستارے یاوری نہیں کر رہے تھے۔ٹھیک پانچ منٹ بعد ایک فورسیٹر ٹویوٹا بلیک پراڈو کے عین ساتھ نظر آ رہا تھا۔اگرچہ

کہ یہ عجیب بات نہیں تھی سڑک پر گاڑیوں کا ازدحام تھا، لیکن فورسیٹر ٹویوٹا میں متعدد مسلح افراد نظر آرہے تھے، جن کے تیور خطرناک لگ رہے تھے۔ وہ ہر حال میں پراڈو کو اوورٹیک کرنا چاہ رہے تھے۔ قیصر نے بھی ایکسیلیٹر پر پیر کا دباؤ بڑھا دیا تھا۔ ٹویوٹا اور پراڈو آگے پیچھے برق رفتاری سے دوڑ رہی تھیں۔ ٹریفک متاثر ہوئی تھی، لیکن کسی نے مداخلت یا کسی ردعمل کا اظہار نہیں کیا۔ حتیٰ کہ پولیس ناکے پر بھی کسی نے انہیں رکنے کا سگنل نہیں دیا اور یوں ون وے سڑک پر یہ دونوں گاڑیاں سب سے آگے تھیں۔

''لگتا ہے یہ پاشا کے ساتھی ہیں۔ ان کے ارادے بہت خطرناک لگ رہے ہیں۔''

فوزیہ نے ٹویوٹا کی طرف دیکھتے ہوئے خدشہ ظاہر کیا۔

''تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ یہ دشمن ہیں اور تعداد میں چار ہیں۔ شک کی کوئی گنجائش نہیں ان کے پاس خطرناک اسلحہ بھی ہوگا۔ یہ مرنے مارنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔'' عقب سے ارشی نے قدرے بلند آواز میں کہا۔

فوزیہ متوحش نظروں سے دشمن کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''اسلحہ ہمارے پاس بھی ہے۔ گاڑی میں تین تین اے کے 47 اور بریٹا پسٹل کے علاوہ دستی بم بھی ہیں۔ دشمن کو اینٹ کا جواب پتھر سے ملے گا۔''

قیصر پیچھے دیکھے بغیر پرجوش لہجے میں بولا۔

''او کے تم اسلحہ نکال کر ریڈی کرو، اور ابھی کوئی رسک نہ لینا ٹریفک سے نکل کر ان سے نپٹتے ہیں۔''

اسی دوران فوزیہ بھی ارشی کے پاس عقبی حصے میں پہنچ گئی۔ دو منٹ بعد اسے کے سینتالیس گنز موت اگلنے کیلئے تیار تھیں۔

اچانک ایک لمحاتی خیال کے تحت قیصر نے کہا۔

''اس خبیث کے ہاتھ پیر باندھ دو۔ گاڑی میں نائیلون کی رسی موجود ہے۔''

کچھ دیر بعد اس کے ہاتھ پاؤں باندھ دیے گئے۔ فوزیہ اور ارشی اے کے سینتالیس سنبھال کر موجودہ صورتِ حال سے نپٹنے کیلئے تیار تھیں۔ ایک گن قیصر کو بھی دے دی گئی۔ اب قدرے سنسان علاقہ شروع ہوگیا تھا۔ اکا دکا گاڑیاں گزر رہی تھیں۔ دن کے بارہ بج رہے تھے۔ تیز رفتاری میں محافظ سینٹر کافی پیچھے رہ گیا تھا۔ متعاقب گاڑی بالکل قریب تھی۔

شہر کے آثار مفقود ہو رہے تھے۔ مین روڈ سے کچھ فاصلے پر نشیبی علاقے میں کماد اور مکئی کے کھیت لہلہا رہے تھے۔ پگڈنڈی پر قطار در قطار مختلف انواع واقسام کے درخت بھی نظر آرہے تھے۔ جن میں زیادہ تر ٹاہلی اور کیکر تھے۔ قیصر نے بیک ویو مرر میں دیکھا۔ عقب میں دوڑتی ہوئی گاڑی کی کھڑکی سے رائفل کی مہیب نال کا رخ ان کی گاڑی کی طرف تھا۔ ایک لمحے کیلئے وہ دہل کر رہ گیا۔ اتنی تیز رفتار میں اگر گاڑی کا ٹائر برسٹ کیا جاتا تو بہت زیادہ نقصان کا احتمال تھا۔ نتیجے میں گاڑی الٹ سکتی تھی اور ان کے بچنے کا امکان صفر کے برابر بھی نہیں تھا۔ گاڑیوں کی سپیڈ سو سے متجاوز تھی۔

''سامنے ٹول پلازہ ہے۔ وہاں ڈرائیونگ سیٹ پر میں آجاؤں گی۔'' فوزیہ نے عقب سے کہا۔

''ٹھیک ہے۔ وہ بھی وہاں رکیں گے، لیکن مجھے امید ہے وہ ایسی جگہ پر حملہ نہیں کریں گے۔''

قیصر نے رفتار سلو کرتے ہوئے کہا، کیونکہ سامنے ٹول پلازہ اور سپیڈ بریکر نظر آرہے تھے۔ دشمن کی گاڑی دوسری لائن میں تھی۔ انہی چند لمحوں کی مہلت میں فوزیہ ڈرائیونگ سیٹ پر پہنچ چکی تھی۔

ٹول پلازہ سے نکلتے ہی اس نے رفتار بڑھا دی۔

اس نے بیک ویو مرر میں دیکھا دشمن کی گاڑی بھی روانہ ہو رہی تھی۔

قیصر نے ارشی کے پاس پہنچ کر رائفل سنبھال لی۔ متعاقب گاڑی بدستور سر پر تھی۔ سڑک کے اردگرد گھنے جنگلات کا سلسلہ شروع ہو رہا تھا۔ یہ کافی حد تک سنسان جگہ تھی۔ جو بھی فیصلہ ہونا تھا، یہیں ہونا تھا۔

اسی لمحے قیصر نے ایک لمحاتی مگر خطرناک فیصلہ کیا۔ اس نے گن کی نال گاڑی کی کھڑکی پر رکھی۔ اپنے ساتھ چلتی ہوئی دشمن کی گاڑی کے ڈرائیور کا نشانہ لیا، اور لبلبی دبا دی۔ ایک ساعت شکن دھماکہ ہوا۔ اس کی آنکھیں ٹویوٹا پر مرکوز تھیں، جو کہ چند لمحوں کیلئے لڑکھڑا کر سنبھل رہا تھا۔ اس کا نشانہ خطا گیا۔ گولی ڈرائیور کی بجائے اس

لے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھے ہوئے آدمی کی گردن کو چھلنی کرگئی تھی۔ وہ یقیناً زندگی سے محروم ہوکر منظر سے غائب ہو چکا تھا۔ اس دوران فوزیہ نے کمال مہارت کا مظاہرہ کیا۔ وہ گاڑی کو سڑک پر لہرا لہرا کر بھگا رہی تھی۔ فائرنگ کے بعد ان کے بیچ کم وبیش پچاس گز کا فاصلہ پیدا ہوگیا تھا۔ اس نے اسی فاصلے کو مدنظر رکھتے ہوئے نہایت دانشمندانہ فیصلہ کیا۔ سامنے ایک لوڈ ٹرک نظر آرہا تھا، جو کہ مخصوص رفتار میں اپنی منزل کی جانب رواں دواں تھا۔ وہ انتہائی سرعت سے گاڑی کو اس کی آڑ میں لے جانے میں کامیاب رہی۔ اسی لمحے دشمن نے جوابی کارروائی کا آغاز کردیا۔ گولیوں کی تڑتڑاہٹ گونجی لیکن اس کا نشانہ ٹرک کا عقبی حصہ بنا تھا۔ ٹرک کو زیادہ نقصان نہیں ہوا۔ ٹرک ڈرائیور نے بریک پر پیر رکھ دیا۔ دشمن ٹرک کی دوسری جانب تھے۔ صورتِ حال انتہائی خطرناک تھی۔ ٹرک ڈرائیور دبک کر بیٹھ گیا تھا۔

''ہمیں جو بھی کرنا ہے اسی ٹرک کی آڑ میں کرنا ہے۔''

اس نے دونوں لڑکیوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اسی دوران اس کی نظر دوسری طرف دشمن کی گاڑی پر پڑی۔ وہ بدستوران کے تعاقب میں تھے۔ اس نے چشم زدن میں فیصلہ کیا، اور دوسرے ہی لمحے فائرنگ سے ٹویوٹا کے اگلے دونوں ٹائر بلاسٹ کردیے۔

''ارشی کیپٹن کو کال کرو جلدی'' فوزیہ نے تیزی سے کہا۔

''میں اور قیصر سیل فون لے کر نہیں آئے۔''

''یہاں سروس ایبلیبل نہیں ہے'' وہ سیل فون کی اسکرین کی طرف دیکھتے ہوئے مایوسی سے بولی۔

قیصر نے بیک ویو مرر میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اوہ۔۔ یہ بھی اب ہی ہونا تھا۔ دشمن کی گاڑی کے ٹائرز بلاسٹ ہو چکے ہیں لیکن وہ خود محفوظ ہیں اور وہ گن پوائنٹ پر کوئی گاڑی چھین رہے ہیں۔ یہی موقع ہے۔ گاڑی کو نکالو یہاں سے جلدی، بلکہ تم پیچھے آؤ۔ اب میں ڈرائیونگ سنبھالتا ہوں۔''

چند لمحوں بعد وہ ڈرائیونگ سیٹ پر پہنچ گیا۔

دشمن فی الوقت منظر سے غائب تھا۔

ابھی تک دور دور تک قانونی مداخلت کے آثار نہیں تھے۔ سڑک کے دونوں اطراف میں اب جنگلات گھنا ہوگیا تھا۔ دشمن چھینی ہوئی کریم کلر ایکس ایل آئی میں چند فرلانگ کے فاصلے پر بدستوران کے پیچھے تھے۔ پراڈو ہوا سے باتیں کررہی تھی۔ اس دوران یاشا کو بھی ہوش آگیا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے ارشی اور فوزیہ کو گھور رہا تھا۔

''اس کے پیر کھول دو ارشی'' قیصر نے گاڑی فٹ پاتھ کی طرف کرتے ہوئے کہا۔ ''اگر یہ کوئی حرکت کرے تو بے دریغ گولی مار دینا۔''

فٹ پاتھ سے ذرا فاصلے پر ایک کچی سڑک بائیں طرف جارہی تھی۔ اس سے آگے گھنے درخت بکثرت نظر آرہے تھے۔ وہ اسی سڑک پر اترنا چاہتا تھا۔ رفتار کم ہوتے ہی دشمن قریب پہنچ گئے۔ اب وہ مرنے مارنے پر کمربستہ تھے۔ گنز کی مہیب نالوں کا رخ پراڈو کی طرف تھا۔

اس سے پہلے کہ وہ موت کا دہانہ کھولتے۔ ارشی نے پہل کردی۔ اس نے گن کو سیدھا کیا تھوڑا سا شیشہ ہٹایا اور اپنے عین پیچھے آتی ہوئی گاڑی پر برسٹ چلا دیا۔ یہ حربہ کارگر ثابت ہوا۔ اگرچہ کہ متعاقب دشمنوں کا کوئی جانی نقصان نہیں ہوا، لیکن ان کی گاڑی لڑکھڑا گئی تھی۔ برسٹ نے ونڈ اسکرین کو ریزہ ریزہ کردیا تھا۔ دوسرے ہی لمحے پراڈو کچی سڑک پر اتر گئی۔

''جلدی کرو وہ پیچھے ہی ہیں۔ میں دوبارہ اٹیک کررہی ہوں۔'' ارشی نے میگزین بدلتے ہوئے پرجوش لہجے میں کہا۔

''نہیں ارشی اب فائرمت کرنا۔ کوئی راہ گیر بھی مارا جاسکتا ہے۔ ہمیں بس درختوں کے جھنڈ تک پہنچنا ہے۔''

اس نے گاڑی کی رفتار بڑھاتے ہوئے کہا۔ کچی سڑک کے آس پاس گھنے درختوں کا سلسلہ شروع ہورہا تھا۔ یہ مختصر سا جنگل بھی ہوسکتا تھا۔ دشمن کی گاڑی کچی سڑک پر اتر چکی تھی اور وہ فائرنگ کررہے تھے۔ پراڈو کے عقبی حصے سے گولیاں ٹکرائیں، لیکن ابھی مقدران کی یاوری کررہا تھا۔ پراڈو کی رفتار قدرے کم ہوئی تھی کیونکہ سڑک

کچی اور ناہموار تھی۔ پاشا متوحش نظروں سے دائیں بائیں دیکھ رہا تھا، لیکن اس نے کہا کچھ نہیں۔ ارشی بار بار کیپٹن کا نمبر ٹرائی کر رہی تھی، لیکن ویک سگنلز کی وجہ سے رابطہ نہیں ہو پا رہا تھا اچانک ان کی گاڑی کے بریک چرچرائے اور وہ ایک جھٹکے سے رک گئی۔ سامنے سڑک پر کافی چوڑا اور گہرا گڑھا تھا۔ وہاں سے گاڑی کا گزرنا ناممکن تھا۔ دشمن کیلئے یہی مہلت کافی تھی۔ وہ پراڈو کے عقب میں پہنچ گئے تھے اور پھر اچانک گولیوں کی تڑتڑاہٹ نے ماحول کو لرزا براندام کر کے رکھ دیا۔

❀……❀……❀

جمعرات کی شام ہوتے ہی اس کی طبیعت میں اضطراب فزوں تر ہونے لگا۔ آج پیر جی کے حکم کے مطابق اس نے آستانہ عالیہ پر حاضری دینی تھی۔ افضال بھی تیار تھا، لیکن پتہ نہیں کیوں وہ محسوس کر رہی تھی کہ اس کی پہلے والی گرمجوشی مفقود ہو چکی ہے۔ اب اسے پیر جی سے اس معاملے پر بھی بات کرنی تھی، کہ اس کا محبوب شاید اس سے کترا رہا ہے۔ اگر وہ واقعی کترا رہا ہے، گریزپا ہے تو ایسا کیوں ہے؟ اور اگر ایسا ہے تو اس کا حل صرف پیر نقاب پوش ہی کر سکتے ہیں۔ یہ سوچ کر وہ قدرے مطمئن ہو گئی تھی۔ کیونکہ پیر جی کے تعویذ اور پانی کے استعمال سے اس کا سخت مزاج باپ نور الٰہی موم ہو گیا تھا۔ اب وہ ماں بیٹی کی ہاں میں ہاں ملا رہا تھا۔ اس نے نادیہ نور کو بے چوں وچراں اجازت دے دی کہ وہ پیر جی کے پاس جا سکتی ہے۔ عشا کے فوراً بعد اس نے افضال کا نمبر ڈائل کیا، لیکن کال ریسیو نہیں ہوئی۔ وہ دوسری لائن پر مصروف تھا۔ اس کا شک تقویت پکڑ رہا تھا، کہ افضال گریزپا ہے۔ شاید اس لیے کہ وہ جذبات کے کمزور لمحوں میں اپنا متاع آبرو تک اسے سونپ چکی تھی۔ خدا خدا کر کے آدھے گھنٹے بعد افضال سے رابطہ ممکن ہوا تو وہ شکوہ کناں لہجے میں بولی۔

''کیا بات ہے افضال؟ مجھے لگتا ہے یا تم واقعی مجھ سے دامن چھڑا رہے ہو؟ کب سے کال کر رہی ہوں۔ تم میسج کا ریپلائی بھی نہیں کر رہے۔ تمہیں معلوم بھی ہے کہ آج پیر جی کے پاس جانا ہے۔''

جواباً وہ اسے اپنی لچھے دار گفتگو سے قائل کرنے لگا۔

''میری جان، ایسا کیوں سوچا تم نے۔ دراصل امی اپنے میکے والوں سے بات کر رہی تھی، اور اسے پتہ نہیں چلا کہ کال آ رہی ہے۔ تم گھر سے نکل کر کچی سڑک پر پہنچو میں تمہیں وہیں ملوں گا۔''

اس نے زیر لب مسکراتے ہوئے کال منقطع کی۔ ماں کو بتایا اور گھر سے نکل آئی۔ بازار میں اکادکا ذی نفس ہی نظر آ رہے تھے۔ وہ بازار میں ادھر ادھر دیکھتی ہوئی محتاط قدموں سے آگے بڑھ رہی تھی۔ تھوڑی دیر پہلے ہی بجلی چلی گئی تھی۔ ہر سو گھور اندھیرا اور خاموشی کا راج تھا۔ ایک گھر سے کسی بچے کے رونے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ دور کہیں کتے بھی بھونک رہے تھے۔ وہ سیاہ شال میں ملفوف بازار کے کونے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ بازار کے اختتام پر کچی سڑک شروع ہوتی تھی، جو درختوں کے جھنڈ سے ہوتی ہوئی پیر جی کے آستانے تک جا پہنچتی تھی۔ راستے میں قبرستان بھی پڑتا تھا۔ کم وبیش پانچ منٹ قدرے تیز قدموں سے چلتی ہوئی وہ مطلوبہ جگہ پر پہنچ گئی۔ کچی سڑک کے کنارے کیکر کے گھنے اور ہولناک درختوں کے جھنڈ سے اچانک ایک لحیم شحیم سایہ نمودار ہوا، اور اس کی طرف بڑھنے لگا۔ وہ اسے لاکھوں میں پہچان سکتی تھی۔ وہ اس کے محبوب کا سایہ تھا' اس نے آسمان پر ٹمٹماتے ہوئے ستاروں کو دیکھا۔ اندھیری رات کی سیاہی میں بتدریج اضافہ ہو رہا تھا۔ موسم میں خنکی تھی، لیکن قابلِ برداشت تھی۔ ابھی سرما کا آغاز تھا، ویسے بھی وہ جوان جذبوں کی حدت سے سرشار تھی۔ اس عمر کے عشق میں ہر شے الٹی نظر آتی ہے۔ شاید یہی وہ عشق ہے جو خلل ہے دماغ کا۔ یہی آگ کا دریا ہے جس میں ڈوب کر جانا ہوتا ہے۔ وہ بھی اسی آگ کے دریا میں ڈوب کر افضال کے کشادہ سینے سے جا لگی۔ کچھ دیر پہلے وہ جن خدشات اور واہموں کا شکار تھی۔ اب وہ ختم ہو چکے تھے۔ قربت محبوب کے چند جذباتی لمحوں کے بعد اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔

''افضال جلدی چلو، پیر جی نے عشا کے فوراً بعد آنے کو کہا تھا۔''

وہ کسمساتی ہوئی اس کی بانہوں کے مضبوط حصار سے

اکل گئی۔

''ہاں چلو واپس بھی آنا ہے۔ پہلے ہی بہت دیر ہو چکی ہے۔''

وہ اس کا ہاتھ تھام کر آگے بڑھتے ہوئے بولا۔

چند لمحوں بعد وہ پکی سڑک پر رواں دواں تھے۔ سڑک کے اطراف میں کماد کے کھیت لہلہا رہے تھے۔ کچھ دیر چلنے کے بعد فضا میں اگربتیوں کی خوشبو کا احساس ہونے لگا۔ چند فرلانگ کے فاصلے پر اندھیرے میں جگنو ٹمٹماتے ہوئے نظر آنے لگے، لیکن یہ جگنو نہیں تھے۔

یہ اسلام پورہ کا قبرستان تھا، یہاں وہ لوگ محوِ آرام تھے جو کبھی اس دنیا کا حصہ تھے۔ یہیں رہتے تھے۔ اسی قبرستان میں وہ بارہا آئے ہوں گے۔ متعدد مرتبہ یہاں سے گزرے ہوں گے، اور بالآخر اسی قبرستان نے انہیں پناہ دی۔ زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے۔ وہ نیم اندھیرے میں زمین پر بکھری قبروں اور خودرو جھاڑیوں کو دیکھتے ہوئے آگے بڑھتے رہے۔ قبرستان کی حدود سے نکلتے ہی مختلف اقسام کی انسانی آوازیں ان کی سماعتوں سے ٹکرانے لگیں۔ چند قدم کی مسافت پر آستانہ عالیہ کی روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔ آج جمعرات کی رات تھی۔ مختلف دیہاتوں سے عقیدت مند آئے ہوئے تھے۔ منتیں مرادیں مانگ رہے تھے۔ دربار پر کوئی نعت پڑھ رہا تھا۔ کہیں قوالی ہو رہی تھی۔ یہ آوازیں انہیں سنائی دے رہی تھیں۔ آستانے کی حدود میں داخل ہوتے ہی نادیہ کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ وہ تہہ دل سے مان گئی تھی کہ پیر جی اللہ کے برگزیدہ بندے اور، کرنی والے ہیں۔ مرکزی گیٹ پر انہیں تلاشی کے مرحلے سے بھی گزرنا پڑا۔ خواتین کی تلاشی کیلئے ایک ادھیڑ عمر خرناٹ سی عورت تعینات تھی۔ اس نے خوب ٹٹول کر اسے دیکھا اور آہستگی سے کان میں سرگوشی کی۔

''تم نادیہ نورالٰہی ہو؟ تمہیں اس طرف نہیں جانا۔ میرے ساتھ آؤ اور اسے فی الحال ثنااللہ کے پاس جانا ہے۔''

اس نے افضال کی طرف خفیف سا اشارہ کیا، اور اپنی جگہ کسی اور عورت کو کھڑا کر کے کمروں کی طرف چلنے لگی۔ افضال نے کسی قسم کے ردعمل کا مظاہرہ نہیں کیا۔ وہ چپ چاپ وہیں کھڑا رہا۔ ادھیڑ عمر پستہ قامت عورت اس کے آگے چلتی ہوئی کمروں کی طرف بڑھ رہی تھی۔ صحن میں عقیدت مندوں کا ہجوم دیکھنے لائق تھا۔ سب اپنی اپنی عقیدت کی محفلیں جمائے بیٹھے تھے۔ جگہ جگہ بلب روشن تھے۔ چائے اور کھانے پینے کی اشیا بھی دستیاب تھیں۔ وہ سیاہ نقاب میں اس عورت کے ساتھ چل رہی تھی۔ اچانک عورت دائیں طرف مڑ گئی۔ یہ تنگ سی راہداری کمروں کے عقب میں جا رہی تھی۔ راہداری میں روشنی کا انتظام نہیں تھا۔ ایک لمحے کیلئے وہ متذبذب ہوئی لیکن اس کی اندھی عقیدت نے اس کے وہم کو مسترد کر دیا۔

''توبہ توبہ یہ میں کیا سوچ رہی ہوں۔ پیر جی تو دل کا حال بھی جان لیتے ہیں۔''

اس نے سوچا اور خود کو لعن طعن کرنے لگی۔

کچھ ہی دیر بعد عقبی حصے میں ایک بڑا سا کمرہ دکھائی دے رہا تھا۔ جس کا ڈبل پلائی دروازہ بند تھا، تاہم کھڑکیوں کے شیشوں سے سرخ سی روشنی جھانک رہی تھی۔ ادھیڑ عمر عورت نے دروازے پر ہلکی سی دستک دی، اور پیچھے ہٹ کر کھڑی ہو گئی۔ پھر وہ نادیہ کی طرف دیکھتے ہوئے سرگوشی میں کہنے لگی۔

''لڑکی! یہ تمہاری قسمت کا دروازہ ہے۔ دعا کرو جلدی کھل جائے۔ ورنہ تو یہ کئی کئی سال تک نہیں کھلتا۔ میں جا رہی ہوں۔ جیسے ہی دروازہ کھل جائے۔ جلدی سے اندر داخل ہو جانا۔ تمہارے نصیب بدل جائیں گے۔ دوبارہ دستک نہ دینا، اور اپنا فون مجھے دے دو۔''

عورت یہ کہہ کر اسے پراسرار نظروں سے دیکھتی ہوئی، اس کا موبائل فون لے کر راہداری کے نیم اندھیرے میں غائب ہو گئی۔

نہ جانے کتنی دیر وہ بند دروازے کو پرامید نظروں سے دھڑکتے دل کے ساتھ دیکھتی رہی، لیکن اس کے مقدر کا در وا نہیں ہو رہا تھا۔ دل عجیب سی کیفیت سے دوچار تھا۔ اچھی خاصی سردی میں بھی اسے اپنی پیشانی پر پسینے کی نمی محسوس ہو رہی تھی۔ امید و انتظار کے یہ چند لمحے صدیوں پر محیط تھے۔ دھیرے دھیرے اس کے ہاتھ سے امید کا دامن چھوٹنے لگا۔ اس نے بارہا دستک دینے کا ارادہ کیا، لیکن کوئی

ان دیکھی قوت اسے روک دیتی۔ وہ آنکھیں بند کیے ساکت وجامد دروازے کے سامنے کھڑے تھی۔ مایوسی نے جب آخری حد کو چھوا تو اچانک ایک سحر انگیز خوشبو اس کے نتھنوں سے ٹکرائی۔ سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں اس نے اپنی آنکھوں کے در کھول دیے۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ امید کا در خود کار انداز میں دھیرے دھیرے کھل رہا تھا۔ ایک روشنی اس کی آنکھوں کو خیرہ کر رہی تھی۔ دفعتاً وہ روشنی مفقود ہوگئی۔ خوشبو کا احساس ہوگیا۔ بے ساختہ اس کے بدن پر کپکپی سی طاری ہوگئی۔

''دروازہ کھل جائے تو فوراً اندر داخل ہوجانا۔''

اسے عورت کی کہی ہوئی بات یاد آئی، اور وہ انتہائی سرعت کے ساتھ اندر داخل ہوگئی۔ اسی لمحے خود کار انداز میں دروازہ بند ہوگیا۔ اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دروازے کو دیکھا، اور پھر اس ہال نما طویل وعریض کمرے کا جائزہ لینے لگی۔ فرش پر انتہائی بیش قیمت کارپٹ بچھا ہوا تھا۔ کمرے میں سرخ بلب کی روشنی ماحول کو پراسرار بنا رہی تھی۔ دیواروں پر سبز رنگ کے پھول دار پردے جھول رہے تھے۔ انتہائی خوبصورت اور قیمتی ڈبل بیڈ کے سامنے خوبصورت صوفے ترتیب سے رکھے ہوئے تھے۔ صوفوں کے سامنے شیشے کی ٹیبل پر انواع واقسام کے پھل فروٹ پڑے تھے۔ کونے میں فل سائز فریج پڑی تھی۔ سامنے دیوار پر بتیس انچ کی ایل ای ڈی آویزاں تھی۔ دیوار گیر کلاک پر رات کے نو بج رہے تھے۔ ایک طرف کونے میں ٹیبل پر جدید لیپ ٹاپ پڑا تھا۔ وہ ان چیزوں سے متعلق کچھ نہیں جانتی تھی۔ وہ محوِ حیرت تھی، اسی عالم میں غیر ارادی طور پر اس نے جوتے اتارے اور دائیں بائیں دیکھنے لگی۔

''آگے بڑھو۔''

ہال نما کمرے میں ایک بھاری آواز گونجی۔ وہ چونک کر آواز کی سمت کا تعین کرنے لگی۔ اس کے پسینے چھوٹ رہے تھے۔ دل پسلیوں کے پنجرے میں پھڑ پھڑا رہا تھا۔

تنویمی انداز میں وہ ناک کی سیدھ میں آگے بڑھنے لگی۔ اسی لمحے سامنے دیوار کا سبز پردہ سرکنے لگا۔ ایک چھوٹا سا خوبصورت دروازہ خود کار انداز میں کھل رہا تھا۔ لرزیدہ بدن کے ساتھ وہ اس دروازے میں داخل ہوگئی۔ اسے سیڑھیاں نظر آئیں، جو کہ نیچے اتر رہی تھیں۔ وہ ان سیڑھیوں سے دھیرے دھیرے نیچے اترنے لگی۔ چند لمحوں بعد اس کی آنکھوں کے سامنے اسی جیسا ایک اور کمرہ تھا جس سے وہ گزر کر آئی تھی۔ اس کی ڈیکوریشن نے اسے ورطۂ حیرت میں ڈال کے رکھ دیا تھا۔ دیوار کے ساتھ انتہائی خوبصورت سنگل بیڈ پڑا تھا، جس پر سرخ رنگ کی بیش قیمت چادر بچھی ہوئی تھی۔ بیڈ کے سرہانے ایک نرم وملائم تکیہ نظر آرہا تھا۔ فرش پر بیش قیمت ایرانی قالین بچھا ہوا تھا۔ پردے اس قدر دلکش تھے کہ کمرے کے نیم اندھیرے میں جھلملا رہے تھے۔ بیڈ کی دائیں طرف چھوٹے سے ٹیبل پر ایک خوبصورت فلاسک گلاس پڑا تھا، جس میں سرخ رنگ کا مشروب واضح نظر آرہا تھا۔ اسے اپنے حلق میں کانٹے سے چبھتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔

''آگے بڑھو اور شربت پی لو۔''

کمرے میں پھر وہی گمبھیر آواز گونجی۔

اس نے فوراً مشروب اٹھا کر لبوں سے لگالیا۔ دو گھونٹ پینے کے بعد اسے ہلکی سی کڑواہٹ کا احساس ہوا۔ جلدی سے اس نے گلاس ٹیبل پر واپس رکھ دیا۔ اچانک اس کے بدن میں حدت سی بھرنے لگی۔ اسے گرمی کا احساس ہو رہا تھا۔ وہ دو قدم آگے بڑھی اور اچانک اپنے سامنے کسی نسوانی وجود کو دیکھ کر چونک سی گئی لیکن وہ نسوانی وجود کوئی اور نہیں تھا۔ وہ خود تھی اور قد آدم آئینے کے سامنے کھڑی تھی۔ غیر ارادی طور پر اس نے اپنے جسم سے لپٹی ہوئی چادر اتار کر فرش پر پھینک دی۔ آئینے کے سامنے وہ سرتاپا خود کو دیکھ رہی تھی۔ سیاہ رنگ کے قدرے تنگ لباس میں اس کے جسمانی خطوط واضح ہو رہے تھے۔ مناسب قد، چھوٹی سی خوبصورت ناک میں سونے کی نتھلی۔ گداز لب کشادہ پیشانی اور لمبی صراحی دار گردن، اس نے خود کو ستائشی نظروں سے دیکھا، لیکن اب آئینے میں نقوش دھندلا رہے تھے۔ اسے اپنا سر بھاری ہوتا محسوس ہونے لگا۔ اور پھر جیسے اس کے جسم میں آگ سی بھر گئی۔ پیاس کا احساس فزوں تر ہو رہا تھا۔ اس نے ٹیبل پر پڑا گلاس اٹھایا اور غٹا غٹ خالی کر دیا۔

اسے اپنے جسم پر انگارے سے گرتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ وہ یخ بستہ پانی کے تالاب میں نہانا چاہ رہی تھی، اور پھر اسے یوں لگا کہ جیسے اسے نار جہنم میں پھینک دیا گیا ہو۔ اس کے حواس مختل ہو رہے تھے۔ اس سے پہلے کہ وہ بے دم ہو کر گرتی، کسی نے اسے مضبوط بانہوں کے حصار میں لے لیا۔ وہ نیم بیہوشی کے عالم میں اسے دیکھنے لگی۔ دھندلے سے مردانہ نقوش اسے فریب دے رہے تھے۔ کوئی اسے اٹھا کر بیڈ پر لٹا رہا تھا، اور پھر اسے اپنے جسم کی جاگیر میں کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ اس کے رگ و پے میں ان گنت چیونٹیاں سرایت کر رہی تھیں۔ متحرک انگلیاں شفاف بدن پر عبارتیں رقم کر رہی تھیں۔ وہ خود کو کیف و انبساط کی ہواؤں میں اڑتا ہوا محسوس کر رہی تھی۔ اک راحت انگیز سرور اس کی نس نس میں اتر رہا تھا۔ مزاحمت کی تاب نہیں تھی۔ خود سپردگی تھی، بے خودی تھی، اور وہ تھی۔

❀.....❀.....❀

حور کو ایک مخصوص انجکشن دے گیا تھا۔ دوسری ٹریٹمنٹ کے ساتھ ساتھ وہ اس کا برین واش بھی کر رہے تھے۔ اس انجکشن سے وہ ہوش میں آنے کے بعد مکمل ان کی تابع ہو جاتی۔ ان کے اشاروں پر ناچتی، اور اب وہ ہوش میں آ رہی تھی۔ اس نے کسمسا کر آنکھیں کھولیں، اور اپنے بیڈ کی دائیں طرف کھڑی ماہا کو بے تاثر نظروں سے دیکھنے لگی۔ مراد کو فی الوقت وارڈ سے باہر رکھا گیا تھا، اور اسی بات کو لے کر وہ پریشان ہو رہا تھا۔ کیونکہ اگر اسے معلوم ہو جاتا کہ حور کو مخصوص انجکشن دے دیا گیا ہے تو اس کے پاس اس کا توڑ بھی تھا۔ اس طرح وہ دشمن کے مقاصد اور پلاننگ سے باخبر رہ سکتے تھے۔ انہیں بالکل یہ محسوس نہیں ہونے دیا جاتا کہ ان کے انجکشن کا اثر زائل کر دیا گیا ہے۔

''کیسی ہو دوست؟''

ڈاکٹر ماہا نے استہزائیہ لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔

''تم بالکل ٹھیک ہو۔ اب تمہیں کچھ بھی نہیں ہے۔ اب تمہیں ہمارے پاس، ہمارے ساتھ رہنا ہے۔ جو ہم کہیں بے چوں و چراں وہی کرنا ہے۔''

اس کی ہدایات اس کی برین میموری میں فیڈ ہو رہی تھیں۔ وہ پلک جھپکائے بغیر ڈاکٹر ماہا کی طرف دیکھ رہی تھی۔ کمرے میں ان دونوں کے سوا کوئی نہیں تھا۔ دروازہ بند تھا اور کھڑکی پر سفید پردے جھول رہے تھے۔ وہ اس کی پرکشش آنکھوں میں دیکھتے ہوئے تنویمی انداز میں بولی۔

''میں بالکل ٹھیک ہوں۔ مجھے کچھ بھی نہیں ہے۔ اب میں نے آپ کے پاس، آپ کے ساتھ رہنا ہے۔ آپ جو بھی کہیں اس پر بے چون و چراں عمل کرنا ہے۔''

''دیٹس گڈ'' وہ اس کے گال تھپتھپاتے ہوئے آہستگی سے بولی۔

''اب تمہارا نام مہرین نہیں صوفیہ ہے۔ تمہارے اس گنوار کزن کو کسی بہانے واپس بھیج دیا جائے گا۔''

اس بار بھی اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

اسی لمحے نرس ثمینہ دوڑتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

وہ بوکھلائے ہوئے لہجے میں بولی۔

''ڈاکٹر صاحبہ، وارڈ نمبر تین والی مریضہ کے منہ اور ناک سے خون بہہ رہا ہے۔ جلدی آئیں۔ صدیقی صاحب ہاسپٹل سے باہر ہیں۔''

''اوہ نو۔۔۔''

وہ تیزی سے دروازے کی طرف بڑھتی ہوئی بولی۔

چند لمحوں بعد وہ شعبہ ایمرجنسی کے وارڈ نمبر تین میں جاں بلب مریضہ کے پاس پہنچ گئی۔ نرسیں افراتفری میں بھاگ رہی تھیں۔ مراد راہداری میں گھوم رہا تھا۔ وہ ادھر ادھر دیکھتا ہوا حور کے کمرے میں داخل ہو گیا۔ اس پر نظر پڑتے ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ کوئی گڑبڑ ہو چکی ہے۔ اس کی بے تاثر آنکھوں میں اجنبیت نے اس کے شک کو تقویت دے دی۔ وہ اس کی خالی خالی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے آہستگی سے بولا۔

''کون ہو تم؟''

جواباً وہ رٹے رٹائے جملے فر فر بولنے لگی۔

''میں صوفیہ ہوں۔ مجھے کچھ بھی نہیں ہے۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔''

اس نے تیزی سے اس کے لبوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس

کے پاس وقت بہت کم تھا۔وہ برق رفتاری سے اٹیچڈ باتھ روم میں گھس گیا۔وہ تیزی سے ایک انجکشن ڈسپوزیبل سرنج میں بھر کر باہر نکلا۔اس نے محتاط نظروں سے ادھر ادھر دیکھا اور انجکشن اس کی وین میں انجیکٹ کردیا۔سریع الاثر انجکشن نے فوراً کام دکھانا شروع کردیا۔چند ہی لمحوں بعد اس کی آنکھوں میں اجنبیت کی جگہ شناسائی نے لے لی۔اس نے اسے دیکھتے ہوئے کچھ کہنا چاہا۔

''کچھ مت کہو۔ہمارے شکوک درست ثابت ہوئے۔یہ ڈاکٹرز نہیں وطن دشمن عناصر کا گینگ ہے۔اب تمہارا کام شروع ہوگیا ہے-خیال رہے تمہارے پاس صرف چوبیس گھنٹے ہیں۔اس کے بعد اگر دوبارہ تمہیں انجکشن دے دیا گیا،تو میں شاید کچھ نہیں کر پاؤں گا۔میں یہیں آس پاس رہوں گا۔اپنا خیال رکھنا اور محتاط رہنا۔''

وہ اسے ضروری ہدایات دے کر کمرے سے باہر نکل گیا۔راہداری میں اسے ثمینہ نظر آگئی۔وہ اسی طرف آرہی تھی۔وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے خالص دیہاتی لہجے میں بولا۔

''وہ جی ،مہرین کا کیا ہوگا؟ مجھے تو پنڈ واپس جانا تھا۔پتہ نہیں وہ کب ٹھیک ہوگی''

''تم جانا چاہو تو جاسکتے ہو۔وہ کچھ دن یہیں رہے گی''

عقب سے ڈاکٹر ماہا کی آواز سن کر وہ اس کی طرف متوجہ ہوگیا۔

''چنگا جی۔میں چلا جاتا ہوں۔آپ اس کا خاص خیال رکھیے گا۔میں ایک دو دن بعد چکر لگالوں گا۔''

وہ راہداری میں دیوار گیر کلاک کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔شام کے پانچ بج رہے تھے۔اس نے ہاتھ اٹھا کر اسے سلام کیا،اور راہداری سے دروازے کی طرف بڑھ گیا،ڈاکٹر ماہا سوچتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے اپنے ٹچ اسکرین سیل فون سے کوئی نمبر ڈائل کرنے لگی۔دوسرے ہی لمحے کال ریسیو کرلی گئی۔اس نے دھیرے سے سفاک لہجے میں کہا۔

''مہرین کے ساتھ آئے ہوئے اس دیہاتی کو واپس گھر نہیں پہنچنا چاہئے۔اسے راستے میں ہی اڑا دو۔''

اس نے کال منقطع کی اور حور کے کمرے میں داخل ہوگئی۔

''چلو میرے ساتھ''

اس نے تحکم آمیز انداز میں کہا۔

وہ فوراً بیڈ سے اٹھی اور اس کے پیچھے چلنے لگی۔

راہداری سے ہوتے ہوئے وہ لیبارٹری کے دروازے کے سامنے سے گزر رہے تھے۔حور سہمی سی اس کے عقب میں چل رہی تھی۔کچھ دیر بعد وہ اسے لے کر ایک کشادہ سے کمرے میں پہنچ گئی۔جس میں اسے مضبوط گتے کے متعدد کارٹن نظر آرہے تھے۔کمرے میں ایک سنگل بیڈ،ایک ٹیبل اور چند کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔بیڈ پر کمبل اور تکیہ بھی نظر آرہا تھا۔گیس ہیٹر نے کمرے کے ماحول کو گرم کر رکھا تھا۔

''آج کی رات تم یہاں رہو گی۔دروازہ باہر سے لاک ہوتا ہے،تم دروازے کی طرف مت جانا۔اب اس بیڈ پر لیٹ جاؤ۔کھانے کا من ہو تو بتادو۔میں ثمینہ کے ہاتھ بھیج دیتی ہوں۔''

''مجھے بھوک نہیں ہے۔''

وہ سادہ سے لہجے میں بولی۔اس سے اس کا بیگ اور دیگر سامان لے لیا گیا تھا۔اسے فکر ہو رہی تھی کہ مراد سے رابطہ کیسے ہوگا۔

''ٹھیک ہے۔اب تم آرام کرو کل دس بجے تمہیں ایک اہم کام بتایا جائے گا۔''

ماہا نے سپاٹ لہجے میں کہا اور کمرے سے نکل گئی۔دوسرے ہی لمحے کمرہ لاک ہوچکا تھا۔

وہ بے دلی سے بیڈ پر نیم دراز ہو کر سوچنے لگی۔وہ خطرناک دشمنوں کی قید میں تھی۔سوچنے کے سوا اس نے کسی ردعمل کا مظاہرہ نہیں کیا۔

''ممکن ہے کیمرے کی آنکھ مجھے دیکھ رہی ہو۔''

اس نے سوچا اور اپنے اوپر کمبل لے لیا۔اسے سردی کے ساتھ بھوک بھی محسوس ہو رہی تھی،لیکن وہ کھانے سے منع کرچکی تھی۔سوچوں کے گھمسان میں قریباً دو گھنٹے کا وقت بیت گیا۔اسے نیند نہیں آرہی تھی۔وہ مراد کے متعلق سوچ رہی تھی۔وہ جانتی تھی کہ وہ اپنی حفاظت

کرسکتا ہے، لیکن دشمن بھی انتہائی مکار اور طاقتور تھا۔ اس نے آنکھیں بند کرلیں۔ میڈیسن کی ناگوار سی بو اس کے نتھنوں سے ٹکرا رہی تھی۔ اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ انرجی سیور کی روشنی اسے ناگوار لگ رہی تھی۔ وہ جلدی سے اٹھی اور اسے آف کردیا۔ وہ اندھیرے میں بیڈ کی طرف جاتی ہوئی گتے کے ڈبوں سے ٹکرا گئی۔ اب اس کا تجسس جاگ اٹھا۔ اس نے ایک ڈبے میں ہاتھ ڈالا وہ کھلا ہوا تھا۔ اس میں ادویات تھیں۔ دوسرے کارٹن مضبوطی سے بند تھے۔ وہ کسی قسم کا رسک نہیں لینا چاہ رہی تھی۔ اب اس کی آنکھیں اندھیرے سے مانوس ہو رہی تھیں۔ وہ بیڈ کے پاس پہنچی اور کمبل میں گھس گئی۔ اسی لمحے دروازے میں چابی گھومنے کی آواز سنائی دی۔ ایک دم اس کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ دوسرے ہی لمحے کوئی اندر داخل ہوا اور لائٹ آن ہوگئی۔ اس نے آنیوالے کی طرف دیکھا۔ وہ نرس ثمینہ تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک بڑی سی پلیٹ تھی۔ زیرلب مسکراتے ہوئے اس کی طرف بڑھی۔

''یہ چکن برگر ہے کھالو۔ تمہیں بھوک لگی ہوگی۔ سردی کی رات بہت لمبی ہوتی ہے، اور ہاں اب لائٹ آف نہ کرنا۔''

اس نے پلیٹ اس کے آگے رکھتے ہوئے نرم لہجے میں کہا۔ وہ بیڈ پر پالتی کی طرف بیٹھ گئی۔

اس نے پلیٹ کی طرف دیکھا۔ اس میں کچھ بھی تھا۔ اس کی بھوک جاگ اٹھی۔ وہ کچھ کہے بغیر کھانے لگی۔

''پانی باتھ روم سے پی لینا۔''

اس نے بدستور نرم لہجے میں کہا، اور اپنا سیل فون نکال کر دیکھنے لگی۔

''کیا تم مجھے دیکھ رہی تھیں؟''

وہ برگر کھاتے ہوئے عامیانہ سے لہجے میں بولی۔ اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ وہ معلوم کرنا چاہتی تھی کہ اس کمرے میں خفیہ کیمرے ہیں یا نہیں۔ اس کے بعد وہ ایک خطرناک رسک لینے کا فیصلہ کرچکی تھی۔

''نہیں تو۔۔۔ میں تمہیں کیسے دیکھ سکتی ہوں۔ مجھے تو بس میڈم نے کہا کہ تمہیں کچھ کھانے کیلئے دے آؤں۔ وہ بھی اب سوچکی ہوں گی۔ صبح دس بجے ہی اٹھیں گی۔''

نرس کافی باتونی معلوم ہو رہی تھی۔ اس سے کافی کچھ معلوم ہوسکتا تھا۔

''وہ ایسی جگہوں پر کیمرے لگے ہوتے ہیں ناں۔ اس لیے پوچھ رہی ہوں۔''

اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ کہہ دیا۔

''نہیں۔۔۔ یہ میڈیسن اسٹور ہے۔ یہاں کیمروں کی کیا ضرورت ہے۔ تم جلدی سے کھالو، مجھے بھی نیند آرہی ہے۔'' اس نے جماہی لیتے ہوئے کہا۔

اس دوران وہ برگر ختم کرچکی تھی۔ اس نے مطمئن انداز میں سر ہلایا، اور پلیٹ اس کی طرف کھسکادی۔ وہ پلیٹ اٹھا کر بیڈ سے اٹھی، اس کا منہ دوسری طرف تھا۔ اسی لمحے اس کی کنپٹی پر ایک نپی تلی ضرب لگی۔ اوغ۔۔۔ کی آواز کے ساتھ وہ تیورا کر بیڈ پر گری، اور بے سدھ ہوگئی۔ وہ برق رفتاری سے متحرک تھی۔ اس نے نرس کا سیل فون قبضے میں کیا، اور اسے بیڈ پر لٹا کر اس کے اوپر کمبل ڈال دیا۔ سب سے پہلے اس نے مراد کا نمبر ڈائل کیا، جو کہ اسے زبانی یاد تھا۔ کال فوراً ریسیو کرلی گئی۔

''ہیلو! سر۔۔۔ آپ ایس پی زوار شاہ۔''

''ہاں حور میں زوار شاہ بول رہا ہوں۔''

وہ اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔

''میں ہسپتال کے آس پاس ہی ہوں۔ مجھ پر حملہ ہوا ہے، لیکن ناکام رہا۔ حملہ آور بھاگ گیا ہے۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا کہ ایک دیہاتی مراد کے روپ میں زوار شاہ خود ہے۔''

وہ تیزی سے اسے تمام تفصیلات بتانے لگی۔ ساتھ ساتھ وہ کارٹن بھی دیکھ رہی تھی۔ نچلے کارٹن میں جدید اسلحہ بم اور بارودی جیکٹس دیکھ کر اس کے رونگٹے کھڑے ہوگئے تھے۔ اس کا شک یقین میں بدل گیا کہ یہ ہسپتال دہشت گردوں کا ٹھکانہ ہے۔ اس نے زوار شاہ کو اسلحے سے متعلق بھی آگاہ کردیا۔

''کسی طرح ڈاکٹر ماہا کو قابو کرو۔ ہم تیاری کر رہے ہیں۔ آج کی صبح وطن دشمنوں پر قہر بن کر ٹوٹنے والی ہے۔''

اس نے کال منقطع کی۔ بیڈ کی چادر پھاڑ کر ثمینہ کے ہاتھ پاؤں مضبوطی سے باندھ کر اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا۔ ایک کارٹن سے اس نے پستول اٹھایا اور کمرے سے باہر نکل کر اسے لاک کر دیا۔ راہداری سے ہوتی ہوئی وہ زنانہ وارڈ کے سامنے سے گزر رہی تھی۔ دفعتاً اس کی نظر ڈاکٹر ماہا پر پڑی، جو کہ انتہائی عجلت میں اندر داخل ہو رہی تھی۔ شاید کوئی مریض سیریس تھا۔ اسی لمحے اس کا سیل فون وائبریٹ کرنے لگا۔ اس نے نمبر دیکھا اور کال پک کر لی۔ زوار شاہ لائن پر تھا۔

''میں ہسپتال میں ہوں، لیکن اس حلیے میں نہیں ہوں۔ تم مجھے پہچان لوگی۔ ویلڈن حور، تم نے بہت بڑا کام کیا ہے۔ ہسپتال کے متعلقہ میڈیکل اسٹور کی طرف آؤ۔''

کال منقطع ہوتے ہی وہ اس کی بتائی ہوئی جگہ پر دو منٹ میں پہنچ گئی۔ چند ایک لوگ نظر آ رہے تھے۔ وہ انہیں نظر انداز کرتی ہوئی زوار شاہ کو ڈھونڈ رہی تھی۔ اچانک عقب سے اس کے کاندھے پر کسی نے ہاتھ رکھ دیا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ پینٹ شرٹ اور بلیک جیکٹ میں ملبوس وہ اس کے سامنے کھڑا تھا۔

''یہ پہن لو۔''

وہ اس کی طرف ایک لمبی سی سیاہ جیکٹ بڑھاتے ہوئے بولا۔ چند لمحوں بعد وہ اس کے ساتھ کالونی کی طرف بڑھ رہی تھی۔ جہاں ڈاکٹرز رہائش پذیر تھے۔ قطار در قطار چار کوٹھیاں تھیں۔ ایک کوٹھی کے گیٹ پر ڈاکٹر ماہا لکھا ہوا نظر آ رہا تھا۔ گیٹ پر ایک گن بردار گارڈ کھڑا تھا۔ اس نے سیاہ ملائشیا کی شلوار قمیض کے اوپر جیکٹ پہن رکھی تھی۔ اس کے سر پر کیپ بھی تھی۔ وہ ایک بھرپور جوان اور لمبا تڑنگا آدمی تھا۔

''ادھر کہاں گھسے آ رہے ہو؟''

ان پر نظر پڑتے ہی وہ تیز لہجے میں بولا۔

''ہم ڈاکٹر ماہا کے عزیز ہیں'' حور کی پراعتماد آواز نے اسے قدرے مطمئن کیا۔

''پر وہ تو ہسپتال میں۔۔۔''

''انہوں نے ہی بھیجا ہے۔'' وہ اس کی بات کاٹتے ہوئے بولی۔ ''لو ان سے بات کرو۔''

اس نے اپنا سیل فون اس کی طرف بڑھایا۔ اس دوران وہ گیٹ کے چھوٹے پٹ میں داخل ہو چکے تھے۔ وہ فون پکڑ کر کان سے لگا رہا تھا کہ عقب سے حور نے پستول کا دستہ اس کی کنپٹی پر پوری قوت سے مارا۔ کچھ دیر بعد وہ بیہوش ہو کر گیٹ سے ملحق چھوٹی سی کوٹھڑی میں پہنچا دیا گیا۔ زوار شاہ نے اس کے کپڑے پہن کر اس کی ٹوپی سر پر رکھی اور گن سنبھال کر گیٹ میں کھڑا ہو گیا۔ ستون کی آڑ سے اس نے ماہا کو گیٹ کی طرف آتے ہوئے دیکھا۔

❁.....❁.....❁

ایک لمحے کیلئے وہ دہل کر رہ گیا تھا۔ دوسرے ہی لمحے اس نے سکون کا سانس لیا۔ پیچھے آنے والے دشمن ہوائی فائرنگ کر رہے تھے۔ نہ پائے ماندن نہ جائے رفتن والی بات تھی۔ اسے ایک مشہور پنجابی کہاوت یاد آ رہی تھی، کہ پیچھے آگ اور آگے کھائی۔ بالکل وہی صورتِ حال تھی۔ عقب میں موت کے ہرکارے تھے اور آگے گڑھا تھا۔ یہاں سے سڑک قدرے تنگ تھی، اور اس کے اطراف میں درختوں کا گھمسان تھا۔ اس نے بیک ویو مرر سے عقب میں دیکھا۔ تینوں دشمن اپنی گاڑی کے عقب میں چھپ کر پوزیشنز لے رہے تھے۔ ارشی اور فوزیہ لبلبی پر انگلیاں رکھے دشمن کی تاک میں تھیں، لیکن اب وہ موقع دینے والے نہیں تھے۔

''کیپٹن کو کال ہو جاتی تو مدد مل جاتی۔ یہ آسانی سے پیچھا نہیں چھوڑنے والے۔''

اس نے بڑبڑاتے ہوئے دروازے کے ہینڈل میں ہاتھ ڈالا۔

اسی لمحے فوزیہ نے چونک کر اسے دیکھا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگی تھیں۔ وہ بوکھلائے ہوئے لہجے میں تیزی سے بولی۔

''کک، کیا کر رہے ہو؟ باہر مت نکلنا۔ دشمن گھات میں ہے۔''

اس نے چند لمحوں کیلئے اسے نظر بھر کے دیکھا۔ خوفزدہ حسن کی جھلک نے اسے مبہوت کر کے رکھ دیا۔ بکھری زلفوں کی سیاہی سے جھلکتا ہوا ماہتاب نما چہرہ خوف کی

آمیزش سے اور بھی حسین لگ رہا تھا۔ وہ اپنا نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبائے اسے وارفتگی سے دیکھ رہی تھی۔ اس حسین ولطیف احساس کا احساس اسے پہلی دفعہ ہوا تھا۔ بے ساختہ اسے وہ منظر یاد آ گیا، جب اس کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے اور وہ اسے ہوش میں لانے کیلئے اپنے لبوں سے اس کی گردن کو چھو رہا تھا۔ یکبارگی وہ اک ادا سے خفیف سا مسکرائی۔ موتیوں کی طرح جھلملاتے ہوئے دانت اس کی دھڑکن کو تہہ وبالا کر رہے تھے۔ اس کی جھیل سی آنکھوں میں ان گنت ان کہی باتوں کا سندیسہ تھا۔

ایک دم اس نے زیرِلب مسکراتے ہوئے ہاتھ پیچھے ہٹا لیا، اور آہستگی سے کہا۔

"لیکن ہم اس چوہے دان میں بیٹھے بھی تو نہیں رہ سکتے۔ کچھ تو کرنا ہوگا۔ ورنہ یہی گاڑی ہمارا مدفن بن جائیگی۔"

"اگرانہوں نے ہمیں مارنا ہوتا تو کب کا مار چکے ہوتے"

ارشی نے سنجیدگی سے کہا۔ "ان کا مقصد ہمیں مارنا نہیں کچھ اور ہے۔"

پاشا پھٹی پھٹی آنکھوں سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ اب وہ خوفزدہ نظر آ رہا تھا۔ اسے نے لرزیدہ لہجے میں بمشکل کہا۔"

"مجھے چھوڑ دو۔ یہ میرے لیے آئے ہیں۔ تمہیں کچھ نہیں کہیں گے۔"

ارشی نے زوردار ٹھوکر اس کے پہلو میں مارتے ہوئے غرا کر کہا۔

"کمینے تمہیں کیسے چھوڑ دیں۔ تم سے تو بہت حساب چکانے ہیں۔ اپنی چونچ بند رکھو۔"

اس نے خاموش ہو کر سر جھکا لیا۔ دشمن کی طرف سے مکمل سکوت ان کے اندیشوں میں اضافہ کر رہا تھا، اور پھر اچانک انہیں گویا غیبی امداد مل گئی۔

بیشک اللہ بہترین مسبب الاسباب ہے۔ وہ اپنے بندے کو کبھی بے آسرا نہیں چھوڑتا۔ سامنے سے بھینسوں کا ایک ریوڑ ان کی طرف بڑھ رہا تھا۔ کم وبیش پچاس سے زائد بھینسیں تھیں۔ (ان کیساتھ دو چرواہے) انہیں ہانکتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ انہیں خبر نہیں تھی کہ راستے میں دو دشمن پارٹیوں کا خونی تصادم ہونے والا ہے۔ ان تینوں نے ایک دوسرے کو فیصلہ کن نظروں سے دیکھا، اور تفہیمی انداز میں سر ہلا دیے۔ یہی وہ وقت تھا جب بھینسوں کا ریوڑ بلیک پراڈو کے پاس سے گزر رہا تھا۔

"اس کا خیال رکھنا۔ اگر بھاگنے کی کوشش کرے تو گولی مار دینا۔"

قیصر نے عجلت میں گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے پاشا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

بھینسیں دشمن کی گاڑی کے اردگرد جمع تھیں اور آگے بڑھ رہی تھیں۔ چند ہی لمحوں میں وہ گاڑی سے اتر کر درختوں کے جھنڈ کی طرف بھاگ گئے۔ پاشا ارشی کے گن پوائنٹ پر تھا، راستے میں ہی اس کے پاؤں کھول دیے گئے تھے، تاہم اس کے ہاتھ ابھی بھی پسِ پشت پابندِ رسن تھے۔

ٹاہلی اور کیکر کے گھنے درختوں کا سلسلہ تاحدِ نگاہ نظر آ رہا تھا۔ خودرو جھاڑیاں گھاس پھونس اور جڑی بوٹیاں بھی زمین پر بچھی ہوئی تھیں۔

وہ رائفلیں تانے آگے بڑھ رہے تھے۔ متعاقب دشمن ابھی منظر سے غائب تھے۔ ارشی نے بارہا سیل فون کی اسکرین کی طرف دیکھا۔ سروس اویل ایبل نہیں تھی۔ اس نے جھنجھلا کر فون مخصوص جگہ پر رکھ لیا۔ چند لمحوں بعد رنگ ٹیون کی آواز نے اسے چونکا کے رکھ دیا۔ فوزیہ نے گن کا رخ پاشا کی طرف کرتے ہوئے کہا۔

"کال پک کرو ارشی۔ اسے میں سنبھالتی ہوں"

قیصر پرامید نظروں سے ارشی کو دیکھتا ہوا اس کے قریب پہنچ گیا تھا۔ وہ کیپٹن سے بات کر رہی تھی، تاہم وہ اسے کچھ سمجھا نہیں پا رہی تھی۔ قیصر نے اس کے ہاتھ سے سیل فون لیکر کان سے لگا لیا۔

"سر دشمن ہمارے پیچھے تھے۔ ہم ملتان روڈ پر کافی آگے نکل آئے ہیں۔ اس وقت ہم ٹول پلازہ سے تقریباً دو کلومیٹر آگے ہیں۔ ایک کچی سڑک نیچے اتر رہی ہے۔ سامنے آپ کو دو گاڑیاں اور درختوں کا جھنڈ نظر آئے گا۔ ہم اسی جھنڈ میں ہیں۔" اس نے ٹول پلازہ کا نام بتا کر لوکیشن سمجھا دی۔

''اوکے۔۔ہم نکل رہے ہیں۔غازی خان مسلسل تمہاری نگرانی کررہا تھا،لیکن ٹریفک کی وجہ سے پیچھے رہ گیا۔ہم نے لوکیشن سمجھ لی ہے۔گھبرانا مت۔''

کیپٹن نے پرجوش لہجے میں کہا،اور کال منقطع کردی۔اب انہیں کچھ ڈھارس ملی تھی۔

جلد یا بادیر وہ پہنچنے والے تھے۔وہ بدستور آگے بڑھتے رہے۔دشمن کی طرف سے مسلسل خاموشی انہیں کھٹک رہی تھی۔اچانک انہیں اپنے سامنے سروکے پودوں کا جھنڈ نظر آیا۔بلند و بالا پودے کافی تعداد میں ایک ساتھ قطار میں کھڑے تھے۔قیصر سوچتی ہوئی نظروں سے اسی طرف دیکھ رہا تھا۔پاشا کی حالت پتلی ہورہی تھی۔اس نے بھی سن لیا تھا کہ کیپٹن پہنچ رہا ہے۔

قیصر نے سروکے پودوں میں جھانک کر دیکھا۔چھپنے کیلئے یہ جگہ انتہائی مناسب تھی۔درمیان میں خودرو گھاس کا ایک قطعہ اوراس کے چاروں اطراف سروکے بلند قامت گھنے پودے تھے۔وہ پاشا کو بازو سے پکڑ کر دھکیلتے ہوا پودوں کے اندر داخل ہوگیا۔ارشی اور فوزیہ بھی پہنچ گئی تھیں۔وہ ارشی کی طرف دیکھتے ہوئے دھیرے سے بولا۔

''اس خبیث کو لیکر یہاں بیٹھ جاؤ۔ہم دشمن کی خبر لیتے ہیں''

ارشی اسے قہر بار نظروں سے گھورتے ہوئے گن سے نیچے بیٹھنے کا اشارہ کرنے لگی۔وہ کسی معمول کی طرح زمین پر بیٹھ گیا۔وہ چند قدم کے فاصلے پر رائفل تان کر اس کے سامنے بیٹھ گئی۔

قیصر نے فوزیہ کی طرف دیکھا۔وہ تفہیمی انداز میں سر ہلا کر پودوں سے باہر نکل گئی۔چند منٹ بعد انہیں کسی کے آہستہ سے بولنے کی آواز کا گماں گزرا۔وہ کیکر کے ایک بڑے سے درخت کے تنے کی آڑ میں آگے پیچھے کھڑے ہوگئے۔فوزیہ اس کے پیچھے تھی،اوران دونوں کے کان دشمن کی متوقع آواز کی طرف متوجہ تھے۔پتے چرچرانے کی آواز نے انہیں الرٹ کردیا۔ان کی رائفلیں موت اگلنے کیلئے بے تاب تھیں۔اچانک ایک گونج دار آواز نے ان کی سماعتوں کو مجروح کرکے رکھ دیا۔کوئی بلند آواز میں کہہ رہا تھا۔

''تم جہاں بھی چھپے ہو سامنے آجاؤ۔ہم تمہیں مارنا نہیں چاہتے،کیونکہ تمہیں مارنے کا ہمیں آرڈر نہیں دیا گیا۔تم تینوں کو زندہ پکڑ کر لانے کی تاکید کی گئی ہے لیکن پاشا کو یہیں ختم کرنے کا حکم ملا ہے۔امید ہے تم ہم سے تعاون کروگے۔دوسری صورت میں یہاں خون خرابہ ہوگا۔ہمارے اور ساتھی بھی پہنچ رہے ہیں۔''

فوزیہ نے کچھ کہنے کیلئے منہ کھولا۔انتہائی سرعت سے قیصر نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور سرگوشی میں کہا۔

''بولنا مت،وہ ابھی دور ہیں لیکن آواز کا نشانہ لے سکتے ہیں۔ہوسکتا ہے وہ کوئی چال چل رہے ہوں۔''

اس نے آہستگی سے اس کے منہ سے ہاتھ ہٹادیا اور جھانک کر اس سمت دیکھا،جدھر سے آواز آئی تھی۔کچھ ہی دور اسے ایک متحرک سایہ نظر آیا۔اس نے رائفل سیدھی کی اور اس کا نشانہ لے کر بے دریغ لبلبی دبادی۔رائفل سنگل شارٹ پر تھی۔گولی کا فلک شگاف دھماکہ ہوا۔جنگلی پرندوں کی آوازوں کے ساتھ ایک بھیانک چیخ بلند ہوکر اچانک معدوم ہوگئی۔شاید ایک دشمن جہنم روانہ ہوگیا تھا۔

دوسری طرف سے ایک مکمل برسٹ مارا گیا۔گولیاں درخت کے تنے میں پیوست ہورہی تھیں۔زمین پر بکھرے ہوئے پتے بھی احتجاج کرکے خاموش ہوچکے تھے۔فوزیہ غیر ارادی طور پر اس کی پشت سے لپٹ گئی۔کتنا راحت انگیز احساس تھا۔موت کی وادی میں بھی محبت اپنی موجودگی کا احساس دلا رہی تھی۔وہ اسے زور سے بھینچ رہی تھی،اس میں پیوست ہورہی تھی۔اس میں جذب ہوکر موت کے خوف کو زائل کررہی تھی۔بے ساختہ وہ آنکھیں بند کرکے اس کی طرف گھوم گیا۔وہ اس کے کشادہ سینے میں پناہ ڈھونڈ رہی تھی۔دشمن نے چند لمحوں کی مہلت دی تھی۔انہی چند لمحوں سے وہ محبت کا امرت کشید رہے تھے۔وہ لرزتے بدن کے ساتھ کانپتی ہوئی آواز میں بولی۔

''کیا پتہ وقت اور موت مہلت نہ دے۔مجھے معاف کردینا۔میں نے ہی تمہیں اس دلدل میں دھکیلا ہے۔تم نے مجھے موت کے منہ سے نکالا،اور میری زندگی خرید لی۔

ہم زندہ بچ گئے تو میں اپنے رب سے تمہیں مانگ لوں
ل ،اور اگر یہاں تمہاری بانہوں میں مرگئی
امر امر ہو جاؤں گی۔"

وہ یک ٹک اس کی نمناک آنکھوں میں دیکھ
رہا تھا۔ محبت کا اور ہی جذبہ ہوتا ہے موت اور دشمن کی
للکار سے بے نیاز اسے سحر انگیز کر رہا تھا۔ بلا ارادہ اس نے
ہونٹ اس کی بھیگی ہوئی پلکوں پر رکھ دیے۔ وہ
آنکھیں بند کیے محبوبانہ گستاخی کی منتظر تھی۔ اس کے ہونٹ
پھڑپھڑا رہے تھے۔ دوسرے ہی لمحے اس نے اپنے سلگتے
ہوئے ہونٹوں سے اس کے لرزتے لبوں پر مہر محبت ثبت
کر دی۔ یہ کیسا ملن تھا۔ یہ کیسی گھڑی تھی۔ موت دبے
پاؤں ان کی طرف بڑھ رہی تھی، اور وہ محبت کی بھول بھلیوں
میں گم تھے۔

"مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں۔ تم بھی مجبور تھیں
اور تمہاری وجہ سے مجھے وطن کی خدمت کا موقع بھی ملا۔" وہ
آہستگی سے بولا۔

وصل کے لمحے بہت مختصر ہوتے ہیں، یا مختصر لگتے
ہیں۔ ایسا ہی ان کے ساتھ ہوا۔ دفعتاً پتے چرچرائے۔ اس
سے پہلے کہ وہ سنبھلتے دو خطرناک رائفلوں کی نالیں ان کی
کنپٹیوں پر رکھ دی گئیں۔ دو لحیم شحیم بدمعاش ان کے
سامنے کھڑے انہیں گھور رہے تھے۔ انہوں نے
جینز اور شرٹس پہن رکھی تھیں۔ شکلوں سے ہی وہ چھٹے ہوئے
بدمعاش لگ رہے تھے۔ انہوں نے فوراً ان کی رائفلیں
چھین لیں۔ ایک نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔

"واہ بھئی واہ، یہاں تو پوری فلم چل رہی
ہے۔ جنگل، ایکشن اور عشق محبت، بھئی بڑا سچا عشق لگتا ہے
نیم۔۔۔"

اس نے اپنے ساتھی کی طرف دیکھ کر گھٹیا سا اشارہ کیا۔

"آہو استاد۔۔۔ گل تو آپ کی ٹھیک ہے۔ پر انہیں
اب ہم بتائیں گے کہ جنگل میں عشق کیسے ہوتا ہے۔"

اس نے بیہودہ سا قہقہہ لگایا، اور دائیں بائیں دیکھتے
ہوئے بولا۔

"یہ پاشا اور دوسری لڑکی کدھر ہیں؟"

قیصر خوفزدہ نہیں ہوا تھا۔ اس نے لمبی ناک والے کی
طرف دیکھتے ہوئے دبنگ لہجے میں کہا۔

"کون ہو تم لوگ اور ہمارا پیچھا کیوں کر رہے ہو؟"

"اشکے بھئی اشکے" دوسرا آدمی بیہودہ قہقہہ لگاتے
ہوئے بولا "جناب یہ تو اندھیر ہے۔ ہمارے دو آدمی
مار کر ہمیں ہی ڈرا رہے ہو۔ بھئی کمال ہے۔ اوئے جھلیو۔
ہم نے تمہیں مارنا ہوتا تو ادھر جی ٹی روڈ پر ہی اڑا دیتے پر،
ہمیں حکم تھا کہ پرندوں کو زندہ پکڑ کے لانا ہے۔ بس
پاشا کو اڑا دینا ہے، کیونکہ اب اس کی ضرورت نہیں
رہی۔ کہاں ہے وہ کتے کی دم؟"

قیصر نے اس کا سوال یکسر نظرانداز کرتے ہوئے
پوچھا۔

"تم کس کے آدمی ہو؟"

لمبی ناک والا پھر قہقہہ لگا کر بولا۔

"لے دس۔۔۔ او جی آدمی تو ہم اپنی بیویوں کے
ہیں۔ چلو آج کچھ دیر اس تتلی کے بھی بن جائیں
گے۔" اس کا اشارہ فوزیہ کی طرف تھا۔

"بکواس بند کر" قیصر نے دھاڑ کر کہا۔

وہ ڈھیٹ پن سے مسکراتے ہوئے بولا۔

"اچھا لو جی کردی بند بکواس، اب آپ شروع
ہو جائیں۔ وقت بڑا تھوڑا ہے جی۔ کہاں چھپایا ہے اس
حرامی پلپیے کو؟"

فوزیہ بدستور اس کے سینے لپٹی ہوئی تھی۔ اب رائفل
کی مہیب نال اس کی گردن کو چھو رہی تھی۔ لمبی ناک
والا اسے بازو سے پکڑ کر کھینچتے ہوئے بولا۔

"چلو جی، اب یہ محبت کا ڈرامہ ختم بھی کر دیں۔"

وہ اس کی گرفت میں پھڑپھڑائی۔ اسی لمحے ایک فلک
شگاف دھماکہ ہوا۔ لمبی ناک والے کا سر پاش پاش
ہوا اور وہ چیخنے چلانے کی حسرت دل میں لیے زمین بوس
ہو گیا۔ اس کے خون اور گوشت کے لوتھڑے فوزیہ کے
چہرے اور جسم سے چپک گئے تھے۔ دوسرے نے ہراساں
نظروں سے اپنے عقب میں دیکھا۔ اب ارشی اس کا نشانہ
لے رہی تھی، پاشا اس کے ساتھ کھڑا پھٹی پھٹی آنکھوں سے
لمبی ناک والے کی لاش کو گھور رہا تھا۔

"نہ بی بی نہ" گولی مت چلانا۔ ورنہ تمہارے اس

ساتھی کی کھوپڑی بھی اسی طرح اڑ جائے گی۔''

اس کی رائفل کی نال بدستور قیصر کی کنپٹی پر اور انگلی لبلبی پر تھی۔

''میں صرف دو تک گنوں گا۔ گن پھینک دو۔''

وہ سفاک لہجے میں غرایا۔ ارشی تذبذب میں تھی اور اسے قہر ناک نظروں سے گھور رہی تھی۔

''ایک.....''

اس نے سرد لہجے میں کہا اور لبلبی پر انگلی کا دباؤ بڑھا دیا۔ اسی لمحے پاشا نے اندھا دھند اس کی طرف دوڑ لگا دی۔ ایک لمحے کیلئے اس کا دھیان پاشا کی طرف ہوا اور یہی ایک لمحہ اس کی زندگی کا خاتمہ کر گیا۔ ارشی نے لبلبی دبا دی۔ سرسراتی ہوئی گولی اس کی گردن میں گھس گئی۔ وہ خرخراتی ہوئی چیخ کے ساتھ نیچے گرا۔ اس کی رائفل کا رخ پاشا کی طرف تھا۔ مرنے سے پہلے وہ لبلبی دبا چکا تھا۔ گولیوں کی بوچھاڑ نے پاشا کا پیٹ اور ٹانگیں چھلنی کر کے رکھ دیں۔ آناً فاناً کھیل ختم ہو گیا، لیکن کھیل ختم ہونے سے پہلے ایک بار پھر جنگل کے پراسرار ماحول میں گولیوں کی تڑتڑاہٹ گونجنے لگی۔ آوازیں گاڑیوں کی طرف سے آ رہی تھی۔ فائرنگ سے لگ رہا تھا کہ دو پارٹیاں آپس میں بھڑ چکی ہیں۔ وقفے وقفے سے فائرنگ اور انسانی چیخوں کا تسلسل جاری رہا۔ پانچ منٹ بعد فائرنگ رک گئی، اور پھر کئی دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنائی دیں۔ دوسرے ہی لمحے درختوں کی آڑ سے کیپٹن ارباز، اور غازی خان نمودار ہوئے۔ ان کے ہاتھوں میں اے کے سینتالیس گنز تھیں۔ پاشا آخری سانسیں لے رہا تھا۔ کیپٹن سیدھا اس کے پاس پہنچا۔

''مم۔۔۔ مجھے۔۔۔ معاف کر دینا کیپٹن''

اس نے بمشکل تمام کہا۔ اس کے منہ سے خون کا فوارہ نکلا اسے جھٹکے لگ رہے تھے۔

''مم میں سب کچھ بتا دیتا ہوں۔ میں جن کیلئے آج تک اپنے وطن اور ضمیر سے غداری کرتا رہا، آج وہ ہی مجھے مروانا چاہتے تھے۔ میں نے سب باتیں سن لی تھیں، اور ان آدمیوں کو پہچان لیا تھا۔''

ٹوٹتی سانسوں کے ساتھ وہ بمشکل بول رہا تھا۔

''یہ تینوں ٹاپ ٹین اشتہاری مجرم تھے اور مولانا حقی کیلئے کام کرتے تھے۔ مولانا حقی اسرائیلی ٹیررسٹ ہے اور اس کا باس ڈیوڈ جانسن بھی اسرائیلی ہے اس کا نام ڈین نیلسن ہے۔ جہان پور اور احمد مارکیٹ والے بلاسٹ بھی حقی نے کروائے تھے۔ امجد عالم چٹھہ کو بھی اسی نے مروایا تھا''

اس کی آنکھیں بند ہو رہی تھیں۔ وہ پوری ہمت مجتمع کر کے بولا۔

''اکرام بھٹی اور محمد حیات کو میں نے انہی کے کہنے پر مروایا تھا۔ مم مجھے مم۔۔ معاف۔۔۔ یا اللہ مم مجھے۔۔۔''

اس کی گردن ایک طرف ڈھلک رہی تھی۔

''پاشا جلدی بتاؤ حقی اس وقت کہاں ہے؟''

کیپٹن نے اسے جھنجھوڑتے ہوئے پوچھا۔ بمشکل اس نے آنکھیں کھولیں اس کے لب متحرک تھے، لیکن آواز نہیں نکل پا رہی تھی۔ وہ جان کنی کے عالم میں تڑپتے ہوئے بولا۔

''اس اسلا۔۔۔ اسلام پورہ۔۔۔'' اسی لمحے اس کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔ اس کی کھلی ہوئی آنکھیں کیپٹن کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ جن میں حسرت ندامت اور اذیت کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ کیپٹن نے اپنا ہاتھ اس کی آنکھوں پر رکھ دیا۔

کچھ دیر بعد پولیس پہنچ گئی۔ کیپٹن نے اپنا تعارف کروایا اور دیگر ساتھیوں کے ساتھ وہاں سے نکل آیا۔ بلیک پراڈو اور دشمن کی اغوا کردہ گاڑی کے پاس بھی چند لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ غازی خان نے بتایا کہ یہ دشمن کے ساتھی تھے، جو ان کی مدد کیلئے آئے تھے۔ انہیں "محافظ" کے جوانوں نے واصلِ جہنم کر دیا تھا۔ آدھے گھنٹے بعد وہ محافظ سینٹر میں پہنچ گئے۔ کیپٹن کے ذہن میں ایک ہی لفظ گونج رہا تھا۔ "اسلام پورہ" جو کہ مرتے وقت پاشا نے بتایا تھا، لیکن محض ایک گاؤں کے نام پر وہ ایکشن نہیں لے سکتے تھے۔ خفیہ ذرائع سے انہوں نے اسلام پورہ سے متعلقہ معلومات اکٹھا کی تھیں لیکن وہ بھی حوصلہ افزا نہیں تھیں۔ قیصر فوزیہ اور ارشی ایک خونی معرکے کے بعد آرام کر رہے تھے۔

رات گیارہ بجے اچانک انہیں اطلاع ملی کہ صدیقی ہسپتال میں خونی معرکہ جاری ہے۔ٹھیک پانچ منٹ بعد وہ وہاں سے نکل چکے تھے۔ایک گاڑی میں کیپٹن اور اس کے ساتھی تھے،جبکہ دوسری میں قیصر ارشی اور فوزیہ تھے۔گاڑیاں برق رفتاری سے صدیقی ہسپتال کی طرف دوڑ رہی تھیں۔

❀ .... ❀ .... ❀

رات پچھلے پہر کے عمل سے گزر رہی تھی۔پیر نقاب پوش کے مخصوص کمرے میں افضال اور ثنا اللہ اس کے سامنے بیٹھے اسے بغور دیکھ رہے تھے۔ وہ امپورٹیڈ برانڈ کے سگریٹ کا کثیف دھواں خارج کرتے ہوئے آہستگی سے بولا۔

''ویلڈن افضال تم نے بہت بڑا کام کیا ہے۔پہلے کی طرح تمہیں اس کا بھی بہت بڑا انعام اور اللہ سے قرب کا موقع ملے گا۔بس کل دس بجے اس لڑکی کو لے کر مطلوبہ مقام پر پہنچ جانا۔''

''جی ضرور شاہ جی ایسا ہی ہوگا۔''

اس نے مودب لہجے میں انتہائی عقیدت سے کہا۔

پیر نے سحر انگیز نظروں سے اسے دیکھا اور ایک مخصوص جام اس کی طرف بڑھا دیا۔شیشے کے نفیس گلاس میں ہلکا گلابی رنگ کا مشروب افضال کی کمزوری تھا۔اس نے بیدوں کی طرح گلاس پکڑا اور لبوں سے لگالیا۔ثنا اللہ گہری نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔پیر نے مسکراتی نظروں سے اسے دیکھا اور تکیے سے ٹیک لگاتے ہوئے انگلش میں بولا۔

''رگھو۔۔۔!ہم اپنے مشن کی تکمیل کے بہت قریب ہیں۔ہمارا ٹارگٹ پورا ہونے کو ہے۔اسے اس کے کمرے میں چھوڑ آو۔''اس نے افضال کی طرف اشارہ کیا۔

چند لمحوں بعد وہ اسے ایک کمرے میں چھوڑ آیا۔

''کیسا ہے یہ جانثار؟''

اس نے رگھو عرف ثنا اللہ کے اندر داخل ہوتے ہی پوچھا۔

اس نے ہلکا سا قہقہہ لگاتے ہوئے مکروہ لہجے میں کہا۔

''سر۔۔۔یہ مکمل ہمارے قبضے میں ہے۔آپ کے ذرا سے اشارے پر کچھ بھی کرنے کو تیار ہے۔''

پیر نقاب پوش نے تپائی کے نیچے سے ایک بوتل نکالی۔وہ ام الخبائث کے دو جام تیار کرتے ہوئے زیر لب مسکرا رہا تھا۔

''جب تک نادیہ نور اور افضال جیسے بے وقوف ہیں۔ہمارا مشن جاری رہے گا۔بس کل کا کام بنا کسی رکاوٹ کے ہو جائے پھر ہم یہ گیٹ اپ اتار دیں گے۔''

اس نے اپنی مصنوعی داڑھی اور دراز زلفوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

رگھو کی آنکھوں کی شیطانی چمک بڑھ رہی تھی۔اس نے پیر کے ہاتھ سے جام پکڑ کر ہونٹوں سے لگاتے ہوئے کہا۔

''بھگوان ہمیں سپھل کریگا۔کل سینکڑوں لوگوں کے ساتھ ہاشم لنگڑیال کی مرتیو (موت) سے ایک بار پھر یہاں ماتم کی صفیں بچھ جائیں گی۔''

شب کے نیم اندھیرے میں دو شیطان پھر بے گناہوں کی خون کی ہولی کا پلان ترتیب دے رہے تھے۔

انڈین ایجنٹ رگھو "ثنا اللہ" کے روپ میں ارجن "مولانا قدوس" کی جگہ بھیجا گیا تھا۔وہ انتہائی مہارت وکامیابی کے ساتھ اسلام پورہ کے سادہ مزاج لوگوں کو شیشے میں اتار رہا تھا۔آج سے ایک ماہ قبل افضال بھی اندھی عقیدت کا شکار ہوا تھا۔ ازاں بعد اسے مخصوص نشہ آور مشروب اور انجکشن دے کر تابع بنالیا گیا تھا۔نئے آنے والے سادہ لوح عقیدت مند ضرورتوں مجبوریوں اور مسائل کے مارے لوگ اس کے پاس آکر اپنی غرض وغایت بیان کرتے تھے۔اس کی گھنی مصنوعی داڑھی میں ایک مخصوص ڈیوائس تھی،جس کے ذریعے دوسرے کمرے میں موجود پیر نقاب پوش ساری باتیں سن لیتا تھا اور پھر جب سائل کو اس کے کمرے میں بھیجا جاتا،تو وہ اس کی سنی ہوئی باتیں دہرا کر اس کے دل میں اتر جاتا تھا۔مطلوبہ لوگوں بالخصوص جوان لڑکیوں کو نشہ آور جذبات آمیز مشروب دیکر قبضے میں کرلیا جاتا تھا۔وہ ان کی غیر اخلاقی ویڈیوز بھی بنالیتے تھے۔جب سیدھی انگلی سے گھی نہیں نکلتا تھا تو انگلی ٹیڑھی کر کے انہیں بلیک میل کیا جاتا۔اب تک مذکورہ گاؤں سے متعدد نوجوان لڑکے

لڑکیاں غائب ہو چکے تھے۔جنہیں تخریبی کاروائیوں اور گھناؤنے مقاصد میں استعمال کیا جاتا تھا۔ایسے ہی ایک خطرناک اور خونی مشن کیلئے افضال اور نادیہ نور کا انتخاب کیا گیا تھا۔ پہلے پہل تو افضال نادیہ کو دل وجان سے چاہتا تھا،لیکن پیر نقاب پوش اور ثنا اللہ کے مخصوص شیطانی عمل کے بعد وہ ان کے اشاروں پر ناچ رہا تھا۔اسی سلسلے میں گزشتہ شام نادیہ کو پیر کے مخصوص کمرے میں پہنچا کر اسے ہیجان انگیز مشروب پلایا گیا تھا۔اور پھر ڈاکٹر صدیقی (ڈین نیلسن) اور پیر نقاب پوش نے اس کی عصمت کا سرمایہ لوٹ لیا تھا۔

وہ اسی کمرے میں بیڈ پر بے حس وحرکت پڑی بے تاثر نگاہوں سے اپنے پہلو میں نیم دراز ڈین نیلسن کو دیکھ رہی تھی ،لیکن اس کے ذہن میں کوئی سوال،شک غصہ یا نفرت نہیں تھی۔وہ سرشاری کی اسی حالت میں بیڈ پر پڑی تھی البتہ شیطانی عمل کے بعد اسے ایک سفید فراک اور پاجامہ پہنا دیا گیا تھا۔

آستانے سے ملحق مسجد میں اذانِ فجر کی ایمان افروز آواز گونج رہی تھی، لیکن وہ ہر احساس سے عاری بیڈ پر پڑی تھی۔اسی لمحے ڈاکٹر صدیقی اوپر اٹھا اور اٹیچڈ باتھ روم میں گھس گیا۔کچھ دیر بعد وہ فریش ہو کر قدآدم آئینے کے سامنے کھڑا زیرلب مسکرا رہا تھا۔دفعتاً وہ اس کی طرف متوجہ ہوا۔وہ اب بھی اسے حریصانہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔وہ آہستگی سے چلتا ہوا بیڈ کے پائینتے پر اس کے نزدیک بیٹھتے ہوئے بولا۔

''اٹھو!تمہاری روح کی کثافتیں دھل چکی ہیں۔تم آج ایک اہم کام کیلئے اللہ کی راہ میں جا رہی ہو۔اس کے بعد تمہیں وہ سب کچھ ملے گا جو تم چاہتی ہو۔اللہ کا قرب اور تمہارا محبوب تمہارے منتظر ہیں۔''

وہ بنا کچھ کہے کسی تنویمی عمل کے تحت اٹھی، اور قدآدم آئینے کے سامنے کھڑی ہوگئی۔سفید فراک اور پاجامے میں وہ کوئی پری لگ رہی تھی۔ اسے اپنے چہرے پر ہلکا سا میک اپ بھی نظر آرہا تھا۔ بال سلیقے سے سنوار دیے گئے تھے۔لاارادہ اس نے اپنا جسم ٹٹول کر دیکھا،اسے اپنی فراک کے نیچے ایک عجیب وضع کی جیکٹ کا احساس ہوا۔جس پر اسے کچھ باریک سی تاریں،اور کچھ ننھے ننھے موتی محسوس ہو رہے تھے۔روزن دیوار سے سپیدۂ سحر کے آثار جھانک رہے تھے۔اسے بیڈ کے پاس پڑے بیش قیمت جوتے بھی نظر آئے ،جو کہ اس نے ڈاکٹر صدیقی کے اشارے پر پہن لیے تھے۔ایک سفید چادر بھی اسے دی گئی جو اس نے جسم پر اوڑھ لی تھی۔اسی لمحے پیر نقاب پوش اور رگھو کمرے میں داخل ہوئے۔پیر اسے بھرپور نظروں سے گھور رہا تھا۔رگھو مودب انداز میں ایک طرف کھڑا تھا۔

''تیاریاں مکمل ہیں سر،بس اب کچھ دیر بعد نکلنا ہے''

پیر نقاب پوش نے پرجوش لہجے میں کہا۔

ڈاکٹر صدیقی زیرلب مسکراتے ہوئے دھیرے سے بولا۔

''ویٹس گڈ۔۔۔ہم ٹھیک نو بجے یہاں سے نکلیں گے۔اسے خودکش جیکٹ پہنا دی ہے۔ہاشم لنگڑیال دس بجے اسٹیج پر آئے گا۔ٹھیک دس بج کر تین منٹ پر یہ خود کو اڑا دے گی۔اس کے ساتھ ہاشم لنگڑیال اور سینکڑوں لوگ اڑ جائیں گے۔''

اس نے سفاک لہجے میں کہا اور رگھو کی طرف دیکھا۔

''تمام انتظامات مکمل ہیں سر'' وہ اس کی نظروں کا مفہوم سمجھتے ہوئے آہستگی سے بولا۔

''غلام محمد آباد کی جلسہ گاہ میں ہزاروں کا مجمع ہوگا۔دوسرا دھماکہ دس بجکر چھ منٹ پر ہوگا۔اس کیلئے افضال تیار ہے سر۔''

وہ اسے تعریفی نظروں سے دیکھتے ہوئے پھنکار کر بولا۔

''ویری گڈ یہ ہمارا آخری مشن نہیں،لیکن بہت اہم ہے۔یہاں مخصوص کمروں میں ٹائم بم فکس کردو۔جو کہ دس بج کر دس منٹ پر بلاسٹ ہو جانے چاہئیں۔ہم یہاں کوئی سراغ نہیں چھوڑیں گے۔تمام اہم ثبوت اور کاغذات بریف کیس میں رکھے ہیں۔یہ تمہارے پاس رہے گا۔''

اس نے پیر نقاب پوش کی طرف دیکھا۔

''آئی ایم ریڈی سر۔'' وہ نادیہ نور کی طرف دیکھتے

ہوئے بولا۔ جو کہ بیڈ پر اپنے دھیان میں مگن بیٹھی تھی۔

''واضح رہے، مشن مکمل ہوتے ہی سیون اسٹار ہوٹل میں پہنچنا ہے۔ نیکسٹ پلان وہیں تیار کیا جائے گا'' صدیقی ان دونوں کو ہدایات جاری کر رہا تھا۔

''وقت کی پابندی بہت اہم ہے۔ اس کے فوراً بعد انسپکٹر پاشا کو بھی اڑا دیا جائے گا۔''

رگھو نے تحسین آمیز لہجے میں کہا۔

''گڈ پلاننگ سر''

''فضول باتیں مت کرو رگھو'' وہ اس کی بات کاٹتے ہوئے درشت لہجے میں بولا۔ ''ناکامی اور کمی کوتاہی کا انجام اس دفعہ بہت بھیانک ہوگا۔''

اس نے اپنی نظریں پیر نقاب پوش پر مرکوز کر دیں۔

"مدرسہ راہبر انسانیت " والی کوئی غلطی مت دہرانا جیک وارمر، وہاں تم مولانا حقی کے گیٹ اپ میں اب تک ہوتے تو آج یہ مسائل نہ ہوتے۔''

اس کے سرد لہجے نے پیر نقاب پوش (مولانا حقی) کو دہلا کے رکھ دیا۔ اس نے آہستگی سے مودب لہجے میں کہا۔

''سوری سر لیکن اب ویسا کچھ نہیں ہوگا۔ مجھے پتہ ہے یہ ہمارے لیے آخری موقع ہے۔''

''آٹس اوکے۔۔ ناکامیوں سے سبق سیکھنا چاہیے۔ مجھے بھی جواب دینا ہوتا ہے اوپر والوں کو۔ اور اس مشن میں کیتھی برنارڈ شامل نہیں ہوگی۔ اس کا سیٹ اپ بہت اچھا جا رہا ہے۔''

ایک دم کسی خیال کے تحت وہ اپنا سیل فون نکال کر کیتھی کا نمبر ڈائل کرنے لگا۔

''اوہ شٹ۔۔۔ اس کا نمبر آف ہے۔ ٹھیک ہے اب ہم ناشتہ کرتے ہیں۔''

اس نے ریسٹ واچ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''ایک گھنٹے بعد ہمیں نکلنا ہے۔ اور ہاں۔۔۔ اپنے سیل فون آف کر دو۔ اب غلام محمد آباد میں چیخوں اور دھماکوں کی آواز کے بعد ہی سیل فونز آن ہوں گے۔''

ٹھیک دس منٹ بعد وہ پر تکلف ناشتا کر رہے تھے۔ اس دوران افضال بھی مشن کیلئے تیار ہو چکا تھا۔ ناشتہ وہی خرانٹ سی عورت سرو کر رہی تھی، جو کہ گیٹ پر عورتوں کی تلاشی پر تعینات تھی۔

نادیہ ان کے اشاروں پر عمل پیرا تھی۔ اس نے ڈین نیلسن کے کہنے پر ناشتے سے خوب انصاف کیا۔ افضال بھی ایسا ہی کر رہا تھا۔ پندرہ منٹ بعد وہ چائے پی رہے تھے۔

''اس ثریا کا کیا کرنا ہے سر؟''

رگھو نے اسی خرانٹ عورت کی طرف خفیف سا اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

ڈین کے ہونٹوں پر سفاک مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ انتہائی سرد لہجے میں بولا۔

''رگھو۔۔۔ کیا تمہیں دوبارہ ٹریننگ دینا پڑے گی؟ اس نے ہماری بہت خدمت کی ہے۔ لیکن یہ ہمارے کئی رازوں سے واقف بھی ہے۔ یہ اسی گاؤں کی ایک غریب عورت ہے۔ کچھ بھی بک سکتی ہے۔ اسے آرام کی نیند سلا دو۔''

وہ تینوں انگلش میں بات کر رہے تھے۔ اس لیے نادیہ اور افضال کچھ سمجھنے سے قاصر تھے۔ ویسے بھی وہ ان کے تابع تھے تاہم وہ پھر بھی محتاط تھے۔ رگھو سفاک مسکراہٹ کے ساتھ کچن کی طرف بڑھا۔

کچھ ہی دیر بعد وہ ثریا کے سامنے کھڑا تھا۔

''کیا بات ہے سرکار، کچھ چاہیے؟''

وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے مستفسرانہ لہجے میں بولی۔

''ہاں'' وہ اس کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ ''وہ ناشتہ کر رہی تھی۔ اس نے نوالہ توڑ کر منہ میں رکھا اور کھڑی ہو گئی۔

''تمہیں اب آرام کی ضرورت ہے'' اس نے سفاک لہجے میں کہا اور اپنی جیب سے ایک چھوٹی سی شیشی نکال کر ایک سفید سا قطرہ اس کی چائے کے کپ میں ٹپکا دیا۔ عقیدت کی اندھی ثریا اسے خوش بختی کی انتہا سمجھ رہی تھی۔ اس نے جلدی سے چائے کا کپ اٹھایا اور لبوں سے لگا لیا۔ چند لمحوں بعد اس کی حیرت زدہ آنکھیں کسی غیر مرئی نکتے کو گھور رہی تھیں۔ وہ فرش پر بے حس و حرکت پڑی تھی۔ سریع الاثر زہر نے ایک پل کی مہلت بھی نہیں دی

تھی۔آٹھ بج کر پچاس منٹ پر مخصوص اور مشکوک کمروں میں بارود بچھا کر ٹائم فکس کر دیا گیا۔ٹھیک نو بجے وہ کمرے لاک کر کے فورسیٹر ٹویوٹا میں بیٹھ چکے تھے۔ڈرائیونگ سیٹ پر رگھو تھا۔اس کے ساتھ والی سیٹ پر ڈین نیلسن اور عقب میں مولانا حقی کے ساتھ نادیہ نورالٰہی اور افضال تھے۔وہ انتہائی رازداری سے گاڑی میں سوار ہوئے تھے۔شیشوں پر سیاہ جالیاں باہر سے دیکھنے والوں کو بصارت سے محروم کر رہی تھیں۔خودکش جیکٹوں کے ریموٹ کنٹرولز رگھو کی جیب میں تھے، جو کہ موقع پر خودکش حملہ آوروں کو دے دیے جاتے۔برق رفتار گاڑی میں موت کے ہرکارے غلام محمد آباد کی طرف بڑھ رہے تھے۔

❀.....◉.....❀

بعض لوگوں کی چھٹی حس بہت تیز ہوتی ہے۔وہ متوقع خطرات سے بروقت خبردار ہو جاتے ہیں۔کیتھی برنارڈ کی چھٹی حس بھی بہت تیز تھی۔وہ انتہائی خطرناک اور سفاک ایجنٹ ڈاکٹر ماہا کے روپ میں ڈاکٹرز کالونی کی طرف بڑھ رہی تھی۔کچھ دیر پہلے وہ سونے کیلئے بیڈ پر لیٹ چکی تھی، جب اسے ایک ایمرجنسی پیشنٹ کے سلسلے میں بلا لیا گیا تھا۔ڈاکٹر صدیقی انتہائی اہم سلسلے میں ہسپتال سے غائب تھا لہٰذا اس کی عدم موجودگی میں وہی سب کچھ سنبھال رہی تھی۔نیند سے اس کی پلکیں بوجھل ہو رہی تھیں۔دن بھر کی بھاگ دوڑ اور ذہنی مصروفیت سے انسان کا تھک جانا فطرتی عمل ہے، لیکن اس کی طبیعت میں کچھ اضطراب سا پیدا ہو رہا تھا۔ادھر آنے سے پہلے اس نے میڈیسن اسٹور بھی چیک کیا تھا، جس پر ہنوز تالا پڑا ہوا تھا۔وہ کوٹھی کے مین گیٹ سے چند قدم ہی دور تھی، جب اس کے شک کو تقویت مل گئی کہ، کہیں نہ کہیں کوئی گڑبڑ ضرور ہے۔گن مین کریم خان اسے دیکھتے ہی گیٹ سے باہر آ جاتا تھا۔آج خلافِ معمول ایسا نہیں ہوا، تو اس نے اپنے سیل فون سے ایک نمبر ڈائل کیا۔

''مجھے کچھ گڑبڑ لگ رہی ہے۔اپنے آدمی لے کر کوٹھی میں پہنچ جاؤ۔جلدی''

کال ریسیو ہوتے ہی اس نے آہستگی سے کہا، اور کال منقطع کر دی۔اپنی جینز کی بیلٹ میں اڑسا ہوا خطرناک پستول تھپتھپا کر اس نے قدرے مطمئن انداز میں گہرا سانس لیا، اور زیرلب مسکراتی ہوئی مین گیٹ کے سامنے پہنچ گئی۔

دوسرے ہی لمحے چھوٹا پٹ آہستگی سے کھل گیا۔کالونی ہسپتال سے چند فرلانگ کے فاصلے پر ہی تھی۔اس لیے وہ پیدل ہی آتی جاتی تھی۔

اس نے گن مین کو یکسر نظرانداز کر دیا، اور سولنگ پر چلتی ہوئی کوٹھی کی عمارت کی طرف بڑھنے لگی۔دھڑکتے دل اور رکی ہوئی سانسوں کے ساتھ زوار شاہ اس شعلہ جوالہ کو آگے بڑھتا دیکھ رہا تھا۔اس نے گیٹ کا چھوٹا پٹ بند کیا، اور گیٹ سے متصل کمرے میں گھس گیا۔کریم خان بدستور بیہوش پڑا ہوا تھا۔اس نے ایک بوسیدہ سی چادر پھاڑ کر اس کے ہاتھ پیر مضبوطی سے باندھے، اس کے منہ میں بھی کپڑا ٹھونسا، اور اسے چارپائی کے نیچے لٹا دیا۔

اندرونی کارروائی کیلئے اس نے حور کو لائحہ عمل سمجھا کر کوٹھی کے اندر پہلے ہی داخل کر دیا تھا۔

محتاط نظروں سے اردگرد کا جائزہ لیتے ہوئے اس نے سیل فون نکالا، اور ایک نمبر ڈائل کیا۔کال ریسیو ہوتے ہی اس نے آہستگی سے کہا۔

''یہاں پہنچتے ہی ہسپتال کو چاروں طرف سے گھیر لو۔چپے چپے پر فورس کے جوان پھیلا دو۔تمام راستے بلاک کر دو۔ہم منزل کے بہت قریب ہیں ذرا سی غلطی ہمیں ناکامی سے دوچار کر سکتی ہے۔فورسز کے جوانوں کو ڈاکٹرز کالونی کی طرف بھیج دو لیکن رازداری سے۔''

اس نے کال منقطع کر کے سیل فون جیکٹ کی جیب میں رکھا اور، پستول ہاتھ میں پکڑ کر محتاط قدموں سے دیوار کے ساتھ پودوں کی آڑ میں آگے بڑھنے لگا۔ٹھیک تین منٹ بعد وہ کوریڈور کے سامنے پہنچ گیا۔کوریڈور کے سامنی ایک جدید ماڈل ریڈ کلر ہنڈا سوک کھڑی تھی۔وہ سولنگ پر لیٹ کر کرالنگ کرتا ہوا کار کی طرف بڑھنے لگا۔

کیتھی اپنے کمرے میں داخل ہوتے ہی نتھنے سکیڑ کر عقابی نظروں سے ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔اسے اپنے کمرے میں کسی کی موجودگی کے احساس کا گماں ہو رہا تھا۔

فرش پر بچھے کارپٹ کی سلوٹوں نے اس کے شکوک کو تقویت دی۔ اس نے زیرلب مسکراتے ہوئے پستول نکالا اور الماری کی طرف بڑھی۔ ایک جھٹکے سے اس نے الماری کا دروازہ کھول دیا۔ الماری میں ملبوسات کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ اس نے فریج کے عقب میں بھی جھانک کر دیکھا۔ وہاں بھی کوئی نہیں تھا، لیکن اس کی چھٹی حس مسلسل اسے خبردار کررہی تھی۔

اس نے ڈاکٹر صدیقی (ڈین نیلسن) کا نمبر ڈائل کیا اور جھنجلا کر سیل فون کی طرف دیکھنے لگی۔ مطلوبہ نمبر پاور ڈ آف تھا۔ اچانک اس نے عقابی نظروں سے بیڈ کی طرف دیکھا اور سفاک لہجے میں کہا۔

''تم جو کوئی بھی ہو بیڈ کے نیچے سے نکل آؤ، ورنہ میں بیڈ کے نیچے بارود کی آگ لگارہی ہوں۔ میں صرف ایک تک گنوں گی۔''

بیڈ کے نیچے چھپی ہوئی حور کے پسینے چھوٹ رہے تھے۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ماہا اتنی تیز طرار ثابت ہوگی۔ سرونٹ کوارٹر میں خانساماں اور اس کی بیوی خوابِ خرگوش کے مزے لے رہے تھے۔ فی الوقت کسی کی مداخلت کا امکان نہیں تھا۔

زوار شاہ ہنڈا سوک کی آڑ میں لکڑی کے مین دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ دروازہ نیم وا تھا، اور اندر سے روشنی کی اک لکیر باہر جھانک رہی تھی۔ اس نے تمام تر احتیاط کو پس پشت رکھا، اور دروازے میں داخل ہوگیا۔ سامنے ایک حال نما کمرا تھا۔ فرش پر کارپٹ بچھا ہوا تھا۔ ایک ڈائننگ ٹیبل کے آس پاس چھ عدد کرسیاں ترتیب سے رکھی ہوئی تھیں۔ آمنے سامنے چار کمرے تھے، جن میں سے ایک میں روشنی نظر آرہی تھی۔ کونے میں کچن تھا۔ اس کی معلومات کے مطابق روشن کمرہ کیتھی برنارڈ کا تھا۔

اس نے نیم وا در سے اندر جھانکا، اور اس کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ کیتھی پستول کا رخ بیڈ کے نیچے کی طرف کرکے ٹریگر پر دباؤ بڑھا رہی تھی۔ ایک لمحے کیلئے وہ سن ماہو کر رہ گیا۔ اتنی خوبصورت اور دلکش لڑکی بہت کم ہی دیکھنے کو ملتی ہے لیکن وہ ایک خطرناک ٹیررسٹ تھی۔ موت کا بیوپار اور خون کی تجارت اس کا پیشہ تھا۔ اسے اس کے نرم و گداز سرخ لبوں پر لپ اسٹک کی جگہ معصوم بے گناہوں کا خون نظر آرہا تھا۔ اس کی دلکش آنکھوں میں اپنی تمام تر سفاکیت کے ساتھ موت محوِ رقص تھی۔

''وقت ختم ہوا۔''

وہ سفاک لہجے میں غرائی۔

اک روح فرسا پس وپیش درپیش تھا۔ حور موت کے سفاک پنجے میں تھی۔ وقت کے دامن سے مہلت تمام ہوچکی تھی۔ وہ تذبذب کے عالم میں اس کی متحرک انگلی کو دیکھ رہا تھا، جس کا دباؤ بتدریج لمبی پر بڑھ رہا تھا، اور پھر ایک سماعت شکن دھماکے نے درودیوار کو لرزا کے رکھ دیا۔

بیڈ کے نیچے سے ایک شعلہ نکلا۔ کیتھی نے چیختے ہوئے اپنے سینے پر ہاتھ رکھا، اور پیچھے کی طرف گرتی ہوئی فریج سے جا ٹکرائی۔ فریج سے ٹکرا کر وہ اوندھے منہ گری اور ساکت ہوگئی۔ اس کا پستول اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا۔ اسی لمحے زوار شاہ اندر داخل ہوا اور بیڈ کے نیچے سے حور بھی انتہائی سرعت سے نکل آئی۔ اس کا جسم پسینے میں شرابور تھا۔

''ویلڈن حور تم نے بہت بڑا کام کیا ہے۔''

وہ اس کا کاندھا تھپتھپاتے ہوئے دھیرے سے بولا۔

عورت کی فطرت ہے کہ وہ جتنی بھی طاقتور اور بہادر ہو، ڈر جاتی ہے۔ وہ بھی خوف کی شدت سے تھر تھر کانپ رہی تھی۔ وہ کچھ کہنا چاہ رہی تھی لیکن قوتِ گویائی تو جیسے سلب ہوچکی تھی۔ دوسرے ہی لمحے وہ بیہوش ہوگئی۔ وہ اسے اٹھا کر بیڈ کی طرف لے جارہا تھا۔ چند لمحوں کیلئے وہ کیتھی سے غافل ہوا۔ حور کو بیڈ پر لٹا کر اس نے غیر ارادی طور پر اپنے عقب میں دیکھا۔ وہ اس کے سامنے کھڑی تھی۔

اس نے غرا کر کہا۔

''ایس پی زوار شاہ، ہم کچی گولیاں نہیں کھیلتے۔ تم یہاں آتو گئے ہو لیکن یہاں سے واپسی کا راستہ تمہیں کسی صورت نہیں ملنے والا۔ میری طرف حیرت سے مت دیکھو، میں نے بلٹ پروف جیکٹ پہن رکھی ہے۔ اب گولی چلانے کی باری میری ہے۔''

اس نے پستول کا رخ اس کی طرف کر دیا، جبکہ زوار شاہ کے پستول کا رخ پہلے ہی اس کی طرف تھا۔ وہ پراعتماد لہجے میں اپنے سامنے کھڑی ہوئی خوبصورت قیامت سے مخاطب ہوا۔ ''تمہارا بھانڈا پھوٹ چکا ہے۔ ہسپتال کو چاروں طرف سے فورسز نے گھیر لیا ہے۔ تمہارے میڈیسن سٹور سے بھاری مقدار میں اسلحہ بارود بھی دیکھ لیا گیا ہے۔ تمہاری بہتری اسی میں ہے کہ اپنے آپ کو سرینڈر کر دو۔''

ایک لمحے کیلئے اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا، لیکن وہ خوفزدہ نہیں ہوئی۔ اس نے آہستگی سے ایک قدم آگے بڑھایا۔ وہ ٹریگر پر دباؤ بڑھاتے ہوئے دھیرے سے بولا۔

''ہم دونوں ایک دوسرے کے نشانے پر ہیں۔ اس بار تمہارا نشانہ میں لوں گا، اور تمہاری کھوپڑی اڑا دوں گا۔ تمہاری کھوپڑی بلٹ پروف نہیں اور مجھے اپنی موت کا کوئی خوف نہیں۔ میرے لیے تمہاری موت بہت اہم ہے۔''

''بچوں جیسی باتیں مت کرو ایس پی۔''

وہ پھنکار کر بولی۔

''کوئی کچھ ثابت نہیں کر پائے گا۔ ہسپتال میں کوئی ایسا کر رہا ہے اس کی جواب دہ یا ذمہ دار میں نہیں ہوں۔ اوپر سے کی گئی ایک کال تمہارے بڑوں کی نیندیں حرام کر دے گی۔''

''پلیز مس کیتھی'' وہ استہزائیہ انداز میں بولا۔

''جو پشت پر وار کرتا ہے اور اپنی عورتوں کو استعمال کرتا ہے، کم ظرف دشمن ہوتا ہے اور یہ خیال ذہن سے نکال دو کہ محض ایک کال پر تم یہاں سے واپس اپنے ملک روانہ ہو جاؤ گی، کیونکہ موت تمہیں مہلت نہیں دے گی۔''

وہ اسے سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگی۔ حور بیڈ پر بدستور بے حس و حرکت پڑی تھی۔

اس نے ایک لمحے کیلئے حور کی طرف دیکھا، اور زیر لب مسکراتی ہوئی ایک قدم آگے بڑھی۔ وہ اسے شعلہ بار نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ وقت کی بساط پر اپنا آخری داؤ کھیلنے جا رہی تھی۔ خلاف توقع آہستگی سے اس نے نرم لہجے میں کہا۔

''تو مسٹر شاہ، اگر تم ایک غیرت مند اور بہادر قوم کے سپوت ہو تو آؤ ایک نازک اندام لڑکی سے دوبدو مقابلہ کرو۔ پستول پھینک دو۔ اگر میں ہار گئی تو سرینڈر کر دوں گی۔''

وہ آنکھیں سکیڑ کر اس کی آنکھوں میں جھانک رہی تھی۔

''ایک لمحے کیلئے اس کی آنکھوں میں تذبذب اور سوچ کی پرچھائیں عود کر آئی۔ دوسرے ہی لمحے اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ اپنے پستول کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''میں تمہارا چیلنج قبول کرتا ہوں۔''

''گڈ ایس پی، میں پستول پھینک رہی ہوں، میرا نہیں خیال کہ تم ایک خالی ہاتھ عورت پر گولی چلاؤ گے۔''

اس نے کہا اور پستول بیڈ کے نیچے پھینک دیا۔

دوسرے ہی لمحے اس نے اپنی جیکٹ اتار کر فرش پر پھینک دی۔ نیچے بلٹ پروف جیکٹ نظر آ رہی تھی۔ اس نے وہ بھی اتار دی۔ تنگ سی شرٹ میں اس کی رعنائیاں ابھر کر سامنے آ گئیں۔ اس نے پاؤں میں جوگر پہن رکھے تھے۔ گھنے سیاہ بال ہیئر کیچ میں پابند سلاسل تھے۔ ایک آوارہ لٹ اس کے لب و رخسار سے اٹکھیلیاں کر رہی تھی۔ زوار شاہ نے اس کا چیلنج قبول کرتے ہوئے پستول نیچے پھینک دیا۔ وہ خود بھی مارشل آرٹ کی سوجھ بوجھ رکھتا تھا، لیکن آج اس کے سامنے ایک تربیت یافتہ ایجنٹ تھی۔ جو پلک جھپکتے میں ہتھیلی کے وار سے گردن توڑ دیتی تھی۔ اس نے استہزاء آمیز نظروں سے ایس پی کی طرف دیکھا اور زیر لب مسکراتے ہوئے بولی۔

''نو ڈاؤٹ کہ تم ایک جذباتی قوم ہو۔ اپنی ذاتی انا کیلئے تم نے ایک بہت بڑا موقع گنوا دیا ہے۔ تم مجھے گولی بھی مار سکتے تھے۔ تمہاری قوم کے جو بڑے ہیں وہ ڈالرز کی خوشبو کے عوض اپنے عوام کے جذبات مفادات اور ان کا لہو تک بیچ دیتے ہیں، بیچ رہے ہیں۔''

''فضول باتوں میں وقت ضائع مت کرو''

وہ ایک قدم اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔

''ہر ملک ہر قوم ہر معاشرے میں اچھے برے لوگ

ہوتے ہیں۔ گنتی کے چند برے اور کرپٹ لوگوں کی وجہ سے تم جیسے مفاد پرست عناصر اپنے مکروہ مقاصد میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔ لیکن آج تمہارا سامنا سرفروشوں سے ہوگا۔ جو وطن کی آن اور امن کیلئے موت کو بھی مات دیتے ہیں۔''

ایک دم وہ کسی طاقتور اسپرنگ کی طرح ہوا میں اچھلی اور زوردار فلائنگ کک اس کے جبڑے پر ماری۔ چند لمحوں کیلئے اس کا سر چکرا گیا۔ وہ دوسرے حملے کیلئے پر تول رہی تھی۔ وہ دوبارہ سطح زمین سے بلند ہوئی۔ اس بار وہ جوابی حملے کیلئے تیار تھا۔ وہ جونہی اس کی طرف لپکی اس نے پوری قوت سے آہنی گھونسہ اس کے پیٹ میں جڑ دیا۔ اوغ۔۔۔ کی آواز کے ساتھ وہ اچھلتی ہوئی پیچھے کی طرف گئی اور فریج سے ٹکرائی۔ اس کی آنکھوں سے پانی بہنے لگا تھا۔ چہرے پر اذیت کے تاثرات واضح نظر آرہے تھے۔

''گڈ۔۔۔ مزہ آئے گا۔''

اس نے جمپ لگا کر اوپر اٹھتے ہوئے کہا، اور ایک ٹانگ پر گھوم کر اسے کک مارنا چاہی۔ دوسرے ہی لمحے اس کی ٹانگ اس کے دونوں ہاتھوں کے شکنجے میں پھڑ پھڑا رہی تھی۔ وہ اس کی ٹانگ پکڑ کر بری طرح مروڑ رہا تھا۔ درد کی شدت سے اس کے دلکش نقوش مسخ ہورہے تھے۔ اس کی دبی دبی چیخیں کمرے میں گونجنے لگیں۔ ایک دم اس نے بدقت تمام اپنی دوسری ٹانگ اس کے چہرے پر ماری۔ ایک پل کیلئے وہ غیر متوازن ہوا۔ اس کی گرفت کمزور ہوئی۔ وہ اپنی ٹانگ آزاد کروانے میں کامیاب رہی تھی، لیکن اس کی ٹانگ پر وزن نہیں پڑ رہا تھا۔ یہی موقع تھا کیونکہ وقت بہت کم تھا۔ کسی بھی لمحے کچھ بھی ہوسکتا تھا۔ وہ غراتا ہوا اس پر جھپٹا اور زوردار گھونسہ اس کی ناک پر مارا۔ اس کی بھیانک چیخ کمرے میں گونجی۔ اس کی ناک سے خون کا فوارہ نکلا۔

لیکن وہ بلا کی پھرتی سے متحرک تھی۔ ایک بار پھر وہ ہوا میں اچھلی۔ اس بار بھی اس کی زوردار ٹھوکر کا ہدف اس کا جبڑا تھا، جو کہ وہ بروقت نہیں بچا سکا۔ ضرب لگتے ہی وہ لڑکھڑا کر نیچے گرا، اس سے پہلے کہ وہ اٹھتا ایک اور ضرب اس کی کنپٹی پر لگی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا پھیل رہا تھا۔ حواس مختل ہورہے تھے۔

''تو کیا آج ہمارا مشن ناکامی سے دوچار ہوگا؟''

ایک روح فرسا سوال اس کے دماغ میں کلبلانے لگا۔ بمشکل اس نے آنکھیں کھول کر سامنے دیکھا۔ وہ استہزائیہ مسکراہٹ کے ساتھ اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی ناک سے بہتا ہوا لہو اس کے خوبصورت چہرے کو بھیانک بنا رہا تھا۔ اسے متحرک دیکھ کر وہ اس کی طرف لپکی۔ وہ ایک اور گھونسہ اس کی کنپٹی پر مارنا چاہتی تھی، لیکن وہ جوابی حملے کیلئے تیار تھا۔ وہ جونہی آگے کو جھکی اس نے بیٹھے بٹھائے ایک جاندار گھونسہ اس کی ٹھوڑی کے نیچے گردن پر مارا۔ ایک غراہٹ کے ساتھ وہ پیچھے جا گری۔ اس کی ریڑھ کی ہڈی تک میں سنسناہٹ دوڑ رہی تھی۔ وہ بار بار پلکیں جھپکا رہی تھی۔ اس کے چہرے پر تکلیفِ ناروا کے آثار واضح تھے۔ اس نے اٹھنے کے ارادے سے دونوں ہاتھ زمین پر رکھے۔ اس سے پہلے کہ سنبھلتی، وہ اس پر قہر بن کر ٹوٹ پڑا۔ تابڑ توڑ مکوں نے اسے بوکھلا کے رکھ دیا۔ وہ ادھ موئی سی ہوکر نیچے گر کر ہانپنے لگی۔ اس کے ہونٹوں سے خون رس رہا تھا۔ چہرے پر زخموں کے نشان تھے۔ وہ کمزور ہوتے دشمن پر وار کرنے کے حق میں نہیں تھا۔ وہ اسے سنبھلنے کا موقع دے رہا تھا۔ اسی لمحے حور نے کسمسا کر آنکھیں کھول دیں۔ وہ دم بھر کیلئے اس کی طرف متوجہ ہوا اور یہیں وہ مار کھا گیا۔ پوری قوت سے ایک جان لیوا ٹھوکر اس کے پیٹ پر لگی۔ وہ سنبھل نہ پایا۔ نیچے گرا اور اس کا سر بیڈ کے پینڈے سے ٹکرا گیا۔ اسے اپنی آنکھوں کے سامنے تارے سے ناچتے محسوس ہوئے۔ اس سے پہلے کہ وہ اوپر اٹھتا اسے دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز سنائی دی۔ وہ آتشکی پرکالہ کمرے سے نکل چکی تھی۔ دوسرے ہی لمحے باہر فائرنگ کی تڑتڑاہٹ گونجی۔ وہ حور کا ہاتھ پکڑ کر دروازے کی طرف بڑھا۔ دروازے کے ہینڈل میں ہاتھ ڈالتے ہی وہ پیچ و تاب کھا کر رہ گیا۔ دروازہ باہر سے بند تھا۔ اب فائرنگ کے ساتھ انسانی چیخیں اور سائرن کی آوازیں بھی گونج رہی تھیں۔ کیتھی برق رفتاری سے ہسپتال کے مین گیٹ سے

باہر نکل رہی تھی۔ اچانک عقب سے اس کے سر میں زور سے کوئی آہنی چیز لگی۔ وہ ہلکی سی چیخ کے ساتھ نیچے گری۔ دھندلاتی نظروں میں اس نے نرس ثمینہ کا عکس دیکھا، جو کہ آیک آہنی سریا ہاتھ میں پکڑے اس کی طرف بڑھ رہی تھی۔ حیرت، مزاحمت اور اپنے دفاع کی کوشش کیے بغیر وہ بے سدھ ہوگئی۔

❁......۞......❁

اسے نہیں معلوم کہ وہ کب تک بیہوش رہی۔ بزعم خود وہ ناقابل شکست تھی۔ اسے اپنی ٹریننگ، اور اثر و رسوخ پر بڑا گھمنڈ تھا، لیکن تاریخ اسلام گواہ ہے کہ اللہ اپنے دین کے دشمنوں کو صفحہ ہستی سے مٹا دیتا ہے۔ کہیں ہاتھیوں کے لشکر کو ابابیلیں نمونہ عبرت بنا دیتی ہیں، تو کہیں صرف دین کے بہتر سرفروش لاکھوں کی فوج کو شکست فاش دیتے نظر آتے ہیں۔ باطل جتنا بھی کثیر د طاقتور ہو، اسے سرنگوں ہونا پڑتا ہے۔ یہی قانون قدرت ہے۔ وہ بھی ہسپتال کے یخ بستہ کمرے میں پڑی ہوئی تھی۔ فورس نے پورا علاقہ سیل کر دیا تھا، تاہم یہ واقعہ ابھی میڈیا کی چٹ پٹی خبروں کی زینت نہیں بنا تھا۔ کیپٹن کی خصوصی ہدایات پر سب کچھ خفیہ طور پر ہو رہا تھا۔ فورس کے جوان بھی سادہ کپڑوں میں تھے۔ دشمن کی اگلی کارروائی کیا تھی، بس یہی معلوم نہیں ہو رہا تھا، اور یہی معلوم کرنا تھا۔ تلاشی کے دوران ہسپتال کے خفیہ کمروں سے بہت زیادہ اسلحہ اور بارود ملا تھا۔ رات کے تین بج رہے تھے۔ نرس ثمینہ کئی دنوں سے کیتھی برنارڈ کی ٹوہ میں تھی۔ وہ مفلوک الحال تھی مگر بے ضمیر بے حس نہیں۔ اسے جو کچھ معلوم تھا، اس نے ایس پی زوار شاہ کو بتا دیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد کیپٹن ارباز بھی اپنے ساتھیوں کے ہمراہ وہاں پہنچ گیا۔ اسے تمام صورت حال سے آگاہ کیا جا رہا تھا۔ اس کی نگاہیں فرش پر بیہوش پڑی ہوئی کیتھی پر مرتکز تھیں، جو کہ کئی مہینوں سے ڈاکٹر ماہا کے بھیس میں رہ رہی تھی۔

''اسے ہوش میں لاؤ'' کیپٹن غازی خان سے مخاطب ہوا۔ کچھ دیر بعد اسے ایک کرسی پر مضبوطی سے باندھ دیا گیا۔ یخ بستہ پانی کے چھینٹوں سے وہ کسمسانے لگی، اور دھیرے دھیرے اس نے آنکھیں کھول دیں۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنے سامنے کھڑے تینوں افراد کو دیکھنے لگی۔ کیپٹن ارباز، ایس پی زوار شاہ، اور غازی خان کی دہکتی ہوئی آنکھیں اس پر جمی ہوئی تھیں۔ اس نے سنبھلنے اور صورت حال سمجھنے میں زیادہ وقت نہیں لیا۔ اس نے گہرا سانس لیا اور زوار شاہ کی طرف دیکھنے لگی۔

''کیتھی برنارڈ'' وہ اس کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ ''بہتر یہی ہے کہ اب سیدھے سیدھے سب کچھ بتا دو، تمہارا بھانڈا پھوٹ چکا ہے۔''

وہ کچھ نہیں بولی، تو اس نے دوبارہ کہا۔ ''جتنی دیر خاموش رہوگی۔ تمہیں اتنی ہی زیادہ تکلیف ہوگی۔ آج تمہارا واسطہ بزدلوں اور سازشی مکاروں سے نہیں، وطن کے سرفروشوں سے پڑا ہے۔''

''زیادہ سے زیادہ یہی ناں کہ تم مجھے مار دو گے'' وہ پراعتماد لہجے میں بولی۔ ''ہماری تربیت کا پہلا اور آخری سبق موت ہی ہوتا ہے۔''

''سیدھی انگلی سے گھی نہیں نکلے گا۔'' کیپٹن نے کہا، اور کیتھی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔

''تم شاید مجھے نہیں جانتی ہوگی۔ میں کیپٹن ارباز خان ہوں۔'' ایک لمحے کے لیے اس کے چہرے کا رنگ متغیر ہوا، تاہم اس نے خود کو جلدی سے سنبھال لیا۔

وہ بولا۔ ''تمہارے شرپسند شیطان صفت ساتھیوں نے ہمارے ملک کو تماشہ بنا کے رکھ دیا ہے۔ ہمارے دینی مراکز تم جیسوں کی وجہ سے بدنام ہو چکے ہیں۔ گزشتہ کچھ مہینوں میں تم لوگوں نے جو کچھ کیا، وہ زخم ابھی تازہ ہیں۔''

وہ استہزائیہ انداز میں مسکراتے ہوئے بولی۔ ''دشمن، دشمنی کی آخری حد تک جاتا ہے کیپٹن، اور تم مجھے بے دست دپا کر کے کچھ بھی نہیں اگلوا پاؤ گے۔ یہ میرا وعدہ ہے اور دعویٰ بھی۔''

''ہم تو پتھروں کے سینے سے بھی رازوں کے خزانے دریافت کر لیتے ہیں۔ تم فر فر بولوگی، اور سب کچھ بتاؤ گی۔ ان معصوم لوگوں کا قصور بھی بتاؤ گی جو تمہاری بربریت کی بھینٹ چڑھ گئے۔''

''ٹھیک ہے میں تیار ہوں، تم کوشش کر کے دیکھ لو۔'' اس نے اٹل لہجے میں کہا، اور آنکھیں بند کر کے کرسی کی

پشت سے ٹیک لگالی۔

''غازی خاں، اب یہ تمہاری ذمہ داری ہے۔ باہر سے بارہ جوانوں کو بلاؤ اور اس کے کپڑے اتار کر ان کے حوالے کردو۔'' کیپٹن نے سرد لہجے میں کہا اور بیرونی دروازے کی طرف بڑھا۔

ایک جھٹکے سے اس نے آنکھیں کھول دیں، اور بولی۔

''تم ایسا نہیں کر سکتے۔ میں جانتی ہوں تم مسلمان ہو، اور تمہارے مذہب میں ایسا نہیں ہوتا۔''

''ہم اس سے بھی بھیانک سلوک کر سکتے ہیں'' زوار شاہ بولا۔ ''کیونکہ ہمیں ہر حال میں تمہارا آج صبح والا مشن ناکام کرنا ہے۔ ہمارے پاس اتنا وقت نہیں کہ تمہاری زیادہ "خاطر داری" کریں۔

کمرے میں دو دو انرجی سیورز روشن تھے۔ وہ سوچتی ہوئی نظروں سے ان کی طرف دیکھنے لگی۔ سردی سے اس کا جسم ٹھٹھر رہا تھا۔ یہ بارہ بائی چودہ کا کمرہ تھا۔ کمرے میں موجود تمام سامان اٹھوا دیا گیا تھا۔ اکلوتی کرسی پر بندھی ہوئی وہ کیپٹن کو گھور رہی تھی۔ کیپٹن نے زوار شاہ کو اپنے ساتھ باہر آنے کا اشارہ کیا، اور غازی خان سے کہا۔

''کمرے کا اے سی فل کر کے باہر آجاؤ'' اس نے ہدایت پر فوراً عمل کیا۔ وہ الجھی ہوئی نظروں سے اسے دیکھتی رہی۔ ایک ایک کر کے تینوں افراد کمرے سے باہر نکل گئے۔ غازی خان دروازے کے پاس کھڑا ہو گیا۔ اندر کمرے میں دم بہ دم اے سی کی کولنگ کے باعث سردی بڑھتی جا رہی تھی۔ زیادہ سے زیادہ دس منٹ بعد کیتھی کا جسم منجمد ہونے لگا۔ اس کے پورے وجود پر کپکپی طاری تھی۔ مزید پانچ منٹ بعد اس کی حالت ناقابل برداشت ہوگئی۔ اسی لمحے وہ تینوں دروازہ کھول کر اندر داخل ہوگئے۔ وہ کچھ بولنا چاہ رہی تھی، لیکن اس کے دانت بج رہے تھے۔

''ہم ابھی کمرے میں ہیٹر چلا دیں گے'' کیپٹن بولا۔ ''بس یہ بتادو کہ تمہارا اگلا کا ٹارگٹ کیا ہے؟''

وہ چپ رہی۔ اس کے بدن پر بدستور کپکپی طاری تھی۔ کیپٹن نے غازی خان کو مخصوص اشارہ کیا۔ اس نے بیرونی دروازے پر ہلکی سی دستک دی۔ دوسرے ہی لمحے دس لحیم شحیم افراد اندر داخل ہوئے۔

''اپنا کام شروع کردو۔'' کیپٹن نے آرڈر دیا۔

وہ سب اپنی اپنی شرٹس اتار کر کیتھی کی طرف بڑھنے لگے۔ اے سی بند کر کے کمرے میں ہیٹر چلا دیا گیا تھا۔ یخ بستگی کم ہو رہی تھی۔ ایک ہٹا کٹا جوان آگے بڑھا۔ اس نے کیتھی کی شرٹ میں مضبوطی سے ہاتھ ڈالا۔ اس سے پہلے کہ وہ اسے کھینچتا۔ وہ بمشکل بولی۔ ''میں تیار ہوں۔'' وہ خوفزدہ آنکھوں سے لحیم شحیم نیم عریاں افراد کو دیکھ رہی تھی۔ کیپٹن کے اشارے پر وہ زیر لب مسکراتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئے۔ وہ سب فورس کے جوان تھے۔ وہ فر فر بولنے لگی۔ احمد مارکیٹ کے بلاسٹ سے لے کر سانحہ جہان پورہ تک، اس نے سب کچھ بتا دیا۔ امجد عالم چٹھہ کی ٹارگٹ کلنگ کا بھی اس نے اعتراف کرلیا۔

''ہم لوگ مدرسے کے منتظم افراد کو بلیک میل کرتے ہیں۔ ان کی فیملیز کو اغوا کر لیتے ہیں۔ جان سے مار دینے کی دھمکی بھی کام کر جاتی ہے'' وہ بتا رہی تھی۔ ''ایسا ہی ہم نے "راہبر انسانیت" میں کیا۔'' دھیرے دھیرے اس نے تمام راز اگل دیے۔

''آج کی پلاننگ کیا ہے؟'' کیپٹن نے سخت لہجے میں استفسار کیا۔

''میرا خیال ہے صبح ہونے والی ہے'' وہ بولی۔ ''تمہارے پاس وقت بہت کم ہے۔ آج دن دس بجے غلام محمد آباد میں ہاشم لنگڑیال کا جلسہ ہے۔ وہاں خودکش حملہ ہوگا۔ اہم ہدف ہاشم لنگڑیال ہے۔''

''ہاشم لنگڑیال کیوں؟''

''کیونکہ وہ ہمارا سہولت کار ہے، لیکن اب وہ نظر میں آگیا ہے۔ اس لیے اس کا خاتمہ ضروری ہے۔''

''ہم وہ جلسہ رکوا سکتے ہیں۔'' ایس پی بولا۔

''نہیں، اب تک تو خودکش حملہ آور تیار ہو چکے ہوں گے'' وہ بولی۔ ''انہیں مخصوص نشہ آور ادویات دی جاتی ہیں۔ وہ کسی صورت بھی رکنے والے نہیں۔''

''اس کا ماسٹر مائنڈ کون ہے؟'' کیپٹن نے پوچھا۔

وہ چند لمحے سوچتی رہی۔ پھر بولی۔ ''پیر نقاب پوش، جو کہ اصل میں اسرائیلی ٹیررسٹ ڈین نیلسن ہے۔''

دفعتاً کمرے کا دروازہ کھلا اور حور تیزی سے اندر داخل ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں لمبی نال والا پستول تھا، اور اس کا رخ کیتھی کی طرف تھا۔ وہ پھنکارتے ہوئے بولی۔ ''کمینی عورت تم نے ہمارے وطن کا بہت نقصان کیا ہے۔ میرے ملک کی گلیوں میں خون کے دریا بہائے ہیں۔ تمہاری وجہ سے میرا باپ مرا اور کتنے معصوم لوگ جان سے گئے'' وہ پھنکارتی ہوئی آگے بڑھنے لگی۔ کیتھی کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ ''میں تمہیں اسی پاک سرزمین پر نمونہ عبرت بنادوں گی۔''

اس سے پہلے کہ کیپٹن یاز وار شاہ اسے روکتے۔ پستول کی مہیب نال سے بے آواز شعلہ نکلا اور کیتھی کے چہرے کو چھلنی کر گیا۔ وہ مختصر سی چیخ کے ساتھ بے جان ہوگئی۔ حور اب بھی اسے شعلہ بار نظروں سے گھور رہی تھی۔ زوار شاہ آہستگی سے آگے بڑھا، اور اس کے ہاتھ سے پستول لے لیا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

''اب تم واپس گھر جاسکتی ہو حور اس سے آگے ہمارا کام شروع ہوتا ہے۔'' اس نے دھیمے لہجے میں کہا اور اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

''ہمارے پاس صرف چار گھنٹے باقی ہیں'' کیپٹن رسٹ واچ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''غلام محمد میں سکیورٹی سخت سے سخت کردو اور آنے جانے والوں پر نظر رکھو۔ آج کے جلسے میں کوئی ناخوشگوار واقعہ نہیں ہونا چاہئے۔ ہمیں ہر حال میں ڈین نیلسن اور جیک وارمر کو کیفر کردار تک پہنچانا ہے۔'' وہ قیصر ارشی اور فوزیہ کو ہدایات دینے لگا۔ جو کہ ابھی ابھی کمرے میں داخل ہوئے تھے۔ کیتھی کا خون فرش کو رنگین کر رہا تھا۔

❀.....◉.....❀

ہاشم لنگڑیال ٹھیک نو بج کر پینتالیس منٹ پر غلام محمد آباد میں پہنچ گیا۔ سخت سکیورٹی اور حواریوں کے ہجوم میں شاہانہ کروفر سے چلتا ہوا وہ اسٹیج کی طرف بڑھ رہا تھا۔ جلسہ گاہ میں عوام کا جم غفیر تھا۔ مجمع کی تعداد لمحہ بہ لمحہ بڑھتی چلی جارہی تھی۔ خواتین، مرد بچے بوڑھے، حتیٰ کہ بچے بھی پرجوش نظر آرہے تھے۔ کم وبیش دو ایکڑ اراضی میں جلسے کا اہتمام کیا گیا۔ تاحد نگاہ کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ لیکن عوام کی تعداد شمار سے باہر تھی۔ جو بیٹھ سکتے تھے، انہوں نے کرسیاں سنبھال لیں۔ باقی لوگ چاروں اطراف کھڑے تھے۔ یہ ایک وسیع وعریض جگہ تھی۔ شہر کی آبادی سے قدرے ہٹ کر ملک غلام رضا کے فارم ہاؤس کے ساتھ کھیتوں میں جلسہ منعقد کیا گیا تھا۔ مذکورہ آدمی اپنے علاقے کی بااثر ورسوخ سیاسی شخصیت تھی۔ اسٹیج کے عقبی حصے میں کماد کی فصلیں لہلہا رہی تھیں۔ ایک چھوٹی سی پختہ روسٹرک فارم ہاؤس سے نکل کر مین روڈ کی طرف جاتی تھی۔ کچھ ہی فاصلے پر ملک غلام رضا کے مزارعین کے لیے کچے مکانوں کی سہولت تھی۔ مذکورہ مکانوں میں عرصہ دراز سے اللہ بخش اپنی بیوی رضیہ، نوسالہ بیٹی تانی اور ایک جواں سال بیٹے محمد رفیق کے ساتھ رہ رہا تھا۔ وہ ملک غلام علی کے باپ کے زمانے میں یہاں آیا تھا اور یہیں کا ہو کر رہ گیا۔ جواں سالہ محمد رفیق کھیتوں میں اپنے باپ اللہ بخش کا ہاتھ بٹاتا تھا۔ باپ بیٹا ملک غلام رضا کے اچھے اخلاق کے گرویدہ اور اپنی گزراقات سے مطمئن تھے، لیکن آج صبح چھے بجے سے کچھ دیر پہلے ان پر مصیبت ٹوٹ پڑی تھی۔ جب کماد کی فصلوں سے اچانک چار افراد نمودار ہوئے، اور ان کے گھر میں گھس کر انہیں یرغمال بنالیا۔ ان میں ایک جواں سال خوبرو لڑکی بھی تھی، جو کہ نادیہ نور الٰہی تھی۔ دوسرا نوجوان افضال تھا، اور باقی دو آدمی اس کے ساتھی تھے۔ ان کے پاس جدید اسلحہ موت اگلنے کے لیے بے تاب تھا۔ وہ بھرپور اعتماد کے ساتھ ان کی حویلی میں داخل ہوگئے۔ اللہ بخش بستر میں پڑا کھانس رہا تھا۔ چھوٹی تانی ماں کے پہلو میں سوئی ہوئی تھی جبکہ محمد رفیق کافی دیر پہلے اٹھ کر مال مویشیوں کا چارہ کاٹنے نکل گیا تھا۔

''کون ہو تم؟'' ان کے قریب پہنچنے پر اللہ بخش نے کھانستے ہوئے استفسار کیا۔ پچھلے کچھ دنوں سے اس کی طبیعت خراب چل رہی تھی۔

''ہم سے تعاون کرو گے تو ہم اچھے لوگ ثابت ہوں گے'' چاروں افراد میں سے ایک لمبا تڑنگا آدمی آہستگی سے بولا۔ ''اور اگر شور مچاؤ گے تو تم سے پہلے یہ بوڑھی عورت اور بچی تمہارے سامنے ذبح کردی جائیں گی۔''

''کیسا تعاون؟ کیا چاہیے تمہیں؟'' وہ گھبراہٹ زدہ

لے میں بولا۔

دوسرا آدمی رضیہ اور تانی پر خطرناک پستول تان کر کھڑا ہوگیا۔ نادیہ اور افضال ایک طرف چپ چاپ کھڑے تھے۔

''زیادہ سوال جواب مت کر بڈھے'' وہ آدمی غرا کر بولا۔ ''ہم تھوڑی دیر بعد چلے جائیں گے۔ تم نے اگر کسی کو بتانے، یا شور مچانے کی کوشش کی تو.....

میں کچھ نہیں کہوں گا بیٹھ جاو۔'' وہ اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔ اور وہ وہ قدرے مطمئن ہو کر بیٹھ گئے۔

''ہم مصیبت میں ہیں بابا'' پستول بردار نرمی سے بولا۔ ''ہمارے دشمن ہمارے پیچھے ہیں۔ ہم تھوڑی دیر بعد چلے جائیں گے۔''

اللہ بخش تفہیمی انداز میں سر ہلانے لگا۔ رضیہ اور تانی جاگ گئی تھیں اور سہمی ہوئی نظروں سے انہیں دیکھ رہی تھیں۔ اللہ بخش نے انہیں کھانے پینے کا پوچھا، لیکن انہوں نے سختی سے منع کر دیا۔ یہ وہ موت کے ہرکارے تھے جو غلام محمد آباد کے جلسے میں موت کی ہولی کھیلنے آئے تھے۔ یہ سب کچھ مکمل پلاننگ کے ساتھ کیا گیا تھا۔ ان میں رگھو بھی شامل تھا جو کہ انتہائی خطرناک انڈین ٹیررسٹ تھا اور پیر کے لباس پوش کے ساتھ ثناءاللہ کے روپ میں رہ رہا تھا۔ وہ شارپ شوٹر تھا اور، اسے ''را'' نے ارجن کی جگہ بھیجا تھا۔ وہ اس مشن کا کمانڈر تھا جبکہ نادیہ اور افضال نے مجمعے میں گھس کر خود کو بلاسٹ کرنا تھا۔ پلاننگ انتہائی خطرناک اور ہر لحاظ سے مکمل تھی۔ ڈین نیلسن اور جیک وارمر انہیں مطلوبہ مقام پر ڈراپ کر کے شہر کے ایک غیر معروف سستے سے ہوٹل میں رک گئے تھے، اور کامیابی کی خبر کے منتظر تھے۔ دس بجنے سے کچھ دیر قبل انہوں نے اللہ بخش، رضیہ اور تانی کو بے ہوش کر دیا، اور آہستگی سے کماد کی فصلوں کے راستے سے جلسہ گاہ کی طرف بڑھنے لگے۔ لوگ جوق در جوق جلسہ گاہ کی طرف جا رہے تھے۔ سکیورٹی بہت سخت کر دی گئی تھی۔ نادیہ نے بے تاثر نگاہوں سے افضال کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں بھی کسی جذبے کی رمق نہیں تھی۔ وہ کماد کے بیچ پگڈنڈی پر چلتے ہوئے آگے بڑھتے رہے۔ چونکہ فارم ہاوس آبادی سے کافی ہٹ کر تھا، لہذا یہاں فصلوں کا پایا جانا بعید از قیاس نہیں تھا۔ اگر ممکنہ حملے کی اطلاع ایک دو دن پہلے مل جاتی تو جلسے کی جگہ تبدیل کی جا سکتی تھی۔ لیکن اب ایسا کرنے سے دشمن خبردار ہو کر محتاط ہو سکتا تھا۔ ناقابل قبول امر یہ تھا کہ ملک غلام رضا کے مزار عین کی طرف کسی کا دھیان نہیں گیا، کہ دشمن اس ویک پوائنٹ سے بھی فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ بہرحال دشمن نے موت کا جال بچھا دیا تھا۔ موت کے اس کھیل میں محمد رفیق بھی سبز نوٹوں کی ایک گڈی کے عوض شامل ہو گیا تھا۔ جونہی پگڈنڈی کا اختتام ہوا، اچانک سامنے سے رفیق آتا ہوا دکھائی دیا۔ اس نے مخصوص انداز میں رگھو کو انگوٹھا دکھایا اور پلٹ کر اس کے آگے آگے چلنے لگا۔ چند فرلانگ کا فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ جلسہ گاہ کے عین قریب پہنچ گئے۔ سامنے پولیس کے جوان اسلحے سے لیس نگرانی پر مامور تھے۔

''بے خوف میرے پیچھے چلتے رہو۔'' رفیق نے سرگوشی کی۔ ''یہ پولیس والے آئے دن فارم ہاوس پر دعوت اڑاتے ہیں۔ سب مجھے جانتے ہیں، اور میں نے انہیں بتایا ہے کہ ملک صاحب کے کچھ خاص مہمان میرے ہاں ٹھہرے ہوئے ہیں۔''

''ویری گڈ۔'' رگھو نے اسے خوش کرنے کے لئے اس کا کاندھا تھپتھپایا۔ وہ درختوں کے ایک گھنے جھنڈ میں داخل ہو گئے۔ ٹاہلی، کیکر اور توت کے درختوں کا یہ جھنڈ ایک محفوظ پناہ گاہ ثابت ہو سکتا تھا، لیکن انہوں نے یہاں ٹھہرنا نہیں تھا۔ رگھو نے ریسٹ واچ کی طرف دیکھا۔ دس بجنے میں تین منٹ باقی تھے، اور پہلا بلاسٹ دس بج کر تین منٹ پر ہونا تھا، جو کہ نادیہ نور کے ذمے تھا۔ دوسرا بلاسٹ دو منٹ بعد ہونا تھا۔ جس کے لیے افضال تیار تھا۔

''تم تیار ہو؟'' رگھو نے ان دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔

''ہاں، ہم تیار ہیں۔'' دونوں بیک وقت بولے۔ رفیق نے چونک کر انہیں دیکھا اور بولا۔

''تم نے مجھے ساری بات نہیں بتائی۔ کیا کرنا چاہتے ہو؟''

''یہ غیر ضروری سوال ہے میرے دوست'' رگھو پلٹ کر

اس کے سامنے رکھتے ہوئے غرایا۔ ”تم صرف پیسے گنو“

رفیق اسے سوچتی ہوئی تشکیک آمیز نظروں سے دیکھنے لگا۔ رگھو نے اچانک لمبی نال والا پستول نکالا۔ اور نال کا رخ اس کے سینے کی طرف کر کے ٹریگر دبا دیا۔ ہلکی سی آواز کے ساتھ ایک شعلہ نکلا اور اس کے سینے میں گھس گیا۔ وہ بے یقینی سے اسے دیکھتا ہوا نیچے گرا۔ اس کی چیخ ساؤنڈ کی آوازوں میں دب کر رہ گئی۔

”جلدی کرو، صرف تین منٹ باقی ہیں“ اس نے افضال اور نادیہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تم نے مطلوبہ جگہ پر پہنچتے ہی سرخ بٹن دبانا ہے“ پھر وہ نادیہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”تم اسٹیج کے عین قریب جا کر بٹن دباؤ گی۔“ دونوں نے تفہیمی انداز میں سر ہلا دیے۔ رگھو نے اچٹتی نگاہ رفیق پر ڈالی۔ اس کا سینہ لہو میں تر ہو رہا تھا۔ وہ جلدی سے آگے بڑھنے لگے۔ وہ مطلوبہ مقام کے عین پیچھے پہنچ گئے تھے۔ دور سے چند پولیس والے نظر آئے جو کہ سگریٹ پھونکتے ہوئے، آپس میں گپیں ہانک رہے تھے۔ وہ پُراعتماد انداز میں آگے بڑھتا ہوا ان کے قریب پہنچ گیا۔ پولیس والے تعداد میں چار تھے۔ ان کے پاس عام سی رائفلیں نظر آ رہی تھیں۔

”انسپکٹر باجوہ؟“ اس نے سوالیہ انداز میں ایک کانسٹیبل کی طرف دیکھا۔ ”اسے ملک صاحب کا پیغام دینا ہے۔“

”وہ جلسے میں ہے۔“ سپاہی نے نادیہ کو گھورتے ہوئے بتایا۔ اور اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھ کر معنی خیز انداز میں مسکرایا۔

”ٹھیک ہے، یہ انہیں دے دینا۔“ اس نے خاکی رنگ کا ایک پیکٹ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”اور بھی مل جائیں گے۔“

”تابعدار جناب۔“ وہ خوشامدانہ انداز میں مسکراتے ہوئے بولا۔ خاکی رنگ کا پیکٹ سونگھ کر اس نے جیب میں رکھ لیا۔

رگھو نے اپنے تینوں ساتھیوں کو آگے بڑھنے کا اشارہ کیا، اور یوں وہ سب باآسانی پنڈال میں داخل ہو گئے۔

گولی رفیق کی پسلیوں میں لگی تھی، وہ ابھی زندہ تھا، اور ضمیر کی ملامت سے نبرد آزما تھا۔ اس نے اپنے کاندھے پہ رکھا ہوا سیاہ پٹکا کس کر زخم پر باندھا اور جلسہ گاہ کی طرف بھاگنے لگا۔ یہی وہ وقت تھا جب قیصر کی عقابی نگاہوں نے لہو میں لت پت رفیق کو دیکھا۔ وہ برق رفتاری سے حرکت میں آیا، اور رفیق کی طرف بھاگا۔ چند ہی لمحوں میں وہ اس کے قریب پہنچ گیا۔ اسی لمحے رگھو نادیہ اور افضال جلسہ گاہ کی طرف بڑھ رہے تھے۔ رفیق مسلسل ان پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ اس نے قیصر کو اکھڑتی سانسوں سے سب کچھ بتایا۔ اور پنڈال کی طرف بڑھتے ہوئے موت کے ہرکاروں کی طرف اشارہ کر کے نشاندہی بھی کر دی۔ اتنا بتا کر وہ بے ہوش ہو کر نیچے گر پڑا۔ فورس کے جوان، اس کی طبی امداد میں مصروف ہو گئے۔ نادیہ اپنے حدف کی طرف بڑھ رہی تھی۔ جبکہ افضال ہجوم کے وسط میں کھڑا چاروں اطراف دیکھ رہا تھا۔ قیصر سیل فون کے ذریعے اپنے ساتھیوں سے رابطے میں تھا۔ اس نے ارشی کو خبردار کر دیا۔ ارشی کے ذریعے خبر کیپٹن ارباز، ایس پی زور ارشاہ اور فوزیہ تک بھی پہنچ گئی۔ "محافظ" تنظیم کے سرفروش حرکت میں آ گئے تھے۔ ٹھیک دس بجے ہاشم لنگڑیال اسٹیج پر عوام سے مخاطب تھا۔ قیصر کے پاس بے آواز پستول تھا۔ وہ رگھو کے عقب میں چلتے ہوئے، اس کے ساتھی کے عین پیچھے پہنچا، اس کی پشت پر پستول کی لمبی نال رکھی اور ٹریگر دبا دیا۔ رگھو ہجوم سے دور نکلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ قیصر نے ارشی کی طرف دیکھا جو کہ اس کے ساتھ چل رہی تھی۔

”وہ سیاہ کرتے والا خود کش حملہ آور ہے۔“ اس نے اس کے کان میں کہا، ہر احتیاط کو بالائے طاق رکھا، اور مجمع سے دور جاتے ہوئے رگھو کی طرف بھاگا۔ لوگ نعرے بازی میں مگن تھے۔ چند ایک نے توجہ دی لیکن کسی ردعمل کا مظاہرہ نہیں کیا۔ رگھو کے ساتھی کی لاش فوراً کیپٹن کے آدمیوں نے اٹھا لی تھی۔ رگھو ایک گھاگ آدمی تھا۔ اسے اپنے تعاقب کا احساس ہوا تو وہ سرپٹ درختوں کی طرف بھاگنے لگا۔ سامنے وہی پولیس والے کھڑے تھے۔ انسپکٹر باجوہ نے اسے فوراً حراست میں لے لیا، کیونکہ اب بازی پلٹ چکی تھی اور اس کے پاس ہیرو بننے کا سنہری موقع تھا۔ اس نے پستول کا رخ اس کی طرف کیا اور اس کی پسلیوں میں ان گنت چھید کر دیے۔ اچانک مجمع منتشر ہونے لگا۔ یہی وہ وقت تھا جب ارشی نے اپنے آگے چلتے

ہوئے افضال کو دونوں بازوؤں سے پکڑا، اور اسے کھینچتے ہوئی، درختوں کے جھنڈ کی طرف بڑھنے لگی۔ دھینگا مشتی میں، بارودی جیکٹ پھٹنے کا احتمال تھا، لیکن اب اسے اپنی جان کی پروا نہیں رہی تھی۔ اس نے ان گنت معصوم لوگوں کو بچا کر دشمن کو کیفر کردار تک پہنچانا تھا۔ اسٹیج کے پاس کھلبلی مچ گئی تھی۔ نادیہ کی آنکھوں میں تذبذب اور کشمکش کے آثار واضح تھے۔ اچانک بھگدڑ میں بے قابو ہو کر وہ نیچے گری۔ اسی لمحے بوکھلایا ہوا، خوفزدہ ہاشم لنگڑیال اسٹیج سے نیچے اتر رہا تھا۔ لوگ بجلی کی سی سرعت کے ساتھ اسٹیج سے دور ہو رہے تھے۔ نادیہ کے پاس یہی موقع تھا۔ اس نے سرخ بٹن پر ہاتھ رکھا، اور اسے دبا دیا۔ ایک سماعت شکن دھماکہ ہوا، اور پھر چیخ و پکار کا طوفان امڈ پڑا۔ نادیہ کے ساتھ ہاشم لنگڑیال بھی ٹکڑوں میں تقسیم ہو گیا۔ لوگ بھاگ رہے تھے، ایک دوسرے کو روند رہے تھے۔ ایک نفسانفسی کا عالم تھا۔ اس بلاسٹ میں ہاشم کے ساتھ دو گن مین مارے گئے تھے، جبکہ متعدد افراد زخمی ہوئے تھے۔ منتشر مجمع پنڈال سے نکل رہا تھا۔ کیپٹن فوزیہ، زوار شاہ اور غازی خان کے علاوہ، متعدد لوگوں کی نظریں ارشی پر جمی ہوئی تھیں، جو کہ افضال کو کھینچتی ہوئی درختوں کے جھنڈ کے پاس پہنچ گئی تھی۔ دل کنپٹیوں میں دھڑک رہے تھے۔ فورسز کے جوانوں کی گنز کی نالیں افضال کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ وہ بھرپور مزاحمت کر رہا تھا۔ لیکن ارشی نے اس کے بازو آزاد نہیں کیے۔ برق رفتاری سے بھاگتا ہوا، قیصر بھی درختوں کے جھنڈ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اچانک ارشی نے ایک زوردار گھونسہ افضال کی کنپٹی پر مارا۔ وہ دھڑام سے پیٹ کے بل زمین پر گرا۔ یہ وہ وقت تھا جب ذہن منجمد اور زبانیں گنگ تھیں۔ ارشی نے ایک لمحے کے لئے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا، زیرلب مسکرائی۔ اور پھر کانوں کو پھاڑ دینے والا دھماکہ ہوا۔ افضال کے ساتھ وہ بھی ٹکڑوں میں تبدیل و تقسیم ہو گئی۔ کچھ فاصلے پر کھڑے، پولیس اہلکار بھی محفوظ نہ رہ سکے۔ وہ بھی ٹکڑوں میں تقسیم ہو کر مٹی پر بکھر گئے۔ ان میں انسپکٹر باجوہ بھی شامل تھا۔ ایک لہو میں لت پت کانسٹیبل کی پھٹی ہوئی جیب سے خالی رنگ کا پیکٹ نظر آ رہا تھا۔ ممکنہ حادثہ ٹل گیا تھا۔ مرنے والوں کی تعداد آٹھ کے لگ بھگ تھی، جن میں ہاشم لنگڑیال بھی شامل تھا۔ بلاسٹ سے پہلے فورس کے جوان رگھو اور رفیق کو ہسپتال لے گئے تھے۔ جہاں رگھو نے آخری سانسوں کے دوران سب کچھ بتا دیا۔ اس کی اطلاع پر شہر کے غیر معروف ہوٹل پر ریڈ کیا گیا۔ جہاں ڈین نیلسن اور جیک وارمر نے بھرپور مزاحمت کا مظاہرہ کیا۔ فورسز کی کارروائی میں وہ دونوں زندہ گرفتار نہ ہو سکے۔ ارشی کو احترام کے ساتھ سپرد خاک کر دیا گیا۔

کیپٹن، زوار شاہ اور غازی خان کی آنکھوں میں نمی تھی، جبکہ قیصر اور فوزیہ زار و قطار رو رہے تھے۔

''کیپٹن نے قیصر کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے تفاخر کے ساتھ کہا۔ ''ایسی موت تو نصیب والوں کو ملتی ہے۔ اور کون کہتا ہے، ارشی مر گئی۔ وہ زندہ ہے، زندہ رہے گی۔ ہماری محبتوں میں، دعاؤں میں اور دلوں میں۔''

''زوار شاہ نے با آواز بلند کہا۔ ''شہید کی جو موت ہے، وہ قوم کی حیات ہے'' اور ویلڈن قیصر اینڈ فوزیہ تم نے وطن کے دشمنوں کی سرکوبی کے لیے بہت بڑا کام کیا ہے۔''

''نہیں سر یہ تو ہر محب وطن پاکستانی کا فرض ہے'' وہ نمناک لہجے میں بولا۔ ''اور ہمیں فخر ہے کہ ہم نے وطن کی سربلندی کے لئے آپ کے ساتھ کام کیا۔''

کیپٹن نے آگے بڑھ کر اسے گلے لگاتے ہوئے کہا۔ ''محافظ'' کی پوری فورس اور پوری قوم کو تم پر ناز ہے، اور تم ایسے لوگوں کی ضرورت ہے۔ میں چاہوں گا کہ تم دونوں ہمیشہ ایک ساتھ رہو، اور ہمارے ساتھ کام کرو۔''

فوزیہ کے ہونٹوں پر مدھم سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ قیصر اسے معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

''سر، ہمیں آپ کے ساتھ کام کر کے بہت خوشی ہوگی، لیکن اس سے پہلے ہمیں ہمیشہ ایک ساتھ رہنے کے لیے کچھ دنوں کی چھٹی چاہیے ہوگی۔''

اس نے کہا اور آگے بڑھ کر فوزیہ کا ہاتھ تھام لیا۔ کیپٹن ارباز، اور ایس پی زوار شاہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ رقص کر رہی تھی۔

ختم شد

ایفائے عہد

زرین قمر

ایک ماں کی اپنے بیٹے سے پیار کی روداد، اس نے اپنے بیٹے کی آخری خواہش کے مطابق اس کی لاش دفنانے کے بجائے جلا دی، بیٹا بھی ایفائے عہد کے لیے اپنی ماں سے ملنے آتا ہے۔

زرین قمر کے قلم سے نئے افق کے قارئین کے لیے بطور خاص

وہ اسپتال کے بیڈ پر بے حس و حرکت پڑا ہوا تھا اس کے ذہن کی ساری صلاحیتیں ختم ہو چکی تھیں سننے کی، دیکھنے کی، سمجھنے کی، سونگھنے کی، وہ کئی روز سے اسی کیفیت میں تھا اس کی زندگی بھی شاید اس کا ساتھ چھوڑ گئی تھی لیکن وہ الیکٹرانک مشینوں پر جی رہا تھا اس کی ماں ایلن نے اس کے ماتھے کا پسینہ پونچھا اس کے بوڑھے ناتواں ہاتھ کانپ رہے تھے وہ جانتی تھی کہ اس کا بیٹا چند لمحوں کا مہمان ہے وہ مشین سے نکلنے والی ان لہروں کو محسوس کر سکتی تھی جو اس کے بیٹے کے جسم سے گزر رہی تھیں اس کے پورے جسم میں صرف اس کی نیلی آنکھیں تھیں جن تک اس کا موذی مرض نہیں پہنچا تھا وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔

''جارج!'' اس نے اپنے بیٹے کو آواز دی فرط جذبات سے اس کی آواز کانپ رہی تھی اور جارج کی آنکھیں خلاؤں میں گھور رہی تھیں۔

''جارج! میرے بیٹے کیا تمہیں یقین ہے کہ تم یہی چاہتے ہو؟'' اس نے کہا تو جارج نے بے بسی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''میں چاہتی ہوں جارج کہ تم ایک بار پھر سوچ لو۔'' ایلن نے کہا۔

''میں..... یہی..... چاہتا..... ہوں۔'' جارج نے نحیف سی کمزور آواز میں کہا وہ جارج کی آواز بھی نہیں تھی اس کی سانس کی نالی کو آکسیجن کی ٹیوب نے گھیرا ہوا تھا' اسے بولنے اور نگلنے میں بھی تکلیف ہوتی تھی اس کے جسم کا رواں رواں دکھ رہا تھا اس کی آنکھوں کی پتلیاں آہستہ آہستہ اوپر چڑھتی جا رہی تھیں اسے ڈرپ لگی ہوئی تھی جس میں سکون کی دوا ڈال دی گئی تھی وہ آہستہ آہستہ بے ہوش ہوتا جا رہا تھا۔ درد دکھ اور تکلیف سے دور جا رہا تھا۔

ایلن سے اس کے بیٹے نے باہوش و حواس ایک خواہش کی تھی' یہ دو دن پہلی ہی کی بات تھی ایلن اس کے ساتھ اس کے کمرے میں بیٹھی تھی تب بھی جارج کے آکسیجن لگی ہوئی تھی۔

''ماں! تم میری آخری خواہش پوری کر دو گی؟''

اس نے ایلن کی طرف حسرت سے دیکھتے ہوئے پوچھا اس کی نیلی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر ایلن تڑپ گئی تھی۔

''آخری خواہش؟ کیسی آخری خواہش..... تم ٹھیک ہو جاؤ گے میرے بیٹے..... تمہیں کچھ نہیں ہوا ہے..... ڈاکٹر کوشش کر رہے ہیں..... مجھے امید ہے تم ٹھیک ہو جاؤ گے۔'' ایلن نے کہا۔ اسے خود بھی اپنے الفاظ بے جان لگ رہے تھے وہ جانتی تھی اس کا بیٹا آہستہ آہستہ زندگی کی بازی ہارتا جا رہا ہے اس کا بچنا ناممکن ہے ڈاکٹروں نے اس کے جینے کی جو آخری مدت بتائی تھی وہ آ پہنچی ہے۔

''ماں! تم اور میں اچھی طرح جانتے ہیں کہ اب کچھ تبدیلی نہیں آئے گی مجھے بہرحال جانا ہی ہے۔''

''اللہ نہ کرے بیٹا..... خدا بڑا مہربان ہے..... وہ تمہیں صحت دے گا۔'' ایلن نے کہا۔

''ماں! تم میری بات سن لو..... میرے مرنے کے بعد میرے جسم کو دفنانے کے بجائے جلا دینا۔'' جارج نے کہا تو وہ تڑپ گئی۔

''ایسا مت کہو جارج..... کیا تم چاہتے ہو کہ میں اس صدمے سے مر جاؤں؟ دیکھو بیٹا جب تک سانس ہے..... تب تک آس ہے..... میں تمہارے بچانے کی جدوجہد کرتی رہوں گی۔'' ایلن نے پیار سے کہا۔

''ٹھیک ہے..... لیکن میری یہ بات یاد رکھنا ماں کہ میرے مرنے کے بعد میرے جسم کو جلا دیا جائے اور میرے جسم کی راکھ کو میرے مکان کے احاطے میں گھر کے سامنے بکھرا دیا جائے۔'' جارج نے کہا ایلن رونے لگی تھی اب وہ جان گئی تھی کہ اس کا بیٹا یہ خواہش کیوں کر رہا تھا' وہ اپنی بیوی تریسا اور بیٹی جین سے بہت پیار کرتا تھا تریسا اس کی پہلی اور آخری محبت تھی اس سے شادی کے بعد جارج نے اپنی رہنے کے لیے اپنی ماں کے گھر سے دور اوہیو ''Ohio'' میں ایک گھر بنایا تھا جو تریسا کی پسند تھا پھر اسے خدا نے ایک خوبصورت سی بیٹی دی تھی اور اس کی زندگی کی نعمتوں کو مکمل کر دیا تھا وہ بہت خوش تھا اور اپنی بیوی اور بیٹی کے ساتھ پرسکون زندگی گزار رہا تھا پھر اچانک اسے کینسر ہو گیا اس نے بہت علاج کرائے شروع میں تریسا بھی اس کے ساتھ رہی اسے ڈاکٹرز کے پاس لے کر جاتی اس کے ہر قسم کے ٹیسٹ کرواتی اس کو وقت پر دوائیں دیتی اور تھوڑے تھوڑے دن بعد ایلن کو فون پر اس کی کیفیت سے آگاہ بھی کر دیتی تھی پھر ایسا مرحلہ آیا کہ ڈاکٹروں نے مایوسی کا اظہار کر دیا اور بتا دیا کہ جارج صرف چھ ماہ تک زندہ رہے گا اس روز تریسا ایلن سے ملنے اس کے گھر آئی تھی جارج بھی اس کے ساتھ تھا لیکن اس نے جارج کو یہ بات نہیں بتائی تھی وہ اس کے سامنے رونا بھی نہیں چاہتی تھی ایلن کو یاد تھا وہ کتنی بے قرار تھی۔

''تریسا! تم پریشان مت ہو..... یہ ڈاکٹر کوئی خدا تو نہیں ہیں..... یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ کوئی انسان کب تک زندہ رہے گا.....؟ موت اور زندگی کا علم تو صرف خدا کو ہے۔'' ایلن نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا تھا اس وقت جارج لونگ روم میں بیٹھا ٹی وی دیکھ رہا تھا اور جین بھی اس کے ساتھ وہیں بیٹھی تھی۔

''لیکن ڈاکٹر نے ساری رپورٹس اور ایکسرے دیکھ کر یہی بتایا ہے..... ان کا کہنا ہے کہ کینسر اس کے سارے جسم میں پھیل چکا ہے اور بچنے کی کوئی امید نہیں۔'' تریسا نے روتے ہوئے کہا۔

''نہیں تم پریشان مت ہو.....'' ایلن نے اسے

سمجھاتے ہوئے کہا۔ ''ابھی تو تم جارج کو اپنے ساتھ لے جاؤ کیونکہ ابھی یہاں چھوڑ کر گئیں تو وہ پوچھے گا کہ تم ایسا کیوں کر رہی ہو اور اسے شک ہو جائے گا پھر وہ بھی پریشان ہوگا جو اس کے ذہن اور صحت کے لیے اچھا نہیں ہے زندگی سے اس کی امید ٹوٹنا نہیں چاہیے اس میں زندہ رہنے کی خواہش اور امید رہنا بہت ضروری ہے۔''

''میں نے بھی انہیں نہیں بتایا'' تریسا نے کہا۔

''تم نے بہت اچھا کیا..... میں ایک ہفتے بعد آؤں گی اور جارج کو اپنے ساتھ یہاں لے آؤں گی اور کسی اچھے اسپتال میں اس کو داخل کروادوں گی تم ملنے آتی رہنا..... وہ ضرور ٹھیک ہو جائے گا۔'' ایلن نے اسے سمجھایا۔

پھر ہوا بھی یہی تھا ایلن ایک ہفتے بعد جارج کو اپنے ساتھ لے آئی تھی پہلے تو وہ آنے کے لیے تیار نہیں تھا لیکن پھر ایلن کے بہت سمجھانے پر راضی ہو گیا تھا اور اپنے گھر لانے کے بعد اس نے جارج کو اسپتال میں داخل کرا دیا تھا جہاں اس کا خاص خیال رکھا جا رہا تھا۔

''ٹھیک ہے جارج۔'' ایلن نے اپنے خیالات سے چونکتے ہوئے جارج کی طرف دیکھا جو بیڈ پر اس کے سامنے بیٹھا تھا۔

''ماں میں جانتا ہوں کہ تم نے اور تریسا نے مجھ سے یہ بات چھپائی تھی کہ ڈاکٹر نے میری زندگی کی مہلت چھ ماہ دی تھی جو پورے ہونے والے ہیں۔'' جارج نے کہا تو ایلن حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔

''تمہیں کیسے پتہ؟ ایسی تو کوئی بات نہیں۔'' ایلن نے جھوٹ بولا۔

''میں جانتا ہوں ماں۔'' جارج نی اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''مجھ سے وعدہ کرو کہ میری آخری خواہش پر عمل کرو گی۔'' اس نے ایلن کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے میں وعدہ کرتی ہوں۔'' ایلن نے ہار مانتے ہوئے کہا۔ ''لیکن تم بھی مجھ سے وعدہ کرو اگر تمہیں کچھ ہو گیا تو تم پھر بھی مجھ سے ملنے آؤ گے۔'' ایلن نے کہا حالانکہ وہ جانتی تھی کہ یہ ناممکن ہے۔

''میں وعدہ کرتا ہوں۔'' جارج نے کہا تو وہ اسے حیرت سے دیکھنے لگی اور اب جارج اس کے سامنے اسپتال کے بیڈ پر بے حس لیٹا ہوا تھا اس کی آنکھیں آہستہ آہستہ بند ہوتی جا رہی تھیں۔

''تم ہم سب کے ساتھ دفن ہونا کیوں نہیں چاہتے؟'' ایلن اٹھ کر اس کے قریب چلی گئی اور اس کے کان میں سرگوشی کی وہ جانتی تھی کہ اب جارج سننے سمجھنے کی صلاحیت کھو چکا ہے لیکن پھر بھی وہ امید لگائے ہوئے تھی۔

''میں تمہارے لیے اپنے گھر کے قریب ہی زمین خریدوں گی..... تمہیں اپنے ساتھ رکھوں گی۔'' وہ آہستہ آہستہ بول رہی تھی وہ اس کے ہوش کھونے سے پہلے اسی سے باتیں کرتے رہنا چاہتی تھی اس کے گالوں سے آنسو بہہ رہے تھے اس کے بیٹے کی سانسیں بھی اب اس کا ساتھ چھوڑ رہی تھیں۔

''میں جہاں خوش رہوں گا وہاں جانا چاہتا ہوں ماں..... میں آپ سے ملنے آؤں گا۔'' اسے کہیں قریب سے جارج کی آواز سنائی دی اس نے چونک کر کمرے میں چاروں طرف دیکھا اس کا بیٹا تو اسی طرح بیڈ پر آنکھیں بند کیے بے حس لیٹا ہوا تھا' بس اس کا سینہ اوپر نیچے حرکت کر رہا تھا' جیسے جیسے مشین اسے مصنوعی سانس دلاتی تھی ایلن بہت دیر تک اس کا زرد رنگت والا ٹھنڈا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھامے اسے حرارت پہنچانے کی کوشش کرتی رہی پھر اس نے اسپتال کے بیڈ کی سفید چادر پر اس کا بے جان ہاتھ رکھ دیا تھا اور زار و قطار رونے لگی تھی اس کا بیٹا اسے چھوڑ گیا تھا اس نے بہت صبر کیا تھا' خود کو اپنے بیٹے کے سامنے مضبوط بنا کر پیش کرنے کی خاطر اس نے اپنی

آنکھ کا ایک ایک آنسو اپنے اندر اتار لیا تھا لیکن اب جارج کے آنکھیں بند کرتے ہی اس کے باندھے ہوئے سارے بند ٹوٹ گئے تھے۔

جارج کی آخری رسومات ہونے کے تقریباً دو ماہ بعد اس کا ذہن کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل ہوا تھا تریسا اور جین ایک ماہ تک اس کے ساتھ رہی تھیں اور پھر واپس چلی گئی تھیں' ایلن نے جارج سے کئے ہوئے وعدے سے وفا کرنے کا ارادہ کرلیا تھا' اس نے اس کے جسم کی راکھ ایک لکڑی کے بکس میں بند کرکے رکھی ہوئی تھی جسے جارج کی خواہش کے مطابق اسے ٹھکانے لگانا تھا۔

ایک صبح وہ اپنی کار میں لانگ ڈرائیو پر نکلی اس کے ساتھ لکڑی کا مستطیل نما بکس تھا جو ایک جوتے کے ڈبے کے برابر تھا جس میں جارج کے جسم کی راکھ رکھی ہوئی تھی اس نے اپنی کار کو لمبی ویران سڑک پر ڈال دیا جو اوہیو کی طرف جاتی تھی اس کے بیٹے کے گھر کی طرف جہاں تریسا اور جین رہتی تھیں وہ جگہ تین سو میل کے فاصلے پر تھی اور یہ راستہ اسے شام سے پہلے عبور کرنا تھا' اس کے دل کی عجیب کیفیت تھی آسمان پر چمکنے والا سورج بالکل زرد نظر آرہا تھا اس کی گرمی میں بالکل تپش نہیں تھی اور اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے راستہ ہمیشہ سے زیادہ طویل اور تھکا دینے والا ہوگیا ہو وہ سوچ رہی تھی کہ جارج اس سے اور اپنی بیوی اور بیٹی سے کتنی محبت کرتا تھا اس نے ایلن کو منع کردیا تھا کہ اس کی خاک اس کے لان میں بکھیرانے کے بارے میں وہ تریسا کو بالکل نہ بتائے' یہ کام خاموشی سے کرے چنانچہ اس نے اپنے آنے کی اطلاع تریسا کو نہیں دی تھی' سنسان سڑک پر وہ سو میل گھنٹہ کی رفتار سے سفر کررہی تھی اور ٹھیک تین گھنٹے بعد اس گھر کے سامنے موجود تھی جو اس کے بیٹے کی جنت تھا' اس نے دیکھا کہ گھر کے دروازے بند تھے اور باہر کوئی نہیں تھا اس نے کار کا دروازہ کھولا اور باہر آگئی' کار کو اس نے گھر سے تھوڑے فاصلے پر روکا تھا پھر اس نے لکڑی کا مستطیل نما بکس نکالا تھا اور آہستہ آہستہ قدم اٹھتی گھر کی طرف بڑھ گئی تھی جہاں گھر کے باہر دور دور تک گھاس لگی ہوئی تھی پھر گھر کے لان کی حدود میں داخل ہونے کے بعد اس نے بکس کھولا تھا اور اپنے بیٹے کے جسم کی خاک چاروں طرف بکھیر دی تھی' جو ہوا کے ساتھ اڑتی ہوئی دور دور تک چلی گئی تھی' ایلن کے گالوں پر آنسو بہہ رہے تھے وہ کبھی بھی یہ کام نہیں کرنا چاہتی تھی اس نے جارج کو بہت سمجھایا تھا کہ وہ ایسا نہ کرے اور اپنے اباؤ اجداد کی طرح زمین میں دفن ہونے کو ترجیح دے لیکن نہ جانے کیوں جارج نے اس کی بات نہیں مانی تھی اور اسے مجبوراً جارج سے وعدہ کرنا پڑا تھا کہ وہ اس کی خواہش پوری کرے گی۔

اسے وہ دن یاد آرہے تھے جب جارج اپنی بیٹی کے ساتھ اس لان میں کھیلتا تھا۔

''اوہ جارج! میرے بیٹے یہ کیسا کام تم نے مجھ سے کروایا ہے۔'' اس نے روتے ہوئے کہا۔

''یہ لو میرے پیارے! میں نے اپنا وعدہ پورا کردیا۔'' اس نے روتے ہوئے کہا۔

''خدا تم پر رحم کرے' تمہیں جنت میں مقام دے' اب تم وہاں سکون سے رہو۔'' وہ آہستہ آہستہ اپنے بیٹے کو دعائیں دے رہی تھی۔

''یاد رکھنا جارج! اب تمہاری باری ہے..... اپنا وعدہ پورا کرنے کی..... اب تمہیں مجھ سے ملنے آنا ہوگا..... میں تمہارا انتظار کروں گی۔'' اس نے گالوں پر بہنے والے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ ہوا راکھ کو اڑا کر دور لے گئی تھی اور اس کی تیز مہک ہوا میں پھیل گئی تھی پھر ایلن واپس اپنی گاڑی میں آکر بیٹھ گئی تھی اس نے اطمینان کرلیا تھا کہ اسے کسی نے نہیں دیکھا تھا دور دور تک چھوٹے چھوٹے مکانوں کی قطاریں سر اٹھائے کھڑی تھیں سڑک پر سناٹا تھا کبھی کبھی کوئی گاڑی وہاں سے گزر جاتی تھی۔ گاڑی میں بیٹھ کر اس کے ہاتھ

خود بخود دعا کے لیے اٹھ گئے۔

''یا اللہ! میرے بیٹے کو اب سکون بخش دینا..... اس کے گناہ معاف کر دینا..... اس نے اس دنیا میں بہت تکلیف اٹھائی ہے اسے اب آرام بخش دینا۔'' اس دعا کے پڑھنے کے بعد کار موڑ کر واپس گھر کی طرف روانہ ہوگئی تھی۔

وہ رات ایک بجے کے قریب واپس گھر پہنچی تھی اس کی آنکھیں جل رہی تھیں اور وہ بہت زیادہ تھک چکی تھی اس نے چاہا کہ وہ کچھ دیر سو جائے تاکہ آرام نصیب ہو لیکن کافی دیر بستر پر لیٹی وہ کروٹیں لیتی رہی لیکن نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ اس کے ذہن سے جارج کی یادیں چمٹی ہوئی تھیں وہ اٹھ کر غسل خانے میں چلی گئی وہاں اس نے اپنے چہرے پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مارے لیکن اسے سکون نہیں ملا پھر وہ لونگ روم میں چلی گئی اور ٹی وی کھول لیا۔ وہ بے مقصد بیٹھی کافی دیر تک چینل بدلتی رہی لیکن کچھ بھی دیکھنے کو اس کا دل نہیں کر رہا تھا..... سب عام سی خبریں تھیں کوئی بچہ کھو گیا تھا اس کی گمشدگی کا اعلان' کسی جگہ ایک قتل کا ذکر ہو رہا تھا' جس کا معمہ حل نہیں ہو رہا تھا' کہیں ایک عمارت میں آگ لگ گئی تھی تمام وہی خبریں تھیں جو زندگی جینا مشکل بنانے والی تھیں جو زندگی سے بے زار کرنے والی تھیں ایسے حالات کا ذکر تھا جہاں انسان بے بس تھا' جارج کی طرح جیسے جارج اپنی بیماری کے آگے بے بس ہو گیا تھا اس نے تنگ آ کر VCR میں ویڈیو ٹیپ لگا کر دیکھنا شروع کر دیں لیکن اس میں بھی اس کا دل نہ لگا' اچانک اس کی نظر ایک ویڈیو کیسٹ پر پڑی یہ جارج نے اسے بنا کر بھیجی تھی جس میں وہ اپنی فیملی کے ساتھ موجود تھا اس نے گلاس میں سے پھر پانی پیا جو قریب ہی میز پر رکھا تھا اور ویڈیو VCR میں لگا کر پلے کا بٹن دبا دیا۔

ویڈیو میں وہ سب لان میں بیٹھے کھانا کھا رہے تھے یہ جین کی سالگرہ کا موقع تھا۔ جو انہوں نے گھر ہی میں منائی تھی اور پھر یہ ویڈیو بنا کے ایلن کو بھیجی تھی یہ ویڈیو ایلن کئی بار دیکھ چکی تھی' میز کے گرد تین کرسیاں رکھی تھیں ایک پر جارج بیٹھا تھا اور دوسری دو کرسیوں پر تریسا اور جین بیٹھی تھیں وہ بہت خوش تھیں وہ کھانا کھاتے ہوئے ایک دوسرے سے باتیں کر رہے تھے جارج بہت خوش نظر آ رہا تھا جارج کو دیکھ کر ایک بار پھر ایلن کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے تھے۔

''جارج میرے بیٹے!'' اس نے پھر ایک بار سسکی لی تھی اور اچانک وہ چونکی تھی وہ ویڈیو دیکھنے میں اتنی محو تھی کہ اسے احساس ہی نہیں ہوا تھا کہ جو ویڈیو وہ دیکھ رہی ہے اس میں میز کے گرد چار کرسیاں رکھی ہوئی تھیں اور چوتھی کرسی پر بھی کوئی بیٹھا تھا اس کے ہاتھ سے پانی کا گلاس چھوٹ گیا اور پانی اس کے کپڑوں پر بکھر گیا اس نے جھک کر گلاس اٹھایا اور اسے میز پر رکھ دیا' اس کی توجہ پھر ویڈیو کی طرف ہو گئی تھی لیکن اب وہ کرسی خالی تھی جس پر پہلے اس کا بیٹا جارج بیٹھا ہوا تھا اور اب چوتھی کرسی پر جارج تھا لیکن اب اس کی حالت پہلے والی جارج جیسی صحت مند و توانا نہیں تھی' بلکہ اب وہ وہی جارج تھا جسے اس نے اسپتال میں دیکھا تھا زرد رنگت' نحیف اور کمزور..... اس کی پوتی جین کیمرے کی طرف ہاتھ کر کے ہلا رہی تھی تریسا ہنس رہی تھی اور ایلن رو رہی تھی..... جارج ہنس نہیں رہا تھا لیکن اس کے چہرے سے محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ خوش ہو اس کے چہرے پر کوئی سانس لینے کی نلکی نہیں لگی ہوئی تھی کیونکہ مردہ لوگوں کو سانس لینے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی' ایلن یہ ویڈیو کئی بار دیکھ چکی تھی اسے اس کا ایک ایک سین ازبر تھا اس ویڈیو میں پہلے یہ چیز نہیں تھی یہ ویڈیو اس وقت ختم ہو جاتی تھی جب جین کیمرے کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلا رہی ہوتی تھی لیکن آج یہ ختم نہیں ہوئی تھی' جارج اپنی بیوی اور بیٹی سے باتیں کر رہا تھا اس نے اپنی کرسی بھی بدلی تھی

حالانکہ پہلے ویڈیو میں تین کرسیاں ہی تھیں اور جارج اسی کرسی پر بیٹھا ہوتا تھا جو آج خالی ہوگئی تھی ایلن کے جسم میں ایک جھرجھری سی آئی اسی لمحے جارج نے پھر اس کی طرف دیکھا وہی خالی خالی نیلی آنکھیں جو ہاسپٹل میں اس کے سامنے آہستہ آہستہ بے جان ہوگئی تھیں۔

''اوہ میرے خدا!'' اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا اور اس کی آنکھوں سے ایک بار پھر آنسو بہنے لگے اور دل تیزی سے دھڑک رہا تھا اس نے تیزی سے ہاتھ بڑھا کر VCR کا Stop کا بٹن دبا دیا تھا ویڈیو رک گئی تھی' فیملی کا سین غائب ہوگیا تھا اور ٹی وی کا اسکرین بلو نظر آنے لگا تھا۔

وہ کانپتی ہوئی پھر غسل خانے میں چلی گئی تھی وہاں لائٹ آن کر کے اس نے پھر اپنے چہرے پر پانی کے چھینٹے مارے تھے۔

''یہ میرا وہم ہوگا۔' وہ بڑبڑائی' مجھے اس کے غم نے پاگل کر دیا ہے..... میں اسے بھلا نہیں سکوں گی..... وہ جس تکلیف دہ کیفیت سے گزر رہا تھا' میں اسے کبھی بھول نہیں سکتی۔''

وہ پھر کمرے میں آ گئی تھی اور صوفے پر بیٹھ کر VCR اور ٹی وی کو گھور رہی تھی۔

''نہیں' یہ میرا وہم ہوگا..... یہ کیسے ہوسکتا ہے..... میں نے پہلے بھی یہ ویڈیو کئی بار دیکھی ہے..... اس میں یہ سین نہیں تھا۔'' اس نے پھر خود سے کہا۔

''جارج کی موت کا غم میرے حواس پر چھا گیا ہے.....'' اس نے پھر سرگوشی کی اس کے بعد وہ اٹھ کر ٹہلنے لگی تھی اچانک اس کی نظر دیوار پر لگے آئینے میں پڑی وہ خود کو دیکھ کر حیران رہ گئی تھی اس کی رنگت بالکل جارج کی طرح زرد ہو رہی تھی اور وہ بہت کمزور اور ناتواں نظر آ رہی تھی وہ بالکل ویسی ہی لگ رہی تھی جیسا جارج اپنی موت سے پہلے نظر آتا تھا۔

''نہیں..... نہیں..... یہ میرا وہم ہے..... ایسا نہیں ہوسکتا.....'' وہ گھبرا کر پھر VCR کے قریب آ بیٹھی تھی۔

''میرا وہم ہوگا..... مجھے دوبارہ ویڈیو پلے کر کے دیکھنا چاہیے۔'' اس نے زیر لب کہا اور اس کا ہاتھ آہستہ آہستہ VCR کی طرف بڑھا پھر پلے کے بٹن پر جا کر رک گیا' اس نے چند لمحے سوچا لیکن پھر ہاتھ پیچھے ہٹا لیا' وہ ڈر رہی تھی کہ کہیں دوبارہ ویڈیو پلے ہونے پر اس کا شک یقین میں نہ بدل جائے کئی بار خود کو روکنے کے باجود وہ اس خواہش کو نہ دبا سکی کہ اسے VCR کو پلے کر کے دیکھنا چاہیے آخر کار اس نے پہلے کا بٹن دبا دیا اس کی آنکھوں کے آگے اب نیا منظر تھا جو اس نے اس ویڈیو میں پہلے نہیں دیکھا تھا۔ جارج ہاسپٹل کے بیڈ پر لیٹا ہوا تھا اس کی ناک میں آکسیجن کی نلکی لگی تھی اور وہ کیمرے کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلا رہا تھا۔ ایلن نے جلدی سے STOP کا بٹن دبا دیا..... وہ کانپ رہی تھی۔

''نہیں..... یہ نہیں ہوسکتا.....'' وہ بڑبڑائی اور پھر اس کا ہاتھ ویڈیو ڈرائیو کی طرف بڑھ گیا وہ ویڈیو کیسٹ نکالنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن ویڈیو کیسٹ نکل نہیں رہی تھی وہ ناکام ہو کر صوفے پر پیچھے ہو کر بیٹھ گئی تو اچانک ویڈیو ڈرائیو کا شٹر کھل گیا..... وہ خالی تھا اس میں کوئی کیسٹ نہیں تھی بلکہ اس میں سے دھوئیں کی شکل میں راکھ سی باہر آ رہی تھی اور کمرے میں اس کے بیٹے کے جسم کی راکھ سے آنے والی بو پھیل گئی تھی..... وہی بو جو اس نے Ohio اوہیو میں جارج کے گھر کے باہر اس کے جسم کی راکھ بکھیرتے ہوئے محسوس کی تھی..... شاید اس کا بیٹا ایفائے عہد کے لیے اس سے ملنے واپس آ گیا تھا۔

پتھارے والا

عارف شیخ

اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ پولیس سے بڑا کوئی بدمعاش نہیں ہوتا، پولیس قانون کے دائرے کے اندر رہ کر کس طرح مافیا کی طرح کام کرتی ہے اس کا اندازہ اچھے اچھوں کو نہیں ہوتا۔

سپاہی سے انچارج بننے والے ایک شخص کی روداد

کانسٹیبل ولی محمد بیدار ہوا تو اس نے دیکھا کہ صبح ہوئے کافی دیر ہو چکی ہے اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا کہ وہ ابھی نیند سے جاگے‘ حالانکہ وہ ساری رات سویا تھا‘ لیکن اس نے ڈیوٹی کافی لمبی اور تھکا دینے والی کی تھی اس لیے اس کا سارا بدن درد کر رہا تھا اور وہ ابھی مزید سونا چاہتا تھا۔

وہ بستر پر یونہی لیٹے لیٹے سوچوں کے سمندر میں غوطے مارتا ہوا ماضی کے دریچوں میں چلا گیا۔ اسے اپنا گاؤں یاد آنے لگا‘ جہاں اس کا باپ اور ماں نے چھوٹا سا گھر بنا رکھا تھا۔ اسے وہ غربت بھی یاد آنے لگی جو اس نے اور اس کے گھر کے لوگوں نے دیکھی تھی۔

اچانک دروازہ زوردار آواز کے ساتھ کھلا اور اس کی موٹی سی بیوی اندر داخل ہوگئی۔

”یونہی بستر توڑتے رہو گے۔“ وہ اپنے مخصوص جلائے انداز میں بولی۔ ”یا اٹھو گے؟“

”نیک عورت کبھی تو مزاج میں نرمی پیدا کر۔“ وہ اٹھ بیٹھا۔ ”میں پولیس والا ہو کر اتنا کڑک نہیں ہوں جتنی تو غصہ دکھاتی ہے۔“

”جب زندگی اتنی کٹھن ہو تو بدمزاجی خودبخود آجاتی ہے۔“ اس نے فوراً ہی جواب دیا۔ ”تم اپنا کام کرو‘ بعد میں مجھے دوسرے بھی کام کرنے ہیں۔“

”میرا کیا کام ہے‘ مجھے تو صرف چائے ناشتہ چاہیے۔“ اس نے پاؤں بستر سے نیچے زمین پر لٹکائے اور کھڑا ہوگیا۔ ”اس سے زیادہ تجھے کوئی تکلیف دی ہے۔“

”جتنا تم کماتے ہو اس میں چائے ناشتہ ہی تکلیف دے بن جاتا ہے۔“ وہ واپسی کے لیے گھومی۔ ”اب مجھے باتوں میں مت الجھاؤ‘ جلدی آؤ تاکہ میں دوسرے کام کرسکوں۔“

ولی محمد سیدھا باتھ روم میں گھسا نہانے کے بعد اس نے رات والی وردی ہی دوبارہ چڑھالی تھی۔ اب وہ کچن کے ساتھ والے کمرے میں آ گیا تھا۔ وہ سرکاری کوارٹر میں رہتا تھا۔ جو تھانے کے عقب میں بنے ہوئے تھے۔ یہ دو کمرے کے کوارٹر بھی اسے بڑی مشکل سے ملا تھا۔

وہ کمرے میں موجود تخت پر بیٹھا تو بیوی نے ہر روز کی طرح چائے اور پراٹھا اس کے سامنے رکھ دیا اور خود بھی سامنے ہی بیٹھ گئی۔ یہ سارا عمل اس کے معمولات میں شامل تھا۔

”آج بھی اتنی ہی لمبی ڈیوٹی ہوگی۔“ اس نے پوچھا۔ ”مجھے بتا کر جایا کرو تاکہ انتظار نہ کرنا پڑے۔“

”یار مجھے خود نہیں معلوم ہوتا۔“ اس نے چائے کی چسکی بھری۔ ”اچانک معلوم ہوتا ہے کہ آج یہ ڈیوٹی کرنی ہے۔“

”کیا تم کوئی اور کام نہیں کرسکتے۔“

”پہلے شاید سوچ سکتا تھا بلکہ بہت کچھ کرسکتا تھا لیکن اب تو اس ملازمت کو دس برس سے زیادہ عرصہ ہوگیا ہے۔“ وہ بولا۔ ”اب تو جو کچھ ہے یہی ہے۔“

”پولیس والے تو بڑے پیسے کماتے ہیں۔“ وہ بھی آج اسی موضوع پر ٹکی رہنا چاہتی تھی۔ ”لیکن تم تو بالکل ہی فقیر

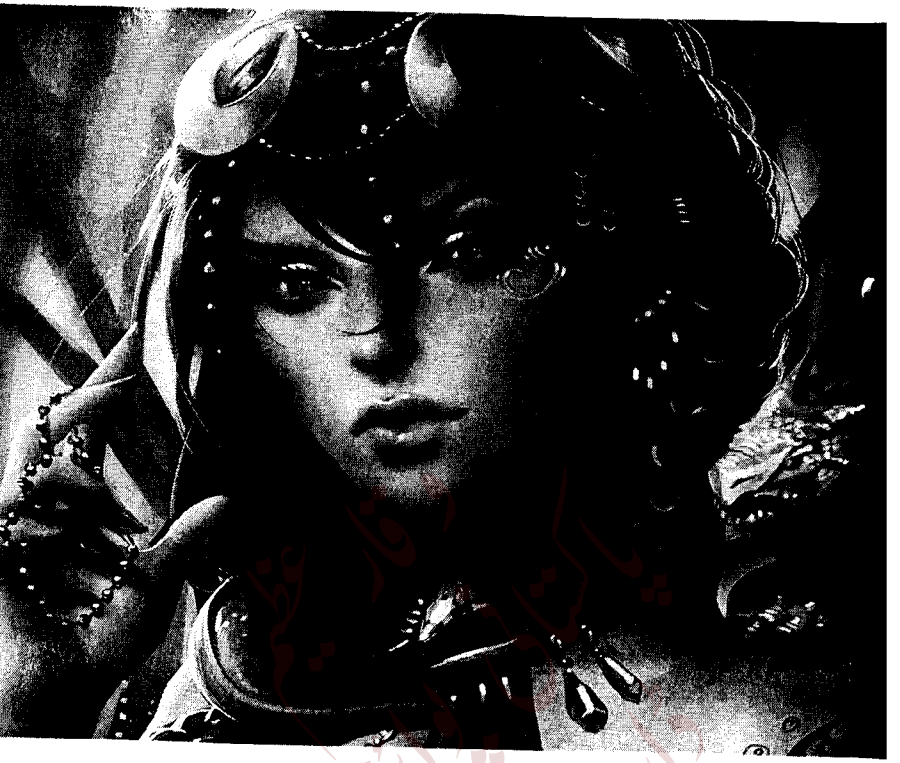

ہو۔''

''کیوں تنخواہ نہیں آتی ہے۔'' وہ اس کی طرف دیکھ کر بولا۔ ''سرکاری مکان بھی ملا ہوا ہے۔''

''مکان نہیں اسے کھنڈر کہتے ہیں۔'' اس نے چھت کی طرف اشارہ کیا جو جگہ جگہ سے جھڑ رہی تھی۔ ''اور تنخواہ سے صرف روٹی پانی بامشکل چل رہا ہے۔''

''ہر پولیس والا نہیں کما سکتا۔'' وہ سمجھانے لگا۔

''تم میں تو جذبہ ہی نہیں کہ تم کچھ حالات بدل سکو۔'' وہ ناراضگی سے بولی۔

''میرے اندر بھی خواہش ہے لیکن پولیس کمائی کے لیے اوپر تعلقات کا ہونا ضروری ہے۔'' وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ ''اچھا اب میں چلتا ہوں۔ دیر سے پہنچا تو افسر کی ڈانٹ سننا پڑے گی۔'' وہ اپنے کوارٹر سے نکل کر پیدل ہی تھانے کی طرف بڑھ گیا۔

❀.....❀.....❀

ولی محمد نے گاؤں میں ہی میٹرک پاس کیا تھا اور پھر باپ کی اجازت سے حالات بدلنے کی جستجو میں شہر آ گیا دو برس ادھر ادھر ملازمتیں کرنے کے بعد اسے آخر کار پولیس میں کانسٹیبل کی نوکری مل گئی۔ فوراً ہی اس کی شادی بھی ہوگئی' یوں ملازمت کے ساتھ بیوی کی ذمے داری بھی آ گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کے تین بچے تین سالوں میں ہوگئے اور یوں خرچے ایسے بڑھے کہ تنخواہ پورے مہینے کے بجائے گھٹ کر مشکل سے بیس چوبیس دن ہی چل پاتی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی بیوی کی شکایت درست ہے لیکن وہ کیا کرے اسے کوئی موقع نہیں ملتا تھا رقم کمانے کا۔ ابھی چند روز قبل اسے بڑی مشکل سے ایک ذمے داری ملی تھی جس کے لیے وہ اپنے انچارج کے سامنے بہت رویا گایا تھا تب جا کر اسے وہ کام ملا تھا۔ اس

کام سے اسے تنخواہ کے علاوہ چھ سات ہزار کی اوپر کی کمائی ہوجائے گی لیکن یہ بات اس نے ابھی اپنی بیوی سے پوشیدہ رکھی ہوئی تھی۔

❀.....❀.....❀

وہ سیدھا تھانے پہنچ گیا تھا جہاں اسے موبائل کے ساتھ گشت پر جانا تھا یہ اس کی سرکاری ڈیوٹی تھی۔ اس نے برسوں اسی طرح سے خدمات انجام دی تھیں زیادہ تر تو موبائل پر گشت کرتے ہوئے کبھی کبھار کسی ریڈ پر بھی جانا پڑا تھا کئی مرتبہ بینک پر بھی ذمے داری لگادی گئی تھی۔

اکثر ایسا بھی ہوا کہ کسی بڑے پولیس افسر کی سیکورٹی پر تعینات کردیا گیا۔ دو مرتبہ وزیروں کے ہمراہ بھی کئی ماہ تک ڈیوٹی دی تھی۔ ابھی گزشتہ دس ماہ سے وہ سکون میں آیا تھا اور اب اسے انچارج نے الگ سے کام بھی دیا تھا جسے وہ ایمانداری اور محنت سے کرکے مستقبل بنیادوں پر کرنا چاہتا تھا' اسے گشت ختم کرکے شام والی ڈیوٹی کا انتظار تھا۔

❀.....❀.....❀

رات آٹھ بجے ولی محمد اپنی گشت والی ڈیوٹی کے فرائض سے آزاد ہوا تو سیدھا اس سڑک کی طرف بڑھا جہاں سے اسے نئی آمدنی شروع ہوئی تھی۔ اس سڑک کے دونوں طرف پتھارے اور ٹھیلے تھے' یہ بازار کافی رش والا تھا۔ یہاں لوگوں کی آمدورفت کی وجہ سے ٹھیلے اور پتھارے والوں کی ٹھیک ٹھاک کمائی تھی۔

کانسٹیبل ولی محمد بازار والی سڑک سے ہوتا ہوا سیدھا ایک مکان کے پاس پہنچا تھا' جہاں وہ بغیر رکے اندر چلا گیا تھا۔ اس مکان کے مکین سے وہ ہفتے میں ایک بار ملنے آتا تھا' یہ ذمے داری اسے انچارج نے دی تھی۔ وہ سیدھا اس کمرے میں آیا جہاں اے سی کی ٹھنڈک میں ٹی وی دیکھا جارہا تھا۔

''سلام علیکم!'' اس نے بلند آواز کمرے میں موجود تین افراد کو مخاطب کیا۔

''جواب میں بغیر آواز کے گردن ہلادی گئی تھی۔ ولی محمد کو یہ بات پسند نہیں تھی کہ اس کے سلام کا جواب نہیں دیا جائے لیکن وہ اس معاملے کو لے کر الجھنا نہیں چاہتا تھا۔

''انچارج صاحب نے بھی سلام بھیجا ہے۔''

دوسری طرف سے صرف ایک آواز آئی۔ ''انچارج کی رقم دے کر اسے فارغ کر۔'' سامنے ہی صوفے پر گھسا بیٹھا شخص سکندر گجر نے کہا۔

ولی محمد کو معلوم تھا کہ اسے مزید بات نہیں کرنی ہے اس لیے وہ وہاں موجود سکندر گجر کے آدمی عرفان سے ملا جس نے اسے ایک لفافہ پکڑادیا۔ اس کے بعد ولی محمد کو وہاں نہیں رکنا تھا' وہ سیدھا دوبارہ بازار میں آ گیا اور وہاں سے اس نے چند ٹھیلے والوں سے پھل وغیرہ مفت میں حاصل کیے اور اب وہ سیدھا انچارج کی طرف جارہا تھا۔

❀.....❀.....❀

وہ رات دس بجے کے بعد گھر میں داخل ہوا تھا۔ بچے بھی اسے دیکھ کر خوش ہوئے تھے اس لیے کہ اکثر وہ رات دیر سے گھر لوٹتا تھا تو بچے سو چکے ہوتے تھے۔ وہ سیدھا اپنے کمرے میں گیا اور باتھ روم میں جا گھسا۔ جب وہ ہاتھ منہ دھو کر باہر آیا تو اس نے اپنی بیوی کے ہاتھ میں نوٹوں کا لفافہ دیکھا جو وہ سکندر گجر سے لایا تھا۔

اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتا' اس کی بیوی نوٹ کی گڈی دیکھ چکی تھی۔ ''یہ کیا اتنے سارے نوٹ کیا یہ ہمارے ہیں؟'' وہ بولی۔

پہلے تو ولی محمد گھبرا گیا لیکن پھر اس نے خود کو سنبھالا۔

''یہ ہمارے نہیں انچارج صاحب کے ہیں۔''

''کہاں سے آئے ہیں۔''

ولی محمد نے بیوی کے ہاتھ سے نوٹوں کی گڈی لی۔

''اوپر کی آمدنی ہے۔'' اس نے بتایا۔

''کیا اس میں سے تمہیں کچھ ملیں گے۔''

''صرف دو ہزار۔'' وہ بولا۔

''اتنے سارے نوٹوں میں سے صرف دو ہزار ملیں گے۔'' وہ حیرت اور خفگی کے ساتھ بولی۔ ''یہ ہیں کتنے؟''

''پچاس ہزار ہیں۔''

''انچارج اکیلا پچاس ہزار رکھے گا۔'' وہ غصے سے بولی۔

''سب انچارج کے نہیں ہوتے ہیں اسے بھی اوپر اعلیٰ افسروں کو دینے پڑتے ہیں۔''

''پھر بھی تمہیں دس ہزار تو ملنے چاہئے۔''

''ملنے کو تو یہ خواہش بھی ہوسکتی ہے کہ یہ پورے پیسے مجھے ملتے لیکن ہر خواہش پوری نہیں ہوتی ہے۔''

''لیکن دو ہزار میں کیا ہوگا؟'' وہ منہ بنا کر بولی۔

''میں جانتا ہوں کہ اتنی چھوٹی رقم سے بہت زیادہ نہیں ہوسکتا لیکن ہر ہفتے دو ہزار ملیں تو مہینے کی آٹھ ہزار آمدنی بڑھ جاتی ہے۔''

''کب تک؟''

''جب تک انچارج سے بنی رہے گی' اس وقت تک تو یہ آمدنی آرہی ہے بعد میں معلوم نہیں کیا ہوگا؟'' اس نے کہا۔ ''چل اب کھانا دے دے۔''

اس کی بیوی کھانا نکالنے چلی گئی۔

❀.....❀.....❀

وہ اجنبی کی طرح سے بازار میں گھوم رہا تھا' اسے ایک گھنٹے سے زائد ہو چکا تھا' اس بازار میں آئے ہوئے وہ پہلی بار اس طرف نہیں آیا تھا' وہ ایک ہفتے میں تیسری بار اس بازار میں آیا' دکانوں کے ساتھ ٹھیلے اور پتھارے ابھی آباد ہو رہے تھے' وہ دو مرتبہ ایک کونے سے دوسرے کونے تک ہو آیا تھا۔

آخر کار وہ ایک پتھارے والے کے پاس رک گیا۔ ''سلام وعلیکم!'' وہ ہاتھ پیشانی تک لے گیا۔

''وعلیکم سلام!'' وہ ایک بوڑھا شخص تھا۔

''کیا میں آپ کے پاس یہاں کچھ دیر بیٹھ سکتا ہوں۔'' اس نے پوچھا۔

''بیٹھ جاؤ۔'' وہ بوڑھا بولا۔

اس نے دیکھا کہ وہ بوڑھا شخص ابھی اپنا پتھارے کو آباد کر رہا ہے۔ ''جناب میرا نام بلال ہے۔'' وہ بولا۔

بوڑھا اس کی طرف متوجہ ہوا۔ ''میرا نام عبدالرحیم ہے۔'' اس نے بلال سے مصافحہ کیا۔ ''لگتا ہے تم کو مجھ سے کوئی کام ہے۔''

''آپ کے تجربے کو میں رد نہیں کروں گا۔'' بلال نے جواب دیا۔ ''مجھے واقعی آپ سے کام ہے۔''

''کہو کیا کام ہے۔'' وہ بوڑھا اب دوبارہ سے اپنے کام کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔

''آپ کا پتھارا کس چیز کا ہے؟''

بدعت کی ہلاکتیں

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

''بہترین بیان اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے اور بہترین نمونہ اور سیرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت ہے اور وہ کام بُرے ہیں جو نئے نئے گھڑے جائیں اور ہر بدعت گمراہی ہے اور ہر گمراہی جہنم میں لے جانے والی ہے۔''

(مسلم ونسائی)

اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نہ کسی بدعتی کا روزہ قبول کرتا ہے۔ نہ نماز، نہ صدقہ قبول کرتا ہے اور نہ حج اور عمرہ اور نہ جہاد اور نہ کوئی فرض عبادت قبول کرتا ہے، نہ نفلی عبادت۔ بدعتی اسلام سے ایسے خارج ہو جاتا ہے جیسے گوندھے ہوئے آٹے سے بال نکالا جاتا ہے۔'' (ابن ماجہ) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی ارشاد فرمایا: ''جس شخص نے کسی بدعتی کی تعظیم وتوقیر کی تو اس نے اسلام کو گرانے میں اس کی مدد کی۔'' (مشکوٰۃ)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی ارشاد فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے بدعتی کے عمل کو قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے جب تک کہ وہ اپنی بدعت چھوڑ نہ دے۔''

(ابن ماجہ)

بدعتی سمجھتا ہے کہ میں چوں کہ نماز ادا کرتا ہوں، روزے رکھتا ہوں، زکوٰۃ دیتا ہوں، حج کر چکا ہوں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت بھی کرتا ہوں لہٰذا میں تو سیدھا جنت میں جاؤں گا، اسی وجہ سے اسے توبہ کی توفیق نہیں ہوتی اور بدعت اس کے تمام اعمال کو ضائع کر دیتی ہے۔

انتخاب: سید وقار الدین..... نواب شاہ

''میرے پاس مصالحے اور اچار چٹنی کا سامان بکتا ہے۔'' عبدالرحیم نے بتایا۔

''کیا میں بھی پتھار الگا سکتا ہوں۔'' وہ مقصد کی بات پر آیا۔

''جگہ چاہیے۔'' بوڑھا اس کی طرف گھوما۔

''اگر آسانی سے مل جائے۔''

''سرکاری سڑک ہے کسی کی ذاتی ملکیت تو ہے نہیں۔'' وہ ہنسا۔ ''اس لیے آسانی سے مل جائے گی۔ بس ایک شخص سے اجازت لینا ہوگی۔''

''مجھے کس سے ملنا ہوگا۔'' بلال نے پوچھا۔

''اس سڑک کا مالک ہے سکندر گجر۔'' وہ بولا۔ ''اس پوری سرکاری سڑک کا وہی مالک ہے' اس سے مل لو کام ہو جائے گا۔''

❀.....❀.....❀

بلال اسی دن سکندر گجر کے مکان پر موجود تھا جہاں اسے بتایا گیا کہ اس کے لیے اسے سکندر گجر سے نہیں بلکہ اس کے منیجر عرفان سے ملنا ہوگا۔ چنانچہ اس کی ملاقات عرفان سے ہوگئی۔

دونوں ایک دوسرے کے متضاد جسمانی خدوخال کے مالک تھے۔ بلال صحت مند لمبے قد اور بھرے بھرے چہرہ کا مالک تھا جبکہ عرفان قد کا کم اور سوکھے بدن کا دکھتا تھا۔

''تو تمہیں اپنے پتھارے کے لیے جگہ چاہیے۔'' عرفان اسے بغور دیکھ رہا تھا۔

''اگر آپ کی عنایت ہو جائے تو میری بے روزگاری دور ہو سکتی ہے۔'' اس نے عاجزی سے کہا۔

''کیا کام کرو گے؟''

''بچوں کے گارمنٹ کا پتھار الگاؤں گا۔''

''پانچ سو روپے روزانہ دے سکتے ہو۔'' عرفان نے کہا۔

''یہ تو بہت زیادہ ہیں۔''

''اس میں خرچا بھی ہوتا ہے' کوئی سرکاری ادارہ تمہیں انگلی تک نہیں لگائے گا۔'' وہ بتانے لگا۔ ''بجلی بھی مفت میں ملے گی جتنی چاہے خرچ کرو' رات میں مال کی چوکیداری بھی ہوتی ہے' سمجھو پانچ سو روپے میں مفت دکان مل رہی ہے۔''

''جگہ تو اچھی مل جائے گی۔'' اس نے پوچھا۔

''تین چار جگہ دکھا دیں گے جو پسند ہو لے لینا۔''

''میں دو ایک روز میں آجاتا ہوں۔'' بلال نے رضامندی ظاہر کر دی تھی۔ اس کے بعد وہ وہاں سے روانہ ہو گیا۔

❀.....❀.....❀

ولی محمد کو تھانے میں اس کے ایک ساتھی کانسٹیبل نے خبر دی تھی کہ سکندر گجر نے اپنے مکان پر کھانے کی دعوت رکھی ہے' ولی محمد نے اپنے ساتھی سے سوال کیا۔

''کیا خیال ہے کس سلسلے میں ہوگی یہ دعوت؟''

وہ کچھ دیر سوچتا رہا پھر بولا۔ ''سکندر گجر کو کوئی اور کام بھی کرنا ہوگا' وہ اس کے لیے انچارج سے بات کرنا چاہتا ہوگا۔''

''ٹھیک ٹھاک کام ہے اتنی آمدنی ہے ابھی بھی کوئی اور کام کرنا ہے۔'' ولی محمد بولا۔

''ارے دولت کمانے کا نشہ ہو جائے تو کوئی بھی کام چھوڑا نہیں جاتا ہے۔''

''ساتھ کون کون جا رہا ہے۔'' ولی محمد نے پوچھا۔

''موبائل تو انچارج صاحب کے ساتھ پوری جائے گی لیکن جب وہ اکیلے میں بات کرے گا تو شاید کوئی بھی نہ ہو۔''

''غیر قانونی کام ہوگا لیکن پھر معلوم ہو جائے گا۔'' ولی محمد نے کہا۔ ''جانا کب ہے؟''

''پرسوں کی خبر ہے۔''

''چلو دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے۔'' وہ یہ کہتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

❀.....❀.....❀

بلال کو ایمانداری کے ساتھ تین جگہیں دکھائی گئی تھیں' جس میں سے اس نے ایک پسند کر لی۔ اس کی دوکان صرف ایک پتھار اتھی لہٰذا اسے آباد کرنے میں اسے دو گھنٹے ہی لگے۔ قمیصیں سجا کر اس نے مال رکھا اور دکانداری شروع کر دی۔ ایک ہی دن میں اسے مارکیٹ کے تمام قوانین بھی معلوم ہو گئے تھے۔ ہر شام پانچ سو روپے دینے تھے۔

اس تمام کاروبار کا سکندر گجر اکیلا مالک تھا۔ عرفان اور دو اور کارندے اس نے تنخواہ پر رکھے ہوئے تھے' جو اندھیرا ہونے کے بعد پورے بازار سے وصولی کرتے تھے' پولیس کی موبائل کبھی کبھار آتی ضرور تھی لیکن راؤنڈ لگا کر چلی جاتی تھی۔ اس نے بھی جلد ہی اڑوس پڑوس سے مراسم بڑھا لیے تھے۔

❁ ...... ❁ ...... ❁

ولی محمد سونے کے لیے لیٹا تو بیوی پاس آ گئی وہ سمجھ گیا کہ اسے باتیں کرنی ہوگی ورنہ تو گھر کے کاموں میں مصروف رہتی ہے۔

''کوئی بات دل میں کھٹک رہی ہے جو تجھے کرنی ہے۔'' وہ بیوی کے چہرے کو گھور رہا تھا۔

''خوب پہچانتے ہو مجھے۔'' وہ مسکرائی۔

''اتنے برسوں سے ساتھ ہوں۔ اسی لیے تجھے سمجھ پایا ہوں۔'' وہ بولا۔ ''پوچھ کیا پوچھنا ہے۔''

''میری آنکھوں اور دماغ سے وہ نوٹوں کی گڈی نہیں ہٹ رہی ہے۔''

''نوٹ ایسی ہی چیز ہوتے ہیں نشے کی طرح سے جکڑ لیتے ہیں۔''

''انچارج ہر ہفتے اتنی موٹی گڈی لے کر کیا کرتا ہوگا؟''

''خرچ کرتا ہوگا۔'' وہ ہنس کر بولا۔

''وہ تو خاصا امیر ہوگا۔''

''ظاہر ہے جب انسان کی آمدنی تگڑی ہو تو وہ امیر ہو جاتا ہے۔''

''تم انچارج کب بنو گے۔'' اس نے اشتیاق سے پوچھا۔

''یہ تو میرا بھی خواب ہے لیکن نا جانے کب پورا ہوگا۔'' وہ چھت کو گھور رہا تھا۔

''یہ جو تمہارا سکندر گجر ہے وہ بازار کا کیسے مالک بن گیا۔''

وہ اٹھ کر بیٹھا۔ ''سنا ہے کہ پہلے وہ چھوٹا موٹا بدمعاش تھا' کئی مرتبہ تھانے میں بند بھی ہوا لیکن اس نے یہ بازار والا کاروبار شروع کر دیا۔''

وہ چند لمحے توقف کر کے بولا۔ ''اب تو وہ نامی گرامی بدمعاش اور پیسے والا ہے۔''

''اس کا کوئی خاندان نہیں ہے۔'' بیوی نے پوچھا۔

''وہ یتیم تھا' رشتے داروں نے پالا' اسی لیے آوارہ گردی میں پڑ گیا تھا۔''

''انچارج اگر نہیں مانتا تو تم سکندر سے دوستی کرو' وہ ضرور پیسے کمانے میں مدد کرے گا۔''

ولی محمد نے اسے گھور کر دیکھا اور بولا۔ 'مجھے سونے دے صبح ڈیوٹی پر جانا ہے۔'' اس نے لیٹ کر چادر تان لی تھی۔

❁ ...... ❁ ...... ❁

سکندر گجر اور انچارج آمنے سامنے تھے۔ کھانے کے لوازمات کے ساتھ پینے کا انتظام بھی کیا گیا تھا۔ دونوں کے علاوہ کمرے میں اور کوئی موجود نہیں تھا۔

''تمہیں خاص بات کرنی ہے۔'' انچارج منظور خان بولا۔

''ایک بڑا کام ہے' اس میں مجھے تمہارا ساتھ چاہیے۔'' سکندر نے کہا۔

''کام کی تفصیل بتاؤ گے تو پھر میں فیصلہ کروں گا کہ ساتھ دینا ہے کہ نہیں۔''

''بازار کے دائیں طرف والی زمین دیکھی ہے۔''

انچارج چونکا۔ ''وہ تو سرکاری زمین ہے۔''

''ہاں سرکاری ہے اور کس محکمے کی ہے یہ مجھے معلوم ہے۔'' سکندر نے کہا۔

''کیا کرنا ہے۔'' وہ سکندر کو سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

''اس زمین پر قبضہ کر کے گھر بنانے ہیں۔''

''یہ کام آسان نہیں ہے۔'' انچارج کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

''آسان کام میں بڑی رقم نہیں آتی ہے۔'' سکندر مسکرایا۔

''مجھے کیا کرنا ہوگا؟'' انچارج نے پوچھا۔

''صرف آنکھیں بند کر کے ایک موبائل وہاں پہرے پر کھڑی کرنی ہوگی۔''

''مجھے کیا ملے گا؟''

''ایک کروڑ۔'' سکندر نے بتایا۔

انچارج کے دل میں کھلبلی مچ گئی تھی لیکن اس نے ظاہر نہیں ہونے دیا تھا۔ ''مجھے سوچنے کی مہلت دو۔''

''ضرور سوچو لیکن بہت دیر مت کرنا کیونکہ مجھے یہ کام کرنا ہے۔'' سکندر نے کہا۔ ''ورنہ مجھے کسی اور سے بات کرنا پڑ جائے گی۔''

انچارج منظور خان کو سکندر کا یہ انداز پسند نہیں آیا تھا لیکن وہ کاروباری معاملے کو سمجھداری سے چلانا جانتا تھا۔

❀ ..... ❀ ..... ❀

ولی محمد، سکندر کے مکان سے ہفتہ کی رقم وصول کر کے نکلا تو اسے کچھ فروٹ لینے تھے بچوں کے لیے وہ ایک پتھارے پر پہنچا' اس نے اس فروٹ والے سے کیلے لے کر تھیلے میں ڈالے تو اسے پڑوس میں موجود بچوں کے کپڑوں کا پتھارا دکھائی دے گیا۔ وہ فوراً اس کے پاس آیا۔

''کیا نیا لگایا ہے۔'' اس نے پتھارے والے جوان شخص کو مخاطب کیا۔

وہ بلال تھا۔ ''ہاں آج چوتھا دن ہے۔'' اس نے بتایا۔

''کتنی عمر کے بچوں کے کپڑے ہیں تمہارے پاس؟''

اس نے کپڑے ادھر ادھر کر کے دیکھنے شروع کر دیئے تھے۔

''ہر عمر کے بچے کا سائز مل جائے گا۔'' وہ بولا۔ ''آپ عمر بتائیں اور لڑکی ہے یا لڑکا یہ بتائیں۔''

''یار دو لڑکوں کے سوٹ نکال دے۔'' ولی نے سوچا نیا ہے اسے رعب میں لے لیتا ہوں۔ ''ایک لڑکی ہے لڑکے تو سات اور چھ سال کے ہیں لڑکی پانچ سال کی ہے۔''

جناب ابھی نکال دیتا ہوں۔'' بلال نے جلدی سے اس سائز کے ڈیزائن اور رنگ کے کپڑے ولی کے سامنے کر دیئے۔

''یہ تینوں سوٹ شاپر میں ڈال دے۔'' ولی محمد نے فیصلہ سنایا۔

بلال نے دکانداری انداز میں وہ شاپر اس کی طرف بڑھایا۔ ''ایک ہزار جناب۔''

''کیا ایک ہزار۔'' ولی محمد چونکا۔

''ان کپڑوں کی قیمت جناب۔''

''تو پولیس والے سے پیسے لے گا۔'' ولی محمد نے ہلکی آواز میں اسے دھمکی دی۔ ''ابے ہم تو کپڑوں کے ساتھ پیسے بھی لیتے ہیں۔''

''جو دینا ہوگا اس سے لے لو مجھے تو میرے مال کی قیمت دے دو۔'' اس کی آواز خاصی بلند تھی۔

ولی محمد نے اپنے اطراف میں دیکھا کہ کئی ٹھیلے پتھارے والے انہی کو دیکھ رہے تھے۔ وہ سمجھ گیا کہ اگر اس نے کمزوری دکھائی تو پھر کوئی پتھارے والا اسے مفت سامان نہیں دے گا۔

''دیکھ تو مشکل میں پڑ جائے گا۔'' اس نے دھمکی آمیز رویہ اختیار کیا۔

''میں مفت مال کیوں دوں' پانچ سو روپے روز کرایا دیتا ہوں۔'' اس کی آواز اسی طرح بلند تھی۔ ''اور جس کو پانچ سو روپے روزانہ دیتا ہوں اس نے بتایا تھا کہ سب کچھ مفت ہے کوئی تنگ نہیں کرے گا۔''

ولی محمد کافی بے عزتی برداشت کر چکا تھا۔ ''تجھے تھانے لے گیا تو وہ چھترول کروں گا کہ اس بازار سے ہی غائب ہو جائے گا۔''

''تھانے کی دھمکی دیتا ہے۔'' وہ چیخا۔

ولی محمد نے فی الحال وہاں سے روانگی ڈالنے کی سوچ لی تھی ورنہ معاملہ بگڑ سکتا تھا اور اگر انچارج ناراض ہو جاتا تو یہ تھوڑی بہت اوپر کی آمدنی بھی ہاتھ سے چلی جاتی۔ لہٰذا وہ اس پتھارے والے کو دھمکی دیتا ہوا وہاں سے نکل گیا۔

❀ ..... ❀ ..... ❀

بلال عرفان کے سامنے حاضر تھا۔ ''تم نے کیا ہنگامہ مچا رکھا ہے۔'' وہ سختی سے بولا۔

''میں نے کوئی ہنگامہ نہیں مچایا۔'' اس کی آواز میں کوئی ڈر خوف نہیں تھا۔ ''جو معاہدہ ہوا ہے اس کے آگے پیچھے ہونا مجھے پسند نہیں ہے۔ میں نے وعدے کے مطابق پانچ سو روپے روزانہ دیئے ہیں اب اس کے علاوہ کوئی ایک روپے کا بھی تقاضہ کرے گا تو اسے سبق سکھا دوں گا۔''

''بہت اونچا اڑ رہا ہے۔'' عرفان نے غصے سے

کہا۔ ''یہاں پر وہ آدمی پسند نہیں کیا جاتا تو ضرورت سے زیادہ بہادری دکھائے۔''

''مجھے بھی وہ لوگ قطعی ناپسند ہیں جو مجھے ڈرانے کی کوشش کریں۔''

عرفان کو اب اپنی بے عزتی محسوس ہو رہی تھی اس لیے کہ سکندر کے ملازم بھی اس وقت موقع پر موجود تھے' وہ اپنے غصے کو کنٹرول رکھتے ہوئے بولا۔

''اب تو ایسا کر یہاں سے اپنا پتھارا اٹھا اور کہیں اور جا کر لگا۔''

''کس مائی کے لعل میں ہمت ہے کہ میرے پتھارے کو ہاتھ لگائے۔'' اس نے سینہ تانا۔

''ہم وہ مائی کے لعل ہیں۔'' عرفان نے فیصلہ سنایا۔

''کل اگر تو بازار میں دکھائی دیا تو پھر تیری خیر نہیں ہے تو تو جائے گا ہی تیرا مال بھی ہمارے قبضے میں ہوگا۔''

''میں کل ضرور آؤں گا اور میری دکان بھی کھلے گی۔'' بلال نے کہا اور وہاں سے نکل گیا۔

عرفان جانتا تھا کہ اس بلال کا فیصلہ ضروری ہو گیا لیکن سکندر کو تمام حالات بتانے بھی ضروری ہیں تاکہ کوئی اونچ نیچ ہو جائے تو وہ سنبھال سکے۔

❀.....❀.....❀

ولی محمد کی بیوی اپنے شوہر کو بغور دیکھ رہی تھی۔

''کیا سوچ رہے ہو؟'' آخر اس نے پوچھ ہی لیا۔

'اس نے بازار والی افتاد سنائی اور پھر بولا۔ ''کل اس کا بزنس دی اینڈ ہو جائے گا۔''

''وہ کیسے؟''

''کل سکندر کے آدمی اس کے پتھارے پر قبضہ کر کے اسے تھانے میں بند کروا رہے ہیں۔'' اس نے بتایا۔

''انچارج نے کل موبائل سمیت بازار جانے کا حکم دے دیا ہے۔''

''ہائے بے چارے نے ابھی تو کاروبار شروع کیا تھا۔ بیوی نے ہمدردی دکھائی۔

''ارے اس کی حرکتیں ہی ایسی ہیں۔'' ولی محمد بولا۔ ''پولیس کو دھمکی دے رہا ہے اور سنا ہے کہ سکندر کے آدمیوں سے بھی اڑ گیا تھا' انجام تو یہی ہونا تھا۔''

آنچل کی جانب سے ایک اور آنچل

ماہنامہ حجاب کراچی

شائع ہو گیا ہے

ملک کی مشہور معروف قلمکاروں کے سلسلے وار ناول، ناولٹ اور افسانوں سے آراستہ ایک مکمل جریدہ گھر بھر کی دلچسپی صرف ایک ہی رسالے میں موجود جو آپ کی آسودگی کا باعث بنے گا اور وہ صرف ''حجاب'' آج ہی ہاکر سے کہہ کر اپنی کاپی بک کرالیں۔

اس کے علاوہ

خوب صورت اشعار منتخب غزلوں اور اقتباسات پر مبنی مستقل سلسلے

اور بہت کچھ آپ کی پسند اور آرا کے مطابق

Infoohijab@gmail.com
info@aanchal.com.pk

کسی بھی قسم کی شکایت کی صورت میں

021-35620771/2
0300-8264242

''تم اس معاملے میں بہت آگے نہیں چلے جانا۔'' بیوی نے سمجھایا۔

''نہیں' نہیں میں تو بددعا سے ڈرتا ہوں ہاں نوٹ کمانا ضرور چاہتا ہوں۔''

''ہائے کیا پتا وہ تم کب کماؤ گے۔'' اس نے ٹھنڈی سانس بھری اور اٹھ گئی۔

❀.....❀.....❀

دوسرے دن شام میں بازار میں ہنگامہ ہوا' عرفان جب ایک بندے کے ساتھ وہاں پہنچا تو بلال اپنے پتھارے پر موجود تھا۔ عرفان کے اصرار کے باوجود اس نے پتھارا بند کرنے سے انکار کردیا۔

''اس کا سامان اٹھا کر پھینک دے۔'' عرفان نے ساتھ آئے ہوئے آدمی کو حکم دیا۔

''تو آگے بڑھ پھر دیکھ کیا ہوتا ہے؟'' بلال پتھارے کے سامنے آ گیا۔

اور پھر وہ ہوا جو نہیں ہونا چاہیے تھا۔ بلال کا گھونسہ اس کے منہ پر پڑا' عرفان اس کی طرف لپکا ہی تھا کہ سکندر بھی وہاں پہنچ گیا اس کے ساتھ بھی ایک اور بندہ تھا۔ سکندر نے ہوائی فائر مارا تو پورے بازار میں بھگدڑ مچ گئی۔

سکندر نے بلال کی طرف اپنے ریوالور کی نال کی۔

''ٹھوک دوں تجھے۔''

بلال اپنی جگہ پر خاموشی سے کھڑا رہا' وہ دیکھ رہا تھا کہ کچھ دوری پر موبائل بھی آ کر رک چکی تھی اور اس میں موجود کانسٹیبل بھی باہر آ چکے تھے۔

''پھینکو اس کا سامان۔'' سکندر نے آواز لگائی۔

''نہیں پھینکو نہیں بلکہ ضبط کرلو۔ اس کا دماغ بھی اچھی طرح درست کرو' اور اگر گڑبڑ کرنے کی کوشش کرے تو ٹھکانے لگادو۔''

سکندر کے حکم پر وہی ہوا بلال کا سارا سامان ضبط کرلیا گیا اور اسے اتنا مارا گیا کہ وہ ادھ موا ہوگیا تھا پھر اسے اٹھا کر موبائل میں ڈالا گیا اور پولیس اپنے ساتھ لے گئی۔

❀.....❀.....❀

''اس کا کیا کیا ہے؟'' سکندر نے انچارج سے ملاقات پر پوچھا۔

''ابھی تو لاک اپ میں ہے۔'' انچارج نے بتایا۔

''اس کی مرمت کرنی ہے اور کسی کیس میں اندر کردے۔''

''تم نے اور تمہارے آدمیوں نے پہلے ہی بہت مارا ہے ساری رات درد سے تڑپتا رہا ہے۔ ہماری مار سے مرگیا تو کوئی مشکل کھڑی ہوسکتی ہے۔''

''تو پھر لمبا کیس بنا کر مہینوں کے لیے اندر کردے۔'' سکندر نے کہا۔

''یہ بھی ٹھیک نہیں ہوگا۔''

''کیا ٹھیک نہیں ہوگا۔'' وہ جھنجلایا۔

''مقدمہ چلے گا تو پھر بازار کا بھی ذکر آئے گا اور پھر اخبار ٹی وی والے کہانیاں چھاپیں گے کہ یہاں قبضہ مافیا کا راج ہے۔''

سکندر کی سمجھ میں آ گیا تھا۔ ''پھر کیا کرنا ہے۔''

''کچھ نہیں اسے کافی سبق مل گیا ہے۔'' انچارج نے کہا۔ ''باقی میں اسے سمجھادوں گا۔ وہ اپنی شکل بھی نہیں دکھائے گا۔''

''ایسا ہی ہونا چاہیے۔'' سکندر نے کہا۔

''ایسا ہی ہوگا' مجھے قانونی طریقے سے معاملہ ہینڈل کرنے دو۔''

سکندر سر ہلا کر رہ گیا۔

❀.....❀.....❀

ولی محمد نے لاک اپ کا دروازہ کھولا تو بلال نے اپنی سوجی ہوئی آنکھ سے اسے دیکھا۔ ''تم لوگ بھی اس کا ساتھ دے رہے ہو؟''

''ابھی عقل ٹھکانے آ گئی ہے تو ادھر سے رفو چکر ہوجا' پھر اپنی شکل نہ دکھانا۔'' ولی نے مخاطب کیا۔

''کیا مجھے چھوڑ رہے ہو۔''

''تیری جان بخش رہے ہیں۔'' ولی محمد نے کہا۔ ''ورنہ تو تیری لاش کسی ویران جگہ ملتی۔''

''ٹھیک ہے میں چلا جاتا ہوں۔'' وہ ولی محمد کے ساتھ لاک اپ سے باہر آیا۔

''کدھر جائے گا۔'' ولی محمد نے پوچھا۔

''جہاں آسانی سے کام مل جائے ادھر چلا جاؤں گا۔''
وہ بولا۔ ''آپ سے دور چلا جاؤں گا۔''
''یہ اچھا کرے گا۔'' ولی محمد نے کہا۔ ''بلکہ میرا مشورہ ہے کہ تو اس شہر ہی کو چھوڑ دے۔''
لیکن اس نے جواب نہیں دیا تھا۔ وہ دھیمی چال سے چلتا ہوا تھانے سے باہر نکلا اور سڑک پر ایک طرف چلتا چلا گیا۔

❀.....❀.....❀

تھانے دار منظور خان اور سکندر گجر اس مرتبہ باہر ایک ہوٹل میں مل رہے تھے۔ یہ ملاقات اسی زمین کے سلسلے میں تھی جو سکندر قبضہ کر کے فروخت کرنے والا تھا۔
''پھر کیا سوچا ہے۔'' سکندر گجر نے پوچھا۔
''سوچنا کیا ہے کام تو کرنا ہے لیکن ہمارا حصہ کم ہے اسے بڑھانا ہوگا۔''
''ایک کروڑ کم ہے۔'' وہ چونکا۔
''یہ زمین شہر کے بیچوں بیچ ہے۔'' منظور خان نے کہا۔ ''اور یہ علاقہ خاصا قیمتی ہے۔''
''لیکن دوسرے جھمیلے بھی ہیں۔ صرف میں اور تم اکیلے حصے دار تو نہیں ہیں۔''
''یہی تو میں کہہ رہا ہوں کہ میرے اوپر بھی افسران ہیں انہیں بھی ساتھ ملانا ہوگا۔''
سکندر سمجھ گیا تھا کہ منظور خان موقع سے فائدہ اٹھا رہا ہے۔ ''بول کتنے میں بات ختم کرتے ہو۔''
''دو کروڑ۔'' منظور خان انگلیوں سے وکٹری کا نشان بنایا۔
''یعنی دو کھوکھے۔''
''اگر منظور ہو تو منظور خان کو بھی قبول ہے۔'' وہ بولا۔ ''ورنہ تو تم جانتے ہو۔''
''ہم کاروبار کر رہے ہیں بلیک میل نہیں کر رہے ہیں۔'' وہ ناراضگی سے بولا۔ ''ٹھیک ہے لیکن اس کے بعد کوئی اور رکاوٹ نہیں ہونی چاہیے۔''
''نہیں ہوگی۔'' منظور خان نے کہا اور دونوں نے اس ڈیل پر ہاتھ ملایا۔

❀.....❀.....❀

بلال تھانے سے نکل کر اپنا حلیہ درست کرنے کے بعد سیدھا ایک ایسی عمارت تک پہنچا تھا جہاں وکیلوں کے دفاتر تھے وہ بورڈ پڑھتے ہوئے ایک وکیل کے دفتر میں داخل ہوگیا۔ یہ دفتر ایڈووکیٹ شہلا کا تھا۔ وکیل شہلا قریشی نے ایک برس قبل ہی پریکٹس شروع کی تھی۔
بلال نے اسے تمام صورت حال سے آگاہی دیتے ہوئے مشورہ طلب کیا۔ تو وکیل خاتون نے جواب دیا۔
''تمہارے ساتھ واقعی زیادتی ہوئی ہے تم کیس کرنے کا حق رکھتے ہو۔''
''تو پھر فوراً مقدمہ کر دیں۔''
''کیس تو میں داخل کر دوں گی لیکن میری فیس کا کیا کرو گے؟''
''ابھی میرے پاس یہ دس ہزار ہیں لیکن اس تھانے کے لوگوں کو بھی اس مقدمے میں شامل کرنا ہے۔'' اس نے نوٹ سامنے رکھے۔
''تم بے فکر ہو جاؤ ایسا مقدمہ قائم کروں گی کہ وہ سب بھاگتے پھریں گے۔'' وہ مسکرائی۔

❀.....❀.....❀

کیس کے متعلق نوٹس سکندر گجر، عرفان، تھانے دار منظور خان اور ولی محمد کو جاری ہوگئے تھے۔ سکندر گجر اگر غصے میں تھا تو منظور خان پریشان تھا۔ دوسری طرف ولی محمد بھی مشکل سے دوچار تھا لیکن یہ اطمینان تھا کہ وہ نہ تو مار پیٹ میں شامل تھا اور نہ ہی اس کا بازار کے معاملے سے کوئی اہم تعلق تھا۔
سکندر گجر اور منظور خان عدالت کے آگے بے بس تھے لڑائی جھگڑے مار پیٹ کا تعلق ہوتا تو وہ لوگ استاد تھے لیکن عدالت میں تو کسی کی نہیں چلتی تھی۔ سکندر اور منظور خان دونوں نے بلال کو ڈھونڈنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ بالکل گم تھا کہیں سراغ نہیں مل رہا تھا۔

❀.....❀.....❀

''میں اسے قتل کر دوں گا۔'' سکندر گجر اس وقت آپے سے باہر ہو رہا تھا۔
''مجھے معلوم ہوتا تو میں تھانے میں ان کاؤنٹر کر دیتا۔'' منظور خان نے کہا۔

ولی محمد جو اس وقت وہاں موجود تھا۔ ''اب لکیر پیٹنے سے کیا ہوگا' کوئی اچھا سا راستہ نکالیں۔''

''وہ مارا تو جائے گا۔'' سکندر گجر بدمعاشوں والی ہی بات کرر ہا تھا۔

''وہ بعد کی بات ہے ابھی اس کیس کو ختم کرنا ہے ورنہ زمین کا معاملہ بھی لٹک جائے گا۔'' منظور نے کہا۔

''وہ اتنا تگڑا نہیں ہے اگر اسے کمزور کرنا ہے تو اس کے وکیل کو خرید لیتے ہیں۔'' ولی محمد نے تجویز دی۔

''کیا بکواس کرر ہا ہے۔'' سکندر گجر نے کہا۔

''نہیں ...... نہیں یہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔'' منظور خان جلدی سے بولا۔ ''وکیل لوگ خود فیسوں کے بھوکے ہوتے ہیں۔ زیادہ معاوضہ دے کر اسے اپنی طرف کر لیتے ہیں۔''

''وہ رہے اسی طرف اور اسے بے وقوف بناتا رہے اور ...س قائم ہی نہ ہو۔'' ولی محمد نے رائے دی۔

''آج تیرا دماغ بہت چل رہا ہے۔'' منظور خان نے ...ینب لی۔

''مجھے کیا کرنا ہے۔'' سکندر گجر نے ان دونوں کو حیرت ...یکھا۔

''میں سمجھاتا ہوں بس تمہیں وہی کرنا ہے۔'' منظور ...ان پلان سمجھانے لگا۔

''مجھے اکیلے جانا ہے۔'' سکندر گجر نے کہا۔

''یار تجھے غصہ جلدی آتا ہے تیرے ساتھی بھی تیری ہی ...رح ہیں۔ تجھے تنہا جانا ہے۔'' منظور خان نے کہا۔

''لیکن میں وکیل سے اکیلے بات نہیں کرسکوں گا۔''

''پھر میں چلا جاتا ہوں۔'' ولی محمد بولا۔

''ہاں یہ ٹھیک رہے گا تو نے اس کے غصے کو سنبھالنا ہے ... وکیل کو ساتھ ملانا' کوئی مشکل کام نہیں ہے صرف رقم ...نی ہوگی۔''

❁......❁......❁

...ھانے دار منظور خان اس وقت سکتے کی حالت میں رہ ...ب اسے یہ خبر ملی کہ وکیل کے دفتر میں سکندر گجر کا قتل ... اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ آخر یہ ہوا کیسے...... ...لی جگہ اس کے تھانے کی حدود نہیں آتی تھی اس ...وہ مداخلت نہیں کرسکتا تھا لیکن جب ولی محمد سے ملاقات ہوئی تو اسے تفصیلات معلوم ہوئیں۔

''جناب عالی سب چوپٹ ہوگیا۔'' ولی محمد حواس باختہ انداز میں بات کرر ہا تھا۔

''آخر ہوا کیا؟'' منظور کی زبان اس کی بے چینی کو ظاہر کررہی تھی۔ ''جلدی سے بک دے کیوں امتحان لے رہا ہے۔''

''یہ تو آپ جانتے ہو کہ ہم دونوں اس وکیل کے دفتر میں گئے تھے۔'' وہ ٹھہر ٹھہر کر سمجھانے کے انداز میں بتانے لگا۔

''ہاں جانتا ہوں۔''

''جب ہم وکیل کے دفتر پہنچے تو وہ وہاں اکیلی تھی اور جناب عالی کافی جوان اور خوب صورت تھی' لگتا تھا کہ نئی نئی وکالت شروع کی ہے۔''

''مجھے کہانی مت سنا۔''

''سرجی سکندر نے معاملہ شروع ہی سے گڑبڑ کردیا تھا۔'' وہ بولا۔ ''وہی بدمعاشی کا انداز وہی دھمکی دینا' وہ اس کے دفتر کو بھی اپنا بازار سمجھ رہا تھا۔''

''تو کیا جھگڑا فوراً ہی شروع ہوگیا تھا۔'' انچارج نے سوال کیا۔

''جب وکیل کو دھمکی دو گے تو وہ کیا نرمی سے بات کرے گی۔'' ولی محمد نے بتایا۔ 'جب وکیل نے لہجے میں سختی برتی تو وہ گالیوں پر اتر آیا' دونوں کے درمیان تلخ کلامی بہت بڑھ گئی۔''

''تم نے مداخلت کرکے معاملہ کو کیوں نہیں سنبھالا۔''

''جناب عالی میں نے کوشش کی تھی لیکن سکندر کہاں سنتا ہے۔'' ولی محمد بولا۔ ''بلکہ اس نے تو طیش میں آکر اپنا پستول نکال لیا۔''

''اس کو تو میں نے سمجھایا تھا کہ ریوالور لے کر نہیں جائے۔''

''اس نے سیدھا اس وکیل خاتون پر پستول تانا اور اسے دھمکی دے ڈالی کہ تو مقدمہ واپس لیتی ہے یا پھر تجھے ٹھوک ڈالوں۔''

''اگر یہ صورت حال تھی تو سکندر کا قتل کیسے ہوا؟'' منظور خان سوچ میں پڑ گیا۔

''میں تو اس تمام صورت حال سے گھبرا گیا تھا اور وہاں سے فرار کا راستہ ڈھونڈنے لگا' مجھے تو میری ملازمت کی فکر لگ گئی تھی۔''

''اصل بات پر آ سکندر کا قتل کیسے ہوگیا؟'' وہ جھنجلا کر بولا۔

''وہ جو وہاں پہنچ گیا تھا۔''

''کون پہنچ گیا تھا۔''

''وہی شخص بلال جس کے کیس کی وجہ سے سکندر اس ایل سے ملنے پہنچا تھا۔'' ولی محمد نے بتایا۔

''تو کیا اس نے سکندر کو قتل کیا ہے۔''

''جی جناب میرے سامنے اس نے سکندر کو قتل کیا ہے۔''

''کیسے..... کیا اس کے پاس بھی اسلحہ تھا۔''

''نہیں ..... نہیں .....'' ولی محمد بولا۔ ''دراصل وہ اچانک وہاں آ گیا تھا' پہلے تو وہ بھی حیرت زدہ رہ گیا اور سکندر بھی لیکن پھر سکندر نے اسے مارنے کا ارادہ کیا اور اس کی طرف گھوما' لیکن اس وکیل عورت نے سکندر پر حملہ کر دیا اور سکندر گر پڑا' پستول اس کے ہاتھ سے نکل گیا اور اس بلال کے قبضے میں آ گیا۔''

اس خاتون وکیل نے سکندر کو جونک کی طرح اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا تھا..... سکندر اس سے اپنے آپ کو آزاد کرانے میں بے دھیان ہوگیا اور بلال نے دو فائر مارے اور سکندر گجر کی کہانی ختم کر دی۔''

کمرے میں اب کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی ولی محمد سے تفصیلات جان کر منظور خان کافی حیران پریشان تھا کیونکہ صورت حال یکسر بدل چکی تھی کل تک کروڑوں کی ڈیل چل رہی تھی آج وہ پل ہی گر گیا تھا۔

''سر جی اب اس سے بھی اہم بات۔'' ولی محمد نے اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔ ''اس عورت وکیل نے مجھے دھمکی دی ہے کہ اگر سچی گواہی سے ہٹا تو وہ میرے خلاف بھی مقدمہ دائر کر دے گی۔''

''اب کیا کرنا ہے؟''

''سر جی سکندر تو دنیا سے چلا گیا اب جو زندہ ہیں اس کا سوچیں۔''

''کیا مطلب ہے؟''

وہ اپنے انچارج کے نزدیک آ گیا۔ ''سکندر گجر اس لیے بے خوف اور بہادر تھا کہ پولیس کا ہاتھ اس پر تھا۔ پولیس سے بڑا بدمعاش کوئی نہیں ہوسکتا' ہر غنڈ ابدمعاش اپنا راج چلاتا ہے تو پولیس کے تعاون سے کیوں میں نے غلط تو نہیں کہا۔''

''بات تیری ٹھیک ہے لیکن مجھے سمجھانا کیا چاہ رہا ہے' یہ بات واضح نہیں ہے۔'' وہ اپنے ماتحت کا چہرہ بغور دیکھ رہا تھا۔

''سیدھی بات ہے' سکندر گجر کی جگہ پر کسی کو لائیں تاکہ بازار اور دوسرے کام یونہی چلتے رہیں۔'' وہ بولا۔

''کس کو لائیں؟'' انچارج سنجیدہ تھا۔

''پورا بازار اور ارد گرد کے لوگ سکندر گجر سے ڈرتے تھے اور جو سکندر گجر کو قتل کر دے اس سے کیا وہ نہیں خوف زدہ ہوں گے۔''

''میں تیرا مطلب سمجھ گیا۔'' انچارج مسکرایا۔ ''جس نے سکندر گجر کو قتل کیا ہے اسی کو سکندر گجر کی جگہ پر کھڑا کیا جائے۔''

''ہم بلال کو دوسرا سکندر گجر بنا دیتے ہیں۔'' ولی محمد نے کہا۔ ''سکندر گجر کو برسوں پہلے کسی پولیس والے ہی نے سکندر گجر بنایا ہوگا۔''

''کیا یہ کام ہوجائے گا۔'' انچارج نے کہا۔ ''میرا مطلب ہے کہ پہلے تو وہ کیس سے ضمانت پر آئے گا اور پھر وہ راضی ہوگا۔''

''کیس سے تو وہ آسانی سے باہر آ جائے گا' اس لیے کہ سکندر نے خاتون وکیل پر حملہ کیا اور وہاں موجود بلال اور وکیل نے اپنے بچاؤ میں گولی چلائی..... میری گواہی اہم ہوگی اور اس کی ضمانت ہوجائے گی۔''

''پھر تم اس سارے معاملے کو ہینڈل کرلو۔'' انچارج نے کہا۔

''لیکن سر جی سارا معاملہ اگر سیٹ ہوجاتا ہے تو کیا میں صرف دو ہزار ہفتے کا آدمی رہوں گا۔''

انچارج نے پہلے اسے گھور کر دیکھا پھر مسکرا کر بولا ''نہیں تیری قیمت بھی بڑھے گی اور تجھے اہمیت بھی ملے

گی۔''

ولی محمد نے بھی مسکرا کر سر ہلا دیا تھا۔

❀ ..... ❀ ..... ❀

ولی محمد نے سب سے پہلے عرفان اور سکندر گجر کے ملازم لوگوں سے ملاقات کر کے بازار کا سسٹم یونہی چلاتے رہنے کی ہدایت کی تاکہ بازار پر کنٹرول بنا رہے اس کے بعد اسے تھانے جا کر بلال سے ملنا تھا..... ملاقات بھی ہوئی اس نے بلال کو سکندر گجر کی جگہ لینے کی پیشکش بھی کر دی لیکن بلال نے یہ کہہ کر اس کی درخواست مسترد کی کہ پہلے وہ باہر آ جائے پھر اس موضوع پر بات کرے گا اور سوچ سمجھ کر فیصلہ کرے گا کہ اسے یہ کام کرنا چاہیے یا نہیں' چنانچہ اب ولی محمد کو بلال کی ضمانت کا انتظار تھا' اس میں بھی دیر نہیں لگی تھی اس لیے کہ سکندر کی طرف سے کوئی پیروی نہیں تھی اس لیے بلال کی وکیل شہلا نے اس کی ضمانت کروالی تھی۔ ضمانت کے موقع پر ولی محمد عدالت میں موجود تھا ویسے ولی محمد نے بھی بلال کے حق میں گواہی دی تھی اور سکندر گجر کو ملزم ٹھہرایا تھا' اس نے اپنی وکیل کے دفتر آمد کو بھی ایک جھوٹے بہانے سے جوڑا تھا جس کی تصدیق خاتون وکیل نے کی تھی۔

❀ ..... ❀ ..... ❀

خاتون وکیل کے دفتر میں اس وقت چار افراد موجود تھے چاروں آمنے سامنے بیٹھے ایک دوسرے کا جائزہ لے رہے تھے..... خاتون وکیل کے ساتھ بلال بیٹھا تھا اور انچارج منظور خان کے ہمراہ ولی محمد تھا' ان کے درمیان بازار والے معاملے اور سکندر گجر کی جگہ بلال کو کھڑا کرنا موضوع بحث تھا۔ ولی محمد نے انچارج کی طرف سے آفر کر دی تھی۔

''یہ وہ جگہ سنبھالے گا۔'' خاتون وکیل نے فیصلہ سنایا۔

''بلال نے مجھے اختیار دیا ہے کہ میں جو فیصلہ کروں لہٰذا' یہ سکندر کی جگہ سنبھالے گا لیکن اس میں میرا کیا حصہ ہوگا؟''

''جو آپ طے کریں۔'' ولی محمد بول پڑا۔

''میں بلال کی وکیل رہوں گی اور تمام قانونی معاملات میں دیکھوں گی۔'' اس کی آواز سب کے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔ ''کورٹ وغیرہ کا مسئلہ بھی میں سنبھالوں گی..... لیکن بازار کی آمدنی کا حساب ہوگا اور میں برابر کی حصے دار ہوں گی۔''

''ٹھیک ہے یہ تم بلال سے طے کر لینا۔'' انچارج بولا۔ ''تھانے کو تو اس کا حصہ ہر ہفتے ملنا چاہیے۔''

''مل جائے گا۔'' بلال پہلی بار شامل گفتگو ہوا۔

''بس تو پھر سارے کام خوش اسلوبی سے طے پا گئے ہیں۔'' ولی محمد نے خوشی کا اظہار کیا۔

انچارج نے موقع ضائع نہیں کیا اور اس زمین کی بابت بھی بتا دیا جو سکندر اور اس کے درمیان قبضے کی صورت میں آئی ہوئی تھی۔

''اسے بھی وکیل اچھی طرح سنبھالتا ہے۔'' خاتون وکیل مسکرائی۔

اس کے بعد وہ لوگ مزید باتوں میں مصروف رہے۔

❀ ..... ❀ ..... ❀

سکندر گجر کے قتل کو پورا ایک برس مکمل ہو چکا تھا۔ اب تو سکندر کا تذکرہ بھی نہیں ہوتا تھا اب سب کچھ بلال تھا۔ وہی لوگ جو سکندر کے ساتھ کام کرتے تھے اب بلال کے ماتحت تھے اس جگہ جہاں کبھی سکندر گجر کے نام سے لوگ خوف کھاتے تھے اب وہاں بلال سے ڈرتے ہیں۔ بازار سے یونہی بھتا وصولی کا سلسلہ جاری ہے ہاں اگر کچھ بدلا ہے تو ولی محمد کی زندگی بدل چکی ہے۔ کیونکہ انچارج نے تمام معاملات میں اسے آگے کر دیا ہے اب بلال کے ساتھ وہی بازار کو سنبھالتا ہے۔

چھ ماہ کے بعد ہی ولی محمد سرکاری کوارٹر سے نکل کر ایک اچھے علاقے میں اپنی فیملی کو منتقل کر چکا تھا۔ اب اس کے بچے اعلیٰ درجے کے اسکول میں پڑھ رہے تھے۔ اس کی بیوی نے کار چلانا سیکھ لی تھی اور اب وہ شکایت بھی نہیں کرتی تھی کہ ولی محمد پولیس والا ہو کر کم آمدنی میں کیوں گزارا کرتا ہے۔

انہوں نے زمین پر بھی قبضہ کر کے ایک بلڈر کو ساتھ ملا کر وہاں تعمیرات شروع کر دی تھیں۔ زمین کو قانونی شکل خاتون وکیل دے رہی تھی اس سے ان سب کو کروڑوں کی آمدنی ہونے والی تھی۔

انچارج منظور تو اب صرف نام ہی کا انچارج رہ گیا تھا

کا بنگلہ پورے تھانے کو اب ولی محمد ہی چلا رہا تھا۔ ولی محمد کی آمدنی بڑھنے سے طاقت بھی بڑھ رہی تھی اس نے کمائی کے نئے راستے تلاش کر رکھے تھے جلد ہی علاقے میں وائن شاپ کھلنے والی تھی' اس وائن شاپ کی آمدنی کا حصہ براہ راست ولی محمد اوپر ایک اعلیٰ افسر کو پہنچا رہا تھا' یوں اس نے پولیس میں ترقی کے سفر کا آغاز بھی کر دیا تھا۔ اس لیے کہ وہ اب کانسٹیبل نہیں بلکہ حوالدار ہو چکا تھا۔

ولی محمد کی نظریں اب انچارج کی کرسی پر لگی ہوئی تھیں۔ یہ بات منظور خان بھی محسوس کر چکا تھا لیکن وہ بے بس تھا اس لیے کہ آمدنی پر پورا کنٹرول بلال خاتون وکیل اور ولی محمد کے قبضے میں آ چکا تھا۔ اسے تو صرف اس کا حصہ دیا جاتا تھا۔

❀.....❀.....❀

ایک سال اور گزر گیا سکندر گجر کی دوسری برسی آ کر گزر گئی لیکن کسی کو خیال تک نہیں آیا' ہاں کچھ اور تبدیلیاں ضرور آ گئی تھیں۔ ولی محمد اب تھانے کا انچارج لگ چکا تھا۔ اس نے ایک کروڑ میں تھانے کی انچارج شپ حاصل کر لی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ لگائی ہوئی رقم وہ چند ماہ میں وصول کر لے گا۔

ولی محمد نے نیا بنگلہ خریدا تو اس میں دعوت کا اہتمام کیا گیا۔ اس کے دوستوں اور شہر کے امیر کاروباری لوگوں کے علاوہ زمین کے بیوپاری اور دوسرے بااثر لوگوں کی تواضع کی جا رہی تھی۔ ولی محمد اب خود قبضے کی زمین پر پلازہ تعمیر کرنا چاہتا تھا۔

تقریب کے اختتام پر ایک کمرے میں صرف تین لوگ رہ گئے تھے۔ ولی محمد' بلال اور خاتون وکیل شہلا..... ان کے درمیان اہم گفتگو جاری تھی۔

''زمین پر قبضہ ہو چکا ہے۔'' بلال نے بتایا۔ ''میں نے وہاں اپنے مسلح لوگ بٹھا دیے ہیں۔''

''میں بھی پولیس صبح ہی کھڑی کروا دوں گا۔'' ولی محمد بولا۔

''میں سرکاری اداروں سے کاغذات بنوا کر اسے غیر قانونی سے قانونی کروا دوں گی۔'' خاتون وکیل نے بتایا۔

''اس پلازہ کا ہم نام کیا رکھیں گے۔'' بلال نے پوچھا۔

''ماں کے نام سے کام کا آغاز کرتے ہیں۔'' ولی محمد نے کہا۔ ''ہم صابرہ بیگم کے نام سے اس عمارت کو بنائیں گے۔''

''بھائی ابا کے نام سے بھی کام کرنا ہے۔'' خاتون وکیل نے کہا۔ ''بلکہ کمپنی جو کنسٹرکشن کرے گی وہ اپنے ابا کے نام سے رجسٹرڈ کروا لیتے ہیں۔''

''بالکل ٹھیک ہے سلطان محمد کے نام سے ہماری تعمیراتی کمپنی ہوگی۔'' بلال بولا۔

''اب تجھے بھی شادی کر لینی چاہیے۔'' ولی محمد نے بلال کو محبت سے دیکھا۔

''نہیں بھائی پہلے بہن کی شادی کرواؤ' پھر میں شادی کروں گا۔'' بلال نے شہلا کی طرف اشارہ کیا۔

خاتون وکیل ایک لمحے کے لیے شرمائی پھر بولی۔

''بھائی تم نے کیا پلان بنایا کسی کو پتہ نہیں چلا کہ بلال تمہارا بھائی ہے۔''

''اور ہم تینوں بھائی بہن ہیں۔'' بلال ہنسا۔

''یہ راز بھی دفن سمجھو کہ سکندر کو گولی میں نے ماری تھی۔'' ولی محمد پہلی بار مسکرایا تھا۔

''یہ تو پہلے ہی سے طے تھا کہ سکندر کو ہٹا کر ایک نیا بدمعاش لانا ہے۔'' شہلا نے کہا۔

''پولیس سے بڑا کوئی بدمعاش نہیں ہوتا ہے۔'' ولی محمد نے کہا۔ ''ہم خود بدمعاش بناتے ہیں لیکن ہمیں بدمعاش سے آگے جانا ہے۔ اس شہر کے امیر ترین لوگ بننا ہے' اس کے لیے ہم تینوں کا اتحاد ضروری ہے۔''

''بھائی ہم تم سے کبھی الگ نہیں ہوں گے۔'' دونوں نے جواب دیا اور اپنے بڑے بھائی کے گلے سے جا لگے۔

❖

روٹی کا ٹکڑا

صداقت حسین ساجد

PakistanPoint.com
Waqar Azeem

وزیرستان کے ایک علاقے کی کہانی جو خشک اور بنجر تھا، اس علاقے میں تیزی سے آبادکاری ہو رہی تھی۔ لوگ شہر چھوڑ رہے تھے۔ ہر طرف کیمپ لگے ہوئے تھے، لیکن زیادہ تر لوگ کھلے آسمان تلے بے یارو مددگار پڑے تھے۔ بھوک اور بیماری نے مستقبل کے حوالے سے انھیں بے حس بنا دیا تھا۔

روٹی کے ایک ٹکڑے کیلئے چھوٹے سا بچہ زندگی کی بازی ہار گیا

گولہ باری کا سلسلہ صبح سے جاری تھا اور دوپہر تک جگہ جگہ سے درختوں اور مکانوں سے شعلے اور دھواں اٹھتا رہا تھا۔ زیادہ تر مکان ملبے اور راکھ کے ڈھیر میں بدل چکے تھے۔ یہ وزیرستان کا وہ علاقہ تھا، جو خشک اور بنجر زمین والا تھا۔ شہر سے باہر اس علاقے میں تیزی سے آبادکاری ہو رہی تھی۔ لوگ شہر چھوڑ رہے تھے۔ ہر طرف کیمپ لگے ہوئے تھے، لیکن زیادہ تر لوگ کھلے آسمان تلے بے یارو مددگار پڑے تھے۔ بھوک اور بیماری نے مستقبل کے حوالے سے انھیں بے حس بنا دیا تھا۔ کہنے کو تو حکومت کی طرف سے خوراک اور طبی امداد مہیا کی جا رہی تھی۔ مگر تعداد کے مقابلے میں نہ ہونے کے برابر تھی۔

کل کا پورا دن گزر گیا تھا اور اب سورج کی تپش میں تیزی سے اضافہ ہو رہا تھا۔ اب تک خوراک نہیں پہنچی تھی، جو تھوڑی بہت خشک خوراک موجود تھی، وہ تقسیم کر دی گئی تھی۔ میں پاکستانی فوج کے اس دستے میں شامل تھا، جس کا کام امن و امان بحال کرنا تھا۔ میری ڈیوٹی خوراک تقسیم کرنے پر تھی۔ آج مجھے دوسرا ہفتہ ہو رہا تھا۔ مجھے سخت بے زاری ہو رہی تھی۔ لوگ مجھ سے بار بار خوراک کا پوچھتے اور میں انھیں ایک ہی جواب دے دے کر تنگ آ گیا تھا۔

اسی وقت جب میں سامنے زمین پر ایک چیونٹی کو گوشت کا سڑا ٹکڑا لے جانے کی کوشش میں مصروف دیکھ رہا تھا کہ میرے آگے دو برہنہ پاؤں ٹھہر گئے۔ مجھے بغیر اوپر دیکھے پتا چل گیا کہ یہ ننگے پاؤں کس کے ہیں۔

''ولی خان!'' میرا لہجہ سخت تھا۔

''فوجی لالہ! وہ..... وہ میں.....''

''میں نے تمھیں کتنی بار کہا ہے کہ مجھے لالہ نہ کہا کرو۔'' میرا لہجہ مزید سخت ہو گیا۔ مجھے ایک پٹھانوں کا واقعہ یاد آ گیا۔ اس واقعے میں ایک فوجی کو سب فوجی لالہ کہتے تھے، مگر وہ بہت ظالم انسان تھا۔

''مگر میں تمھیں فوجی لالہ ہی کہوں گا۔'' اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

''وہ کیوں؟'' میرا لہجہ سرد ہو گیا۔

''تمھاری شخصیت ہی ایسی ہے۔ مجھے یہی تاثر ملتا ہے کہ تمھارا نام فوجی لالہ ہونا چاہیے۔ شاید مجھ سے اپنی بات کی وضاحت اچھی طرح سے نہیں ہو رہی۔''

''کس لیے آئے ہو؟'' تنگ آ کر میں نے موضوع بدلا۔ حالاں کہ مجھے اس کے آنے کا مقصد اچھی طرح معلوم تھا۔ وہ بارہ برس کا سرخ وسفید لڑکا تھا۔ اس کے جسم پر لباس نام کی صرف شلوار تھی۔ اس کے بال سخت اور کھردرے تھے۔ اس کی حالت سے لگتا ہی نہیں تھا کہ وہ بارہ تیرہ برس کا نو عمر لڑکا ہے۔ حالات کی سختیوں نے اسے وقت سے پہلے ہی سخت بنا دیا تھا۔ بھوک اور غربت کے باوجود مجھے کبھی اس کی موٹی موٹی آنکھوں میں التجا نہیں دکھائی دی۔ حالاں کہ وہ بچہ تھا اور اسے سب سے بڑی فکر کھانے کی ہونا چاہیے تھی۔ مگر ایسا لگتا تھا جیسے اسے کھیلتے کھیلتے کھانا یاد آ جاتا تھا اور وہ یہاں چلا آتا۔ جواب میں انکار سن کر وہ اپنی بھوک کو بھول کر دوبارہ کھیلنے میں مصروف ہو جاتا۔

''مجھے بہت بھوک لگی ہے۔'' اس نے جیسے اعلان کیا۔

''مگر کھانا ابھی تک نہیں آیا۔'' میں نے وہی رٹا رٹایا جواب دہرایا، جسے بار بار دہرا کر میں اس حد تک تنگ آ چکا تھا کہ اسے دہراتے ہوئے میرے پیٹ میں بل پڑ جاتے تھے۔

''مگر مجھے بہت بھوک لگی ہے، میں نے کل سے کچھ نہیں کھایا۔''

''جوں ہی کھانا آئے گا، میں سب سے پہلے تمھیں ہی بتاؤں گا۔ شاباش! اب جا کر کھیلو۔''

''میرا کھیل میں جی نہیں لگتا۔'' اس نے جواب دیا۔

میں کچھ دیر اس کا بھوک زدہ چہرہ تکتا رہا۔ پھر میں

نے سر کھجا کر کہا۔

''اچھا! جاؤ اور کچھ دیر سو جاؤ۔ مجھے لگتا ہے کہ تم پچھلی رات نہیں سوئے۔''

''میری امی کہتی تھیں کہ بھوکا سونے سے آدمی بیمار ہو جاتا ہے۔'' اس نے ایک اور دلیل دی۔

میں نے ایک گہرا سانس لیا اور بے چینی سے ادھر ادھر ٹہلنے لگا۔ میرے پاس اسے اطمینان دلانے کے لیے کوئی کارگر دلیل نہیں تھی۔ وہ مضبوطی سے اپنی جگہ پر جما کھڑا تھا۔ مجھے یقین ہو چکا تھا کہ اس بار اسے جھوٹا دلاسا دے کر ٹالا نہیں جا سکتا تھا، لیکن پھر بھی اپنی طرف سے میں نے کوشش کرنا چاہی۔ میں نے اپنے مضبوط ہاتھ اس کے شانوں پر رکھے اور یقین دلانے والے لہجے میں کہا۔

''دیکھو! اس وقت کچھ بھی نہیں۔ سب کچھ ختم ہو چکا ہے۔ اگر میرے اپنے حصے کا بھی کھانا موجود ہوتا، تو وہ میں تمھیں دے دیتا۔ آخر تمھیں یقین کیوں نہیں آتا!!''

''مگر میں تمھارے حصے کا کھانا نہیں کھاتا۔'' اس نے میرے ہاتھ جھٹکے۔ ''مجھے اپنے حصے کا کھانا چاہیے۔ تمھیں میرے لیے بھوکا رہنے کا سوچنا بھی نہیں چاہیے۔''

میں نے اس کی بات پر طنزیہ قہقہہ لگانا چاہا۔ مگر یہ جان کر میں بہت حیران ہوا کہ میری آنکھوں میں دھندلاپن اور گلے میں آنسوؤں کی نمکینی سی پھیل گئی ہے۔ اچانک مجھے اس معصوم بچے پر ترس آنے لگا اور خود سے گھن سی آنے لگی۔ آج صبح ناشتے میں، میں نے جی بھر نے کے بعد بھی بہت کچھ کھا لیا تھا، جس کی وجہ سے مجھے ہضم کرنے کے لیے بڑی دیر تک چہل قدمی کرنا پڑی تھی۔

''اگر تم صبح آ جاتے، تو.....'' میں نے پہلے کی طرح مضبوط لہجے میں کہنا چاہا۔ مگر میرا لہجہ اور الفاظ ایک دوسرے سے بالکل میل نہیں کھاتے تھے۔

''میں رات کو دیر سے سویا تھا، اس لیے صبح دیر تک سویا رہا۔'' اس نے میری بات کاٹ کر کہا۔

''کیا تمھیں بہت زیادہ بھوک لگی ہے؟''

یہ سن کر اس کی آنکھیں چمکیں۔

''ہاں، ہاں! میں نے کل سے کچھ نہیں کھایا۔''

اس کے سینے کی ہڈیاں آسانی سے گنی جا سکتی تھیں۔ پیٹ بھوک کی وجہ سے کمر سے لگ گیا تھا۔ میں سوچنے لگا، مجھے اس کے لیے کچھ کرنا چاہیے۔ مگر میں کیا کرتا، کیوں کہ خوراک ابھی تک نہیں پہنچی تھی۔

''کچھ بھی مل جائے۔'' اس نے بات جاری رکھی۔

''کچھ بھی..... بسکٹ کا ایک آدھ ٹکڑا..... ایک کھجور کا دانہ..... کوئی بھی چیز.....''

جانے کیوں مجھے معدے میں اینٹھن سی اٹھتی ہوئی محسوس ہوئی۔ میں نے اس کی طرف پیٹھ کی اور جھک کر تسمے باندھنے کے بہانے آنسو صاف کرنے لگا۔

''میں ڈھونڈنے کی کوشش کرتا ہوں۔'' میں نے یکا یک ایک فیصلہ کرتے ہوئے کہا۔

''تمھیں یقین ہے کہ میرے لیے کچھ نہ کچھ مل جائے گا!'' اس کی آنکھیں امید کی کرن سے جگمگانے لگیں۔

مجھے پتا تھا کہ اس کی امید بہت کم تھی، مگر میں اسے نفی میں جواب دے کر اس کے ننھے سے دل کو توڑنا نہیں چاہتا تھا..... یا..... پھر شاید مجھ میں انکار کرنے کی ہمت نہ تھی۔

''ہاں! مجھے یقین ہے۔'' میں نے اس کے روئی کی طرح نرم نرم رخساروں کو تھپتھپایا۔ ''تم دعا کرو۔''

اس نے اثبات میں سر ہلایا جیسے کھانا حاصل کرنے میں اس کے حصے کی کوشش صرف دعا تک ہے اور وہ اپنے حصے کا کام اچھی طرح سے پورا کرے گا۔

''آؤ..... چلیں! ہم اپنی تلاش کا آغاز راشن ڈپو سے کرتے ہیں۔''

ہم دونوں اکٹھے ہی راشن ڈپو کی طرف چل دیے۔

میری انگلی اس کے ننھے سے نرم ہاتھ میں تھی۔ اس کے ساتھ چلتے ہوئے مجھے بڑا سکون محسوس ہو رہا تھا۔

''تم بہت اچھے ہو۔'' وہ بہت باتونی تھا۔ وہ چپ رہتا ہی نہیں تھا۔ ''تم سے پہلے جو فوجی لالہ تھا، وہ بہت مارتا تھا۔ مجھے اس کے پاس جاتے ہوئے بڑا خوف آتا تھا۔ پتا ہے..... اس کے غصے کی سب سے بڑی نشانی کیا تھی؟''

''کیا تھی؟''

''وہ اپنی ہی ٹانگ پر بڑے زور زور سے بید مارتا تھا۔ جانے کیوں؟ کیا اسے درد نہیں ہوتا تھا؟''

''کیا پتا..... نہ ہوتا ہو۔''

''میرا خیال ہے کہ ہوتا ہوگا۔ میں نے ایک دن اپنی چھڑی اپنی ٹانگ پر ماری تھی، تو مجھے بہت درد ہوا تھا..... حالاں کہ میں نے اتنے زور سے بھی نہیں ماری تھی۔'' پھر وہ پرخیال انداز میں خود ہی نتیجہ نکالنے لگا۔ ''مگر یوں بھی تو ممکن ہے کہ میری ٹانگ ننگی تھی اور اس کی ٹانگ پر موٹے کپڑے کی وردی تھی، جس طرح کی تمھاری ہے۔''

وہ میری وردی کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔

''لو! راشن ڈپو آ گیا۔'' میں نے اسے بتایا۔

''تم دیکھ آؤ..... میں ادھر ہی دروازے پر کھڑا رہوں گا۔''

میں اندر داخل ہو گیا۔ وہاں خالی ڈبوں کا ڈھیر موجود تھا۔ میں بڑی دیر تک کونا کونا کھنگالتا رہا، مگر مجھے کچھ نہ ملا۔ میں جب باہر نکلا، تو میرا سر جھکا ہوا تھا۔

''ولی خان! مجھے افسوس ہے کہ.....''

''کوئی بات نہیں فوجی لالہ! مگر ہمیں اپنی تلاش جاری رکھنی چاہیے۔'' اس نے میری بات کاٹ دی۔

ہم میس کی طرف چل پڑے۔ یہاں کھانا ملنے کی امید نہ ہونے کے برابر تھی۔ ہمارا کھانا وقت پر آ جاتا تھا اور جو بچ جاتا، اسے بھوکے لوگوں میں بانٹ دیا جاتا۔ مگر میں اس مبہم امید پر جا رہا تھا کہ شاید کچھ مل جائے۔ ایک آدھ روٹی کا ٹکڑا..... ایک بسکٹ..... کوئی بھی چیز۔

''تم کہاں سے آئے ہو؟'' چند لمحوں بعد اس نے چلتے چلتے خاموشی کو توڑا۔

''پنجاب سے۔''

''کیا وہاں جنگ ہوتی ہے..... کیا وہاں بھی لوگ بھوکے سوتے ہیں..... کیا وہاں بھی بچوں کے امی ابو بارود میں جل کر راکھ ہو جاتے ہیں۔''

یہ سن کر میرے گلے میں کانٹے سے چبھنے لگے۔

''تمھارے امی ابو کہاں ہیں؟''

''گزشتہ مہینے جو بمباری ہوئی تھی نا!..... اس میں سے ایک بم ہمارے گھر پر گرا تھا۔ امی ابو دونوں ہی مر گئے۔ ان کے جسموں کے ٹکڑے ٹکڑے اڑ گئے تھے۔'' وہ سوچ میں پڑ گیا تھا۔ ''مگر مجھے یہ سب کچھ بہت عجیب سا لگتا ہے۔ ہر وقت مجھے دکھائی دینے والے امی ابو اب مجھے کبھی بھی دکھائی نہیں دیں گے۔ مجھے یہ سب کچھ مصنوعی سا لگتا ہے اور کبھی کبھی تکلیف دہ بھی..... کبھی کبھی مجھے بڑی شدت سے ان کی طلب ہوتی ہے..... ان کی گود کی..... ان کے پیار کی۔ میرے پاس بہت سی باتیں جمع ہو جاتی ہیں، مگر اب میں انھیں پہلے کی طرح سنا نہیں سکتا، تو میرا سینہ پھٹنے لگتا ہے۔ پھر میں یہ ساری باتیں پومی سے کر لیتا تھا۔''

وہ خاموش ہو گیا۔ ہمارے درمیان خاموشی کا ایک لمبا وقفہ در آیا۔ صرف ہمارے قدموں کی چاپ ہمیں سنائی دے رہی تھی۔ میں اس سے پوچھنا چاہتا تھا کہ یہ پومی کون ہے، مگر مجھے خوف تھا کہ اگر میں بولا، تو وہ رونے لگے گا۔

اسی دوران میں ہم میس پہنچ گئے۔ میرا دل رو رو کر التجا کر رہا تھا کہ کھانے کو کچھ مل جائے۔ اس وقت بھری کائنات مجھے بڑی فضول اور بے رنگ سی لگ رہی تھی۔ مجھے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے اب میری زندگی کا مقصد کھانا حاصل کرنا ہے، جو اس ننھے سے پیٹ میں لگی

بھوک کی آگ کو بجھا دے۔
مین گیٹ کے پاس جا کر وہ ٹھہر گیا اور سابقہ فقرہ دہرایا۔
''تم جاؤ! میں یہاں ٹھہر کر تمھارا انتظار کروں گا۔''
میں نے سر ہلایا اور اندر جانے لگا، تو اس نے مجھے پھر آواز دی۔
''فوجی لالہ!''
میں نے مڑ کر اس کی طرف کن اکھیوں سے جواب طلب نظروں سے دیکھا۔
''میں دعا کروں گا۔''
اس نے اپنے چھوٹے سے ہاتھ دعا کے لیے اٹھا لیے۔
''ضرور بیٹا! کبھی کبھی سارے مسئلے ایک دعا سے ہی حل ہو جاتے ہیں۔'' میں نے ہونٹ بھینچ کر کہا۔
''اللہ تعالیٰ تمھیں کامیاب کرے؟'' اچانک اس کا لہجہ بزرگانہ ہو گیا۔
میں اندر داخل ہو گیا۔ میس میں سناٹا تھا۔ میس انچارج کاؤنٹر کے پیچھے کرسی پر سو رہا تھا۔ میں نے میس کا کونا کونا چھان مارا، مگر مجھے روٹی کا ایک خشک ٹکڑا بھی کہیں دکھائی نہ دیا۔ مجھے مایوسی کی حالت میں بڑا غصہ آنے لگا۔
''یا اللہ! مجھ سے سارا کچھ چھین لے، مگر مجھے روٹی کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا دے دے۔''
مجھ میں ولی خان کا سامنا کرنے کا حوصلہ نہیں تھا۔ میں میس سے باہر آنے کی بجائے کاؤنٹر کی طرف بڑھا۔ میں نے کاؤنٹر تھپتھپایا، تو میس انچارج نے بوکھلا کر آنکھیں کھولیں، مگر مجھے دیکھتے ہی اس کے چہرے پر برہمی کے تاثرات آ گئے۔ شاید اسے میری دخل اندازی بری لگی تھی۔
''کیا بات ہے؟''
''کچھ مل جائے گا؟''
میرا لہجہ ایسا بے بس اور التجا آمیز تھا کہ جیسے میں صدیوں سے بھوکا ہوں۔
''کچھ بھی نہیں۔'' اس نے دوبارہ آنکھیں میچ لیں۔
''تم دیکھو، تو سہی۔'' میں کاؤنٹر پر جھکا۔ ''شاید کچھ مل جائے..... صبح کا بچا کھچا۔''
''تمھارا دماغ تو درست ہے۔'' اس کا لہجہ تند ہو گیا۔ ''جب ایک بار بتا دیا ہے کہ کچھ بھی نہیں، تو بار بار پوچھنے کی وجہ؟''
''شاید کچھ..... روٹی کا ایک آدھ ٹکڑا..... ایک بسکٹ.....'' میرا لہجہ بھرا گیا۔
''دیکھو صاحب!'' وہ سنبھل کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ ''یہ ڈرامہ بند کرو اور جاؤ..... زیادہ بھوک لگی ہے، تو خودکشی کر لو، میرے پاس اس وقت کچھ بھی نہیں۔''
اس کے تضحیک سے پر لہجے نے مجھے غضب ناک کر دیا۔ اچانک میں نے اسے گریبان سے پکڑا اور کاؤنٹر کے اوپر سے گھسیٹتا ہوا باہر لے آیا۔ شاید وہ ابھی تک غنودگی کے عالم میں تھا۔ میں نے الٹا ہاتھ اس کے منہ پر رسید کیا، تو وہ اچھل کر پیچھے جا گرا۔ اس کے منہ سے نکلنے والی چیخ سے یوں لگتا تھا، جیسے اس کی گردن کی ہڈی ٹوٹ گئی ہو حالانکہ ایسا کچھ نہیں تھا۔ وہ اٹھ کر بھاگنے ہی والا تھا کہ میں نے اسے پکڑ لیا۔
''کیوں نہیں ہے کچھ..... راشن ڈپو میں کچھ نہیں ہے، میس خالی ہے، تو پھر کہاں گیا کھانا؟ تمھارے پیٹ میں.....؟'' میں ہسٹریا والے مریض کی طرح حلق کے بل چیخا۔
''ارے..... ارے آفیسر! ہوش میں آؤ! کیا کر رہے ہو؟'' کسی نے مجھے کندھے سے پکڑ کر جھنجوڑا۔
میں نے چونک کر اپنے آس پاس دیکھا۔ میس کا سارا عملہ ہمارے گرد اکٹھا ہو چکا تھا۔ مجھے ہوش دلانے والا میرے ہی رینک کا فوجی تھا جس کی ڈیوٹی کبھی کبھی میرے ساتھ راشن ڈپو میں لگتی تھی۔
''میں کیا کروں آفیسر! وہ بھوکا ہے۔'' میں نے

اس کے شانے سے اپنی پیشانی لگا کر سسکی لی۔ اس نے مجھے اپنے ساتھ لپٹا لیا۔

''کون بھوکا ہے دوست!'' اس کے سرخ وسفید چہرے پر حیرت امڈ آئی۔

''دوست! مجھے افسوس ہے کہ ایسا ہرگز نہیں ہونا چاہیے تھا، مگر جانے کیسے ہوگیا؟''

''دوست! خود کو سنبھالو۔'' اس نے میرے کندھوں کو تھپتھپایا۔

میں بڑی مشکل سے پاؤں گھسیٹتا ہوا باہر تک آیا۔ میرے چہرہ دیکھ کر وہ اصل بات کی تہ تک پہنچ گیا۔ اس نے کچھ بھی نہ پوچھا۔ خاموشی سے میری انگلی تھامی اور بغیر سوچے ہم ایک طرف چل پڑے۔

''تمھیں معلوم ہے کہ پومی کون تھا؟'' اس نے اپنی نامکمل بات آگے بڑھائی۔ مجھ سے بولا نہ گیا۔ میں نے منہ کھولا۔ مگر مجھے یوں لگا کہ جیسے میں سچ مچ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو دوں گا، اس لیے میں نے جلدی سے اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔

''وہ میرا ایک چھوٹا سا سفید بکرا تھا..... روئی کی طرح نرم وملائم۔'' وہ دوبارہ بولنے لگا۔ ''تین ماہ پہلے وہ پیدا ہوا تھا۔ وہ جلد ہی میرا دوست بن گیا۔ امی ابو کے بعد وہ میرا بہت اچھا ساتھی تھا۔ جب جنگ شروع ہوئی، تو ایک صبح جب میں جاگا، تو وہ غائب تھا۔ میں نے اسے پاگلوں کی طرح ڈھونڈا۔ کونا کونا چھان مارا، مگر وہ نہ ملا۔''

وہ سسک کر خاموش ہوگیا۔ مگر صاف لگ رہا تھا کہ اس کے پاس کہنے کے لیے اور بھی بہت کچھ ہے۔ مگر اتنا تلخ ہے کہ اس کی ہمت نہیں ہو رہی، لیکن وہ خاموش بھی نہیں رہ سکتا تھا، اس لیے دوبارہ بولا۔

''مجھے ایک جگہ بکرے کی ایک ننی سی ٹانگ ملی۔ وہ ٹانگ پومی سے ملتی جلتی تھی۔ شاید وہی ہو، مگر..... مگر مجھے یقین ہے کہ وہ کوئی اور ہے۔ پومی کھیلنے کے لیے کہیں گیا ہوگا اور راستہ بھول گیا ہوگا۔ وہ ضرور واپس آئے گا۔'' وہ خیالوں میں گم ہوگیا۔ ''فوجی لالہ! جب وہ لوٹے گا، تو میں اسے بہت ڈانٹوں گا۔ کسی سے وہ نہیں ڈرتا، صرف مجھ سے ڈرتا تھا۔ میں تھوڑی دیر بولوں گا بھی نہیں۔ میں کہوں گا جب مجھے تیری ضرورت تھی، تو تو مجھے تنہا چھوڑ کر چلا گیا..... دوست ایسے ہوتے ہیں کیا؟''

میں نے مڑ کر اس کے چہرے کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر بڑا کرب تھا۔ پھر میری آنکھوں میں امڈنے والی نمی نے اس کا کرب زدہ چہرہ دھندلا دیا۔

''ہوسکتا ہے کہ وہ واقعی راستہ بھول گیا ہو۔'' میں نے اسے دلاسا دیا۔ ورنہ مجھے یقین تھا کہ وہ کسی حملے میں مر گیا ہوگا۔

''ہاں! مجھے بھی یقین ہے کہ وہ مر سکتا ہے نہ مجھے اس حال میں چھوڑ سکتا ہے۔''

میرے جھوٹے دلاسے نے اس کا غم آدھا کر دیا۔ میں اسے اور تسلی دینا چاہتا تھا، مگر مجھ میں اب اور بولنے کی طاقت نہیں رہی تھی۔

''مگر وہ بہت بھوکا ہوگا۔'' مجھے خاموش دیکھ کر وہ خود ہی کچھ سوچ کر بولا۔ ''وہ صرف میرے ہاتھ سے کھانا کھاتا تھا۔ شاید وہ مجھ سے زیادہ بھوکا ہو۔ ہم کچھ کھانا اس کے لیے بچا کر رکھیں گے۔ وہ کسی بھی وقت آ سکتا ہے۔''

میرا دل چاہا کہ اکیلا کسی کونے میں چھپ کر گھٹنوں میں سر دے کر چلا چلا کر روؤں۔ یہاں تک کہ میری آنکھیں خشک ہو جائیں۔

ہمارا باقی کا سفر خاموشی سے طے ہوا۔ ہم بے خیالی میں جہاں پہنچے تھے۔ وہاں قطاروں میں ٹرک کھڑے تھے۔ میری آنکھیں امید سے چمک پڑیں کہ ہوسکتا ہے کہ ہمیں یہاں سے کچھ نہ کچھ مل جائے۔ شاید ان میں کچھ رہ گیا ہو۔ شاید کسی ڈرائیور سے بات کرنے سے مسئلہ حل ہو جائے۔ ممکن ہے کسی نے کچھ بچا کر رکھا ہو۔

میں نے ایک ٹرک میں ڈرائیور والے گیٹ کی طرف سے جھانکا۔ اندر ایک ٹرک ڈرائیور سو رہا تھا۔ میں نے اسے جگانا مناسب نہ جانا اور پچھلے حصے میں داخل ہو گیا۔ مگر وہاں بھی کچھ نہیں تھا۔ میں نے ایک ایک کر کے سب کی تلاشی لی۔ مگر بے سود۔

مجھے چند ڈرائیور جاگتے ہوئے ملے۔ وہ تاش کھیل رہے تھے۔ میں نے ان سے بات کی، مگر انھوں نے بے پروائی سے جواب دیا۔

میں وہاں سے بھی مایوس لوٹ آیا۔ میں جب ان سے کچھ دور ہوا، تو انھوں نے بڑے زور کا قہقہہ لگایا تھا۔ یہاں بھوک سے مرتے لوگوں کو دیکھ کر ان کا احساس پتھر ہو گیا تھا۔ انھیں حیرت ہو رہی تھی کہ ایک لاوارث بچے کے لیے میں اپنی ڈیوٹی چھوڑ کر مارا مارا پھر رہا ہوں۔

یہاں کے لوگوں پر تین مصیبتیں ایک ساتھ نازل ہوئی تھیں۔ چند دشمن ممالک نے کچھ لوگوں کو اپنا آلہ کار بنایا۔ ان کی مدد کے لیے ان ممالک نے اپنے ایجنٹ بھیجے جنھوں نے سادہ لوح لوگوں کو اپنے جال میں پھنسا لیا۔ پھر ان لوگوں نے ظلم و ستم کا بازار گرم کر ڈالا۔ خواتین کی عزتیں محفوظ نہ رہیں۔ لوگوں کو پکڑ کر جانوروں کی طرح ذبح کیا گیا، جو بھی ان کے آڑے آیا۔ وہ پھر زندہ نہ رہ سکا۔ یہ سب کچھ اسلام کے نام پر ہوتا رہا۔ وہی دین جو امن کا دین ہے۔ اس کو اپنی مرضی کے مطابق مسخ کر کے اور توڑ موڑ کر پیش کیا گیا۔

حکومت پہلے تو اپنے مفادات کی وجہ سے ان سے غفلت برتتی رہی، جب معاملات حد سے بڑھ گئے، تو انھیں ہوش آیا، لیکن اس وقت پانی سر سے بلند ہو چکا تھا۔ انھیں اتنا وقت مل چکا تھا کہ وہ اپنی جڑیں پورے ملک میں پھیلا سکیں۔ وہ اتنے مضبوط ہو چکے تھے کہ انھوں نے حکومت کو چیلنج کر دیا۔ ارباب اختیار نے مذاکرات سے ان حالات کو قابو کرنے کی کوشش کی۔ جب اس میں ناکامی ہوئی، تو پاک فوج نے تھوڑے ہی عرصے میں اس علاقے کو ایسے غنڈہ صفت، شر پسندوں اور نام نہاد مسلمانوں سے خالی کرا لیا۔ ابھی یہ سلسلہ جاری تھا کہ عالمی امن کا سب سے بڑا دعوے دار اور ٹھیکے دار امریکا وہاں کے معصوم لوگوں پر ڈرون حملے کرنے لگا۔

میں یہ سب کچھ سوچتا ہوا ابھی ٹرکوں سے باہر ہی نکلا تھا کہ اسی لمحے آسمان پر ایک قرمزی رنگ کا شعلہ چمکا۔ میں نے ایک طرف چھلانگ لگا کر دونوں ہاتھوں سے کان بند کر لیے اور اوندھے منہ زمین پر لیٹ گیا۔ اسی وقت ایک قیامت ٹوٹ پڑی۔ فضا مسلسل دھماکوں سے لرز اٹھی۔ مجھے اپنے کانوں کے پردے پھٹتے ہوئے محسوس ہوئے۔ مجھ پر پتھروں اور مٹی کی بارش ہوتی رہی۔ آخر سکوت چھا گیا۔ میں نے سہمی ہوئی نگاہوں سے سر اٹھا کر آسمان پر ایک ڈرون جہاز کو واپس جاتے دیکھا۔ پھر مڑ کر ٹرکوں کی قطار کو دیکھا۔ کئی ٹرک تباہ ہو چکے تھے اور کچھ جل رہے تھے کہ اچانک میرے اندر خطرے کی گھنٹی بج اٹھی۔ ٹرکوں کی ٹینکیاں کسی بھی لمحے آگ پکڑ کر پھٹ سکتی تھیں۔ نتیجے میں لوہے کے گرم گرم ٹکڑے ادھر بھی آ سکتے تھے۔

اچانک مجھے ولی خان کا خیال آیا، جسے میں ٹرکوں سے کچھ فاصلے پر چھوڑ آیا تھا۔ میرا دل ڈوبنے لگا۔ میں جلدی سے اس طرف لپکا۔ وہاں خاک اور ملبے کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ بھاگنے کے دوران میں مجھے چوٹ بھی لگی، مگر مجھے اس کا کوئی احساس نہیں تھا، کیوں کہ میرے حواس پر ولی خان سوار تھا۔ میرے اندیشے کانٹوں کی طرح چبھ رہے تھے۔ اس ننھے اور بھوکے بچے کے بچ جانے کی امید بہت کم تھی۔

میں ادھر ادھر دوڑنے لگا۔ جلد ہی وہ مجھے ایک دروازے کے نیچے مل گیا۔ اس وقت وہ دروازہ جل رہا تھا اور بہت گرم تھا۔ مگر میں نے پکڑ کر پوری قوت سے ایک طرف پھینک دیا۔ میرے ہاتھ جل گئے تھے۔ مگر مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میرے اندر درد کی حس ہی مر گئی

۔ اس کی ایک ٹانگ گیٹ کے پھل سے کٹ گئی تھی ۔ وہاں سے اب خون پرنالے کی طرح بہ رہا تھا۔ وہ زندہ تھا۔ میں نے اسے جلدی سے اٹھایا اور اندھا دھند لڑکوں سے دور بھاگنے لگا۔ نشیب میں اتر کر میں نے اس کا جائزہ لیا۔ وہ ہچکیاں لے رہا تھا۔ اس کے متغیر چہرے کا رنگ تیزی سے زرد ہوتا جا رہا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں روٹی کا ایک سوکھا ہوا چھوٹا سا ٹکڑا تھا، جو جانے کہاں سے اسے مل گیا تھا۔

''جنگ خود ایک مسئلہ ہے، یہ مسائل کو حل کیا کرے گی۔''

وہ اٹک اٹک کر بولنے لگا۔ پھر خاموش ہوگیا۔ میں نے اپنی قمیص اتاری اور اس کی ٹانگ سختی سے باندھ دی۔ اس وقت میں خود کو بہت مجبور سمجھ رہا تھا۔ اس کی ٹانگ سے بہتے ہوئے خون میں کوئی کمی نہ آئی۔ میری خاکی قمیص جلد ہی سرخ ہوگئی اور اب لہو کے قطرے باہر رس رہے تھے۔

''فوجی لالہ!'' اس نے مجھے مخاطب کیا۔ ''تم..... تم میرے لیے رو رہے ہو؟''

''ہاں!'' میں نے بے اختیار ہچکی لی۔

''کیوں؟'' اس کے چہرے پر کرب پھیل گیا۔

''اس لیے..... اس لیے کہ میرے بچے! میں تمھیں بہت چاہتا ہوں۔'' میرے آنسو اس کے چہرے پر گرنے لگے۔

''فوجی لالہ!'' اس کا لہجہ کمزور پڑنے لگا۔

''تم کچھ کہنا چاہتے ہو ناں؟'' میں نے اس کی پیشانی چوم کر پوچھا۔

''ہاں..... آں..... ہاں.....'' اس نے سر کو ہلکی سی حرکت دی۔

''فوجی لالہ! یہ ہم نے امریکی لوگوں کا کیا بگاڑا ہے۔ یہ ہمیں بموں سے کیوں مارتے ہیں؟ ہم تو پہلے ان کی وجہ سے بھوک سے مر رہے ہیں۔''

''ولی خان! میرے بچے! تم ہمت نہ ہارو۔''

''تم دنیا کو بتا دینا کہ..... کک کہ.....'' اس سے بولا نہیں جا رہا تھا۔

''ولی خان! میں سن رہا ہوں..... آگے بولو۔ شاباش!''

''کک..... کک کہ..... بھبھ..... بھبھ بھوک.....''

اس کی بات ادھوری رہ گئی اور گردن ایک طرف کو ڈھلک گئی۔ میرے چہرے کو تکتی آنکھیں ہمیشہ کے لیے ساکت ہوگئیں۔ آنکھوں کی چمک ماند پڑ چکی تھی۔ وہ مر چکا تھا۔

''ولی خان..... !بولو..... ولی خان.....!'' میں نے اسے سینے سے چمٹا لیا۔

میں اس کے سینے پر سر رکھ کر بڑی دیر تک بلک بلک کر روتا رہا۔ میرے ساتھیوں نے آکر مجھے اٹھایا۔ جو ٹرک ڈرائیور بچ گئے تھے، وہ ہمارے گرد کھڑے تھے۔ اب کسی کی آنکھوں میں تضحیک نہیں تھی۔ وہ پہلے ہی سے ولی خان کے ساتھ میری جذباتی وابستگی سے آگاہ تھے اور ممکن ہے کہ وہ اب اپنے اس مذاق پر شرمندہ ہوں۔

میرے ایک ساتھی نے آگے بڑھ کر مجھے سنبھالا۔ دوسرے نے ولی خان کو اٹھا کر اسٹریچر پر لٹا کر اس کے اوپر سفید چادر ڈال دی۔ اس کے ہاتھ میں ابھی تک روٹی کا ٹکڑا دبا ہوا تھا۔ اس کے چہرے کو دیکھ کر اب بھی یہی لگتا تھا کہ یہ چہرہ ایک بھوک زدہ چہرہ ہے۔

میلا پراتا

اسحاق جنجوعہ

ہمارے ہاں ہر سرکاری ملازم سے ملک و وطن کے لیے جان کی قربانی مانگی جاتی ہے اور ہر دوسرا ملازم وطن پر جان وار بھی دیتا ہے لیکن اس کے لواحقین اور پسماندگان کے ساتھ کیا ہوتا ہے یہ ایک تلخ پہلو ہے جس کی جانب کوئی دیکھنا بھی پسند نہیں کرتا۔

شہید کے ایک بچے کا فسانہ، اس کی خواہش صرف ایک میٹھا پراٹھا تھا

زرینہ لکڑیوں کے ایندھن سے جلنے والے مٹی کے چولہے پر روٹی پکا رہی تھی اور ننھا راجو پاس ہی کچے فرش پر بچھی ایک پرانی اونی دری پر بیٹھا، تام چینی کی پلیٹ کا طبلہ بنائے اپنی توتلی زبان میں گائے جا رہا تھا۔

انور علی بھی نہا دھو کر اپنی وردی کے بٹن بند کرتا ہوا اس کے قریب آ بیٹھا اور اس کے بال سہلاتے ہوئے بولا۔

کیوں شور مچا رہے ہو کاکے۔

مجے میتا پلاتا چاہیے۔

روز کی طرح میٹھے پراٹھے کی ضد کر رہا ہے راجو کے تو تلاتے ہی زرینہ نے لقمہ دیا۔

''تو پکا دو ناں میرا کاکا نہیں کھائے گا تو اور کون کھائے گا۔''

''چینی اور گھی ختم ہونے کے قریب ہیں، پہلی بھی دو رہے۔ اس کے پراٹھوں کے چکر میں جلد ختم ہو جائیں گے آپ ناشتہ کر کے جائیں، میں بہلا لوں گی۔'' انور نے راجو کی سفارش کی تو زرینہ نے جواب دیا۔

''میری چائے نہیں بنائی تو اسے پراٹھا بنا دو، ایک ہی تو کاکا ہے ہمارا، یہ بھی عیاشی نہ کرے گا تو کون کرے گا۔''

''ابھی تو عیاشی کرا لو، جب اسکول جانے لگے گا تو خرچے کہاں سے پورے ہوں گے۔''

''کتنی دفعہ کہہ چکی ہوں کہ تنخواہ ناکافی ہے اور لوگ بھی تو ہیں پولیس میں کھلے ہاتھوں عیاشیاں کرتے ہیں، آپ سے ایک کا کا نہیں پالا جا رہا۔ ایسے کب تک جئیں گے۔'' زرینہ نے شکوہ کیا۔

''کوشش تو میں بھی کر رہا ہوں کب سے ٹریفک پولیس میں تعیناتی کے لئے درخواست دے رکھی ہے، امید تو ہے کہ جلد تقرری ہو جائے گی۔ تنخواہ بھی زیادہ ہو جائے گی۔ حالات بدلتے دیر لگتی ہے تو اسے پراٹھا بنا کر دے میں چلتا ہوں۔''

انور علی نے کہا اور سر پر ٹوپی رکھ کر گھر سے نکل گیا۔

زرینہ نے آٹے کے پیڑے پر چینی چھڑکی اور اسے دوبارہ گوندھ کر راجو کو اس کا پسندیدہ میٹھا پراٹھا بنا کر دے دیا۔

راجو نے تام چینی کی پلیٹ کو سیدھا کیا اور پھر سے، میلا میتا پلاتا..... میلا میتا پلاتا..... کا نغمہ گنگناتے ہوئے کھانے میں مشغول ہو گیا۔

شام سے ذرا پہلے زرینہ آنگن میں لگی نائلون کی تاروں سے دھلے ہوئے کپڑے سمیٹ رہی تھی جب انور اپنے ہاتھوں کو کمر کے پیچھے چھپائے مسکراتا ہوا گھر

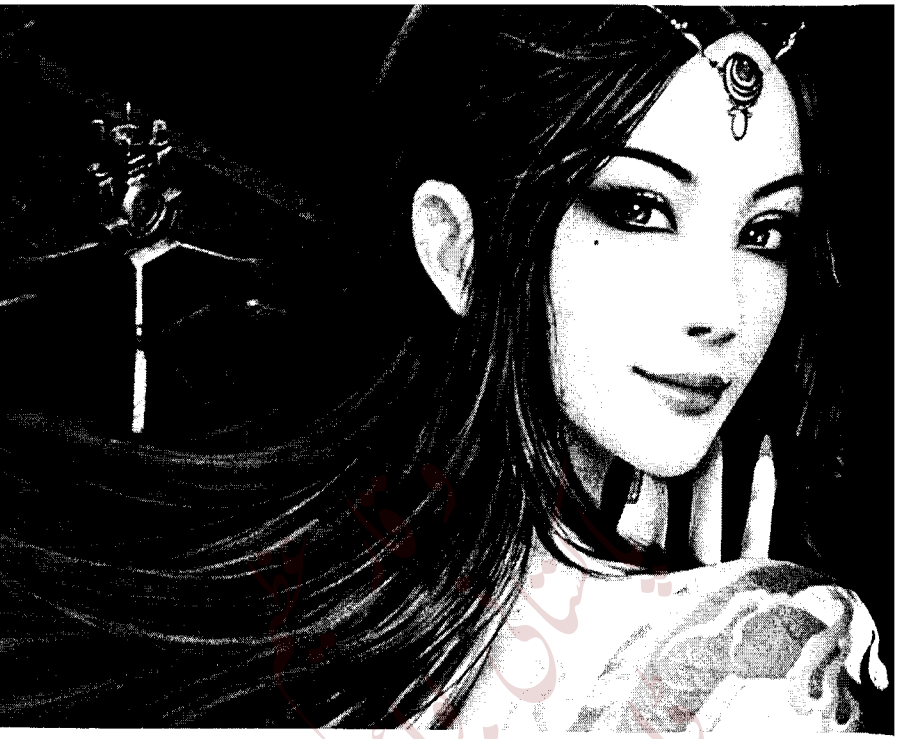

میں داخل ہوا اور زرینہ کے پاس جا کر اس سے پوچھا۔

بتا تو میرے ہاتھ میں کیا ہے۔

آپ کے کاکے کی تو تلیوں نے تو میری مت ہی مار رکھی ہے، آپ خود ہی بتا دیں، مجھ سے تو نہیں بوجھا جائے گا۔

ابودی ابودی، میلا لولی پوپ لائے او۔

(ابو جی ابو جی میرا لولی پاپ لائے ہو)

انور علی کی آواز سن کر راجو بھی چہچہاتا ہوا آیا اور اپ کے گھٹنوں سے بغلگیر ہو گیا۔

ہاں ہاں لایا ہوں، مگر پہلے تیری ماں کو تو بوجھ لینے دے کہ آج میرے پاس خاص شے کیا ہے۔

انور علی نے پیار بھرے لہجے میں بیٹے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا، تو زرینہ لجاتے ہوئے بولی۔

آئے ہائے اب راجو کے سامنے مسخریاں کرنا بند کرو اور سیدھے سیدھے بتاؤ کہ بات کیا ہے۔

زرینہ کی بات سن کر انور علی نے اپنے دونوں ہاتھ سامنے کر دیئے، جن پر سیلوفین کے شفاف لفافے میں تہہ شدہ سرمئی وردی رکھی ہوئی تھی۔

میری تعیناتی ٹریفک پولیس میں ہو گئی ہے۔ یہ دیکھ نئی وردی، تنخواہ بھی تقریباً دگنی رب نے تیری دعاؤں اور میری ایمانداری کی لاج رکھ لی۔

حیرت اور خوشی کی ملی جلی کیفیت میں غرق زرینہ نے وردی کو ایسے چھو کر دیکھا کہ جیسے خواب اور حقیقت کی پرکھ کر رہی ہو۔

وردی زرینہ کے ہاتھ میں پکڑا کر انور نے گھٹنوں

سے چپکے راجو کو اٹھایا اور گال چومنے کے بعد جیب سے دو لالی پاپ نکال کر اسے دے دیے۔

راجو نے باپ کے بازو پر بیٹھے بیٹھے ایک لالی پاپ کھولا مزے سے چوسنے لگ گیا۔

اسے ٹھیک سے استری کر دینا، مجھے صبح جلدی جانا ہے اب میری ڈیوٹی گاؤں کی چوکی کے بجائے شہر میں لگی ہے۔

انور نے زرینہ کو ہدایت کی تو راجو نے لالی پاپ منہ سے نکال کر پوچھا۔

جے کا اے ابو

(یہ کیا ہے ابو)

''یہ تیرے ابو کی نئی وردی ہے، نئی نوکری ملی ہے انہیں، اب ہمارے پاس بہت سے پیسے آئیں گے۔

زرینہ نے مسکراتے ہوئے راجو کے گال پر نرم سی چٹکی کاٹتے ہوئے اسے سمجھایا۔

وادی واب تو لوز لوز میتے پلاٹے۔

(واہ جی واہ..... اب تو روز روز میٹھے پراٹھے)

راجو کا پیارا سا جواب سن کر زرینہ اور انور علی اپنے قہقہوں کو نہ روک سکے۔

تجھے اپنے میٹھے پراٹھے کے سوا کسی شے کی فکر نہیں۔

انور نے راجو کو پچکارتے ہوئے کہا اور اسے لے کر کمرے میں چلا گیا۔

زرینہ نے نئی وردی صبح ہی صبح بڑے چاؤ کے ساتھ استری کر کے ہینگر پر ٹانگ دی، انور علی اسے پہن کر باہر آیا تو زرینہ کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

اللہ نظر نہ لگائے، آج تو بالکل بڑے افسر لگ رہے ہو۔

جس طرح تو مجھے دیکھ رہی ہے سب سے پہلے تو مجھے تیری ہی نظر لگے گی۔

انور نے زرینہ کو چھیڑا۔

ہائے ہائے نظر لگے آپ کے دشمنوں کو، میں تو صدقے واری جا رہی ہوں۔

انور ناشتہ کر رہا تھا اور زرینہ اسے ٹک دیکھے جا رہی تھی اتنے میں راجو بھی آنکھیں ملتا ہوا آ گیا اور باپ کے پاس بیٹھ کر بولا۔

امی مدے آدبی میتا پلاتا دو دی ناں۔

(امی، مجھے آج بھی میٹھا پراٹھا دو گی ناں)

نہیں نہیں، روز نہیں،، دانتوں میں کیڑا لگ جائے گا اور نیکر میں بھی خارش ہو گی۔

مدل ابو تی نوی نوتلی تا میتا پلاتا تو بنا دو ناں۔

(مگر ابو کی نئی نوکری کا میٹھا پراٹھا تو بنا دو ناں)

راجو کی توتلی فرمائش نے انور اور زرینہ کے لبوں پر پھر سے ہنسی سجا دی۔

انور ناشتہ کر کے اٹھنے لگا تو زرینہ آہستہ سے بولی۔

کچھ دیر رک نہیں جاتے آج بڑے سوہنے لگ رہے ہو، جی کرتا ہے دیکھی جاؤں۔

منجھلی والا دن نئی وردی میں ہی گزاروں گا، جی بھر کے دیکھ لینا۔ چلتا ہوں، دعا کرنا دن اچھا گذرے۔

انور زرینہ کی طرف دیکھ کر بڑے پیار سے بولا۔

اللہ خیر کرے گا..... راجو..... ابو کو ٹاٹا کرو۔

تا تا ابو لولی پوپ لے تل آنا۔

ضرور لاؤں گا۔ انور علی نے بیٹے کے ماتھے پر بوسہ دیتے ہوئے کہا، اور گھر سے نکل گیا۔

.....☆☆.....

انور علی اور زرینہ کی شادی چار سال پہلے ہوئی تھی،، شادی کے وقت تک انور علی کے والد اشرف علی زندہ تھے، جبکہ اس کی والدہ کچھ برس قبل وفات پا چکی تھیں۔

اشرف علی ایک متوسط حال مگر خالص دیہاتی رعب داب شخصیت کے حامل آدمی تھے، ان کی زندگی میں گھر کا سارا نظم و نسق ان کے ہاتھ میں تھا اور انور علی اپنے دونوں بڑے بھائیوں اکرم علی اور اکبر علی کے ساتھ ہی رہتا تھا، اکرم علی بھی پولیس ملازم تھے جبکہ اکبر علی سی بی آر میں کلرک تھے،، دونوں اپنی نوکریوں اور اختیارات کا بھرپور فائدہ اٹھا کر دونوں ہاتھوں سے

کمائی کرتے تھے اور باپ کی پرانی حویلی کو از سر نو تعمیر کر چکے تھے زرینہ کے مائیکے انتہائی مفلوک الحال تھے اور اس کی شادی انور کے ساتھ خاندانی رشتہ داری کی بنا پر ہوئی

شادی کے سال بھر بعد ہی راجو کی آمد ہوئی راجو ابھی چار ماہ ہی کا تھا جب ایک شام اشرف علی اپنے کھیت سے واپسی پر سائیکل چلاتے ہوئے ایک حادثے کا شکار ہو کر دار عدم سدھار گئے۔

والد کا سایہ اٹھنے کی دیر تھی کہ انور علی کے تو جیسے برے دن ہی شروع ہو گئے۔ ابا کے دسویں پر ہی بھائیوں نے یہ کہہ بے دخلی کا حکم سنا دیا کہ حویلی کی تعمیر اور انور کی شادی پر سارا خرچہ ان کا ہوا تھا اسلیے اب اس کا حویلی اور کھیت پر کوئی حق نہیں تاہم دیگر رشتہ داروں اور گاؤں کی پنچایت کی مداخلت پر حویلی کے صحن میں دیوار کھینچ دی گئی اور صحن کا مختصر حصہ انور علی کو دے دیا گیا جس میں صرف ایک ہی بوسیدہ کمرہ تھا جسے اشرف علی اپنی کھیتی باڑی کا مال اسباب رکھنے کے لیے استعمال کیا کرتے تھے۔

دفتر سے قرض لے کر انور نے اس جگہ کو رہنے کے قابل کیا، اور ہر ماہ اس کی تنخواہ سے کٹوتی شروع ہو گئی۔

راجو ابھی قدم قدم چلتا تھا کہ ایک روز کھیلتے کھیلتے اچانک گر پڑا۔ ہسپتال لے جایا گیا تو یہ خبر والدین پر بجلی بن کر گر پڑی کہ وہ خون کی ایک بیماری کا شکار ہے اور اس کی بقا صرف ہر تین ماہ بعد خون کی تبدیلی سے ہی ممکن ہے۔ علاج خاصہ مہنگا تھا اور سرکاری طور پر ملنے والی امداد کے باوجود انور علی کو ہر ماہ ایک معقول رقم جمع کرنا پڑتی جس وجہ سے معاشی حالات مزید ابتر ہوتے گئے۔ دونوں بڑے بھائی اس کی مدد کے بجائے اسے وردی سے کمائی کی تلقین کرتے رہتے جو انور علی کے ایماندار مزاج کو گوارہ نہ تھی۔

وہ اپنے حال میں ہی گزارہ کرتا رہا اور ترقی کے لیے کوششیں کرتا رہا جس کا پہلا زینہ آج طے ہوا اور وہ نئی تشکیل پانے والی ٹریفک فورس میں تعینات ہو گیا۔

.....☆☆.....

شام کا دھندلکا پھیل چکا تھا،، عام طور پر انور اس وقت تک گھر آ جاتا تھا، مگر آج ابھی تک نہیں پہنچا تھا،،

زرینہ کو فکر ہوئی تو خود کو یہ کہہ کر سمجھا دیا کہ شاید آج نئی نوکری کا پہلا دن ہے اس لیے تاخیر ہو گئی۔

راجو بھی کچھ دیر تک تو تتلی زبان میں اپنے ابو بارے پوچھتا رہا مگر رات کا اندھیرا پھیلتے ہی ماں کی آغوش میں سو گیا۔

راجو کے سوتے ہی خاموشی بڑھی تو زرینہ بے چین ہو کر صحن میں آ نکلی،،

شوہر کی منتظر ٹہلتے ٹہلتے کبھی دروازے کی اوٹ سے جھانکتی اور کبھی صحن کے کنارے لگی تندور کی منڈیر پر کھڑے ہو کر گاؤں میں آنے والی کچی سڑک پر نگاہ دوڑاتی مگر انور کا کوئی نشان نظر نہ آیا۔

رات کا نصف پہر گذر رہا تھا، زرینہ تندور کی منڈیر پر بیٹھی اونگھ رہی تھی کہ باہر کسی گاڑی کے رکنے اور پھر دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز آئی۔

زرینہ نے دوپٹہ سیدھا کرتے ہوئے دروازہ کھولا تو باہر ایک سرمئی وردی والا آدمی کھڑا تھا، جو انور نہیں تھا۔

یہ انور علی کا گھر ہے۔؟

جی یہی ہے۔ زرینہ نے جواب دیا۔

اور آپ۔؟

جی میں ان کی بیوی ہوں۔ وہ کہاں ہیں،، خیر تو ہے،، زرینہ نے سوال کے جواب میں پوچھا۔

انور علی کی ڈیوٹی آج وزیر صاحب کے پروٹوکول والے روٹ پر تھی۔، وزیر صاحب کے قافلے پر آج شام خودکش حملہ کیا گیا۔ جسے ناکام بنانے کی کوشش میں انور علی شہید ہو گئے۔

اطلاع دینے والے کے منہ سے نکلے ان الفاظ کا ہتھوڑا اس قدر شدید تھا کہ زرینہ خود پر قابو نہ رکھ سکی اور

غش کھا کر گر پڑی۔ تھوڑے اوسان بحال ہوئے تو دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ رونے چلانے کی آواز صحن کی دیوار کے پار جیٹھوں کے گھر تک پہنچی تو وہ بھی آ گئے۔

اطلاع دینے والے رخصت ہوئے تو جیٹھانیاں اور محلے کی عورتیں زرینہ کو سہارا دے کر کمرے میں لے آئیں۔

رونے کی آواز سن کر راجو بھی جاگ گیا۔ اور اپنے ابو کا پوچھنے لگا۔ زرینہ کے پاس رونے کے سوا کوئی جواب نہ تھا۔

زرینہ کی آدھی رات انتظار میں اور باقی رونے میں گذر گئی۔

دوسری صبح وہ صحن میں بچھی اکلوتی دری پر افسوس کے لیے آنے والی عورتوں کے درمیان بیٹھی ہوئی تھی جب پندرہ بیس پولیس اہلکار آئے۔

ان میں سے ایک نے بتایا کہ انور علی کا جسد خاکی ضروری کارروائی کے بعد کل گاؤں لایا جائے گا۔ وزیر صاحب بھی جنازے میں شرکت کے لیے تشریف لائیں گے،، ان پر مزید حملے کا خطرہ ہے اس لیے سیکورٹی آج ہی پوزیشن سنبھال رہی ہے زرینہ پورا دن افسوس کیلئے آنے والی عورتوں کے درمیان بیٹھی روتی رہی اور سیکورٹی اہلکار وزیر صاحب کی ممکنہ آمد کے پیش نظر زرینہ کے کچے آنگن سے ذرا سا دور گاؤں کی گلیوں کی ہنگامی آرائش و مرمت اور قریبی میدان میں پنڈال سجانے میں مصروف رہے۔ گاؤں کے داخلی راستوں پر عارضی چوکیاں قائم کر دی گئیں۔ اور تقریباً ہر چھت پر ہی سیکورٹی اہلکار پوزیشن سنبھالے کھڑے رہے۔

راجو اپنے باپ کی موت اور ماں کو پہنچنے والے صدمے کے کرب سے ناشناس آنگن میں لگنے والی غیر متوقع رونق سے محظوظ ہوتا رہا۔

عورتیں اسے باری باری اپنی گود میں بٹھاتیں اور جب ان کی رانیں پر اس بوجھ سے دکھنے لگتیں تو اپنے ساتھ آئے بچوں میں سے کسی کو بلا کر اسے ان کے ساتھ کھیلنے کیلئے باہر بھیج دیتیں۔

یہ رات بھی پچھلی رات کی طرح آنکھوں سے بہتے بہتے گزر گئی۔

دوسری صبح ایک ایمبولینس اور پولیس کی چند گاڑیاں سائرن بجاتے گاؤں میں داخل ہوئیں اور زرینہ کے دروازے پر رک گئیں۔

زندگی کے یاروں کی بارات زرینہ کے دولہے کو کاندھوں پر اٹھا کر گھر میں داخل ہوئی اور اس کا تابوت آنگن میں رکھ دیا۔

پھوڑی پر بیٹھی زرینہ ہارے ہوئے لمحوں کا جنازہ سینے پر لاد کر اٹھی اور پژمردہ قدموں کے ساتھ تابوت کے قریب جا ٹھہری۔

اپنے سرتاج پر لپٹا قومی پرچم ہٹانے کی کوشش کی تو ایک اہلکار نے روک دیا۔

شہید کا سارا بدن ٹکڑوں میں ہے۔ اس لیے تابوت کو سیل کر دیا گیا ہے۔

زندگی کے ساتھی کی ناگہانی جدائی کا صدمہ کیا کم تھا کہ آخری دیدار سے محرومی کا دکھ بھی زرینہ پر پہاڑ بن کر ٹوٹا اور وہ غش کھا گئی۔

ظہر کے بعد انور علی کا جنازہ ادا کیا گیا اور اسے سرکاری اعزاز کے ساتھ سپرد خاک کر دیا گیا۔ لوگوں کی ایک بڑی تعداد آئی تھی۔، کچھ جنازے میں شرکت کرنے اور باقی گارڈ آف آنر کا نظارہ کرنے،، وزیر صاحب کی آمد ہوئی تو وہ پھولوں کا پہیہ نما گلدستہ قبر پر رکھنے کے بعد محافظوں کے حصار میں اسٹیج کے بلٹ پروف گلاس کیبن میں کھڑے ہو کر تقریر کرنے لگے۔

شہید ایک بہادر اور ایماندار سپاہی تھا۔ میں نے خود دیکھا کہ اس نے کمال ہمت سے میری گاڑی کی طرف بھاگتے دہشت گرد کو دبوچا اور اپنی جان ملک و قوم کے مفاد پر قربان کر دی۔ شہید کی خدمات کے اعتراف میں حکومت کی طرف سے گولڈ میڈل، اور

اس کے ورثاء کے لئے ایک لاکھ روپے کی امداد کا اعلان کرتا ہوں۔

شہر سے گاؤں تک ایک سڑک بھی تعمیر کی جائے گی ،جس کا نام انور شہید روڈ رکھا جائے گا، گاؤں کے سکول کا نام بھی تبدیل کر کے انور شہید سکول رکھ دیا گیا ہے۔

اعلان کے ساتھ ہی اکرم علی راجو کی انگلی تھامے سٹیج پر حاضر ہوئے تو وزیر صاحب نے گولڈ میڈل راجو کے گلے میں ڈال کر ایک لاکھ کا چیک اس کے تایا کو پکڑا دیا۔

جلسے کے بعد وزیر صاحب گھر بھی گئے اور زرینہ سے رسمی تعزیت کے بعد کیمروں کے جلتے بجھتے فلیشوں کی روشنی میں راجو کا سر سہلاتے ہوئے یہ اعلان کیا کہ بچے کو بالغ ہونے کے بعد باپ کی جگہ نوکری دی جائے گی اور سکول جانے پر تعلیم کا سارا خرچ بھی حکومت اٹھائے گی۔

انور علی کے سوئم تک لوگ گھر میں تعزیت کے لیے آتے رہے جن کی تواضع کا اہتمام دونوں بڑے بھائیوں نے کر رکھا تھا۔

سوئم کے اگلے روز سے راجو اور زرینہ گھر میں تنہا رہ گئے۔

کیلنڈر کا مہینہ گھر سے راشن کو ساتھ لے کر رخصت ہوا،، زرینہ اپنے جیٹھ اکرم علی کے پاس گئی تو انہوں نے بتایا کہ چیک جمع کروا دیا ہے۔ سرکاری چیک ہے اس لیے رقم آنے میں دیر لگے گی۔

زرینہ نے اپنی مجبوری سے پردہ اٹھایا تو انہوں نے جیب سے تین ہزار روپے نکال کر دیئے اور کہا کہ اپنا نظام چلاؤ، امدادی رقم آئے گی تو وہ اس میں سے رکھ لیں گے،، نیز اکبر علی بھی انور کی پنشن جاری کروانے کیلئے بھی دفتروں کے چکر لگا رہے ہیں۔

زرینہ نے ان سب پیسوں کا راشن خریدا اور گھر چلی گئی۔

اگلی صبح ناشتہ بناتے ہوئے جب اس نے آٹے کے پیڑے پر چینی چھڑکی تو راجو اچھل اچھل کر اپنا پسندیدہ گانا گانے لگ گیا۔

میلا بیتا پلاتا۔

میلا میرا پلاتا۔

اس کی ادائیں دیکھ کر زرینہ کے چہرے پر بے رنگ سی ہنسی چھا گئی۔ انور علی کی شہادت کے بعد یہ پہلی ہنسی تھی جو زرینہ کے لبوں پر سجی۔

نصف ماہ بعد زرینہ پھر سے جیٹھ کے سامنے حاضر تھی اور انہیں بتایا کہ راجو کے علاج کی تاریخ قریب آ رہی ہے۔ چیک اور پنشن کی کوئی خبر آئی یا نہیں۔

میں تو پوری کوشش کر رہا ہوں،، ہر جگہ رشوت مانگی جا رہی ہے،، اکبر نے بتایا ہے کہ پنشن والے بھی کہتے ہیں کہ وہ جاری کرنے کیلئے بھی رشوت لیں گے اور ہر ماہ حصہ بھی رکھیں گے،،

اکرم علی کی بات سن کر زرینہ چند لمحے متاسف رہی اور بولی۔

میرے پاس اب گزارے کا کوئی چارہ نہیں، آپ ان کو حصہ دے دیں، کچھ نہ کچھ سبب تو بن ہی جائے گا،، بس کسی طرح راجو کے ہسپتال جانے کے روز تک پیسے مل جائیں تا کہ اس کے علاج کا سلسلہ بلا تاخیر چلتا رہے۔

زرینہ کی بات سن کر اکرم علی نے اسے تسلی دی اور جیب سے مزید دو ہزار روپے نکال کر دے دیئے۔

دو روز کے وقفے کے بعد سہ پہر کے وقت اکرم علی اور اکبر علی ایک کاغذ لے کر زرینہ کے پاس گئے اور اسے حساب کتاب سمجھانے لگے۔

چیک جاری کروانے کے لیے تیس ہزار رشوت دی ،،

باقی ستر میں سے پچیس ہزار انور علی کے جنازے، سوئم اور دسویں پر آئے لوگوں کی تواضع میں خرچ ہو گئے۔

پانچ ہزار دفتروں کے چکر لگانے میں خرچ ہوئے اور پانچ ہزار وہ کٹ گئے جو زرینہ نے ادھار لئے

تھے،،

انور کی پنشن جاری کروانے کے لئے دس ہزار روپے رشوت لگی اور کلرک سے سودا طے پایا ہے کہ وہ چھ ہزار کی پنشن میں سے ایک ہزار ماہانہ حصہ لیا کرے گا اور باقی پنشن اکبر علی کے ہاتھ گھر پہنچ جایا کرے گی۔

یہ ہیں چیک اور پنشن کی رقم سے باقی کے تیس ہزار روپے۔،

اکبر علی کا حساب زرینہ کی سمجھ سے بالا تھا مگر اس نے ہاں میں سر ہلا کر ان کے ہاتھ سے رقم والا لفافہ لے کر جھولی میں رکھ لیا۔

اسی شام جب زرینہ گلابی مسور کے شوربے میں روٹی ڈبو کر کھا رہی تھی اسی وقت دونوں جیٹھوں کے آنگن سے تلے کبابوں کی خوشبوئیں کوئلوں کے دھویں میں تحلیل ہو رہی تھیں۔

زرینہ رات بھر حساب لگاتی رہی۔

سات ہزار راجو کے ہسپتال کا سہ ماہی خرچہ اور انور علی کے چہلم کے لیے پندرہ ہزار۔

گھر کا محافظ اب نہیں رہا تھا اس لیے آٹھ ہزار روپے خرچ کر کے تالوں والے نئے دروازے لگوا کر اگلے مہینے کے راشن کیلئے ہاتھ میں صرف تین ہزار باقی رہ گئے۔ اگلے مہینوں کی پنشن سے دو ہزار روپے ماہانہ راجو کے علاج کیلئے جمع کرنا بھی ضروری تھا۔

وقت کے پر پھڑ پھڑاتے رہے دال سبزیوں سے گزارہ کرتے کرتے ایک سال گذر گیا،،

بڑھتی ہوئی مہنگائی کے باعث راجو کا میٹھا پراٹھا بھی روزانہ کی بنیاد سے ایک روز اور پھر مزید ناغوں کا سفر کرتے ہوئے ہفتے میں ایک دن تک محدود ہو گیا۔

اب وہ ضد بھی کبھی کبھی ہی کرتا تھا مگر روٹیاں پکاتی ہوئی ماں کے ہاتھوں پر نظر ضرور جما کر رکھتا تھا۔ اس کی تو تلاہٹ ابھی بھی کم نہیں ہوئی تھی،،

زرینہ کی اداس شامیں انور شہید کی نشانیوں سے دل بہلاتے گذر رہی تھیں،، یہ نشانیاں تھیں بھی کتنی۔

راجو، گولڈ میڈل اور اس کی پرانی وردی۔

یہ وقت راجو کے سکول جانے کا تھا،، نئی جماعتوں کے داخلے کھلے تو زرینہ راجو کی انگلی پکڑ کر اسے اس کے باپ کے نام والے سکول میں لے گئی۔

داخلہ کے امور پر متعین عملے نے راجو سے پیار اور ہمدردی جتانے کے بعد داخلے کی ضروریات کی فہرست زرینہ کے ہاتھوں میں پکڑا دی۔ زرینہ نے وزیر صاحب کا مفت تعلیم کے لیے دیا جانے والا خط دکھایا تو اس پر منکشف کیا گیا کہ صرف ماہانہ فیس معاف ہے، کتابیں کاپیاں، سٹیشنری اور یونیفارم خود خریدنے پڑیں گے جن کا خرچہ آٹھ ہزار روپے ہے۔

سکول والوں کا جواب سن کر ماں بیٹا انور شہید روڈ پر چپلیں گھساتے گھر واپس لوٹ گئے۔

حالات کی ماری زرینہ کا ایک ہی خواب تھا کہ راجو پڑھ لکھ جائے اور اس کا سہارا بنے۔ اور وہ اس کو توڑنا نہیں چاہتی تھی۔ رات کو کمرے کی چھت پر تارے گنتے گنتے اس نے انور علی کی ایک نشانی قربان کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

دوسرے روز اس نے ٹرنک سے گولڈ میڈل نکالا اور راجو کو ساتھ لیے سنار کے پاس پہنچ گئی۔،

سنار کافی دیر تک خاموشی سے میڈل کا معائنہ کرتا رہا،، پھنکا کر آواز سنی، کالے رنگ کی پتھریلی کسوٹی پر رگڑا اور پھر اپنے موٹے موٹے عدسوں والی عینک ماتھے پر ٹکا کر بولا،،

بی بی مجھے افسوس سے بتانا پڑ رہا ہے کہ یہ نقلی ہے۔ اور حکومت کی طرف سے صرف علامتی طور پر دیا گیا۔ اصلی سونا اسے چھو کر بھی نہیں گذرا،، یہ راجو کا کھلونا تو بن سکتا ہے مگر اور کسی ضرورت کے کام نہیں آ سکتا۔

اتنا کہہ اس نے میڈل راجو کے گلے میں ڈال دیا اور زرینہ اپنے ان بہے آنسو حلق سے نگل کر واپس ہو لی۔

رات کے خاموش لمحات میں زرینہ نے پھر حساب کتاب لگایا،

راجو کو عید پر کپڑے دلوانے کیلئے کچھ پیسے جوڑے تھے،، ان کا یونیفارم آجائے گا،،

اکبر علی کا سب سے چھوٹا بچہ اسی سال دوسری کلاس میں گیا ہے، اس کی پرانی کتابیں مانگ کر کام چل جائے گا،،

ہسپتال کی تاریخ میں دو ماہ باقی ہیں، اس ماہ کی رقم سے کاپیاں اور سٹیشنری آجائے گی،،

بچت کے خلاء کو پر کرنے کیلئے لوگوں کے کپڑے سی لوں گی۔

گھر کا آنگن خالی رہتا ہے اس میں سبزیاں اگا لوں گی،، وہ خرچہ بھی بچ جائے گا،،

زرینہ نے اسی منصوبے پر اگلی صبح سے عمل شروع کر دیا،،

چند روز بعد داخلے کی آخری تاریخ کو زرینہ سب لوازمات پورے کر کے راجو کے سکول گئی اور داخلہ منظور کرلیا گیا۔

گھر واپس آ کر اس نے آنگن کی کچی زمین میں گوڈی کی اور اس میں سبزیوں کے بیج دبانے لگی۔

راجو پاس کھڑا اپنے باپ کے گولڈ میڈل سے کھیلتا ہوا سب دیکھ رہا تھا کھیلتے کھیلتے اس نے زرینہ سے پوچھا۔

امی امی،، جے تیا تل لئی او۔

(امی امی یہ کیا کر رہی ہو۔)

سبزیاں اگا رہی ہوں راجو۔

جے شنز یاں تیسے اوتی ایں۔

(یہ سبزیاں کیسے اگتی ہیں،،)

ان کے بیج زمین میں دبا رہی ہوں۔ کچھ دن بعد پودے نکل آئیں گے اور پھر ان پر سبزیاں اگ آئیں گی جنہیں ہم مزے سے کھائیں گے،،

زرینہ نے آلو کی آنکھ والا ٹکڑا مٹی میں دباتے ہوئے جواب دیا اور پانی والا برتن اٹھا کر نلکے تک چلی گئی۔

وہ واپس آئی تو راجو اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے مٹی ہموار کر رہا تھا،

کیا کر رہے ہو راجو۔ زرینہ نے لاڈ سے پوچھا،

میں نے بھی بید دابا اے۔ اس پل میلے میتے پلاتے ادیں دے۔

(میں نے بھی بیج دبایا ہے،، اس پر میرے میٹھے میٹھے پراٹھے اگیں گے)

راجو کا جواب دل پر کچوکے سے لگا گیا۔ زرینہ نے راجو کے بال سہلاتے ہوتے پوچھا۔

اور یہ میٹھے پراٹھوں کا بیج کہاں سے آیا۔

وہ ابو تا دولد میدل تھاناں۔ بالکل میتے پلاتوں دیسا تا۔ میں نے اسے داب دیا۔ اب تو لے دنوں میں اس پل بوت سارے میتے پلاتے ادیں دے اول میں لوز تھایا تلوں دا،

(وہ ابو کا گولڈ میڈل تھاناں۔ بالکل میٹھے پراٹھوں جیسا تھا۔ میں نے اسے دبا دیا۔ اب تھوڑے دنوں میں اس پر بہت سارے میٹھے پراٹھے اگیں گے اور میں روز روز کھایا کروں گا۔)

راجو کو معصوم سا جواب زرینہ کے ضبط کا بندھن توڑ گیا۔

وہ کچے فرش پر دوزانو ہو کر ہچکیوں سے رونے لگی تو اسے دیکھ کر راجو کی آنکھوں سے بھی ستارے بہہ نکلے۔ جنہیں وہ اپنی نئی شرٹ کی آستین سے پونچھنے لگا۔

کالے کھدر کے کپڑے کی یہ شرٹ اس کی ماں نے کل ہی شہید باپ کی پرانی وردی کاٹ کر بنائی تھی۔

ہو جذبۂ عشق گر

فاطمہ عبدالخالق

دشمن کی اور وطن پرستوں کی حکمت عملی میں زیادہ فرق نہیں ہوتا دونوں کا مقصد ایک دوسرے کو نقصان پہنچا کر زمین پر قبضہ کرنا ہوتا ہے اگر فرق ہوتا ہے تو ایمان کا مسلمان جذبہ ایمان کے تحت لڑتا ہے اور اسلام دشمن صرف دنیاوی جذبوں کا اسیر ہوتا ہے۔

نئے افق کے قارئین کے لیے بطور خاص

حکم اذن تھا کہ چاند بھی بادلوں کی اوٹ میں چھپ گیا تھا چار سو گہری تاریکی کا راج تھا، بھاگتے دوڑتے قدموں کی چاپ میں اب چیخ و پکار بھی شامل ہو چکی تھی، یکا یک چلنے والی ہلکی ہلکی ہوا نے جس زدہ فضا کو آزادی کی سند بخشی اور دیکھتے ہی دیکھتے خوشگوار ہوا کے جھونکے جنگل کی تاریکی کے ساتھی بن گئے اور چھم چھم بارش کی بوندیں گرنے لگیں موسم کا ایک دم پلٹا کھا جانا ان لوگوں کے غیض و غضب میں اضافے کا سبب بنا تھا، آثار بتا رہے تھے کہ اگر موسم یونہی برقرار رہا تو ان کی شکست لازم ہے، لفظ شکست کی بازگشت نے اشتعال کی جانب قدم بڑھا کر سبھی کے خون کر مادیئے اور جذبۂ جوش سے گھپ اندھیرے میں سمت کا تعین کیے بنا بندوقوں کے دھانے کھل گئے لیکن بھاگنے والے نے پیچھے مڑ کر دیکھنے کی بجائے اندھا دھند دوڑ جاری رکھی اسے ہر حال میں مطلوبہ جگہ تک پہنچنا تھا، غار کے دھانے کے قریب پہنچا ہی تھا کہ اچانک کسی نے اسے پیچھے سے دبوچ لیا، اسے دھکا دے کر نیچے گراتا وہ غار میں داخل ہو چکا تھا۔

پکڑو پکڑو جانے نہ پائے، آج یہ بچنے نہ پائے، سب ادھر آؤ وہ اس غار میں چھپا ہے غار کے باہر شور و غل مچ چکا تھا۔

"ہم تمہیں دس منٹ کی مہلت دے رہے ہیں اگر تم باہر نا آئے تو ہم اس غار کو بم سے اڑا دیں گے"

لاؤڈ اسپیکر پر انڈین آرمی کے چیف کی آواز جنگل کے سناٹے کو چیرتی ہوئی اس کے کانوں تک پہنچی تھی وہ یہ وارننگ سن کر ایک لمحے کے لئے بھی نہیں گھبرایا بلکہ ایک مبہم سی مسکراہٹ نے اس کے لبوں کو چھوا تھا، غار کے اندھیرے میں جس قدر تیزی سے وہ بھاگ سکتا تھا بھاگ رہا تھا گھپ اندھیرے میں ڈوبی لمبی چوڑی غار کے عین وسط تک پہنچنے کے لئے اسے پورے نو منٹ اور پچاس سیکنڈ لگے تھے فوراً ہی اس نے مخصوص بھاری پتھر کو ہٹایا اور چھلانگ لگا دی جس لمحے وہ پھسلتا ہوا غار کے عقب میں بنے دریا تک پہنچا غار کے ٹکڑے ٹکڑے ہو چکے تھے۔ اگر اسے دس سیکنڈ کی بھی دیر ہو جاتی تو شاید وہ بھی اس دھماکے میں مارا جاتا اور اس کا فولادی جسم غار کے پتھروں میں راکھ کا ڈھیر بن چکا ہوتا لیکن ایک بار پھر سے وہ انڈین آرمی کو شکست دینے میں کامیاب رہا تھا۔ مسکراتے ہوئے اس نے نیلی چھتری والے کی جانب نظر اٹھائی اور دریا میں تیرتا ہوا اسے پار کرتے ہوئے پاکستان کی سرحد میں داخل ہوا تھا غوطہ خوری کی کی گئی مشقیں آج اس کی معاون ثابت ہوئیں تھیں۔ یہ میجر شیر علی تھا جو پاک آرمی کا داہنا باز و سمجھا جاتا تھا انتہائی تیز ترین اور عقل مند دماغ کا حامل شیر علی کئی بار انڈین آرمی کو ناکوں چنے چبوا چکا تھا۔ انڈین ایجنسی را کی سازشوں کو ناکام کرنے کے لئے اپنی جان ہتھیلی پہ لئے پھرتا تھا حقیقتاً وہ اپنے نام ہی کا پرتو تھا را والے اس کے سائے سے بھی گھبراتے تھے اس کے سر کی قیمت کروڑوں لگ چکی تھی مگر کوئی بھی اسے زندہ یا مردہ گرفتار نہیں کر پایا

تھا۔ آج زندگی میں پہلی بار کسی نے اسے پہچان لیا تھا اور اس کی مخبری ہوئی تھی لیکن وہ چونکہ ہمیشہ واپسی کا راستہ پہلے تیار رکھ کر دشمنوں کے نرغے میں گھستا تھا اس لئے آج تک دشمن اسے پکڑنے میں ناکام رہے تھے۔ رشیر علی کی بدولت چونکہ دشمنوں کی سازشیں ہمیشہ ناکام ہوتی تھیں، جس کی بنا پہ وہ مزید تلملا جاتے تھے۔ آج بھی ہمیشہ کی طرح وہ اپنے مشن میں کامیاب و کامران لوٹا تھا اور دشمنوں کو حقیقتاً دھول چٹائی تھی اس لئے پاک سرزمین پر قدم رکھتے ہی وہ اللہ کے حضور جھک گیا یہ اس کی پرانی عادت تھی کہ ہر کامیابی کے بعد اللہ کا شکر ادا کرنے کے دو نوافل ضرور پڑھتا تھا۔

.....☆☆.....

السلام علیکم سر کیا میں اندر آسکتا ہوں؟ شیر علی اجازت طلب نظروں سے جنرل علی عثمان کو دیکھ رہا تھا۔

علی عثمان صاحب کے لبوں پہ مسکراہٹ رینگی اور انہوں نے سر اثبات میں ہلایا، گویا وہ اس کی عادت سے واقف تھے تھوڑا آرام کر لیتے شیر علی، ابھی تو تھکے ہارے لوٹے ہو۔

" آرام کرنے والی قومیں سست ہو جاتی ہیں اور ان کی سستی ہی انہیں لے ڈوبتی ہے اس لئے کام کو وقت پہ ہی انجام دینا چاہیئے یہ میرے والد محترم کہتے ہیں اور میں ان ہی کی پیروی کرتا ہوں۔'' شیر علی مسکراتے ہوئے بولا۔

جنرل صاحب کے ہونٹ ایک لمحے کے لئے مسکرائے تھے۔

مشن کیسا رہا؟

بہت سیریس مسئلہ ہے سر، ہمارے وطن کے خلاف بہت بڑی سازشیں کی جا رہی ہیں اور آج اسی سازش کا ایک سرا میرے ہاتھ آیا ہے میں جلد از جلد آپ سے گمبھیر مسئلہ شیئر کرنا چاہتا ہوں لیکن اس سے پہلے میں چاہتا ہوں کہ آپ قومی سطح پر میری موت کی خبر پھیلا دیں تاکہ ہمارے مشن کی راہ میں کوئی رکاوٹ نا آئے..

علی عثمان صاحب کو شیر علی کی بات سن کر یک دم شاک سا لگا کیا مطلب شیر علی ایسا کیوں کر کیا جائے؟ جنرل صاحب سنبھلتے ہوئے گویا ہوئے۔

میری وہاں مخبری کی گئی تھی اور راو والے جانتے ہیں کہ میں ان کی سازشوں سے آگاہ ہو چکا ہوں اس لئے وہ اپنا منصوبہ بدل کر وار کر سکتے ہیں اس لیے چونکہ ان کی نظروں میں، میں مر چکا ہوں اس لئے بہتر یہی ہے ان کو میری موت کا یقین آجائے تاکہ میں اپنے وطن کو را کی گھناؤنی سازشوں کا شکار بننے سے بچا سکوں شیر علی اپنے ازلی جوش و جذبے سے بول رہا تھا۔

اور تمہارے گھر والے.. تمہارے والدہ کیا وہ یہ صدمہ برداشت کریں گی؟

میری ماں بہت بہادر ہے سر جی، جس کے سر کا تاج پاک وطن کی حفاظت میں دن رات جتا رہے جس کے دو بیٹے جام شہادت نوش فرما چکے ہوں اس کے لئے یہ صدمہ نہیں خوشخبری ہے سر جی۔

اور تمہاری بیوی اور دونوں بچے؟ ان کے بارے میں کیا کہو گے؟

بچے بھی تو اسی ملک کی امانت ہیں ان کی جانیں وطن کی سلامتی پہ ہی قربان ہوں گی میری شریک حیات بہت بہادر

ہیں جس کے پاس مستقبل کے دو فوجی تیار ہو رہے ہیں، میری شہادت کو اپنی خوش نصیبی سمجھیں گی۔

اور تمہارے والد صاحب؟ جنرل صاحب شاید ہر طرح سے اس کا امتحان لے رہے تھے یا اپنی تسلی کر رہے تھے بھی سوال پہ سوال کئے جا رہے تھے

اب کی بار سوال سن کر شیر علی مسکرایا تھا میرے والد کو سر جی آپ سے بہتر کون جان سکتا ہے؟ میں اب گمنام سپاہی رہ کر کام کرنا چاہتا ہوں یہی میری خواہش ہے اور میں امید رکھتا ہوں آپ میری خواہش کا احترام کریں گے۔

ٹھیک ہے برخوردار! ہم ملک کی بھلائی کی خاطر تمہاری خواہش کا احترام کرتے ہیں..

چنانچہ فوج کی جانب سے میڈیا کو خبر پہنچا دی گئی تھی خبر سن کر شیر علی کی ماں اور بیوی مسکرا رہی تھیں کیونکہ ان کے نزدیک وہ دونوں خوش قسمت ترین عورتیں تھیں جو شیر علی سے نسبت رکھتی تھیں۔

......☆☆......

ہاہاہاہا آج خوب جشن ہونا چاہیئے مہتا جی...

دھرمیندر نے جام سے جام ٹکراتے ہوئے فلک شگاف قہقہہ لگاتے ہوئے خوشی کا اظہار کیا تھا...

پتہ نہیں دھرمیندر میرا دل نہیں مان رہا کہ وہ اتنی آسانی سے مر گیا ہے میرا من کہہ رہا ہے وہ زندہ ہے۔

اوئے مہتے اس وقت بدشگونی نہ کر، بس جشن منا ہمارا سب سے بڑا دشمن ہمارے ہاتھوں مر گیا ہے اور یہی سچ ہے دیکھ وہ دیکھ ٹی وی پہ کیسے لوگ اس کی موت کا اعلان کر رہے ہیں دیکھ اپنے دشمنوں کے ملک کا ہر چینل دیکھ لے سالے (دھرمیندر نے ایک موٹی سی گالی دی) اپنے ہی ملک کے ہیرو کی موت کو بریکنگ نیوز بنا دیتے ہیں دھت تیرے میڈیا کی دھرمیندر شراب میں مست اوٹ پٹانگ بول رہا تھا۔

جشن تو میں بھی منانا چاہتا ہوں لیکن ہم نے اس کی لاش کو اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا پھر کیسے مان لیں وہ مر گیا مہتا کمار جیسے کچھ سوچتے ہوئے بولا تھا۔

مہتا اسے اب بھول جا غار کے پتھروں میں وہ بھی راکھ کا ڈھیر بن چکا ہے لے جام پکڑ پی اور جشن منا دھرمیندر مہتا سے شراب کا جام پکڑاتے ہوئے بولا۔

یار دھرمیندر رے یہ مسلے سالے ان کا دماغ بڑا تیز ہوتا اس پہاڑی جنگل کی دوسری طرف دریا بھی بہتا ہے ہو سکتا ہے اس نے وہاں کوئی راستہ بنا رکھا ہو کوئی سرنگ وغیرہ اور وہ وہاں سے اپنے ملک چلا گیا ہو...

مہتے تجھے وہم ہو گیا ہے اور وہم کا کوئی علاج نہیں ہوتا وہ مر گیا ہے میرا دل کہتا ہے دھرمیندر اپنے سینے پہ بائیں جانب ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔

میں تو کہتا ہوں ہم اپنا منصوبہ بدل لیتے ہیں دھرمیندر نہیں مہتا نہیں.. میرا برسوں پرانا خواب پورا ہونے جا رہا ہے میں اس وطن کو جڑ سے اکھڑا ہوا دیکھنا چاہتا ہوں میرے سینے میں شعلے دہکتے ہیں جن کی آگ اسے جلا کر راکھ کرنا چاہتی ہے جس قدر جلدی ہو سکے ہمیں اپنا مشن پورا کرنا ہے۔

دھیرج رکھ دھرمیندر سنگھ.. جلدی میں کہیں تو موت کے منہ میں نہ چلا جائے تو جانتا ہے ہر بار وہ ہمارے منصوبے کو ناکام بنا دیتے ہیں میں نہیں چاہتا اس بار بھی ہم ناکام ہوں اس لئے تجھے کہہ رہا ہوں ضد نہ کر میری بات مان لے اور منصوبہ بدل لیتے ہیں۔

ہاہاہاہاہا مہتے اب وہ کچھ نہیں کر سکتے کچھ بھی نہیں ہاہاہاہا کیونکہ ان کا دایاں ہاتھ کٹ چکا ہے ابھی وہ اس غم کو منانے میں ویست (مصروف) ہوں گے یہی درست موقع ہے ہم ان پہ وار کر کے انہیں تباہ و برباد کر سکتے ہیں۔

ہاں یہ بات تو تیری بالکل ٹھیک ہے دھرمیندر ابھی ہمارے لئے سنہری موقع ہے ہمیں اس موقعے سے فائدہ اٹھانا چاہیئے تا کہ ہم اپنا برسوں پرانا خواب پورا کر سکیں اور پھر ہمیں راوالے بڑا عہدہ بھی دیں گے اور ہمارے پاس ملک میں سب سے طاقت ہو گی خوب عیش کریں گے ....ہاہاہاہا... چیس..... جام سے جام ٹکرایا... مئے سے مدہوش بدمست ہاتھی کی طرح وہ لڑکھڑا کر گر چکے تھے۔

......☆☆......

''اب خوش ہو شیر علی؟ جیسا تم چاہتے تھے میں نے ویسا کر دیا ہے......!'' جنرل علی عثمان بولے۔

''جی سر: میں اس کے لئے آپ کا شکر گزار ہوں۔

علی عثمان زیر لب مسکرائے مشن کو ڈسکس کر لیں یا کچھ دیر آرام کرنا چاہو گے؟

نہیں سر میں مشن کو ہی ڈسکس کرنا چاہتا ہوں۔
مجھے تم سے یہی امید تھی نوجوان... جنرل صاحب بولے

شیر علی نے جیب سے ایک نقشہ نکالا اور اسے میز پر رکھ دیا ایک جگہ پہ نشان لگایا۔
سر یہ افغانستان کا وہ علاقہ ہے جہاں بھارتی فوجی افغانوں کے بھیس میں رہتے ہیں اور یہ ہمارا خیبر پختونخواہ ہے۔'' شیر علی نے ایک اور جگہ نشان لگایا اور یہ وہ پہاڑ ہے جہاں ہماری سرحدی چوکی ہے اور یہ وہ جگہ ہے جہاں افغانستان، ہمارے خیبر پختونخواہ کی سرحد سے ملتا ہے شیر علی نے سرخ رنگ کا نشان واضح کر کے جگہ کی نشاندہی کی جس کا مطلب تھا یہی وہ جگہ ہے جہاں خطرہ ہو سکتا ہے...
جنرل علی عثمان صاحب انتہائی غور سے شیر علی کی بات سن رہے تھے...
''اب را کا پلان بتاتا ہوں جو میں نے سنا تھا، افغانوں کے بھیس میں بھارتی یہاں خیبر پختونخوا میں آئیں گے اور اس جگہ سے کہیں سرنگ کھودی جا رہی ہے... یہ بھی ہو سکتا ہے یہ کسی مکان سے کھودی گئی ہو یا ہو سکتا ہے کوئی بزنس کی آڑ میں اسے سرانجام دے رہا ہو اور یہ سرنگ کھودتے ہوئے وہ اس محل تک جائیں گے جہاں اس وقت بھاری فوجی افغانوں کے بھیس میں موجود ہیں ہیں پھر اس محل سے ہمارے خیبر پختونخواہ میں اسی سرنگ کے ذریعے منشیات، ٹائم بم تیار کرنے کا سامان اور اسلحہ اسمگل کیا جائے گا اور پھر افغانستان سے یہاں موجود پاکستانی تھیس بھرے انڈین افسران تک پہنچایا جائے گا اور ہمارے پاک وطن کو عبرت کا نشان بنانے کا منصوبہ بنا رہے ہیں پھر شیر علی نے ایک فلیش اپنی جیکٹ کی خفیہ جیب سے نکالی اور اسے لیپ ٹاپ آن کر کے اس کے ساتھ منسلک کیا اس میں ان تمام لوگوں کی ڈیٹیل ہے جو انڈیا یعنی را کے لئے کام کرتے ہیں... یہ انکرپٹ فائل ہے اسے ڈیکرپٹ کرنا پڑے گا اس کے لئے میں نے ارسلان نامی ایک لڑکے کو جو کہ آئی ٹی کا ماہر ہے، بلایا ہے تاکہ وہ ہمارے سامنے بیٹھ کر اسے Decript کر سکے تاکہ یہ راز فائل کھولنے والا بھی نہ جان سکے، کیونکہ میں چاہتا ہوں یہ راز جس قدر کم لوگوں کے علم میں ہوگا ہمارا مشن اتنا ہی زیادہ کامیاب رہے گا اگر آپ کی اجازت ہو تو میں اسے اس ساؤنڈ پروف کمرے میں بلا سکتا ہوں؟ وہ باہر بیٹھا میرا انتظار کر رہا ہے۔
جنرل صاحب نے اثبات میں سر ہلایا تھا گویا ان کی طرف سے اجازت ہے۔
شیر علی اٹھا اور باہر نکل گیا دو منٹ بعد وہ جب اندر داخل ہوا تو اس کے ساتھ نوجوان بھی تھا جس کے چہرے پہ ہلکی ہلکی داڑھی تھی اور چہرے پہ دبا دبا جوش تھا، جس کا نام شیر علی نے ارسلان بتایا تھا۔
ارسلان نے آگے بڑھ کر جنرل صاحب سے مصافحہ کیا اور بولا سر یہ میری خوش نصیبی ہے کہ میں آج آپ سے مل رہا ہوں میں آپ کا بہت بڑا شیدائی ہوں۔ آپ کا نام سن کر ہی میں سیر کے بل دوڑا چلا آیا مجھے آپ سے ملنے کی بہت چاہت تھی یہ میری خوش نصیبی ہے کہ میں آپ کے کام آسکوں کچھ الفاظ اس نے شیر علی کی شہادت کی شان میں بھی کہے اس بات سے بے خبر کہ اس کے ساتھ میک اپ میں شیر علی ہی بیٹھا ہوا ہے۔
''یہ ایک فلیش ہے نوجوان! اس کی فائلز Encrypt ہیں اسے DeCrypt کرنے کے لئے ہمیں تمہاری مدد چاہئے تمہیں یہاں بلانے پہ ہم معذرت خواہ ہیں لیکن ہم مجبور ہیں اس لئے آپ کو بلانا پڑا کیونکہ ہمیں معلوم ہے کہ تم یہ کام احسن طریقے سے سرانجام دے سکتے ہو علی عثمان بولے تھے۔
''جی سر آپ کو معذرت کرنے کی ضرورت نہیں، میں آپ کے لئے کوئی بھی کام کرنے کے لئے تیار ہوں یہ تو ایک معمولی سا کام بتایا آپ نے۔'' ارسلان نے چٹکی بجاتے ہی گویا مسئلہ حل کرنے کا سائن دیا۔ لہجے میں دبا دبا جوش و خروش تھا۔
خاموش بیٹھے علی شیر نے لیپ ٹاپ کو ساتھ بیٹھے ارسلان کی طرف کھسکایا۔
ارسلان کے ہاتھوں کی انگلیاں ٹک ٹک لیپ ٹاپ کے کی بورڈ پہ تھرکنے لگیں کمرے میں ٹک ٹک کی آواز کے سوا مکمل خاموشی تھی...
اسی ٹک ٹک میں آدھا گھنٹہ گزر گیا اس دوران میں شیر علی کی نظریں مسلسل اسکرین پہ ہی تھیں ٹھیک اکتیس منٹ بعد ارسلان نے لیپ ٹاپ واپس شیر علی کی طرف کھسکایا

تھا، فائل اوپن ہوگئی تھی۔

''اب آپ جاسکتے ہیں اس کا معاوضہ آپ کو دیا جائے گا لیکن یاد رہے اس بات کا ذکر کسی سے نہ کیا جائے۔''

''جی سر بہتر جو حکم۔'' ارسلان مصافحہ کرتے ہوئے اجازت ملتے ہی اٹھ گیا کیونکہ کمرے میں چھائی خاموشی اسے بتا رہی تھی کہ کوئی گمبھیر مسئلہ ہے ارسلان کے باہر نکلتے ہی شیر علی نے لیپ ٹاپ جنرل صاحب کی طرف بڑھایا اور خود بھی اٹھ کر ان کی دائیں جانب آ کھڑا ہوا۔

لیکن جب لسٹ اوپن کی گئی تو نام پڑھتے ہوئے، شیر علی اور جنرل صاحب کے لئے ایک شاک تھا

مشہور ٹی وی چینل کا مالک سرفراز عرف نجو انڈیا کا آدمی تھا، پچیس افراد چھوٹے چھوٹے گاؤں کی مسجدوں کے امام در پردہ بھارتی آدمی تھے جو بچوں کے برین واش کر کے انہیں نیکی کا لالچ دیتے ہوئے ان سے دھماکے کروانے کے لئے باقاعدہ تیار کرتے تھے، گورنمنٹ یونیورسٹی کا کیفے کا مالک بھارتی آدمی تھا جس پہ منشیات کھانے میں ملانے کا شبہ تھا، یہ تو بہت خطرناک معلومات ہیں علی عثمان بولے تھے۔

شیر علی نے خاموش رہنے پہ اکتفا کیا تھا۔

فائل میں کل ملا کر مختلف جگہوں پہ بکھرے سو افراد کے نام بمعہ تصاویر اور ان کی ڈیٹیل معلومات تھیں جن میں ایک پارلیمنٹ کا آدمی اور چار ایم این اے بھی شامل تھے یہ سو کے سو افراد وہ نمک حرام لوگ تھے جو اسی پاک وطن کی تھالی میں کھاتے ہوئے چھید کر رہے تھے ایسی ہی کالی بھیڑیں ایمان بیچ کر ملک کا سودا کرتی ہیں۔''

''اب کیا منصوبہ ہے شیر علی؟'' جنرل صاحب نے میجر شیر علی سے اس کی منصوبہ بندی کو جاننا چاہا۔

میرا منصوبہ یہ ہے کہ ان سو افراد پہ سول یونیفارم میں پولیس کی نظر رکھیں اور موقع ملتے ہی انہیں اٹھا کر ہیڈ کوارٹر لایا جائے دوسرا ہم اس پہاڑ والی چوکی کے ساتھ والی جگہ جہاں سرخ نشان لگایا تھا انگلتے رکھتے ہوئے بولا ہمارے پاکستانی پختون باشندے بن کر نگرانی کریں گے اور کسی بھی مشکوک سرگرمیوں کی اطلاع فراہم کریں گے اگر کوئی سرحد پار کر کے آئے تو ان کی نگرانی کرتے ہوئے دیکھتے ہی ان پر ہاتھ ڈالا جائے گا۔

منصوبہ بندی تو بہت اچھی ہے شیر علی لیکن ہوسکتا ہے انہوں نے اب تک سرنگ بنالی ہو؟

یہاں سے وہاں کا فاصلہ ایک سو پچاس کلومیٹر ہے اس میں کافی دن لگ سکتے ہیں اور دوسرا میں نے جوان کی باتیں سنی تھیں اس کے مطابق کام ابھی جاری ہے اور ہمیں اس کام کو ختم ہونے سے پہلے پہلے تک جگہ کی نشاندہی کرنی ہے اس کے لئے ہم سویلین بھیس میں خیبر پختونخواہ میں جائیں گے اور ان شاء اللہ اس بار بھی فتح ہمارا مقدر بنے گی۔ شیر علی جوش و خروش سے بول رہا تھا

''ٹھیک ہے پھر اسی منصوبے کے مطابق ایکشن لیا جائے گا جنرل علی عثمان نے شیر علی کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے جواب دیا جاؤ اب کچھ دیر آرام کر لو نوجوان.....!''

شیر علی مسکراتے ہوئے ساؤنڈ پروف کمرے سے باہر نکل گیا۔

.....☆☆.....

روشن دان سے چھن چھن کر آتی سورج کی کرنیں جب مہتہ کمار اور دھرمیندر سنگھ کے چہرے پہ پڑھیں تو وہ مدہوشی سے ہوش کے سفر کی جانب واپس لوٹ آئے دھرمیندر نے آنکھیں ملتے ہوئے گھڑی کی جانب نگاہ اٹھائی دن کے بارہ بج چکے تھے۔

اوہ اتنا وقت بیت چکا تھا..

دھرمیندر اور مہتہ کمار نے باری باری فریش ہو کر ناشتے سے بھرپور انصاف کیا اور اپنے مخصوص تھیلوں سے میک اپ کا سامان نکال کر چہرے کے نین نقش بدلے حلیہ کیا بدلا تھا کہ اب وہ کہیں سے بھی رات والے دھرمیندر اور مہتا کمار نہیں لگ رہے تھے بلکہ افغانوں کا روپ دھار چکے تھے

مہتا تمہارا نام اب سے جب تک مشن پورا نا ہو جائے تیمور ہے اور میرا نام قاسم ہے نام مت بھولنا ٹھیک ہے؟ اور یہی ہمارے کوڈ ہیں مہتا نے اثبات میں سر ہلایا

اور سامان منی بیگز میں سمیٹتے ہوئے وہ آہستہ آہستہ خیبر پختونخواہ کی سرحد کی جانب بڑھنے لگے

چھپتے چھپاتے سرحد پار کرتے وہ خیبر پختونخواہ میں داخل ہو چکے تھے

خیبر پختونخواہ میں داخل ہوتے ہی انہیں وجے ورما سے رابطہ کرنا تھا منصوبے کے مطابق ان کا گرگا وجے ورما

وہاں پہنچ کر ایک مکان کرایے پہ حاصل کر چکا تھا لیکن اس سے پہلے وہ اپنے تھیلوں سے سامان نکال کر پختون باشندوں کا بہروپ لینا نہیں بھولے تھے۔

وجے ورما سے رابطہ کرنے کے بعد وہ اس مکان کو تلاش کرتے ہوئے بالآخر وہاں تک پہنچ ہی گئے تھے ارے واہ وجے تم نے بہت اچھا کام کیا تمہیں کوئی مسئلہ تو نہیں ہوا یہ مکان لیتے ہوئے یا کسی کو تمہاری طرف کوئی شک وشبہ تو نہیں ہوا...

مہتا کمار نے بیٹھتے ہی سب سے اپنی تسلی چاہی تھی۔

نہیں باس میں نے انہیں بتایا کہ میں ایک ریسرچ کمپنی کی جانب سے بھیجا گیا ہوں یہ معصوم لوگ آسانی سے بیوقوف بن جاتے ہیں، اس کے ساتھ ہی تینوں کا فلک شگاف قہقہہ فضا میں بلند ہوا تھا۔

یوں ہی قہقہے لگاتے ہوئے کھانا تناول کیا گیا، جونہی کھانے کا اختتام ہوا دھرمیندر بولا

"اب ہم کچھ دیر آرام کرنا چاہیں گے وجے تم باہر جا سکتے ہو اور ہمیں کافی کے دو کپ بنا کر بھجوا دینا" وجے مسکراتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا

کافی کے کپ تیار کرتے ہوئے وجے ورما مخصوص پاوڈر ڈالنا نہیں بھولا تھا...

کافی کمرے میں موجود اکلوتی ترپائی پر رکھ کر جونہی وہ سیدھا کھڑا ہوا، دھرمیندر سنگھ نے اسے باہر جانے کا اشارہ کیا، وجے ورما مسکراتے ہوئے کمرے کا دروازہ پار کر گیا۔

کافی کی چسکیاں لیتے لیتے دھرمیندر سنگھ اور مہتا کمار انٹا غفیل ہو چکے تھے....

دس منٹ تک جب وہ مکمل طور پہ بیہوش ہو چکے تھے وجے ورما نے انہیں کمرے میں موجود رسی سے اچھی طرح باندھ کر گاڑی میں لادا اور اپنی منزل کی جانب روانہ ہوا تھا۔

جب ان کی آنکھ کھلی تو وہ ایک بند کمرے میں تھے جس میں نا کوئی دروازہ تھا نا ہی کوئی کھڑکی یا روشن دان گویا وہ کسی خفیہ تہہ خانے میں تھے ان کے ہاتھ پشت کی جانب کس کے بندھے ہوئے تھے رسی ایسی تھی کہ ہاتھوں کی معمولی سی حرکت پہ بھی وہ گوشت میں سوئی کی مانند چبھتی تھی۔

یہ ہم کہاں آ گئے مہتے ...دھرمیندر سنگھ شاک کی کیفیت میں بولا تھا۔

"میں نے تمہیں کہا تھا" [illegible] بات کا یقین نہیں کیا اب دیکھ لے ہو گیا ہمارا [illegible] چوپٹ اور اوپر سے ہم بھی پکڑے گئے ہیں اب ہم مار دیئے جائیں گے تمہیں میں نے کتنا سمجھایا تھا لیکن تو میری بات نا مانا اب منا لے جشن، یہ سارا کیا دھرا اسی سالے کا ہو سکتا ہے، اس کے علاوہ کون اتنی جلدی ہم پہ ہاتھ ڈال سکتا ہے۔" مہتا کمار غصے سے پھٹ پڑا تھا۔

دھرمیندر سنگھ کے حقیقتاً رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے وہ بے بسی سے مہتا کمار کو دیکھ کر رہ گیا وہ بری طرح اس چوہے دان میں پھنس چکے تھے جہاں سے بچ نکلنے کی کوئی سبیل بھی نہیں نظر آ رہی تھی۔

......☆☆......

پورے خیبر پختونخواہ میں سوکلن پھیل چکے تھے جنہیں شیر علی لیڈ کر رہا تھا۔

سارے خطے پہ گہری نظریں رکھیں کوئی بھی مشکوک نظر آئے تو اس پہ نگاہ رکھی جائے اور کوئی بھی نیا آنے والا بندہ ہو تو اس کا کھوج لگایا جائے یقیناً ان کا کوئی نا کوئی ساتھی ضرور یہاں چھپا ہوگا یا پھر آنے والا ہوگا۔

سبھی سول یونیفارم میں موجود آرمی فوجیوں تک یہ پیغام پہنچ چکا تھا سبھی ہوشیار اور چوکنے ہو چکے تھے۔

شیر علی خود بھی خیبر پختونخواہ کی گلیوں میں مٹرگشت کر رہا تھا سارا چکر لگا کر جونہی وہ واپس آیا اس کے لئے ارجنٹ کال کا پیغام کوڈ کیا گیا تھا اس نے ٹرانسمیٹر کی فریکوئنسی سیٹ کی اور شہزاد سے رابطہ کیا۔

"ہاں شہزاد بولو کیا اطلاع ہے؟ سر ہمیں ابھی کچھ دیر پہلے معلوم ہوا ہے کہ یہاں کچھ دن پہلے ایک نیا آدمی آیا ہے اس نے یہاں کے لوگوں کو بتایا ہے کہ وہ یہاں کسی ریسرچ کمپنی کی جانب سے بھیجا گیا ہے لیکن وہ کبھی گھر سے باہر نہیں نکلا نا ہی گھر میں کسی کو گھسنے دیتا ہے۔ جس چیز کی بھی ضرورت ہو فون پر آرڈر دے کر منگوا لیتا ہے

"اوہ...شیر علی کے منہ سے بے اختیار نکلا تھا۔ یہ تو بہت اہم خبر ہے.. تم جگہ کی نشاندہی کرو شہزاد، میں وہاں پہنچتا ہوں۔

یہ کون سا ریسرچ ورکر جو یہاں ریسرچ کرنے آیا ہے

اور ابھی تک گھر میں ہی محصور ہے، علی شیر نے سرگوشی کی۔

کچھ سوچتے ہوئے، اس نے جنرل علی عثمان کو فون کال ملائی اور انہیں کہا پتہ کروائیں کہ کسی ریسرچ کمپنی کی جانب سے کوئی آدمی خیبر پختونخواہ بھیجا گیا ہے یا نہیں

ٹھیک ہے میں پتہ کرواتا ہوں اس کے ساتھ ہی رابطہ کٹ کر دیا گیا۔

شیر علی اس جگہ جانے کی تیاری کرنے لگا تقریباً پندرہ منٹ بعد اس کے فون کی رنگ ٹون بجنے لگی۔

اس نے اسکرین کو دیکھا جنرل صاحب کا فون تھا وہ اسی فون کال کا انتظار کر رہا تھا۔

''یس سر کیا اطلاعات ہیں؟'' شیر علی نے فوراً سوال داغا۔

''شیر علی کسی بھی ریسرچ کمپنی کی جانب سے کوئی بھی شخص خیبر پختونخواہ نہیں بھیجا گیا بہتر ہے اس پر کڑی نگاہ رکھو اور اس سے اس کے مقاصد جاننے کی کوشش کرو۔''

''ٹھیک ہے سر۔'' اس کے ساتھ ہی رابطہ دوبارہ کٹ ہو گیا تھا۔

شیر علی فوراً مطلوبہ مقام تک پہنچا تھا شہزاد نے مکان کی نشاندہی کی سر یہی وہ مکان ہے جس میں وہ آدمی مقیم ہے۔

ٹھیک ہے شہزاد میں دستک دے کر اندر جاتا ہوں تم لوگ پیچھے ہی رہنا سامنے مت آنا جب تک میں اس پہ قابو پانے کی کوشش کرتا ہوں، اگر دس منٹ تک میری طرف سے تم لوگوں کو کوئی کاشن نہ ملے تو اندر کود پڑنا...

لیکن سر اندر موجود آدمی خطرناک بھی ہو سکتا ہے۔'' شہزاد بولا...

شہزاد.. مسلمان کبھی بھی خدا کے علاوہ کسی پہ بھروسہ نہیں کرتا ہم خدا کی امان میں ہی دشمن کے نرغے میں گھستے ہیں شیر علی نے مسکراتے ہوئے شہزاد کا کندھا تھپتھپایا اور آگے بڑھ گیا۔

دروازے پر مسلسل دستک دئے جانے کی بنا پہ اندر موجود شخص بھنایا ہوا باہر آیا۔

''جی کہیئے کیوں دروازہ پیٹ رہے ہیں۔'' وہ شخص غصیلے لہجے میں بولا

میں آپ کے ساتھ والے گھر سے آیا ہوں میری مسز نے بتایا کہ آپ یہاں کسی ریسرچ کے سلسلے میں آئے ہیں اور تنہا ہیں میں اس لئے آیا تھا کہ اگر آپ کو کسی چیز کی ضرورت ہو تو ہمیں بتایئے گا۔'' شیر علی نے شیریں لہجے میں کہا۔

''جی بہت شکریہ مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔'' نوارد نے روکھے لہجے میں کہتے ہوئے دروازہ بند کرنا چاہا تھا۔

لیکن شیر علی دروازے میں کھڑا ہو گیا کیونکہ وہ آدمی تنہا تھا، اسے اطمینان ہو چکا تھا۔

''یہ کیا بدتمیزی ہے مسٹر میں نے کہا نا کہ مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔''

''چلو اندر بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔'' شیر علی نے پستول کی نال اجنبی کے پسلیوں میں چبھوتے ہوئے سخت لہجے میں کہا

''تم مجھے یوں ہراساں نہیں کر سکتے مسٹر میں تم پر کیس دائر کر دوں گا کہ تم ایک شریف شہری کو اس کے گھر میں گھس کر دھمکی دے رہے تھے اور اس پر پستول تان کر اسے ہراساں کرنے کی کوشش کی۔ وہ درشت لہجے میں بولا۔

''چپ چاپ اندر چلو۔'' شیر علی نے اجنبی کا گریبان پکڑتے ہوئے اس اندر دھکیلا تھا ''اس پستول پر سائلنسر لگا ہوا ہے اگر میں نے گولی بھی چلائی تو کوئی تمہیں بچانے نہیں آئے گا۔

اجنبی خاموشی سے مڑا اس سے پہلے کہ وہ اپنے بچاؤ کی خاطر کوئی حرکت کرتا شیر علی نے پستول کا دستہ اس کے سر پر مارا اور وہ بے ہوش ہو کر لڑکھڑاتے ہوئے شیر علی کے بازوؤں میں جھول گیا۔

شیر علی نے بیڈ شیٹ کو پھاڑ کر اس کی رسی بنائی اور اجنبی کے ہاتھ پشت کی جانب باندھ دیئے اور منہ میں کپڑا ٹھونس کر شہزاد کو کاشن دیا کہ وہ اندر آ جائے۔

شہزاد اور اس کے ساتھ دو اور سولجرز آ گئے تھے اسے ایمبولینس میں ڈال کر وہ اپنے مخصوص ٹھکانے پر لے گئے گھر کو لاک کر دیا گیا اور اس کا سیل فون اپنے قبضے میں کر لیا گیا اجنبی کے پاس موجود دستاویزات کے مطابق اس کا نام وجے ورما تھا اس کا مذہب ہندو مت تھا لیکن وہ پاکستانی نیشنلیٹی ہولڈر تھا۔

وجے ورما کو جب ہوش آیا تو وہ ایک کرسی پر بندھا پڑا

تھا اس کے اردگرد چار لوگ موجود تھے جن میں سے ایک وہ بھی تھا جو اس کے گھر میں گھسا تھا۔

پہلا خیال تو اسے یہی آیا کہ شاید وہ پاکستانی ایجنسی کے ہاتھ لگ چکا ہے لیکن جلد ہی اس نے اپنے خوف پر قابو پاتے ہوئے کہا

''تت تم لوگوں نے مجھے کیوں پکڑا ہے؟''

''تم یہاں کس لئے آئے تھے؟ شہزاد نے سخت لہجے میں سوال داغا۔

''میں ایک ریسرچ کمپنی کی جانب سے آیا ہوں۔''

''لیکن تم تو تین دن سے گھر سے باہر نہیں نکلے پھر گھر میں محصور ہو کر کون سی ریسرچ کرنی تھی؟

''دراصل میرے دو اور ساتھی بھی آ رہے ہیں ان کا انتظار کر رہا تھا ساتھ مل کر کام کرنا شروع کریں گے۔''

وجے ورما نے خشک ہونٹوں پہ زبان پھیرتے ہوئے جواب دیا تھا

''تو تم پہلے کیوں آئے؟ شیر علی نے پوچھا۔

''میں یہاں رہائش وغیرہ کا انتظام کرنے کی نیت سے پہلے آیا تھا وجے ورما اطمینان سے بولا دل ہی دل میں وہ خوش ہو رہا تھا کہ وہ ٹھیک ٹریک پہ چل رہا ہے۔

''اوہ... تمہارے دونوں ساتھی کب تک آئیں گے؟ شیر علی نے ہونٹ سکیڑتے ہوئے پوچھا

کل یا پرسوں تک آ جائیں گے۔

تبھی شیر علی زناٹے دار تھپڑ وجے ورما کے چہرے کو سرخ کر گیا بتاؤ کس لئے آ رہے ہیں وہ سچ بتاؤ، ورنہ اتنا ماریں گے کہ تم موت کے لئے ترسو گے۔ شیر علی نے دبنگ لہجے میں کہا۔

دیکھو مسٹر تم ایک باعزت شہری سے یوں مار پیٹ نہیں کر سکتے یہ قانون کی خلاف ورزی ہے وجے ورما غصے کی شدت سے بولا

''تم سے جتنا سوال پوچھا ہے اتنا ہی جواب دو، کیونکہ ہمیں علم ہے تم کسی بھی ریسرچ کمپنی کی جانب سے یہاں نہیں بھیجے گئے دیکھو اگر تم ہمارے ساتھ تعاون کرو گے تو ہم تمہاری جان بخش دیں گے۔

اب کی بار حقیقتاً وجے ورما کے چہرے کی رنگت پھیکی پڑی تھی جسے شیر علی نے بھی بخوبی نوٹ کیا تھا لیکن پھر جلد ہی خود پہ قابو پاتے ہوئے بولا۔

''مجھے کچھ سمجھ نہیں آیا تم لوگ کیا کہنا چاہتے ہو۔''

وجے ورما مہارت سے اپنے تاثرات چھپاتے ہوئے بولا

حالانکہ تمہیں سب سمجھ آ رہا ہے، شیر علی معنی خیز لہجے میں بولا۔

شہزاد اسے ہاف آف کر کے ہیڈ کوارٹر پہنچا دو۔ شیر علی نے مخصوص اشارہ کیا تھا۔

شہزاد نے آگے بڑھ کے وجے ورما کی مخصوص رگ کو دبایا اور اس کے بیہوش جسم کو اٹھا کر ہیڈ کوارٹر جانے لگا...

جونہی شہزاد وجے ورما کو اٹھا کر رخصت ہوا شہزاد نے وجے ورما کا بہروپ لیا اور وہیں آ گیا جہاں سے وہ وجے ورما کو اٹھا کر لے گئے تھے اس گھر کی خوب تسلی سے تلاشی لی اس کے ہاتھ کافی کچھ لگا تھا اب اسے ان آنے والے دونوں آدمیوں کا انتظار تھا اسے شبہ تھا کہ یہ دھرمیندر سنگھ اور مہتا کمار ہی ہوں گے جو ہمیشہ اکٹھے ہی ہر کام سرانجام دیتے تھے بھارت میں ان دونوں کی جوڑی مشہور تھی کہ وہ کوئی بھی کام ایک دوسرے کے بغیر نہیں کرتے تھے۔

اسے یہاں آئے چار گھنٹے بیت چکے تھے ابھی تک وجے ورما کے فون کی رنگ ٹون نہیں بجی تھی نا ہی کوئی پیغام آیا تھا کئی بار اس نے موبائل کو چیک کیا سگنل بالکل ٹھیک تھے شاید وہ ابھی پہنچے نہیں تھے یونہی بیٹھے بیٹھے وہ کسی گہری سوچ میں گم ہو چکا تھا، سوچوں کی آماجگاہ سے وہ باہر تب آیا جب فون کی بیل سنائی دی اس نے فوراً لپک کر فون اٹھایا،

وجے ورما بات کر رہے ہو؟

جی باس: وجے ورما بول رہا ہوں

پائیل نے تمہیں ہمارے آنے کی اطلاع دی ہوگی؟

جی باس: میں آپ کی خدمت کے لئے حاضر ہوں میں نے یہاں ایک مکان کرایے پہ حاصل کیا ہے آپ خود آئیں گے یا میں آپ کو لینے آؤں؟ شیر علی وجے ورما کی آواز میں بولا تھا

نہیں تم وہیں ٹھہرو ہم خود آتے ہیں۔

او کے باس اور ساتھ ہی اسے فون پہ ایڈریس سمجھانے لگا

اور ہاں وجے ورما ہمارا کوڈ ورڈ تیمور اور قاسم ہوگا یاد رکھنا،

ٹھیک ہے باس، اس کے ساتھ ہی کال کٹ چکی تھی شکار چوہے دان میں پھنسنے کے لئے آرہا تھا اب اسے جو بھی ایکشن لینا تھا جلد از جلد لینا تھا۔

قریبی ہوٹل میں فون کر کے اس نے کھانے کا آرڈر دیا تقریباً بیس منٹ بعد دھرمیندر سنگھ اور مہتا کمار بھی پہنچ چکے تھے بدلے ہوئے حلیے کے باوجود شیر علی اپنے ازلی دشمنوں کو پہچان چکا تھا لیکن حکمت عملی سے کام لئے بغیر وہ کچھ نہیں کرنا چاہتا تھا کھانا بھی گرما گرم آ گیا کچن میں کھانا برتنوں میں نکالتے ہوئے دونوں کے سامنے رکھا کھانا کھانے کے بعد اس کی توقع کے عین مطابق انہوں نے اس کے سامنے کوئی بات نہیں کی تھی کھانا تناول کرنے کے بعد انہوں نے اسے باہر جانے کا حکم دیا تھا اور کافی بھجوانے کا حکم دیا وہ مسکراتے ہوئے باہر نکل آیا تھا۔

کافی میں بے ہوشی کی دوا مکس کر کے وہ سلیقے سے انہیں پیش کرتا کمرے سے باہر نکل آیا تقریباً پندرہ منٹ بعد جب وہ دوبارہ کمرے میں داخل ہوا دونوں فرش پہ اٹا غفیل پڑے تھے شیر علی نے مسکراتے ہوئے الماری میں موجود نائیلون کی رسی سے دونوں کو کس کر باندھا اور گاڑی کی پچھلی سیٹ پر پھینکا اور فرنٹ سیٹ پہ آ بیٹھا گاڑی فراٹے بھرتی ہیڈ کوارٹر کی جانب گامزن تھی۔

☆☆

شیر علی نے گھر پہنچتے ہی سب سے پہلے اپنے چہرے سے وجے ورما کا بہروپ الگ کیا تھا اور فریش ہونے کے بعد شیر علی جب خفیہ تہہ خانے میں داخل ہوا دھرمیندر سنگھ اور مہتا کمار کو ہوش آ چکا تھا۔

شیر علی کو دیکھ کر دونوں نے نفرت کا اظہار کرتے ہوئے ہونٹ سکیڑے تھے۔

اور سناؤ، دھرمیندر سنگھ اور مہتا کمار جی کیسے ہیں آپ؟ کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتائیں ہم آپ کی سیوا میں کوئی کوتاہی نہیں کریں گے۔ شیر علی مسکراتے ہوئے کہہ رہا تھا آنکھوں میں وہی الوہی چمک تھی۔

اور وہ دونوں شیر علی کی مسکراہٹ پہ تلملائے، میری بدقسمتی ہے جو تو زندہ بچ گیا دھرمیندر سنگھ زمین پر تھوکتے ہوئے بولا۔

اور میری خوش قسمتی ہے کہ تم لوگوں نے آسانی سے مجھے مردہ تصور کر لیا شیر علی مسکراتے ہوئے بولا۔

شیر علی کی مسکراہٹ نے جلتی پہ تیل کا اثر دکھایا ہو نہہ سالے مسلے تو ہمارے ہاتھوں ہی مرے گا۔ اب کی بار مہتا کمار نفرت کی چنگاری میں بھڑکا تھا

تم لوگ یہاں سے واپس جا سکو گے تو ہی کچھ کر پاؤ گے۔

ہمارے ساتھی تمہاری حکومت پہ اتنا دباؤ ڈالیں گے کہ تمہیں ہمیں زندہ سلامت چھوڑنا ہی پڑے گا، ہاہاہاہا دھرمیندر سنگھ کا قہقہہ فضا میں بلند ہوا تھا۔

کتے کی دم کبھی سیدھی نہیں ہوتی علی شیر نے دھرمیندر سنگھ پہ طنز کیا تھا۔

جواباً دھرمیندر سنگھ کا ایک اور بلند آواز قہقہہ کمرے کی فضاؤں میں بلند ہوا تھا۔

سنو دھرمیندر سنگھ اور مہتا کمار ہماری حکومت بری ہو یا بھلی ہمارے معاملات ہم خود ہینڈل کرنا جانتے ہیں اور ویسے بھی کہیں بھی کوئی ثبوت ایسا نہیں ملے گا جو ظاہر کرے کہ تم میری قید میں ہو اور ہاں سب سے لازمی بات یہ میرا خفیہ تہہ خانہ ہے یعنی شیر علی کا خفیہ تہہ خانہ جس کا علم میرے علاوہ کسی کو نہیں ہے سو تم لوگ یہیں گل سڑ کر مرنے کے لئے تیار ہو جاؤ کیونکہ اب کی بار تم لوگوں کو معاف کرنا ایک صریح غلطی ہو گی اور ہاں تم لوگ میری قید میں ہو اس کا علم تو میرے جنرل تک کو نہیں ہے تو سوچو زرا تمہیں یہاں شیر کی کچھار سے کون رہا کروانے آئے گا؟

شیر علی کی باتیں سن کر دھرمیندر سنگھ اور مہتا کمار کا رنگ فق ہو گیا تھا۔

دونوں نے چیخنا چلانا اور گالیاں نکالنا شروع کر دیں۔

جتنا مرضی بلند آواز میں چیخو! تمہاری آواز تہہ خانے کی دیواروں سے ٹکراتی ہوئی واپس تمہارے اپنے کانوں تک ہی پہنچے گی۔

ہاں اگر تم مجھے کھودی جانے والی سرنگ کی نشاندہی کر دو تو میں تمہاری جان بخش دوں گا شیر علی بولا

ہاہاہاہاہا دھرمیندر سنگھ کا قہقہہ فضا میں بلند ہوا مہتا کمار نے بھی ساتھ دینا مناسب سمجھا تھا تم ہمارے ٹکڑے ٹکڑے

بھی کر دو تو ہم تمہیں نہیں بتائیں گے،
تم ہمیں جتنی مرضی اذیت دو ہماری زبان نہیں کھلوا سکو گے۔

ٹھیک ہے پھر یہاں بھوکے پیاسے مرنے کے لئے تیار رہو۔

یہ کہتے ہوئے شیر علی نے جیکٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا اس کے ساتھ ہی دیوار نما دروازہ کھلا اور شیر علی ہاتھ ہلاتے ہوئے دروازہ پار کر گیا جونہی وہ اپنے بیڈروم میں داخل ہوا پیچھے تہہ خانے کا دروازہ دوبارہ دیوار بن چکا تھا شیر علی مطمئن تھا دو بڑے دشمن ملک کی تنظیم کے سرغنے اب شیر علی کے قبضے میں تھے وہ جانتا تھا وہ کبھی بھی اپنی زبان نہیں کھولیں گے ان کی سزا یہی تھی کہ وہ بھوکے پیاسے مر جاتے بے شک وہ دشمن تھے مگر وہ کوئی جسمانی تکلیف نہیں دے سکتا تھا نا ہی انہیں گولی مار سکتا تھا اب اسے اپنے بل بوتے پہ ہی اس سرنگ کا پتہ لگانا تھا لیکن کیا کیا جائے یہی سوچ سوچ کر دماغ شل تھا اچانک اس کے دماغ میں ایک خطرناک ترکیب آئی، اگرچہ اس میں اس کی جان کو خطرہ تھا لیکن پیارے وطن اور اس کے باسیوں کی سلامتی کا جذبہ ہر جذبے پہ حاوی آ چکا تھا۔

.....☆☆.....

وجے ورما بھوک پیاس کی شدت کو برداشت نہ کرتے ہوئے بیہوش ہو چکا تھا، شیر علی نے اس کے حلق میں پانی انڈیلا، حلق میں پانی اترتے ہی وہ آہستہ آہستہ ہوش کی دنیا میں لوٹنے لگا، شیر علی اس کے مکمل طور پر ہوش میں آنے کا انتظار کرنے لگا۔

کچھ لمحے گزرے کہ وجے ورما اپنے مکمل ہوش وحواس میں لوٹ آیا

شیر علی نے اس کے لئے گرما گرم کھانا منگوایا اور اس کے سامنے فرش پہ بیٹھ کر اپنے ہاتھوں سے لقمے بنا بنا کر اسے کھلانے لگا

بھوک کی شدت سے بے حال وجے ورما نے خاموشی سے منہ کھولا تھا اور لقمے چبانے لگا،

جونہی کھانا ختم ہوا، شیر علی بولا۔

"وجے ورما مجھے تمہارے بارے میں سبھی معلوم ہو چکا ہے اپنے بارے میں نا سہی لیکن اپنی محبوب بیوی اور نوزائیدہ بچے کے لئے تو کچھ سوچو، جس راستے پہ تم چل رہے ہو وہ انتہائی خطرناک ہے اور جن لوگوں کے ساتھ تم کام کر رہے ہو وہ کام ختم ہوتے ہی تمہیں اور تمہاری بیوی اور بچے کو مار ڈالیں گے، بے شک تم میری قید میں ہو لیکن پھر بھی میں تمہیں مجبور نہیں کروں گا کہ تم میرا ساتھ دو، میں وعدہ کرتا ہوں کہ اگر تم میرا ساتھ دو گے تو ہم لوگ تمہاری اور تمہاری فیملی کی حفاظت کا ذمہ لیں گے، یہ ایک مسلمان کا وعدہ ہے، ایک پاکستانی کا وعدہ ہے اور ایک شیر کا وعدہ ہے فیصلہ کرنا تمہارے ذمے ہے تم جو بھی فیصلہ کرو گے میں بحیثیت مسلمان اس کا احترام کروں گا"

یہ کہتے ہوئے شیر علی نے برتن سمیٹے اور اٹھ کھڑا ہوا۔

میں آپ کا ساتھ دینے کے لئے تیار ہوں، وجے ورما کی آواز گونجی۔

شیر علی بے ساختہ پیچھے مڑا تھا۔

ان لوگوں کا ساتھ دینا میری مجبوری تھی کیونکہ انہوں نے میری بیوی اور بچے کو قتل کرنے کی دھمکی دی تھی میں بے شک آپ کا ہم مذہب نہیں لیکن میں ہم وطن ضرور ہوں اور میرے بدن میں بھی پاکستان کی محبت بستی ہے کیونکہ یہی میرا وطن ہے اسی نے مجھے پالا پوسا، اسی دھرتی ماں نے مجھے پہچان دی مجھے مان بخشا، لیکن میں بہت مجبور ہو گیا تھا سر، مجھے اپنی بیوی اور بچے کی محبت نے اندھا کر دیا تھا کہ میں اس مٹی کے دشمنوں کے جال میں پھنس گیا بھگوان، مجھے معاف فرمایئے میں نے اپنی دھرتی ماں سے غداری کر کے بہت بڑی غلطی کی ہے، میں آپ سے معافی مانگتا ہوں سر اور آپ کا ہر طرح سے ساتھ دینے کو تیار ہوں، وجے ورما کی آنکھوں سے برسات جاری تھی۔

شیر علی نے آگے بڑھ کر وجے ورما کو رسیوں کی قید سے آزاد کیا، اور گلے سے لگا لیا، اس وقت وہ دونوں مذہب کی قید سے آزاد وطن کی محبت میں ڈوبے ہوئے سرفروش تھے،

تمہاری بیوی اور بچہ اب ہماری حفاظت میں ہیں، تمہیں پہلے میں نے اس لئے نہیں بتایا، تم کوئی بھی فیصلہ لیتے وقت خود کو کسی بھی قسم کے دباؤ کا شکار نہ سمجھو، شیر علی نے وجے ورما کو خود سے الگ کرتے ہوئے بتایا۔

وجے ورما فرطِ جذبات سے دوبارہ شیر علی سے لپٹ گیا۔

شیر علی نے فون نکال کر نمبر ملایا اور وجے ورما کو پکڑاتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گیا تاکہ وہ تسلی سے اپنی بیوی سے بات چیت کر سکے۔

پندرہ منٹ بعد وجے ورما مسکراتا ہوا کمرے سے نکلا، ہاتھ میں پکڑا ہوا موبائل شیر علی کی طرف بڑھایا مجھے سمجھ نہیں آتا کس منہ سے آپ کا شکریہ ادا کروں، آپ نے میری زندگی بچالی،

''شکر کرنا ہے تو اوپر والے کا کرو، وجے ورما سب کی تقدیر اسی کے ہاتھ میں ہے، شیر علی جذب سے بولا

''آپ بتائیں اب کیا کرنا ہے، وجے ورما بولا

کیا تمہیں کسی کھودی جانے والی سرنگ کے بارے میں کچھ علم ہے؟ شیر علی نے سوال کیا

نہیں سر مجھے اس کے بارے میں کچھ علم نہیں، انہوں نے کبھی میرے سامنے اس کا تذکرہ نہیں کیا۔

مطلب تم بھی کچھ نہیں جانتے کہ اصل سازش کیا ہو رہی ہے؟

مجھے تو یہی بتایا گیا تھا کہ مجھے یہاں آکر کچھ لوگوں کی رہائش کا انتظام کرنا ہے اور ان کی ضروریات کا خیال رکھنا ہے اور وہ کسی چیز کی تلاش میں آرہے ہیں لیکن مجھے اتنا ضرور علم تھا کہ یہ لوگ افغانستان سے آئیں گے لیکن یہ ہرگز علم نہیں تھا کہ ان افغانوں کے روپ میں بھارتی ہوں گے اور وہ بھی را کے ایجنٹ ورنہ میں ہرگز ان کا ساتھ نہیں دیتا وجے ورما افسردہ لہجے میں بولا تھا۔

مایوس مت ہو وجے میرے پاس ایک منصوبہ ہے، مگر اس کے لئے مجھے تمہارے تعاون کی ضرورت ہے۔

میں ہر طرح کے تعاون کے لئے تیار ہوں، وجے ورما نے یقین دہانی دلائی۔

ٹھیک ہے اب کافی رات ہو چکی ہے تم سو جاؤ صبح تازہ دم دماغ سے اسے ڈسکس کریں گے، شیر علی، وجے ورما کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے بولا۔

شیر علی اور وجے ورما سونے چل دیئے تھے۔

.....☆☆.....

ہیلو باس میں وجے ورما بول رہا ہوں۔

ہاں بولو کیا بات ہے، کیسے فون کیا؟ میں نے منع بھی کیا تھا مجھے فون نہیں کرنا تم نے، پٹیل درشت لہجے میں بولا۔

باس آپ کے لئے میرے پاس دو خبریں ہیں ایک بری اور ایک اچھی، وہی آپ کو بتانا چاہتا تھا۔

''پہلے بری خبر سنا'' پٹیل غراتے ہوئے بولا

آپ کے بھیجے گئے آدمی قاسم اور تیمور کو میجر شیر علی نے پکڑ لیا ہے میں بھی بڑی مشکل سے آزاد ہوا ہوں۔

وہ سالا مسلا تو مر گیا تھا زندہ کیسے ہو گیا؟

باس وہ جھوٹی خبر تھی وہ زندہ ہے، انہوں نے ہمیں دھوکا دیا تھا۔

جو بابا پٹیل نے ایک موٹی سی گالی شیر علی کی شان میں دی اور غراتے ہوئے بولا اچھی خبر کیا ہے؟

باس شیر علی میرے قبضے میں ہے میں نے اسے بے ہوش کر کے قابو کر لیا ہے۔

اسے فوراً گولی مار دو، وجے یہ بہت خطرناک شخص ہے۔

لیکن باس اس کے پاس ہمارے دو آدمی ہیں ان کا ہمیں کیسے معلوم ہو گا اگر اسے قتل کر دیا؟ اس نے انہیں کہیں چھپایا ہوا ہے۔

اچھا ٹھہرو، تمہیں میں ایڈریس میسج کرتا ہوں اسے لے کر وہاں پہنچو، اور اس سے ہوشیار رہنا، اس کا قتل میں اپنے ہاتھوں سے کروں، اور تمہیں بھی اسے پکڑنے پر انعام سے نوازا جائے گا۔

آپ بہت دیالو ہیں باس، بھگوان آپ پہ اپنی کرپا کرے، وجے ورما کہہ رہا تھا کہ اس کی ساتھ ہی رابطہ منقطع ہو گیا۔

فون کال بند ہوتے ہی شیر علی نے وجے ورما کو آنکھ ماری، کیونکہ پٹیل کو کہیں سے بھی کسی قسم کا کوئی شبہ نہیں ہوا تھا کہ وجے ورما کی جگہ کوئی اور بات کر رہا ہے،

وجے ورما اور شیر علی کا منصوبہ تھا کہ وہ دونوں ایک دوسرے کا بہروپ بدل کر میک اپ کی آڑ لئے پٹیل سے ملنے جائیں گے اور موقع ملتے ہی پٹیل پر قابو پالیں گے کیونکہ وہی ان سب کا سرغنہ تھا، ہر کمینی سازش کے پیچھے اسی کا ہاتھ ہوتا تھا۔

جونہی پٹیل نے ایڈریس کا پیغام بھیجا، شیر علی نے شہزاد کو الرٹ کر دیا، کہ مطلوبہ جگہ کے آس پاس رہے اور مخصوص اشارہ پاتے ہی آپریشن کے لئے تیار رہے،

جنرل علی عثمان کو بھی اطلاع مل چکی تھی۔

.....☆☆.....

شیر علی نے وجے ورما کا میک اپ کر کے اسے رسی سے باندھ دیا،

میں تمہیں کچھ نہیں ہونے دوں گا دوست، یہ میرا وعدہ ہے شیر علی بولا،

اب تو وطن کی خاطر جان بھی قربان ہو جائے تو مجھے کوئی گلہ نہیں بلکہ یہ میں اسے اپنی خوش نصیبی تصور کروں گا وجے ورما مسکراتے ہوئے بولا۔

شیر علی وجے ورما کی محب الوطنی پہ حیران تھا بلاشبہ یہ بھی آسمان والے کی عطا تھی اور خاموشی سے گاڑی ڈرائیو کرنے لگا۔

گاڑی فراٹے بھرتی مطلوبہ منزل کی جانب گامزن تھی۔

جونہی وہ مطلوبہ ایڈریس پہ پہنچے اس سے پہلے کہ وہ بیل دباتا، ایک خونخوار شخص نمودار ہوا

اپنا نام بتاؤ وہ غراتے ہوئے لہجے میں بولا

میرا نام وجے ورما ہے مجھے باس نے بلایا ہے۔

قیدی کہاں ہے؟ وہ غراتے ہوئے بولا

گاڑی کی پچھلی سیٹ پہ بیہوش پڑا ہے رسی سے بندھا ہوا ہے۔

ٹھیک ہے تم اسے یہیں چھوڑ کر اندر آ سکتے ہو، اب یہ ہمارا معاملہ ہے ہم اس کے ساتھ کیا کرتے ہیں۔

لیکن ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟

جتنا تمہیں بولا ہے اسی پر عمل کرو زیادہ باتیں کرنے والے باس کو سخت ناپسند ہیں۔

اپنے باس کو بولو میں اسے ایسے نہیں چھوڑ کر آ سکتا میں اسے اپنی آنکھوں کے سامنے مرتا ہوا دیکھنا چاہتا ہوں۔

یہیں ٹھہرو میں تمہارا پیغام باس تک پہنچا دیتا ہوں انٹر کام پہ اس نے پائیل سے رابطہ کیا۔

باس؛ وجے آ گیا ہے۔

تو اسے اندر بھیج دو دوسری جانب سے پٹیل بولا۔

باس وہ کہتا ہے قیدی کے ساتھ جائے گا اسے اپنی آنکھوں کے سامنے مرتا ہوا دیکھنا چاہتا ہے۔

ہمم ٹھیک ہے اسے بھیج دو پٹیل کچھ سوچتے ہوئے بولا

اور تم بھی ہوشیار رہنا قیدی انتہائی خطرناک ہے۔

جو حکم باس،

اور اس کی بھی تلاشی لے لینا اس کے پاس کوئی ہتھیار تو نہیں ہے۔

جو حکم باس،

رابطہ منقطع ہوتے ہی وہ اس کی جانب مڑا۔

اس کی تلاشی لے کر وہ آگے بڑھا اور گاڑی کا دروازہ کھول کر قیدی کو کندھے پر لادا اور بولا میرے پیچھے آؤ باس نے تمہاری بات مان لی ہے۔

وجے ورما کے روپ میں چھپا شیر علی اس موٹے گینڈے جیسی جسامت کے آدمی کے پیچھے پیچھے چل دیا مختلف راستوں میں گزرتے ہوئے وہ ایک آرام دہ کمرے میں پہنچے۔

تم یہیں بیٹھو باس تمہیں یہاں سے بلا لیں گے یہ کہتے ہوئے اس نے قیدی (شیر علی کے میک اپ میں موجود وجے ورما) کو بیڈ پر پٹخا اور کمرے سے باہر نکل گیا راستے میں موجود محافظوں کی تعداد گنتا آیا تھا اس گینڈے نما آدمی کے علاوہ دس اور دیو ہیکل حبشی جسامت کے آدمی تھے ابھی اور پتہ نہیں اس عمارت میں کتنے آدمی موجود تھے ابھی وہ یہی سوچ رہا تھا کہ کمرے کا ایک خفیہ دروازہ کھلا ساتھ ہی ایک آواز سنائی دی وجے ورما قیدی کو کندھے پر اٹھاؤ اور اس دروازے میں داخل ہو جاؤ، وہ یہ آواز بخوبی پہچان چکا تھا یہ پٹیل کی آواز تھی اس نے احکامات کی تعمیل کی بے ہوش قیدی کو کندھے پر لادا اور دروازے سے اندر داخل ہوا جونہی وہ داخل ہوا پیچھے دروازہ بند ہو چکا تھا کمرے میں مدہم سی روشنی تھی۔

ریوالونگ چیئر جونہی گھومی، اسے پٹیل کا چہرہ نظر آیا، اس کا نام تو کافی سنا تھا کہ کافی سخت دل انسان ہے اور انسانوں کو بیجان کھلونوں کی طرح گولیوں سے بھون دیتا تھا اور آج پہلی بار دیکھا تھا، گھنگھریالے بال، سرخ آنکھیں، اور سیاہی مائل رنگت کا پٹیل اس کے سامنے بیٹھا تھا۔

قیدی کو اس کرسی پر بٹھاؤ اور خود ساتھ والی کرسی پہ بیٹھ جاؤ، غراتے ہوئے بولا

وجے ورما (میک اپ میں شیر علی تھا) نے اس کے حکم کی تعمیل کی اور قیدی کو بٹھا کر خود بھی بیٹھ گیا۔

... معلوم ہے تم نے کتنے خطرناک شخص کو قابو کی
... تے ہوئے بولا
... آپ بہتر جانتے ہیں۔
... اسے فوری طور پر مارنا چاہتا ہوں یہ پہلے کئی بار
... ان پہنچا چکا ہے۔
... بہری خواہش ہے کہ میں اسے اپنے ہاتھوں سے
...
... کا ارادہ تھا، کہ پٹیل کو مار کر اس کی جگہ لے لے گا،
... مار دو، پٹیل نے ہاتھ میں پکڑا ریوالور اس کی جانب
...
... باس اس کے پاس ہمارے دو اہم آدمی ہے پہلے
... ہا کاری لے لیں پھر اسے قتل کر دینا
... میں رسک نہیں لے سکتا اسے ہوش میں لانا
... ثابت ہوسکتا ہے
... باس..
... بلواس نہیں کرنی، ریوالور پکڑو اور اسے شوٹ کرو
... اسے شوٹ کردوں گا..
... نے خاموشی سے ریوالور اٹھایا،
... والور کا وزن بتا رہا تھا کہ وہ خالی ہے،
... باس ریوالور تو خالی ہے اس کا یہ کہنا تھا کہ پٹیل فلک
... کاف قہقہہ لگا کر ہنسا
ہاہاہاہا کیوں شیر علی تم پٹیل کو بیوقوف بنانے چلے تھے۔
... آپ کیا کہہ رہے ہیں باس شیر علی تو وہ آپ کے
... نے بے ہوش پڑا ہے۔
مجھے کاٹھ کا الو سمجھا ہوا ہے کیا، شیر علی یہ کرسی میں نے
... ہی حاصل نہیں کی، دشمن کی بو مجھے سو میل دور سے ہی آ
جاتی ہے، میں تو تمہیں نہتا کر کے قتل کرنا چاہتا تھا اس لئے
تمہیں یہاں دعوت دی،
باس آپ مجھے انعام دینے کی خاطر ایسے کہہ رہے ہیں
آپ پیسے بچا رہے ہیں مجھے آپ سے کچھ نہیں لینا میں
وجے ہی ہوں باس میری بات کا یقین کرو۔
ہاہاہاہا شیر علی وجے نے کبھی بندوق استعمال نہیں کی نا ہی وہ ہمارے گینگ کا ہے اسے کیسے پتہ چل سکتا تھا کہ ریوالور خالی ہے، اب تم مرنے کے لئے تیار ہو جاو،
شیر علی کو اچانک اپنی غلطی کا احساس ہوا تھا اسے خالی بندوق ہی چلا دینی چاہئے تھی لیکن اب ایکشن لینے کا وقت آ گیا تھا۔
اس سے پہلے کہ پٹیل کا ہاتھ حرکت میں آتا، شیر علی نے میز کو زوردار لات ماری جو پٹیل کو ساتھ لیتا ہوا دیوار کے طرف بڑھا لیکن اس سے پہلے کہ پٹیل کی کوئی ہڈی ٹوٹتی وہ ایک دم چھلانگ لگا کر اٹھا اور گولی چلا دی شیر علی نے فوراً جگہ بدلی تھی ایک سیکنڈ کی بھی تاخیر ہوتی تو اب تک گولی اس کے دل میں سوراخ بناتی پار جا چکی ہوتی، پٹیل بھی غصے کی شدت سے پاگل ہو چکا تھا اندھا دھند فائرنگ کر رہا تھا اور شیر علی مسلسل کمرے میں حرکت کرتے ہوئے اپنا بچاو کر رہا تھا اچانک ایک گولی وجے ورما کی جانب بڑھی شیر علی نے وجے ورما کو دھکا دیا اور نتیجتاً گولی شیر علی کے بازو میں گھستی ہوئی پار نکل گئی شیر علی کو ایک لمحے کے لئے تکلیف کا احساس ہوا لیکن دوسرے ہی لمحے حب الوطنی کا جذبہ ہر احساس پہ غلبہ پا چکا تھا اور وہ تکلیف بھلائے اٹھ کھڑا ہوا وجے ورما بھی ہوش میں آ چکا تھا اور حیرانی سے یہ خونی کھیل دیکھ رہا تھا جو کہ ان کی، کی گئی منصوبہ بندی کے بالکل الٹ ہو رہا تھا۔
پٹیل نے شیر علی کے بازو سے نکلتے خون سے موقع اٹھاتے ہوئے دوسرا وار کرنا چاہا تھا کہ ریوالور سے کھٹ کھٹ کی آواز آئی جس کا مطلب تھا ریوالور خالی ہو چکا ہے پٹیل نے آگے بڑھ کر انٹرکام کی طرف ہاتھ بڑھانا چاہا تھا کہ قریب ہی بندھے ہوئے وجے ورما نے اس کا ارادہ بھانپتے ہوئے لات چلائی اور انٹرکام نیچے گر گیا، شیر علی نے آگے بڑھ کر اسے اٹھایا اور دیوار پہ دے مارا انٹرکام ٹوٹ چکا تھا اور پٹیل کے لئے اب بیکار تھا لیکن وہ خود اپنے بنائے گئے چوہے دان میں پھنس چکا تھا اب اس کو مارشل آرٹ پہ ہی اکتفا کرنا تھا حالات ابھی اس کے حق میں ہی تھی وجے ورما کے ہاتھ پشت کی جانب بندھے ہوئے تھے اور شیر علی کے بازو میں گولی لگ چکی تھی پٹیل نے شیر علی کے زخمی بازو پہ داو چلانا چاہا لیکن شیر علی نے پھرتی سے سائیڈ بدلی جس کے نتیجے میں پٹیل کا سر دیوار سے ٹکراتے ٹکراتے بچا کیونکہ اس نے اپنے دونوں ہاتھ دیوار کے ساتھ ٹکاتے ہوئے سر کو بچایا اور پلٹا کھا کر فوراً سیدھا ہوا، دونوں ایک دوسرے کے ساتھ گتھم گتھا ہو چکے تھے پٹیل موقع دیکھ شیر علی کے بازو پہ وار کرنا چاہتا تھا مگر شیر علی اس کا ارادہ جانتے ہوئے ٹیڑھا

کھڑا ہو کر ایک ہاتھ سے اس سے لڑ رہا تھا موت اور زندگی سے بھی بڑھ کر اس کے وطن کی سلامتی کا سوال تھا اس لئے وہ جوش و جذبے سے لڑ رہا تھا اور کوشش تھی کسی طرح اس کی گردن قابو میں آ جائے لیکن مدمقابل شخص بھی کائیاں انسان تھا اس کا ارادہ سمجھ چکا تھا لڑتے لڑتے وہ دونوں بھول چکے تھے کہ ان کے سوا ایک تیسرا شخص بھی کمرے میں موجود ہے، فرش پہ لیٹا وجے ورما رسیاں ڈھیلی کرنے کی کوشش کر رہا تھا تا کہ وہ بھی شیر علی کی مدد کر سکے، لیکن کوئی فائدہ نہیں ہو رہا تھا اچانک اس کے دماغ میں ایک ترکیب آئی دیوار کا سہارا لیتے ہوئے وہ اٹھ کھڑا ہوا اور آہستہ آہستہ دبے پاوں پٹیل کی طرف بڑھا، چونکہ پٹیل کی اس کی طرف پشت تھی اس لئے وہ اسے دیکھ نا سکا تھا وجے ورما، پٹیل کے قریب پہنچ کر اس کی پشت سے بالشت بھر کا فاصلہ رکھتے ہوئے مڑا اور اس کی پشت سے پشت ملاتے ہوئے رسی سے بندھے دونوں ہاتھوں سے اس کی گردن کو دبانا شروع کر دیا، شیر علی بھی وجے کی حرکت پہ چونکا تھا اور موقع اسے مل چکا تھا چنانچہ اس سے پہلے کہ پٹیل وجے ورما کو فرش پہ پٹختا شیر علی نے آگے بڑھ کر پٹیل کی گردن کی مخصوص رگ دبا دی پٹیل کے ساتھ ساتھ وجے ورما بھی لڑکھڑاتے ہوئے پٹیل کی لاش پہ گر چکا تھا، شیر علی نے آگے بڑھ کر ایک ہاتھ سے وجے ورما کے ہاتھوں کو رسی کی قید سے آزاد کیا،

شاباش وجے، آج تمہاری عقلمندی کی وجہ سے اتنا بڑا دشمن ختم ہو گیا۔

جواباً، وجے ورما مسکرا دیا تھا وہ اپنی غلطی کا ازالہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا جو اس نے دھرتی ماں کے دشمنوں کا ساتھ دیتے ہوئے کی تھی۔

اچانک اس کی نظر شیر علی کے بازو پہ پڑی تھی زخم سے خون رس رہا تھا۔

اور آپ کا تو اچھا خاصا خون بہہ کا ہے وجے ورما فکرمندی سے بولا،

میرے خون کا قطرہ قطرہ اس وطن کی سلامتی پر قربان، میری جان اس وطن کی سلامتی پہ قربان ہو شیر علی جذب سے بولا چہرے پہ وہی الوہی چمک تھی۔

لیکن آپ کی جان اس وطن کے لئے بہت قیمتی ہے آپ کی زندگی [illegible] پریشانی سے بولا

علی شیر وجے ورما کی پریشانی پہ [illegible] سمجھاتا یہ تو اس شیر کے لئے ایک معمولی سا زخم تھا [illegible] ادھر کہیں دیکھو میڈیکل باکس ضرور ہوگا دیکھو تا کہ تمہاری پریشانی ختم ہو سکے، لہجے میں تھوڑی شرارت بھی تھی۔

وجے ورما نے ادھر ادھر دیکھا لیکن کہیں نہ ملا شاید انہوں نے یہاں میڈیکل باکس رکھنے کی ضرورت محسوس نا کی تھی ایک الماری سے کپڑا برامد ہوا وجے ورما نے اسے پھاڑتے ہوئے بازو پہ پٹی کرتے ہوئے خون روکنے کی ناکام کوشش کی تھی۔

کیا کچھ سرنگ کا پتہ چلا وجے ورما نے پٹی باندھتے ہوئے سوال کیا..

نہیں لیکن میرا یقین کہتا ہے وہ اسی کمرے کے کسی خفیہ خانے سے منسلک ہے۔

ہمیں اسے ڈھونڈنا ہے شیر علی اٹھا اور کمرے کا جائزہ لینے لگا یہاں کوئی خفیہ بورڈ ہوگا اس کرسی کے آس پاس کیونکہ جب وہ آئے پٹیل ایک لمحے کے لئے بھی اپنی کرسی سے نہیں اٹھا تھا اس کا مطلب اس چور خانے کے سارے کنکشن یہیں کہیں تھے لیکن نجانے کیوں نظر نہیں آ رہے تھے؟

اچانک اس کے دماغ میں ایک خیال ابھرا اسی خیال کے تحت اس نے کرسی کو اٹھا کر گھمایا کرسی کی داہنی جانب ایک بورڈ نظر آیا۔

آہا اس کے دماغ نے درست سمت کام کیا تھا یہ دیکھو وجے، یہی بورڈ اب ہمیں ہماری کامیابی تک لے جائے گا لیکن مسئلہ یہ ہے کوئی حکمت علمی کرنا ہوگی کیونکہ ہم شہزاد سے بھی رابطہ نہیں کر سکتے یہاں موبائل سروس کے سگنلز نہیں آتے، وہ ابھی تک میری کال کا منتظر ہوگا ہو سکتا ہے اس سے زیادہ آدمی بھی ہوں ان سے ہم اکیلے میں نہیں نبٹ سکتے کوئی ترکیب لڑانی ہوگی۔

ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک فرش پھٹا اور وہ دونوں سیڑھیوں سے لڑکھڑاتے ہوئے تہہ خانے کے فرش پہ ایک دوسرے کے اوپر نیچے گر پڑے، شیر علی کے دماغ میں کلک ہوئی کہ گرنے سے ایک لمحہ پہلے اس کی ٹانگ سرخ رنگ

کے بٹن سے ٹکرائی تھی شیر علی وجے ورما کے اوپر گرا تھا فوراً اٹھا تھا، سیڑھیوں سے لڑکھڑا کر گرنے سے زخمی بازو میں بھی تکلیف بڑھ گئی تھی تکلیف کو دباتے ہوئے وہ اردگرد کا جائزہ لینے لگا اچانک اس کے کانوں کو مشینری کی بھاری بھرکم آوازیں سنائی دی اوہ، میرا شک ٹھیک نکلا۔ وجے کیا تمہیں بھی مشینری کی آواز سنائی دے رہی ہے؟ شیر علی وجے سے مخاطب ہوا۔

جولباً وجے نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

اس کا مطلب سرنگ کا راستہ یہیں کہیں سے تھا، اور حیرت انگیز طور پہ یہاں موبائل سروس بھی ٹھیک کام کر رہی تھی اس کا مطلب تھا اوپر کے کمرے کا میکنیزم ہی کچھ اس طرح کا تھا کہ وہاں موبائل سروس آئے بھی تو اس کے سگنلز کا آپشن نظر نا آئے جو کہ یقیناً اوپر بلڈنگ میں موجود لوگوں کو دھوکہ دینے کے لئے ایسا میکنیزم بنایا گیا تھا یا پھر نوارد لوگوں کو دھوکا دینے کے لئے تھا تاکہ وہ چاہنے کے باوجود موبائل سے استفادہ نا کر سکیں، چنانچہ شیر علی نے فی الفور کال ملائی اور شہزاد کو ہدایات دیتے ہوئے بلڈنگ پہ حملہ کرنے کی بجائے وہاں بیہوشی کی گیس فائر کرکے ان سبھی کو گرفتار کرنے کو کہا تھا اور ساتھ ٹائم بم بھی لے آنا تاکہ کام آسان ہو سکے اس کے ساتھ ہی رابطہ ختم کرتے ہوئے شیر علی وہاں کا سسٹم سمجھنے کی کوشش کرنے لگا وہ اپنے ساتھ کچھ نہیں لایا تھا اسے علم تھا اس کی تلاشی لے کر اسے اندر بھیجا جائے گا اور اگر گیٹ پہ ہی اس پہ شک ہو جاتا تو شاید پٹیل کی جگہ اس کی وجے ورما کی لاشیں پڑی ہوتیں، سیڑھیوں کے ساتھ ہی ایک بورڈ پہ چار عجیب وغریب بٹن تھے اور ان کے ساتھ مختلف قسم کے الفاظ بھی درج تھے شیر علی نے ان کی گتھی سلجھاتے ہوئے ایک بٹن دبایا تو چھت سے فرش ایک طرف کو کھسک گیا یہ وہی فرش تھا جہاں سے وہ سیڑھیوں پہ لڑکھڑاتے ہوئے اس تہہ خانے میں گرے تھے اس نے ایک اور بٹن دبایا تو ایک دروازہ کھلا تھا جس سے سیڑھیاں اوپر کو جاتی تھیں۔

دروازے کھلتے ہی مشینوں کی گھر گھر کی آہستہ آہستہ آنے والی آواز اب بلند ہو چکی تھی، اور سورج کی روشنی بھی چھن چھن کرتی اندر داخل ہو رہی تھی، شیر علی وجے ورما کو وہی رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے آہستہ آہستہ چلتے سیڑھیاں چڑھنے لگا، سیڑھیوں کے وسط میں پہنچ کر دیکھا ایک وسیع وعریض میدان تھا جس کے چاروں طرف بلند وبالا چار دیواری تھی، کھدائی کی چلنے والی مشینوں کو وہ دور سے ہی پہچان چکا تھا، وہاں مزدور طبقہ کام کر رہا تھا، یقیناً یہاں لانے والے مزدوریاں تو ڈرا دھمکا کر لائے گئے تھے یا پھر اصل محرک سے لاعلم تھے، وہ وہیں سیڑھیوں کے وسط سے واپس مڑا اور آ کر ایک اور بٹن دبایا تھا کہ دروازہ واپس اپنی جگہ پر آ چکا تھا، اوہ تو یہ وہ جگہ ہے وہ خود کلامی کے انداز میں بولا تھا، اور پھر ایک منصوبہ سوچتے ہوئے وہ شہزاد کی کال کا انتظار کرنے لگا، کیونکہ پہلے تو اس کا منصوبہ تھا بلڈنگ کو بم سے اڑا دیا جائے لیکن اب اسے ان بے گناہ مزدوروں کو بھی بچانا تھا

تقریباً بیس منٹ بعد اسے شہزاد کی کال آئی تھی، سر ہم نے یہاں سے چودہ لوگوں کو قابو کیا ہے ہم نے انہیں رسیوں سے باندھ کر بیہوشی کی حالت میں ہیڈ کوارٹر روانہ کر دیا ہے آپ کہاں ہیں؟ ہم اس وقت بلڈنگ کے اندر ہیں لیکن آپ ہمیں کہیں نظر نہیں آ رہے ہیں،

میں یہاں ایک خفیہ خانے میں ہوں یہاں سے باہر نکلنے کا رستہ تلاش کر کے میں آتا ہوں جب تک تم بلڈنگ کی اچھی طرح تلاشی لو کوئی بھی مشکوک چیز ہو تو اسے قبضے میں کر لو۔

اوکے سر شہزاد نے جواب دیا تھا،

خدا حافظ، کال کٹ کرتے ہی شیر علی اور وجے ورما سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اوپر کمرے میں آئے اوپر کمرے میں آتے ہی شیر علی نے مختلف قسم کے بٹن دبانے شروع کئے کہ اچانک نیلے رنگ کا بٹن دباتے ہی وہ خفیہ دروازہ کھلا تھا جس سے وہ اس کمرے میں داخل ہوئے تھے۔

کمرے میں حرکت محسوس ہوتے ہی شہزاد نے اپنا ریوالور سیدھا کیا لیکن سامنے سے شیر علی اور وجے ورما نظر آئے وہ انہیں اکٹھے دیکھ کر حیران ہوا تھا کیونکہ وہ شیر علی کے پلان سے ناواقف تھا، وہ وجے ورما کو شیر علی سمجھتے ہوئے اس کی جانب بڑھا اور اسے سلیوٹ مارا۔

شہزاد میں ہوں شیر علی۔۔ وہ وجے ورما ہے اس کے چہرے پہ میرا میک اپ ہے، باقی باتیں بعد میں پوچھنا ٹائم بم کدھر ہیں؟

اوہ سر آپ کے بازو کو کیا ہوا، شہزاد تفکر سے بولا تھا۔
پٹی باندھنے کے باوجود شیر علی کے بازو سے خون رس رہا تھا، شیر علی پہ ہلکی ہلکی نقاہت طاری ہو رہی تھی، لیکن وہ ہمت سے کام لے رہا تھا۔
شہزاد ٹائم بم کہاں ہیں؟
یس سر میں لایا ہوں میں ابھی لاتا ہو مگر آپ کا بازو سر؟
شہزاد پریشانی سے بولا
جو کہا ہے اس پر عمل کرو یہاں کسی بھی وقت کوئی بھی آ سکتا ہے ہمیں اس بات کا ہرگز علم نہیں ہے اس لئے میں یہ کام جتنی جلدی ہو سکے پورا کرنا چاہتا ہوں
شہزاد باہر کی طرف بھاگا اور دو منٹ بعد جب واپس آیا اس کی سانس اچھی خاصی پھولی ہوئی تھی اس کے ہاتھ میں ایک تھیلا بھی تھا جس میں ٹائم بم تھے
شیر علی نے دو بم شہزاد کو پکڑائے جاوا سے بلڈنگ میں کہیں سیٹ کر آو بیس منٹ کا دورانیہ رکھنا اور سب کو بلڈنگ سے باہر لے جانا ہمارے پیچھے مت آنا ساتھ ہدایت بھی جاری کی تھی، ہم بھی ان شاء اللہ آ جائیں گے اور آس پاس کی بلڈنگز بھی خالی کروالو، تاکہ کوئی ناحق نا مارا جائے۔
وہ وجے ورما کو ساتھ نہیں لے جانا چاہتا تھا لیکن وجے ورما اس کے زخمی بازو کی حالت دیکھ چکا تھا اور ساتھ جانے پہ مصر تھا شہزاد کے باہر نکلتے ہی شیر علی وجے ورما کو لے کر اس خفیہ خانے کی طرف پلٹا اور وہاں تین بم سیٹ کئے جس پہ تیس منٹ کا دورانیہ سیٹ کیا تھا کیونکہ یہ کمرہ ایک بم سے شاید تباہ نا ہوتا، اور پھر تہہ خانے سے ہوتے ہوئے سیڑھیاں چڑھ کر وہ اس خالی میدان میں آئے زخمی بازو میں تکلیف کی شدت بڑھتی چلی جا رہی تھی مگر وہ اپنے حواس قابو کرنی پوری پوری کوشش کر رہا تھا وہاں پہنچ کر اس کی ہدایت پہ وجے ورما نے مزدوروں کو اونچی آواز میں اپنی طرف متوجہ کیا سبھی مزدور حیرانی سے کام چھوڑ کر دنے چہروں کی طرف متوجہ ہوئے، وہ شاید صرف پٹیل کے چہرے سے ہی واقف تھے۔
سب کے متوجہ ہونے پر وجے ورما بولا
"سنو لوگو! یہاں پہ ٹائم بم پھٹنے والے ہیں جسے اپنی جان عزیز ہے وہ بھاگ جائے"
وجے ورما کی بات سنتے ہی مزدوروں میں کھلبلی سی مچ گئی تھی وہ سبھی اپنے اپنے کام چھوڑ کر دروازے کی طرف لپکے اگر وجے ورما اور شیر علی اس راستے سے دائیں جانب نہ کھسکے ہوتے تو یقیناً مزدوروں کا لشکر انہیں روندتے ہوئے گزر جاتا سبھی کو اپنی جان بچانے کیے لالے پڑ گئے تھے، ان کی اس بات سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس خفیہ رستے کے علاوہ اس میدان سے نکلنے کا کوئی اور رستہ نہیں تھا سبھی لوگوں کے گزرنے کے بعد اس میدان میں بھی شیر علی نے وجے ورما کی مدد سے پانچ طاقتور بم فٹ کئے اور بم فٹ کرتے ہی حواس کھو دیئے شاید شیر علی مشن پورا کرنے تک ہی اپنے حواس قابو میں رکھ پایا تھا بیس منٹ بعد یہاں دھماکے ہونے والے تھے اور وجے ورما بیہوش شیر علی کو کندھے پر لادے سیڑھیاں اترتے ہوئے تہہ خانے میں اترا ذہنی طور پہ وہ بے حد تھک چکا تھا لیکن اس سفر میں اسے شیر علی سے اک عجب سی انسیت ہو چکی تھی جسے وہ کوئی نام نہ دے سکا تھا، اسے بس اتنا پتہ تھا کہ اسے ہر حال میں شیر علی کو یہاں سے نکال کر لے جانا ہے کیونکہ اس ملک کو اس جانباز سپاہی کی اشد ضرورت تھی چنانچہ خفیہ کمرے سے گزرتا ہوا شیر علی کو کندھے پر لادے وہ جس قدر تیزی سے بھاگ سکتا تھا بھاگ رہا تھا۔
شہزاد انتہائی پریشانی کے عالم میں کھڑا تھا، آس پاس کی بلڈنگ اس نے خالی کروادی تھیں پاک آرمی کا نام سنتے ہی لوگ بلڈنگ خالی کرتے ہوئے فوراً باہر نکلے تھے کیونکہ انہیں پاک آرمی پہ مکمل بھروسہ تھا سبھی لوگوں کی جانیں محفوظ تھیں لیکن شیر علی اور وجے ورما دور دور تک کہیں نظر نہیں آ رہے تھے، بم پھٹنے میں صرف پانچ منٹ رہتے تھے گھڑی کی سوئیاں الٹی چلنے لگیں شہزاد علی کا پورا جسم اضطراب میں مبتلا تھا وہ بلڈنگ کی طرف بڑھا جہاں بم فٹ کئے گئے تھے کہ دور سے ہی اسے وجے ورما پھولی سانسوں سمیت بھاگتا ہوا نظر آیا اس کے کندھے پر شیر علی لدھا ہوا تھا شہزاد کی سانس میں سانس آئی جونہی وجے ورما شہزاد کے قریب پہنچا، دھماکوں سے زمین لرزنے لگی وہاں موجود سبھی لوگوں نے کانوں پہ ہاتھ رکھتے ہوئے گویا اپنی سماعتوں کو محفوظ کیا تھا، شہزاد وجے ورما کے ساتھ شیر علی کو لیتے ہوئے اسپتال کی طرف روانہ ہوا مشن کامیاب ہو چکا تھا ہمیشہ کی طرح شیر علی نے دشمن کی واٹ لگائی تھی جس کو شاید اس کی آنے والی نسلیں بھی کبھی نا بھولیں گیں۔

وفا کی دیوی

عائشہ بٹ

عورت کی شخصیت عبارت ہے وفا سے، اسی لیے اسے وفا کی دیوی کہا گیا ہے شاید ہی کہیں کسی کتاب مرد کے لیے وفا کا دیوتا کا لفظ استعمال کیا گیا ہو۔

ایک عورت کا فسانہ اسے ماں سے وفاداری پر بے وفا کا خطاب ملا تھا

میری نائلہ سے ملاقات ایک سرکاری اسپتال میں ہوئی تھی۔ میں اپنی بیمار خالہ کو دیکھنے گئی تھی۔ نائلہ اگرچہ بہت زیادہ خوبصورت نہیں تھی..... لیکن قبول صورت سے بڑھ کر تھی۔ اس کی والدہ اپاہج تھیں..... ایک ٹانگ سے معذور تھیں اور ان کا سہارا صرف نائلہ تھی۔

آج کل نائلہ کی والدہ کو سانس کی بیماری بھی تھی' اس لیے نائلہ ان کو لے کر اسپتال میں آ گئی تھی۔

دو چار ملاقاتوں میں جب ہم گھل مل گئیں تو میں نے اسے بتایا کہ مجھے کہانیاں لکھنے کا شوق ہے اور میں کہانیوں کی تلاش میں رہتی ہوں' یہ سن کر چند لمحوں کے لیے وہ سوچ کی گہری وادی میں چلی گئی' میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں میں اذیت کے تاثرات ابھر آئے تھے..... جیسے ماضی کے کسی واقعے یا کہانی نے اس کے اندر ہلچل مچادی ہو..... اس کا وجود دھیرے دھیرے لرزنے لگا' اور اس کے ماتھے پر پسینے کے قطرے جھلملانے لگے۔

مجھے افسوس ہونے لگا کہ میں نے کیوں دبی ہوئی راکھ میں کسی چنگاری کو ہوا دے دی ہے۔

میں نے اسے پانی پلایا..... او ردلاسہ دیتے ہوئے کہا۔

''نائلہ..... مجھے افسوس ہے تم نارمل ہوجاؤ اور اپنے ذہن کو ماضی سے حال میں لے آؤ۔''

اس وقت ہم الگ تھلگ بیٹھی ہوئی تھیں' اس کی امی اور میری خالہ اس وقت سکون آور ادویات کے زیر اثر سوئی ہوئی تھیں۔

اور میں یہاں اس بات کی وضاحت بھی کردوں کہ آج کل میں رات کو اپنی خالہ کے پاس ہی ہوتی تھی۔

میری بات سن کر نائلہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے ..... اور وہ آنسوؤں میں بھیگی ہوئی آواز میں بولی۔

''عائشہ..... میں ماضی کو کیسے بھول جاؤں' اس کا ایک ایک لمحہ مجھے یاد ہے' ماضی کو میں نہیں بھول سکتی..... کبھی نہیں..... کسی شاعر نے اسی لیے کہا ہے

یاد ماضی عذاب ہے یارب
چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

میں اس وقت اپنے آپ کو بالکل بے بس محسوس کررہی تھی..... سوائے اسے تسلی دلاسہ دینے کے کچھ بھی نہیں کرسکتی تھی۔ آخر یہ لفظ نہ جانے کیسے میری زبان سے پھسل گئے۔

''تم اگر چاہو تو مجھے اپنی کہانی سنا کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرسکتی ہو۔''

''ٹھیک ہے..... تم یہ کہانی ضرور لکھنا..... شاید کوئی عبرت حاصل کرلے..... اس نے دیوار گیر کلاک کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ کلاک نے رات کے بارہ بجنے کا یوں اعلان کیا جیسے سوئے ہوئے ضمیروں کو

دگار رہا ہو۔ باہر رات دھیرے دھیرے سرک رہی تھی۔
اور میرے کانوں میں نائلہ کے الفاظ قطرہ قطرہ ٹپک رہے تھے۔

میں گھر بھر کی لاڈلی اور آنکھوں کا تارا تھی...... ہم ہنسی خوشی رہ رہے تھے' پھر پتہ نہیں ہمارے ہنستے بستے گھر کو کس کی نظر لگ گئی۔ ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں میرے ابو اللہ کو پیارے ہوگئے۔ جبکہ امی اپاہج ہوگئیں' وہ ایک شادی میں شرکت کرکے واپس آرہے تھے کہ ان کے نصیب ہار گئے۔

میری تو دنیا ہی اندھیر ہوگئی...... کہتے ہیں وقت سب سے بڑا مرہم ہے' انسان حالات کو قبول کر لیتا ہے' اس نے جینا جو ہوتا ہے' اگر اپنے دکھ کو لے کر بیٹھ جائے تو مشکل ہو جاتی ہے۔

میں نے حالات سے سمجھوتا کرلیا...... اب میری زندگی کا مقصد صرف یہ رہ گیا کہ اپنی ماں کی خدمت کروں...... ان کا سہارا بنوں۔

امی کو میری فکر لگی ہوئی تھی' حالانکہ میں انہیں کئی بار کہہ چکی تھی کہ آپ میری فکر چھوڑ دیں' اپنی صحت کا خیال کریں۔

لیکن......!

وہ اکثر مجھے ساتھ لپٹا کر روتی رہتی تھیں' اس سے میں اور زیادہ پریشان ہو جاتی تھی' وہ یہ کہتی تھیں۔

''بیٹی جان جہان ہو' کب تک مجبوریوں کی سولی پر ٹنگی رہو گی' ابھی تو تمہارے لیے رشتوں کی کمی نہیں ہے جب سر میں چاندی آجائے گی تو پھر تمہیں کون پوچھے گا...... میری مانو تو شادی کرلو' اب میں کتنے دن جیوں گی' میں کوئی آیا رکھ لوں گی۔''

عائشہ تم ہی بتاؤ میں کس طرح' کس دل سے انہیں آیا کے سپرد کرکے اپنی دنیا میں مگن ہو جاتی۔

بہرحال میرے لیے کافی رشتے آئے' مگر میں نے کسی کے لیے بھی ہامی نہیں بھری۔

کئی لڑکوں نے میرے راستے میں آنکھیں بچھائیں' مجھے راغب کرنے کی کوشش کی لیکن......

میں برف کی سل بنی رہی' اگر کسی نے اس برف کو پگھلایا تو وہ شاہد تھا [illegible] آنکھوں والا...... جس کی آنکھیں مجھے بولتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں۔

اس نے اپنی امی کو رشتے کے لیے بھیجا...... میں نے انہیں یہ جواب دیا کہ میں اپنی امی کو نہیں چھوڑ سکتی۔''

وہ بھی جاتے جاتے مجھے کہہ گئیں' کہ عجیب لڑکی ہے' میرا بیٹا اس کے لیے مرا جا رہا ہے' اور یہ نخرے کر رہی ہے۔

مجھے بہت افسوس ہوا' امی سے میری محبت کو وہ نخرا کہہ رہی تھیں' امی کے لیے میں نے اپنی محبت قربان کر دی۔

لیکن...... مجھے کیا پتا تھا؟ تقدیر دور کھڑی مجھ پر ہنس رہی ہے۔

شاہد نے مجھے کہا میں تمہارے بغیر مر جاؤں گا...... تم کچھ تو سوچو کچھ تو خیال کرو' اتنی کٹھور نہ بنو۔

میں نے اس کی سب باتیں سن کر ایک ہی جواب دیا۔

شاید محبت صرف اپنے محبوب کو پانے کا نام نہیں ہے...... قربانی دینے کا نام بھی ہے۔ وہ میری بات کی گہرائی کو سمجھا ہی نہیں' اس نے اپنے ماں باپ کی قربانی دے دی۔

یعنی وہ گھر داماد بن کر رہنے پر راضی ہو گیا۔

میں تو یہ بھی نہیں چاہتی تھی' مجھے تو یہ بھی گوارہ نہیں تھا۔

لیکن وہ اتنا رویا' اتنا گڑگڑایا' خودکشی کرنے کی دھمکی دی' تب میں مجبور ہو گئی۔

عائشہ تم مجھے خود غرض سمجھو گی...... کہ میں نے ماں باپ سے ان کا بیٹا چھین لیا تھا۔

مگر میں کیا کرتی' اس نے کہا تھا' میں ریل گاڑی کے نیچے اپنا سر دے دوں گا' نہ تمہیں زندہ ملوں گا اور نہ اپنے ماں باپ کو۔

لیکن...... اسے اپنی زندگی کا ساتھی بنانے سے پہلے میں نے اس سے چھپ کر سارے حالات اس

کے والدین کے سامنے رکھے تھے..... انہوں نے کہا تھا۔

''تم شادی کے لیے راضی ہو جاؤ..... کم از کم ہمارا بیٹا تو زندہ رہے گا۔

اس طرح ہماری شادی ہوگئی۔

دن عید کی طرح اور راتیں شب برات کی طرح گزرنے لگیں۔

ایک ماہ کا عرصہ پر لگا کر اڑ گیا۔

پھر مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے شاہد مجھ سے کھچا کھچا رہنے لگا ہے۔ بے زار بے زار رہنے لگا ہے۔

میں کافی دن اس کا رویہ نوٹ کرتی رہی' آخر ایک دن میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا۔

میں نے غور سے اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''شاہد..... میں کافی دنوں سے یہ بات نوٹ کر رہی ہوں کہ تمہارا رویہ میرے ساتھ ٹھیک نہیں رہا' تم بدلے بدلے لگ رہے ہو' اس کی کیا وجہ ہے؟''

وہ بھی شاید کسی ایسے ہی لمحے کا منتظر تھا' پھٹ پڑا۔

''دیکھو نائلہ میں نے تمہاری خاطر کتنی بڑی قربانی دی ہے' لیکن میں نے محسوس کیا ہے کہ تم زیادہ خیال 'زیادہ توجہ اپنی امی کی طرف دیتی ہو' میرا اتنا خیال نہیں کرتیں' مجھے اتنی توجہ اور پیار نہیں دیتیں۔''

میں چند لمحے اس کے چہرے کی طرف دیکھتی رہی' پھر بولی۔

''شاہد' یہ تم جان چھڑانے والی بات کر رہے ہو میرے حالات اور میری امی کی حالت تمہارے سامنے تھی اور اب بھی ہے' میں نے اپنی طرف سے تمہیں پوری توجہ اور پیار دینے کی کوشش کی ہے' تمہارے حقوق بھی ادا کرنے کی حتی الامکان کوشش کی ہے' پھر یہ شکایتوں کا دفتر کھولنے کی کیا ضرورت ہے؟ پھر میں نے تمہیں مجبور نہیں کیا تھا' کہ تم اپنے والدین کو چھوڑ دو' یہ تمہاری ضد تھی ..... یہ تمہاری تمنا اور خواہش تھی' پھر تم نے خودکشی کرنے کی دھمکی دی تھی..... بتاؤ..... شاہد تمہارے دل میں کیا ہے؟ ابھی تو میرے ہاتھوں کی مہندی کا رنگ پھیکا نہیں ہوا' تم وہموں اور وسوسوں میں نہ پڑو' ابھی بہت زندگی پڑی ہے۔''

لیکن میں دیکھ رہی تھی کہ میری ان باتوں کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا..... وہ کسی اور ہی سوچ میں مگن تھا۔

اس رات وہ ایسا گیا کہ پلٹ کر خبر ہی نہیں لی..... خودکشی کرنے کی دھمکی دے کر رشتہ جوڑنے والا سب رشتے توڑ گیا۔

کچھ دنوں بعد مجھے رجسٹری کی صورت میں طلاق نامہ اور دس ہزار روپے حق مہر کی مد میں ملے۔

کیا یہی میری وفا کا صلہ تھا' یا اس کی بات ماننے کی سزا تھی۔ مجھے رانی بنا کر رکھنے کا وعدہ کرنے والے' میری خاطر ریل کی پٹڑی پر سر رکھنے والے نے یہی کرنا تھا۔

میں نے تو سینے پر صبر کی سل رکھنے کا تہیہ کر لیا تھا۔

لیکن بے وفائی کی موجودہ سل نے تو مجھے کچل کر رکھ دیا ہے۔

''اگر امی کی حالت کا خیال نہ ہوتا تو میں کبھی کی خودکشی کر چکی ہوتی۔'' دیوار گیر کلاک نے صبح کے چار بجنے کا اعلان کیا تو میں نے نائلہ کو سہارا دے کر اٹھایا..... اور..... پھر ہم بوجھل قدموں سے چل کر اپنے اپنے مریضوں کے پاس آ گئیں جو ابھی تک سکون آور ادویات کے زیر اثر سو رہی تھیں۔

میں سوچ رہی تھی۔

نائلہ کو کیسے سکون آئے گا..... اس کے درد کی دوا کہاں سے آئے گی..... کون لائے گا' وہ وفا کی دیوی تھی' اس نے وفا کر کے دکھا دی تھی' اس کے دل میں کوئی کھوٹ نہیں تھا..... تبھی تو اس نے حق مہر صرف دس ہزار روپے لکھوایا تھا۔

فن پارے

دیس بدیس نئے اور پرانے لکھاریوں کی
رنگا رنگ تحریریں جو آپ کے دل کو چھو لیں گی

چاند کی آنکھ سے ٹپکا آنسو	ابن عبداللہ
سجدہ سہو	صوفیہ کاشف
پین کلر ٹیبلٹ	محمد فارق
خالی ہاتھ	سحرش علی نقوی
عالم وحشت	نائمہ غزل
کالنگ کارڈ	فرحین ناز طارق
وہ ایک لمحہ	ریمل آرزو
دستک	مہوش طالب

چاند کی آنکھ سے ٹپکا آنسو

ابن عبداللہ

رات سفید پہاڑیوں پر سیاہ پرندوں کی طرح منڈلانے لگی اور دیکھتے ہی دیکھتے تاریکی برف کی تھال کو اپنے پروں تلے سمیٹنے لگی، وہ ہوٹل کی بالکونی میں کھڑا شام کی اداس زلفیں بکھیرتے ہوئے دیکھ رہا تھا کچھ ہی دیر تاریکی کسی غریب کی مقدر کی طرح گہری سایہ ہوگئی اور پہاڑیوں پر چاند کی کومل کرنوں نے زمین کو پہلا بوسہ دیا اور چار سو چاندنی اور برف کے امتزاج سے ایک پراسرار سی سفیدی ننگے پاؤں چلنے لگی۔

وہ خاموشی سے ہوٹل سے نکل آیا اور برف میں جوتوں کے دھنسے ہوئے نشان چھوڑتے ہوئے جھیل کے پاس آ بیٹھا اور تحیر کی آنکھ سے جھیل میں اتری پریوں کو نہاتے دیکھنے لگا اس کی رگوں میں رومانیت کا سحر بہنے لگا، اس نے جیب سے پیکٹ نکالا اور لبوں میں پکڑتے ہوئے لائیٹر سے سلگایا اور پھر ڈائری کھول کر کچھ احساس لکھنے لگے۔

اچانک برف پر کسی کے قدموں کی غیر محسوس سی سرسراہٹ پیدا ہوئی تو لکھتے ہوئے وہ چونکا سامنے سے ایک لڑکی چلی آرہی تھی چاند کی کرنیں اس کی ریشمی زلفوں میں گلابوں کی طرح سجی ہوئیں تھیں اور برف کی سفیدی اس کے گالوں میں جذب ہو رہی تھی وہ چاندنی میں نہائی ہوئی ایک خوبصورت لڑکی تھی۔

وہ اسے خاموشی سے اپنی طرف آتے ہوئے دیکھ رہا تھا جب وہ اس کے قریب پہنچی تو وہ ایک بار پھر چونکا لڑکی نے ایک باریک سی نائیٹی پہنی ہوئی تھی جو اس کے بدن کو چھپانے سے زیادہ عریاں کر رہی تھی۔ چاند کی کرنیں اس کے انگ انگ سے محو بوس و کنار تھیں۔

اس نے بے یقینی سے اسے دیکھا جھیل کے کنارے پر اس وقت درجہ حرارت منفی سے نیچے۔

اب وہ اس کے سامنے چٹان پر بیٹھی اسے ہی دیکھ رہی تھی اس نے اس کے بدن کی حشر سامانیوں سے نگاہیں چرائیں اور جھیل پر لہراتے چاند کو دیکھنے لگا۔

''میں نے آپ کو یہاں بیٹھے دیکھا تو اس طرف چلی آئی۔ میں سامنے بالکونی میں کھڑی تھی جب آپ اس طرف آئے۔'' لڑکی نے اسے متوجہ کرتے ہوئے سامنے ہوٹل کی طرف اشارہ کیا تو اس نے سر ہلا دیا۔

اس کی آواز مندروں کی گھنٹیوں کی بازگشت جیسی تھی۔

''آپ کیا کرتے ہیں اور یہاں کب آئے ہیں۔'' وہ پھر سے بولی تھی۔

اس نے جھیل سے نگاہیں ہٹائیں اور سامنے بیٹھی اس لڑکی کو دیکھا جو ایک اجنبی سے اتنے پر اعتماد انداز میں مخاطب تھی جیسے وہ کالج فیلو ہوں اور پھر چاندنی سے بھری ہوئی اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔

''میں شاعر ہوں فطرت کو قریب سے دیکھنے یہاں آتا رہتا ہوں جب اپنی ذات کی تنہائی بانٹنی ہوتی تو یہاں جھیل پر چلا آتا ہوں، آپ کیا کرتی ہیں؟'' اس کو جواب دیتے ہوئے وہ پوچھ بیٹھا تھا۔

''میں.....!'' وہ بڑبڑائی اور چند ثانیے جھیل کو دیکھنے کے بعد بولی۔

''میں طوائف ہوں.....کال گرل.....!''

اس کے لہجے میں اچانک کہیں زخم کھل اٹھے اور برف پر کچھ ان دیکھے خون کے قطرے سے گرے اور وہ ششدر رہ گیا۔ چاند آسمان کی بالکونی میں چلتے ہوئے لڑکھڑا سا گیا اور تارے ایک دوسرے کو معنی خیز انداز میں آنکھیں مارنے لگے۔

وہ اب دور تاریکی گھاٹیوں میں کسی کو گھور رہی تھی اور اسے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ اب کیا کہے۔

''شاید آپ مجھے کوئی شریف زادی سمجھ بیٹھے تھے۔'' کچھ دیر بعد وہ پھر سے بولی تو وہ پہلو بدل کر رہ گیا۔

''ایک بات بتاؤں؟''

''جی.....!'' وہ اتنا ہی کہہ سکا تھا۔ وہ کچھ دیر اسے دیکھتی رہی اور بولی۔

''کبھی میں بھی عورت ہوا کرتی تھی یہ بہت پہلے کی بات ہے میری آنکھوں میں بھی ایک عورت کے خواب تھے لیکن معاشرے کو میرا عورت ہونا منظور نہیں تھا وہ مجھے ایک طوائف کے روپ میں تو قبول کر سکتا تھا لیکن ایک شریف عورت کے روپ میں کبھی نہیں۔

میں ایک غریب گھر کی لڑکی تھی چھ بہنوں میں سب سے بڑی ہم چھ بہنیں دنیا میں اس لئے آئیں کہ میرا باپ بیٹے کی خواہش رکھتا تھا پر ہر بار ایک بہن کا اضافہ ہو جاتا میری ماں بچا جننے کے کرب سے کئی بار گزری اور ہر بار درد زہ تو گزر جاتا پر بیٹی ہونے کا درد اس پر رک جاتا۔

میرا باپ سبزی کی ریڑھی لگاتا تھا گلیوں میں گھومتے ہوئے سبزی بیچتا تھا وہ چھ بیٹیوں کو مشکل سے پال رہا تھا۔''

وہ اتنا کہہ کر خاموش ہو گئی اور دور جیسے اپنی ماں کو دیکھنے لگی۔

''پھر کیا ہوا تھا۔'' اس کی خاموشی جب طویل ہونے لگی تو اس نے سوال کیا۔

''پھر کیا ہوا تھا؟'' وہ مسکرائی ایک ایسی مسکراہٹ جس میں درد ہی درد تھا۔

''جب میں نے جوانی میں قدم رکھا تو سب انگلیاں دانتوں میں داب کر رہ گئے بدقسمتی میں خوبصورت تھی میرے بعد سارے بہنیں بھی جوانی کے راستے پر آنے لگیں میرے لئے بہت سارے رشتے آئے۔

لوگ آتے مجھے منڈی میں کھڑی کسی بکری یا گائے کی طرح دیکھتے میرا باپ کسی سے ادھار لیکر ان کی آؤ بھگت کرتا اور وہ جاتے ہوئے اتنا جہیز مانگ جاتے جس کو پورا کرنا میرے باپ کی بس کی بات نہیں تھی ہر بار میری ماں چھپ کر روتی اور میرا باپ اپنے آنسو اپنے اندر تیزاب کی طرح گراتا رہتا۔

میرے باپ نے لوگوں سے ادھار مانگا پر اسے نا ملا امیروں کی منت سماجت کی پر سوائے حقارت کے چند سکوں کے وہ ہمیشہ خالی ہاتھ ہی لوٹا میری ماں مجھے لیکر شہر کے بڑے ادارے میں گئی جو ایسی لڑکیوں کی مدد کرتا تھا۔ ان کے دفتر میں ایک باریش شخص بیٹھا ہوا تھا اس نے میری ماں کی باتیں ہمدردی سے سنیں اور پھر بولا آپ کل اپنی بیٹی کو بھیج دیجیے گا میں کچھ نہ کچھ کر دوں گا، اگلے دن میں اپنی چھوٹی بہن کے ساتھ وہاں گئی تو وہ وہاں اکیلا تھا۔ اس نے بہانے سے مجھے اکیلا کیا اور بولا۔

اگر تم کچھ دیر میرے ساتھ گزار لو تو میں تمہاری ساری بہنوں کی شادی کا ذمہ لیتا ہوں۔

میرے سامنے ایک ایسا انسان کھڑا تھا جس کے ماتھے پر سجدوں کے نشان تھے اور چہرے پر بڑی داڑھی میں وہاں سے لوٹ آئی اور اپنے کمرے میں جی بھر کر روئی۔

میری ماں کی خالی آنکھیں تھیں اور باپ کے کندھے جھکے ہوئے تھے، یہ سب اس لئے تھا کہ ہم غریب تھے اور ساری بیٹیاں تھیں۔

کچھ دن بعد میرا باپ خون تھوکتے تھوکتے مر گیا تب ہمیں پتا چلا کہ اسے ٹی بی تھی۔ غریبوں کی بیماریاں بھی ان کی موت کے بعد ہی تشخیص ہوتی ہیں۔

ایک زخمی سی مسکراہٹ اس کے چہرے پر پھیلتی چلی گئی تھی اور فضا میں اوس گرنے لگی تھی شاید کائنات رو رہی تھی۔

باپ کی موت کے بعد ہمارے گھر پر بھیڑیوں کے غول حملہ کرنے لگے کوئی ہمدردی کی آڑ میں تو کوئی مدد کرنے کے

بہانے۔ ہم ڈری سہمی بکریوں کی طرح اطراف میں چلتے بھیڑیوں اور ان کی آنکھوں میں چمکتی بھوک کو دیکھنے لگے تھے۔

تب میرے پاس صرف ایک ہی راستہ بچا تھا یا تو میں اپنے اندر کی عورت کو مارتی یا تو اپنی ساری بہنوں کو معاشرے کی بھوک کا شکار بننے دیتی میں نے جانا شاید غریب ہونا یا غریب عورت ہونا ایک ایسا گناہ ہے کہ سزا کے طور پر یہ معاشر آپ کو طوائف بننے کی سزا سناتا ہے۔

میں نے خود کو قربان کرلیا اور شہر کی اسی مشہور فلاحی تنظیم کے ہاں گئی اور ایک عورت کو بیچ کر وہاں سے ایک طوائف خرید لائی ماں کو بتایا کہ مجھے اس تنظیم نے ایک کام پر لگا دیا۔ اور تمہیں پتا ہے ماں نے اسی وقت دو نفل ادا کئے اور شکر بجا لائی۔

اس کی آواز آخری جملوں کی تپش سے نم ہوگئی تھی اور گلا رندھ گیا تھا۔

اور وہ سامنے پتھر پر بیٹھا جیسے پتھر کا ہوگیا تھا اور چار طرف پھیلی برف میں جیسے آگ سی لگ گئی تھی۔

میں یہاں کسی کے ساتھ آئی ہوں چند دن کے لئے۔

اس آنکھوں میں نمی تیرنے لگی تھی اور فضا مکمل بھیگ چکی تھی۔

اس کے پاس کہنے سننے کے لئے اب کچھ بھی نہیں تھا اور وہ بھی اب مکمل خاموشی تھی۔

کچھ دیر بعد وہ جس خاموشی سے آئی تھی اسی خاموشی سے لوٹ گئی تھی وہ چاند اور جھیل تینوں ہی اسے جاتا دیکھ رہے تھے چاند اپنی آنکھوں پر سے آنسو صاف کر رہا تھا اور جھیل خاموش کھڑی تھی چاند کی آنکھ سے ٹپکا ہوا آنسو اب کہیں بھی نہیں تھا۔

☆☆

سجدہ سہو

صوفیہ کاشف

سعدیہ پانچوں نمازیں پڑھتی اور پانچوں وقت سجدہ سہو کرتی۔ انتہائی توجہ سے نماز کا آغاز کرتی رکوع سجود میں آہستگی برتتی، الگ الگ لفظ ادا کرتی مگر نہ جانے لڑی کہاں سے ٹوٹتی، موتی کدھر سے بکھرتے کہ آخیر تک پہنچتے پہنچتے گمشدہ ہو جاتی کتنی رکعت ہوگئیں اور کتنے سجود کچھ حساب نہ رہتا فقط رہ جاتی اک نارسائی ایسی ٹوٹی پھوٹی عبادتوں کا جوڑ لگانے کا ایک ہی طریقہ تھا اس کے پاس، سجدہ سہو! تین رکعتوں کو چار کرنے کا، سجود رکوع کی گنتی پوری کرنے کا اکسیر نسخہ سجدہ سہو سعدیہ کی عادت ثانیہ بن چکا تھا اور شاید اس کے پھٹے چیتھڑے لگے کپڑوں جیسی نمازیں لے جانے والے نورانی فرشتوں کی بھی اگر کبھی جو سجدہ سہو کے بغیر ان کے پاس نماز پہنچ جائے تو شاید وہ بھی بیچ رستے میں چکرا کر واپس آجائیں کہ آج غلطی ہوگی غلط بندے کی نماز پکڑی گئی اس عورت کی نماز کا سجدہ سہو تو رہ گیا۔

وہ عورت جو ہر شے کو اس کے ٹھکانے پر رکھنے کی کوشش کرتی پر نہ رکھ پاتی کوئی غلط بنت پڑ گئی تھی اس کی زندگی کے ویئر میں، کوئی ٹانکا جو غلط لگ گیا تھا یا پھر وہ کسی آسیب زدہ راستے پر بھٹک کر رہ گئی تھی کہ کھو جاتی۔ ڈھونڈنے کی کوشش کرتی اور پھر گما جاتی سنبھلتے سنبھلتے پھر پھسل جاتی۔ ایسی ہو کر رہ گئی تھی اس کی زندگی۔

سعدیہ کی زندگی ہمیشہ سے ایسی نہ تھی۔ اس میں نظم تھا ضبط تھا، آگہی تھی، اختیار تھا! کبھی اس کی زندگی کے آسماں پر صبح میں سورج نکلتا تھا اور رات میں چاند اپنے وقت پر تاریکیاں ہوتیں اپنے وقت پر چاند راتیں۔ یہ بے ربطگی، یہ

گھمسان کا رن تو شادی کے بعد پڑا تھا زندگی میں قیامتیں ساری جگمگاہٹوں، قہقہوں اور جشن کے بعد ٹوٹی تھیں اس کی زندگی میں مگر بجلیاں اس کے ظاہر میں نہیں کہیں اندر ہی اندر گری تھیں۔ چلتا پھرتا اٹھتا بیٹھتا وجود ایک ریت کے بھربھرے وجود میں بدل گیا تھا۔ لاکھ مٹھی میں سنبھالنے کی کوشش کرتی کوزہ بنانے کی جوڑنے کی کوشش کرتی پر ریت بکھر جاتی، اس کی پکڑ میں نہ آتی۔

''نکاح کے لفظوں میں جادو ہوتا ہے۔''

یہ اس کی پھوپی نے کہا تھا۔ قاسم سے نکاح پر دستخط کراتے وقت وہ نہ بھی کہتیں تو دستخط تو وہ کر ہی دیتی جادو چلے یا نہیں منتر اپنا کام کریں یا آسیب سر ہی جھکا دیا تو کیا فرق پڑتا تھا جادو چلیں یا بجلیاں گریں، طوفان آئیں یا بہاریں، نغمیں پھوٹیں یا نوحے، کیا فرق پڑتا تھا اس کو اور کیا فرق پڑتا تھا دستخط کرانے والوں کو فرق تو تب پڑتا جب اس نکاح نامے پر نام کسی اور کا ہوتا دستاریں گر جاتیں، عزتیں نیلام ہو جاتیں، بال نوچ لیے جاتے، گردنیں کٹ جاتیں، خاندان اجڑ جاتے اس نے سب کچھ بچا لیا بس اپنا آپ ہار دیا۔

''تم سے بہت پیار کرتا ہے، بہت خیال رکھے گا۔''

سہیلیاں خاص طور پر بار بار جتاتیں انہوں نے یاد کرایا گیا سبق معہ زبانی رٹ لیا تھا اس لیے بغیر کوئی لفظ بدلے ایک ہی فقرے کی بار بار تکرار کرتیں۔

''اچھا!........ہاں مجھے صرف خیال ہی تو چاہیے۔''

وہ بھی دن میں کئی کئی بار اپنے دل میں یہ فقرے انڈیلتی اپنے دماغ کو جتاتی کانوں میں گونجتی آوازوں کو چپ کراتی بھٹکتی آنکھوں کو پکڑتی، روکتی اور ان کو بتاتی۔

''تمہیں خوش رکھے گا! تمہیں خوش رکھے گا۔''

اور آنکھوں میں جلتی آگ اور بھڑ کنے لگتی بھانبڑ جہنم میں بدل جاتے ہوائیں بپھر کر طوفان بننے لگتیں۔

مجھے جنگل جنگل بھٹکا دو

مجھے سولی سولی لٹکا دو

جو جی سے چاہو یار کرو

ہم بڑھ جو گئے تیری راہ پیا

اور وہ شام سلونا چمکتے سورج کی طرح صبح صبح اس کی منڈیر سے جھانکنے لگتا، شام ہونے پر سورج کے ساتھ غروب ہو جاتا اور چاند بن کر پھر نکل آتا! وہ پردے تانتی، دروازے بھیڑتی، کھڑکیوں کو کنڈیاں لگاتی مگر سورج کی کرنیں اور چاند کی چاندنی نہ پکڑ پاتی نکلتے دن کو روکنا اس کے اختیار سے باہر تھا وہ پاگل تھی عشق کے راستے کی دھول چاٹنے نکلی تھی اور اب دیواروں میں سر پھوڑنے سے بھی گئی تھی باہر موت تھی تو اندر زلزلے، کس کو پکڑتی، کس کو چھوڑتی کسی کا چہرہ تھا جو اس کے اندر باہر گونجتا تھا کچھ الفاظ تھے جو اس کے دل کی دیواروں پر سر مارتے پھرتے کچھ زخم تھے دل میں جو سل کر نہ دیتے واحد! واحد! واحد! اس کے دل میں، دماغ کی تہوں میں، آنکھوں کی چلمنوں پر سانس کی ڈوری میں، دل کی دھمال پر، لہو کی حرارت میں اس کے جسم اور روح کی لہروں پر ایک ہی نام تیرتا پھرتا. ایک نام کا آسیب اس کے وجود سے لپٹ گیا تھا جو وہ چاہ کر بھی اتار نہ پاتی۔ آنکھیں بند کرنے سے اس کا چہرہ گم جاتا تو وہ اپنے ہاتھ سے آنکھیں پھوڑ لیتی کانوں میں زہر انڈیل لیتی اگر اس کی صدائیں روک پاتی لہو نچوڑ کر رکھ لیتی جسم کا اگر اس سے واحد کا نقش مٹ سکتا سانسیں روک لیتی اگر جو کچھ مرہم بنتا مگر وہ تو عشق کا جوگ لگا بیٹھی تھی اور اب طوفانوں کے بیچ معلق تھی اندر باہر کے

طوفان اس کو لڑکھڑائے پھرتے تھے۔
ابا کے الٹے ہاتھ کی مار نے ایسا پٹخا تھا کہ دیوار میں جا لگی تھی بھائی نے مار مار کر ہڈیاں ہی توڑ دی تھیں تب اس نے جانا باپ بھائیوں کے ہاتھ کتنے سخت اور بھاری ہوتے ہیں۔ صرف چوٹ ہی نہیں لگاتے ریزہ ریزہ کر دیتے ہیں پہاڑوں کو توڑ دیتے ہیں۔ زندوں کو مار دیتے ہیں۔ اعتماد توڑنے کی سزا دیوار میں چنوا کر نہیں دیتے پتھروں سے سنگسار کر کے دیتے ہیں اور یہ اعتبار کا پل صراط جس سے دل گر گر جاتے ہیں اور سنگساری مقدر ٹھرتی ہے۔
''اب ہماری بیٹیاں عشق فرمائی گیں۔''
''مار کر کھیتوں میں پھینک دو۔''
باجیاں چنگاڑی تھیں بھائی لپک لپک پڑتے کسی نے جھانپڑ مارے کسی نے ٹانگیں سعدیہ خاموشی سے کھاتی رہی وہ پیار سے بھی کہہ دیتے تو ہونی تو انہی کی مرضی تھی پر باپ اور بھائیوں کو دھونس اور رعب عزیز تھا سعدیہ نے سہہ لیا اپنے چہرے بال اور جسم کو سہلاتی، چوٹوں کو دیکھتی۔
''چلو تم کو لے چلوں! یہ مار دیں گے تم کو۔''
''اپنے باپ کو مار کر نہیں جا سکتی۔''
باپ اس کے دکھ میں مر جاتا تو وہ مر بھی نہ پاتی وہ پیروں میں پڑ گئی۔''
''آپ جو چاہے کریں! جیسے چاہے کریں۔''
لب دم یہی اس کی زبان پر تھا یہی دل میں تھا یہ اور بات وہ دل زلزلوں کی زد میں تھا نزع کا عالم تھا اور اس کے دل کی فکر بھی کس کو تھی۔
عزتوں کا بھرم رکھنے کو بڑی عجلت میں خاندان کا لڑکا پکڑا گیا تھا۔ لڑکی باغی ہو گئی ہے کہیں بھاگ نہ جائے۔ کہیں موہنوں پر کالک نہ مل جائے۔ دنوں میں بات طے ہوئی اور ہفتوں میں نکاح نہ مہندی ہوئی نہ گانے بجے، نہ سہیلیوں نے ڈھولک پیٹی نہ شادمانے بجے اور نکاح ایسے ہو گیا کہ جیسے جنازہ ادا ہوا اعتبار توڑنے والوں کے لیے شادمانے کون بجاتا ہے۔ عشق محبت کرنے والی لڑکیوں کے لیے کہاں آتش بازیاں ہوتی ہیں۔ چاہے عزت بچے، دستار سجے غرور بڑھے پر یہ شادمانی کی نعمت پھر تابعداری سے بھی نہیں ملتی عشق کے رستے پر ہر طرف خواری ہے، ہار کر بھی جیت کر بھی لڑ کر بھی جھک کر بھی، قربانی دے کر بھی اور لے کر بھی یہ دیس نکالا کسی صورت نہیں ٹلتا۔
باپ نے نکاح کے وقت سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ نہ جانے خوش قسمتی کی دعا دی یا نہیں پر شکر ضرور ادا کیا دل میں کہ عزت بچ گئی۔ گھر سے جنازہ بڑی دھوم سے نکلا ماں رونے کی بجائے رخصتی پر ہنستی رہی۔ اس کی بھی عزت رہی، گھر بھی بچا اور سہاگ بھی۔ سب کچھ بچ گیا صرف لٹا تو سسی کا شہر بھنبھور، رومانوی فقرے، تحفے تحائف، دعوتیں، رنگ برنگے کپڑے، جھلمل کرتے زیور سب لوٹ آیا اس کی زندگی میں مگر ایسے کہ جیسے انٹینا ہل جانے سے رنگین ٹی وی کالا ہو جائے۔ تصویر ہلتی رہے چکراتی ہے۔ سعدیہ ایک بار بھٹکی تھی مگر اب قدم سنبھال کر رکھتی زندگی کے ساتھ چلتی رہی۔ گھر بنانے میاں کو اپنانے کی کوششوں میں جت گئی سسرال کی خدمتوں میں مصروف رہنے کی کوششوں میں خود کو بگاڑتی گئی۔ اپنوں نے جن پھولوں پر رخصت کیا تھا تو غیروں سے تو توقع ہی نہ تھی۔ قبولیت ہی قبولیت تھی ہر طرف جھولی میں پھول گریں یا کنکر، روڑے گریں، یا شبنم، کس کو فکر! جب پتھروں پر چلنا مقدر ٹھہرا تو تلوؤں کی کیا فکر۔
نہ فلک ٹوٹے نہ زمینیں پھٹی خدمتیں ہمیشہ کامیاب ٹھہرتی ہیں۔ اس کی بھی ٹھہر گئی تھیں۔ کیا فرق پڑتا ہے کہ دل مر جائے، کیا فرق پڑتا ہے اگر وہ سجدہ سہو کرتی رہے۔ زندگی کی ایک بنت ڈھیلی رہ گئی تھی کوئی ٹانکا غلط جا لگا تھا کہ لباس

تنگ پڑ جاتا، سانس پھنسنے لگتا، دودھ ابلتا، سالن جلتا اور راتیں جاگتی رہتیں۔ نعمتوں میں سے لذت روٹھ گئی، خوبصورتیوں کے رنگ بکھر گئے۔ زندگی ادھوری، اس طرف پوری نہ اس اس طرف پوری۔

ماں باپ کے گھر لڑکیوں کی زندگیوں کے کچھ ٹانکے ادھیڑ دو۔ ساری عمر سسرال کو چاٹتی ان کی ٹھوکروں کو سہتی رہے گی۔ میاں پر آمین پڑھتی رہیں گی گھروں سے ایسے رخصت کرو کہ ڈولی کی بجائے جنازہ لگے پھر جنازہ بھی واپس نہ آئے گا جو بیٹیاں باپ کے گھر لہولہان ہو جائیں ان کو رستوں کے آسیب پھر ڈراتے نہیں۔ راضی باضی سسرال، خوش اور مطمئن شوہر۔ نقصان صرف ایک ذات کا..... اک بے نشاں بیکار وجود کا جس کے ہونے نہ ہونے سے کائنات میں کسی کو فرق نہیں پڑتا۔ زندگی کی بنت میں اس سے بھی کچھ بگڑ گیا تھا کوئی ٹانکا ادھڑ گیا تھا پر اس کو سدھارنے کا اب کوئی چارہ نہ تھا۔ اس نے عشق کی نماز پڑھی تھی جس میں سجدہ سہو نہ تھا۔

.....☆☆.....

پین کلر ٹیبلٹ

محمد فاروق

ڈاڑھ میں درد نے چھٹی کا دودھ یاد دلا دیا تھا مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے جہنم میں بھی گناہ گاروں کو یہی سزا دی جائے گی۔ فرشتے مجرموں سے کہیں گے چلو تم نے دنیا میں قتل و غارتی کی لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم کیا۔ اب یہاں تمہارے لیے داڑھ کا درد بطور سزا ہے۔ توبہ توبہ اس قدر شدید درد، بندہ کی ٹانگ میں درد ہو کھا پی تو سکتا ہے۔ داڑھ کے درد میں تو انسان کچھ کھا بھی نہیں سکتا۔ کل شام جب درد میں بلا کی شدت تھی میں ڈاکٹر صاحب کے پاس گیا اور درد سے تڑپتے ہوئے اُن سے کہا اس ڈاڑھ کمبخت کو جڑ سے نکال دو۔ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔ ڈاکٹر صاحب نے منہ کھلوا کر داڑھ کا دور سے سرسری جائزہ لیا جیسے کوئی آرمی افسر میدان جنگ کا دور جائزہ لیتا ہے اور تشخیص کیا کہ ابھی مسوڑوں پر سوجن ہے چند دن یہ دوائی کھاؤ جب سوجن ختم ہو جائے تو پھر میرے پاس آجانا داڑھ نکال دوں گا۔ ڈاکٹر صاحب نے درد کو رفع کرنے کے لیے پین کلر ٹیبلٹ دے دیں میں نے دی ہوئی گولیاں کلینک میں ہی پھانک لیں اور ایک گلاس پانی ڈگڈگا گیا۔ کوئی دو گھنٹے بعد سکھ کا سانس آیا اور درد میں کچھ افاقہ ہوا۔ دوسرے دن اپنے دفتر چلا گیا۔ انٹر کے بعد ابا جی نے کسی سے کہلوا کر مجھے زراعت کے محکمہ اسلام آباد میں چھوٹا کلرک رکھوا دیا ورنہ آج کل بارہ جماعتیں تو ٹکا ٹنڈ ہیں کوئی گھاس نہیں ڈالتا۔ ابا جی کو ہماری عقل دانش کے بارے کچھ بدگمانی تھی۔ اس لیے میرے چھوٹے کلرک بننے پر پھولے نہیں سما رہے تھے۔ حالانکہ اعلیٰ افسروں والی سارے اوصاف و خواص میرے اندر بدرجہ اتم موجود تھے۔ بس بی اے کے پاس نہ ہونے کی وجہ سے گھر میں ناک کٹ گئی۔ بہر حال اب ہم سرکاری ملازم ہو گئے تھے۔ ویسے تو یہ زراعت کا محکمہ تھا لیکن کام کے لحاظ بالکل بنجر تھا۔ میں سارے دن دفتر میں مکھیاں مارتا، انگڑیاں لیتا، گپیں ہانکتا اور ساتھ والے کلرکوں سے چونچیں لڑاتا۔ یہ سرکاری نوکری بھی من و سلویٰ تھی محنت کے بغیر تنخواہ ملتی رہتی ہے۔ نوکری نے گھر کا چھوڑا نہ گھاٹ کا۔ اب میں حیدر آباد سے اسلام آباد آ گیا تھا۔ اب حیدر آباد میں رہ نہیں سکتا تھا اور اسلام آباد کی روکھی فضا میں دل نہیں لگتا تھا بس کولہو کے بیل کی طرح گھر سے دفتر اور دفتر سے گھر چکر لگاتے دن گذر رہے تھے اسلام آباد میں رہائش کے لیے دفتر کے قریب ایک دوست کے ساتھ مل کر ایک کمرہ کرائے پر لیا ہوا تھا دفتر اور کرایہ کے مکان میں بیس پچیس منٹ کی دوری تھی دفتری اوقات کے بعد میں مٹر گشت کرتا ہوا اپنے جائے قیام پر پہنچ

جاتا۔ ایک تو راستہ کی رونق سے لطف لیتا دوسرا بس کا کرائے کے پیسے بھی بچ جاتے۔ ایک سہ پہر کو میں چھٹی کر کے گھر جا رہا تھا جب میں آبپارہ سے کشمیر روڈ پر نکلا تو میرے سامنے دو عورتیں رکشا میں سے اُتر رہی تھیں شاید وہ بازار سے آ رہی تھیں۔ ان کے ہاتھ میں کپڑے سے ٹھونسے ہوئے شاپنگ بیگ تھے۔ ان خواتین کے رنگ گورے اور نین نقش تیکھے تھے انہوں نے جینز پہنی ہوئی تھی ان میں سے ایک کے ہاتھ میں موبائل فون بھی تھا جب یہ خوبصورت خواتین میرے بالکل قریب سے گذریں تو لامحالہ میں نے ان کو غور سے دیکھا۔ اسی لمحہ میں نے دیکھا کہ خواتین کے پیچھے پیچھے ایک بابا بھی آہستہ آہستہ لاٹھی ٹیکتا آ رہا تھا لگتا تھا کہ کسی گاؤں کا رہنے والا ہے کیونکہ انہوں نے سر پر پگڑی باندھ رکھی تھی ناک پر بڑی سی عینک تھی۔ چہرے پر جھریوں نے عمر رفتہ کے ماہ و سال نقش کر دیے تھے۔ میرا خیال ہے بابا کم از کم ستر اسی کے پیٹے میں ضرور ہو گا کیونکہ بھویں تک چاندی ہو گئیں تھیں۔ بابا سفید رنگ کا کُرتا شلوار پہنے ہوئے تھا جو سفید داڑھی کے ساتھ میچ کر رہی تھی۔ گذرتی خواتین کو تو میں نے کافی گہری نظر سے دیکھا اور کیوں نہ دیکھتا ان خواتین کی تو بڑی بڑی آنکھیں اور ستواں ناک تھی جوانی میں تو چھوٹی آنکھوں اور چپٹی ناک والی خواتین بھی نسیم سحر لگتی ہیں۔ البتہ سن رسیدہ سنو وائٹ بابا جی جب میرے پاس سے گذرے تو میں نے اُن پر ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈالی۔ بھلا بجھتے چراغ اور مرجھاتے پھولوں کو کون اہمیت دیتا ہے۔ شہروں میں اس طرح کے بابے چلتے پھرتے ملتے ہی رہتے ہیں۔ ابھی میں ایک قدم ہی آگے بڑھا تھا کہ بابا جی نے آواز دی۔

''بیٹا .....!'' میں نے پلٹ کر دیکھا۔ یکدم بجلی کی سی تیزی سے من میں یہ خیال کوندہ، کاش شاپروں والی بینا میں آواز دیتیں مگر دل نے کہا اپنی ایسی قسمت کہاں کہ صنف نازک کی مترنم آواز کان میں رس گھولے اپنے مقدر میں تو بابوں کی کھردری آوازیں ہیں میں نہ چاہتے ہوئے بابا کی طرف متوجہ ہوا بابا جی کے ہاتھ میں ایک پرچی تھی انہوں نے اس کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''بیٹا مجھے اس پتہ پر جانا ہے ذرا رہنمائی کرنا'' میں بادل نخواستہ رکا۔ مجھے عمر رسیدہ افراد سے زیادہ اُنس اور لگاؤ نہیں ہے۔ مجھے یہ خبطی سے لگتے ہیں بڑھاپے میں بھی گھر چین سے نہیں بیٹھتے۔ مجھے بچپن میں صرف ایک ہی بوڑھا اچھا لگا وہ میرے دادا تھے آنکھیں تو ان کی بھی اِس بابا کے آنکھوں کی طرح چہرے میں دھنسی ہوئی تھیں اوپر سے موٹے شیشوں والا چشمہ بھی لگاتے تھے داڑھی بالکل سفید براق تھی لیکن میں ان کے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ وہ تو میری جان تھے میرے بچپن نے دادا کی اُنگلی پکڑ کر چلنا سیکھا تھا اور اُن کی گود کے طول و عرض میں کھیلتے میں نے ہوش سنبھالا تھا اور جب میں اپنی زندگی کے پانچویں زینے پر چڑھا تو وہ مجھے اسکول خود داخل کروا کر آئے تھے پھر ان کا معمول بن گیا کہ وہ روز مجھے اسکول چھوڑتے اور لینے جاتے راستے میں مجھ سے یوں باتیں کرتے جیسے کہ وہ میرے ہم عمر ہوں۔ کچھ دن میرے ساتھ آتے جاتے ان کو میرے ٹیچرز کے نام بھی یاد ہو گئے تھے پھر وہ میرے ٹیچرز کے نام لے لے کر اُن کی باتیں کرتے مجھے ایسا لگتا جیسے وہ میرے کلاس فیلو ہیں۔ شام کو میرے ساتھ کرکٹ بھی کھیلتے بلا ان کو صحیح پکڑنا نہیں آتا تھا لیکن مجھے چیلنج دیتے کہ میں تجھے چھکا ماروں گا۔ تھوڑی دیر کے بعد ان کا سانس پھول جاتا تھا جب میں آؤٹ کر دیتا یا وہ خود ہی آؤٹ ہو جاتے تو کہتے کل دیکھ میں تیرے ساتھ کیا سلوک کرتا ہوں لیکن وہ کل کبھی نہیں آئی جنوری کی ایک سرد رات کو ان کی طبیعت ایسی خراب ہوئی کہ ابو اور تایا جان کے قدموں تلے سے زمین نکل گئی وہ اُن کو اسپتال لے جانا چاہتے تھے لیکن خدا جانے میرے دادا جی بھی خبطی ہو گئے تھے کراہتے ہوئے کہنے لگے۔

''مجھے اسپتال نہ لے کر جاؤ، میرا علاج اب اسپتال میں نہیں ہے۔ بلکہ میرے گڈو کو میرے پاس لے آؤ۔ میں ایک نظر اس کو جی بھر کر دیکھ لوں گا تو مجھے قرار آ جائے گا۔'' وہ مجھے پیار سے گڈو کہا کرتے تھے میں اس وقت سو رہا تھا

میں بھلا کیسے علاج کر سکتا تھا۔ میرے دیکھنے سے ان [illegible]
ٹیبلٹ تو نہ تھا۔ شاید بیماری کی وجہ سے دادا جی سٹھیا گئے تھے۔ ممکن ہے اپنا حال [illegible]
کسیلی گولیاں کھانی پڑتی ہیں اور سوئیاں بھی تو لگتی ہیں۔ میرے ابو اور تایا اُن کی زندگی [illegible]
دادا جی کی نہ مانی فوری طور پر اُن کو اسپتال لے گئے مجھے اس لیے نہ اٹھایا کہ مجھے دیکھ کر دادا جی کی طبیعت مزید خراب ہو۔ میں صبح اُٹھا تو دادا جی کو نہ پایا میں ہاتھ منہ دھو کر ابھی والدہ سے دادا جی کی عدم موجودگی کے بارے میں پوچھنا ہی والا تھا کہ دروازے پر ایمبولینس رکی اور میرے سامنے ابو جی اور تایا جان اس میں سے دادا جی کا بے حس و حرکت جسم کو نکال رہے تھے۔ میں نے دادا جی کی طرف دیکھا ان کا چہرہ ایسی میت کا تھا جس کی آخری خواہش پوری نہ ہوئی ہو۔ دادا جی اپنی اننگز کھیل کر آج آؤٹ ہو گئے تھے۔ وہ ٹھیک ہی کہتے تھے کہ اب اسپتال میں میرا علاج نہیں ہے۔ اگر ابو ٹینڈ سے جگا دیتے تو شاید دادا جی ٹھیک ہو جاتے۔ میں کچھ بولنا چاہتا تھا لیکن میرا گلا رندھ گیا جب زبان حال دل بیان کرنے سے قاصر ہو تو ساون آنکھوں میں ڈیرے ڈال لیتا ہے میرے ساتھ بھی یہی ہوا میری آنکھوں سے ساون کی برکھا جی کھول کر برسی۔ میرا بچپن دادا کے بڑھاپے سے لپٹ کر بہت رویا۔ بچے بوڑھوں کے پاس خوش رہتے ہیں اور بوڑھے کی نفسیات بچوں جیسی ہو جاتی ہے۔ اس لیے دونوں ایک دوسرے کے قریب ہو جاتے ہیں جوانوں کا طرز عمل مختلف ہے۔ ان کی خواہشات کا رخ جنس مخالف کی طرف ہوتا ہے۔

کچھ دن کے بعد میری والدہ نے کہا اب تم بڑے ہو گئے ہو اس لیے اسکول اکیلے ہی جایا کرو۔ والد صاحب تو بہت مصروف تھے ان کے پاس وقت نہ تھا کہ مجھے اسکول لینے اور چھوڑنے جاتے۔ اب میں اسکول اکیلا ہی جاتا تھا رفتہ رفتہ میں جوان ہوتا گیا لیکن پڑھنے لکھنے میں میرا گراف نیچے کی طرف آ گیا میرا دل اب لڑکیوں کی طرف کھنچنے لگا میرے شوق کرکٹ کھیلنے اور انڈین فلم دیکھنے تک محدود ہو گئے اور نہ جانے کیوں میرا جی بوڑھے افراد اور بندہوتے بازاروں سے گھبرانے لگا۔ اب میں بچپن سے بالکل مختلف مزاج کا آدمی تھا۔ اس لیے سرے راہ ملنے والا بابا جی سے میری کوئی دلچسپی نہ تھی اگر مجھے کوئی اور راستہ ملتا تو میں پاؤں کھینچ لیتا لیکن بابا جی تو بالکل سر چڑھ گئے تھے ان کو کیسے ٹالتا بادل نخواستہ رو کا۔ تاہم جس پتہ کی بابت وہ پوچھ رہے تھے وہ میرے راستے میں ہی تھا بابا جی کی اس ایڈریس پر لے جانا میرے لیے زیادہ جان جھوکوں کا کام نہ تھا اس لیے اس رہ پڑی نیکی کو جھولی میں ڈال لیا اور بابا جی سے کہا کہ چلئے میرے ساتھ میں آپ کو چھوڑ دیتا ہوں۔ ہم فٹ پاتھ پر شیشم کے درختوں کے سائے میں چل پڑے، چلتے چلتے بابا جی نے مجھ سے میرا نام پوچھا۔ میں نے کہا میرا نام فرید ہے جی فرید شاہ۔ پھر بابا جی نے بتایا کہ ان کا نام خیر الدین ہے پرانے بابوں کے نام بھی ایک سے ہوتے ہیں خیر دین نظام دین چراغ دین۔ ان کی زندگی مذہب کے گرد طواف کرتی ہیں اس لیے اُن کے ناموں میں دین کا لفظ ضرور آتا تھا بعض اوقات قریب سے کوئی رکشا یا موٹر سائکل شور مچاتا ہو گذر جاتا لیکن ہم مسلسل دھیرے دھیرے اپنی منزل کی طرف چلتے رہے۔ بابا جی سے پتا چلا کہ وہ دہاڑی سے سفر کر کے یہاں آئے ہیں۔ میرے سوال پر کہ آپ نے اس عمر میں اتنا لمبا سفر کیوں کیا تو انہوں نے مسکراتے ہوئے بتایا میں اپنے پوتے کاشی سے ملنے آیا ہوں پچھلے دنوں میری طبیعت بہت خراب ہو گئی تھی۔ تپ ایسا چڑھا کہ اُترنے کا نام ہی نہ لیتا تھا بس مجھے ایسا لگا کہ میں پل دو پل کا مہمان ہوں سانس اکھڑی جا رہی تھی۔ ایسے وقت میں مجھے اپنا پوتا کاشی بہت یاد آیا اس کا گلاب کی طرح کھلتا چہرا میرے سامنے تھا۔ میرے دل سے اُس وقت دعا نکلی۔ کہ اللہ ایک دفعہ مرنے سے پہلے مجھے کاشی سے ملا دے۔ اللہ نے میری دعا کو قبول کر لی اور میں رفتہ رفتہ ٹھیک ہوتا گیا۔

میں نے پوچھا کہ ”آپ نے کسی ڈاکٹر سے دوائی نہیں لی؟“

''لی تھی۔'' بابا جی نے زمین پر لاٹھی ٹیکتے ہوئے کہا عمر کے جس حصہ میں ہوں یہاں دوائیاں بے اثر ہو جاتی ہیں اور ویسے بھی یہ جو پوتے پوتیاں نواسے نواسیاں ہوتے ہیں یہ بھی پین کلر ٹیبلٹ ہوتی ہیں ان کو دیکھ کر جسم کے ساتھ ساتھ روح کو بھی آرام آجاتا ہے۔ یہ پوتے پوتیاں اور نواسے نواسیاں جب آنگن میں کھلتے ہیں تو یہ بھی کسی ٹانک سے کم نہیں ہوتے۔ بابا جی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اس لیے میں کاشی سے ملنے آیا ہوں۔ اُس کو دیکھ کر بوڑھی ہڈیوں میں جان پڑ جاتی ہے۔ باتوں باتوں میں راستے کا پتا ہی نہ چلا اور بابا جی کا ایڈریس آگیا میں بابا جی کو اُن کے دیے ہوئے پتے پر چھوڑ کر سوچنے لگا جوانی بڑھاپے کا آپس میں سُر اور ملاپ کیوں نہیں ہے۔ یہ عمر کے دو حصے ایک دوسرے سے دوری پر کیوں کھڑے ہیں۔ شاید جوانی ایک طاقت کا نام ہے بچپن اور بڑھاپا کمزوری اور نقاہت کا نام ہے۔ طاقت اور کمزوری ایک سطح پر برقرار نہیں رہ سکتے۔ کمزور کمزور کے ساتھ اکٹھا ہو جاتا ہے۔ اس لیے بچوں کی راحت بزرگوں میں اور سن رسیدہ افراد کی جان بچوں میں ہوتی ہے۔

.....☆☆.....

خالی ہاتھ
سحرش علی نقوی

''شہروز تم نے ایسا کہا بھی کیسے؟ ایسا سوچا بھی کیسے؟ میں تمہارے علاوہ کسی اور سے شادی کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتی۔'' بھوری آنکھوں میں نمی در آئی تھی..... آواز بھی شدت جذبات کے زیر اثر کپکپاتی ہوئی سی تھی۔

''ہر محبت کے نصیب میں وصل نہیں ہوتا... کچھ محبتوں کی تقدیر میں فقط ہجر لکھا ہوتا ہے۔'' اس نے بھی جذباتی انداز میں اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا تھا۔

''نہیں.... ایسا مت کہو۔'' بے اختیار اس کے لبوں پہ ہاتھ رکھتے ہوئے وہ تڑپ اٹھی۔

''اپنے بابا جان کی بات مان لو عالیہ.... تم جانتی ہو اس محبت کا کوئی انجام نہیں..... پانچ سال سے ہم دونوں پروانے کی صورت شمع کے گرد بے سود چکر لگا رہے ہیں''۔ اس نے نرمی سے اس کا ہاتھ اپنے لبوں سے ہٹا کر کہا۔

''تو پروانے کی طرح ہی مجھے محبت میں جل کر مر جانے دو.. مگر خدا کے لیے مجھے کسی اور کو ہونے کا مت کہو؟'' اب کی بار اس نے حتمی سے انداز میں کہا تھا۔

''مرنا قبول ہے نا تمہیں... تو بس اس شادی کو اپنی موت سمجھ کر قبول کر لو..... مگر اب یہ ہماری آخری ملاقات ہے۔'' اپنا فیصلہ سناتے ہوئے اپنی نشست سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

وہ نم زدہ آنکھوں اور سسکتی آواز سے اسے رک جانے کا کہتی رہی مگر وہ رکا نہیں تھا۔ وہ دونوں شہر کے کسی کیفے میں ملے تھے اور پچھلے پانچ سال سے ملاقاتوں کا یہ سلسلہ جاری تھا۔

پانچ سال پہلے وہ پہلی بار اپنی یونیورسٹی میں ملے تھے دونوں کلاس فیلوز تھے۔ پہلے دوستی ہوئی اور چند ہی دنوں میں دونوں نے اپنی محبت کا بھلا جھجک کھل کر اعتراف بھی کر لیا تھا۔ ان کی گریجویشن اور ماسٹرز ایک دوسرے کے ساتھ محبت بھرے خوابوں سنگ ہوئے تھے۔ پڑھائی کے بعد شہروز کو اچھی جاب حاصل کرنا تھی اور عالیہ کے گھر رشتہ بھیجنا تھا۔ اچھی جاب تو اسے کچھ تگ و دو کے بعد مل گئی تھی اور عالیہ کو ماسٹرز کے بعد اس کی فیملی نے گھر داری سکھانے میں لگا دیا تھا۔ اس کے لیے کئی رشتے آئے تھے جسے وہ کسی نا کسی بہانے سے ٹھکرا دیتی تھی صرف اور صرف شہروز کے انتظار میں۔

کبھی عذر بناتی کے لڑکے کی ماں تیز لگتی ہے تو کبھی بہنیں زیادہ ہیں، جیٹھانی چالاک ہے تو کبھی لڑکے کے سر پر بال

کم ہیں، نیز بھی کیا تو بھی کیا۔ شکل وصورت میں عالیہ کافی اچھی تھی متناسب سراپہ، دراز قد، بھوری آنکھیں، بھورے بال، سرخ وسفید رنگ اور تعلیم یافتہ بھی خاندان بھی اچھا تھا اس وجہ سے رشتوں کی ایک لمبی لائن تھی۔

شہروز اور عالیہ کی ذات میں فرق تھا اور یہی وجہ تھی کہ اب تک شہروز اس کے گھر رشتہ نہیں بھیج پایا تھا۔ عالیہ خود بھی جانتی تھی کہ اس کے ہاں ذات سے باہر رشتے، شادی کا رواج نہیں ہے۔ اس کے اپنے گھر بھی چند ایک دوسری ذات کے رشتے آئے تھے جو کہ شہر میں خصوصی حیثیت رکھنے والے لوگ تھے مگر اس کے والد نے ایک لمحہ سوچے بنا انکار کر دیا تھا۔

''تم کم سے کم ایک بار اپنے پاپا کو میرا ہاتھ مانگنے کے لیے بھیجو تو سہی۔'' وہ ہر بار اصرار کرتی تھی۔

''میں نے کہا نا عالیہ میں ان کو منانے کا ہر جتن کر چکا ہوں.... وہ نہیں مانے.... اور بالفرض میں ان کو خودکشی یا گھر چھوڑ کر جانے کی دھمکی دے کر زبردستی تمہارے گھر بھیج بھی دوں تو تمہارے بابا جان انکار کر دیں گے.... تب میرے منہ میں کیا رہ جائے گا....؟؟''۔ وہ ہر بار یہی جواب دیتا تھا

''میں اپنے بابا جان کو انکار نہیں کرنے دوں گی شہروز.... مگر جو رشتہ ابھی آیا ہی نہیں میں اس کے لیے ضد کیسے کر سکتی ہوں... تم ضد کر کے رشتہ بھیج دو گے تو میں بھی ضد کر کے ہاں کروالوں گی''۔ وہ اسی طرح اس کو فورس کرتی کہ وہ اپنا رشتہ بھیجے۔

''ہم سے بہت بڑی غلطی ہوگئی عالیہ... ہمیں محبت سوچ سمجھ کر کرنی چاہیے تھی....''۔ وہ ایسی ہی کسی نا کسی بات اور لفظوں سے اس کا دل دکھا دیا کرتا تھا۔

''سوچ سمجھ کر کیا جانے والا سودا ہوتا ہے... محبت نہیں''۔ وہ بھی اپنے موقف پر قائم رہتی تھی۔

یوں ہی کبھی بحث میں تو کبھی الجھن میں وقت گزر رہا تھا کہ آخر عالیہ کے بابا جان نے تھک ہار کر عالیہ کا رشتہ خود ہی طے کر دیا تھا۔ وہ اس پر معاملہ چھوڑ کر انجام دیکھ چکے تھے۔ وہ اندھا دھند ہر اچھے رشتے کو ٹھکرا رہی تھی۔ مجبوراً انہوں نے اپنی مرضی چلائی اور عالیہ کا ایک اچھے خاندان میں بنا اس سے پوچھے رشتہ طے کر دیا تھا اور شادی کی تاریخ بھی تین ماہ بعد کی رکھ دی تھی۔ جب عالیہ کو یہ سب پتہ چلا تھا تو وہ ہواس باختہ اپنے بابا جان کے پاس بھاگتی آئی تھی۔

''بابا... سعد یہ مزاق کر رہی ہے نا.... آپ نے میرا کوئی رشتہ طے نہیں کیا نا....''۔

''تمہاری بہن مزاق نہیں کر رہی عالیہ.... میں نے بہت سوچ سمجھ کر تمہارا رشتہ کیا ہے.... اتنا سلجھا ہوا نیک طبعیت لڑکا میں نہیں ٹھکرا سکتا تھا... اگر ٹھکراتا تو ساری عمر دل میں کسک سی رہ جاتی''۔ انہوں نے اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا تھا۔

''لیکن بابا...''۔ وہ احتجاج کرنا چاہتی تھی۔

''میں زبان دے چکا ہوں.... اب تمہیں میری عزت کا پاس رکھنا ہے عالیہ.... تم اپنے کا یوں سر نہیں جھکا سکتی''۔

اس کا احتجاج شروع ہونے سے پہلے ہی ختم کر دیا گیا تھا.... جذباتی بلیک میلنگ کہا جائے یا جو بھی مگر اب وہ منہ چڑھ کر کیسے کہہ دیتی کہ میں آپ کی عزت کا خیال نہیں رکھ سکتی بابا.... میں آپ کا سر جھکا دوں گی۔

وہ چپ چاپ اپنے کمرے میں چلی آئی تھی ساری رات رو کر گزاری تھی۔ آخری حل یہی سوجھا کہ شہروز سے بات کرے وہ رشتہ بھیج دے تو شاید بات بن جائے... تب وہ کم از کم اپنے بابا سے یہ تو کہہ سکتی تھی کہ فرض ہی ادا کرنا چاہتے ہیں تو کاشف کی جگہ شہروز سے اس کی شادی کر دی جائے مگر شہروز نے کیفے میں مل کر اس کی آخری امید پر بھی پانی پھیر دیا تھا۔

.....☆☆.....

''کیوں مجھے بار بار میسج کرتے ہو شہروز... کیوں بار، بار مجھے ملنے کے لیے بلاتے ہو''۔ کیفے میں اس نے بے بس

سے انداز میں کہا تھا۔

''فقط محبت سے مجبور ہوں عالیہ''۔ شہروز نے اس کے ہاتھ کی پشت پر اپنا ہاتھ رکھا تو اس نے جھرجھری سی لے کر اپنا ہاتھ جھٹکے سے میز پر سے ہٹایا اور چیخ کر کہا۔

''میں شادی شدہ ہوں شہروز....''۔

''شادی شدہ ہو تو کیا میں تم سے محبت چھوڑ دوں؟؟؟ بہت کوشش کی تمہیں بھلانے کی مگر میرے اختیار میں نہیں عالیہ.... تم خود ہی سوچو آج کل لڑکیوں کی کمی تو نہیں پھر مجھے کیا ضرورت ہے ایک شادی شدہ عورت کے پیچھے بھاگنے کی''۔ وہ اس کے ہاتھ چھڑانے کے انداز پر تاسف سے اس پر نظریں گاڑے کہہ رہا تھا۔

''میں تم سے صرف اتنا ہی تو کہتا ہوں کہ مجھ سے رابطے میں رہو، کبھی فرصت ملے تو مل لیا کرو، کبھی کچھ دیر بات کر لیا کرو... اپنا حال بتا دیا کرو اور میرا حال سن لیا کرو... مختصر یہ کہ تم سے جڑے رہنے کا احساس مجھ سے مت چھینو''۔

''دیکھو شہروز شادی کے ایک سال بعد بھی میں تمہیں بھولی نہیں ہوں.: جب اصرار کرتے ہو میں خود کو روک نہیں پاتی اور تم سے ملنے چلی آتی ہوں.... تم یوں ہی میری زندگی میں شامل رہے تو میں کبھی بھی تمہیں بھول نہیں پاؤں گی.....''۔ اس نے رندھی ہوئی آواز میں کہا تھا۔ وہ واقعی اس کے سامنے بے بس ہو جاتی تھی اس کی پانچ سال کی محبت شادی کے ایک سال پر بھاری تھی۔

اپنی شادی کے پہلے دن سے ہی اسے کاشف میں کوئی دلچسپی محسوس نہیں ہوئی تھی.... وہ شعوری اور لاشعوری طور پر ہر وقت کاشف اور شہروز کا موازنہ کرتی رہتی..... ہر سچوئیشن میں وہ بس یہی سوچتی کہ اس جگہ شہروز ہوتا تو یہ ہوتا، شہروز ہوتا تو وہ ہوتا۔

اسے لگتا تھا کاشف کے ساتھ اس کا روم میٹ کے علاوہ کوئی رشتہ ہی نہیں... یہاں تک کے دوستی کا بھی نہیں۔ نہ اس کے پاس کاشف سے کرنے کے لیے کوئی باتیں ہوتی تھیں نہ اس کی باتیں سننے میں دلچسپی۔

شادی کے ایک ماہ بعد ہی شہروز نے بھی اسے کالز اور میسجز شروع کر دیئے تھے جنہیں کچھ دن تو اس نے خود پر جبر کرتے ہوئے اگنور کیا تھا مگر پھر اپنی محبت سے مجبور ہو کر اس سے بات کرنے لگ گئی۔ اس کے زیادہ اصرار پر ملنے بھی چلی جاتی تھی مگر جب اسے اپنے شادی شدہ ہونے کا احساس ہوتا تو شہروز سے بھڑ جایا کرتی مگر پھر کچھ ہی دنوں میں پھر سے اس کی محبت جاگ اٹھتی۔

''تم کچھ بھی کر لو مجھے نہیں بھول پاؤ گی عالیہ..... مجھے اگنور کرو گی تو خود ہی اذیت میں رہو گی... جب میں تمہیں نہیں بھول پایا تمہاری شادی ہونے کے باوجود بھی.... تو تم کیسے بھول سکتی ہو مجھے.... میں اپنی محبت میں شراکت کے باوجود تم سے جدا نہیں ہو سکا..... پھر میں تو فقط ہوں ہی تمہارا..... دل و جان سے تمہارا''۔ اس نے پھر سے اس کا ہاتھ تھام لیا تھا اور اس بار وہ اس کی جذباتی باتوں میں اس قدر ڈوبی تھی کہ اپنا ہاتھ چھڑانا اسے یاد ہی نہ آیا تھا.... وہ شادی شدہ، کسی کی بیوی ہے یہ اسے یاد ہی نہ رہا۔

وہ بے خودی سی اس کی آنکھوں میں اپنے لیے محبت کا انبار محسوس کرتے ہوئے سرشار ہو رہی تھی جب اس کا سیل فون زور و شور سے بجنے لگا تھا۔ وہ چونک کر اپنے ہواس میں آئی تھی اور سیل فون پر آنے والی کال ریسیو کی تھی۔

اسے ملازمہ نے کال کی تھی یہ بتانے کے لیے کہ اس کا بیٹا سنبھالے نہیں سنبھل رہا تھا اور مسلسل جانے کیوں روئے جا رہا تھا۔

''میں بس کچھ ہی دیر میں آتی ہوں''۔ ملازمہ سے کہہ کر اس نے کال کاٹ دی تھی اور نم آنکھوں سے شہروز کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''میں ایک ماں بھی ہوں شہروز.... کس، کس رشتے سے بے وفائی کروں؟؟ کاشف سے میں محبت نہیں کرتی مگر

اپنے بیٹے سے بہت پیار کرتی ہوں. تم بھلے ہی صرف میرے ہو مگر میں اپنے بیٹے کی بھی ہوں... میرے بیٹے کی بھلائی اسی میں ہے کہ تم مجھ سے دور چلے جاؤ بہت دور...... بھول جاؤ مجھے اور دوبارہ کبھی میری زندگی میں آنے کو کوشش مت کرنا....''۔اس نے اپنے گالوں پر بہتے آنسوؤں کو ہاتھ کی پشت سے رگڑ کر صاف کرتے ہوئے کہا تھا۔

''صرف تمہارا بیٹا نہیں ہے وہ.... میرا بھی بیٹا ہے عالیہ..... میں نے اسے کبھی کاشف کی اولاد نہیں سمجھا.... میں اس سے اتنا ہی پیار کرتا ہوں جتنا کہ تم..... تم سے جڑی ہر چیز میری ہے... ہر چیز سے مجھے محبت ہے تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تمہارا بیٹا مجھے عزیز نہیں ہو گا....''۔اب کی بار اس نے عالیہ کی بھوری آنکھوں سے برسے مزید آنسوؤں کو صاف کرتے ہوئے کہا تھا۔

''تو تم ہی بتاؤ... کیا کروں میں؟؟ کیا حل ہے اس سب کا.... بیوی کاشف کی ہوں، محبت تم سے کرتی ہوں، گھر میں کاشف کا بیٹا چھوڑ کر آئی ہوں.... اور...''۔وہ جیسے سلگ اٹھی تھی۔

''طلاق لے لو کاشف سے....''۔اس نے حتمی انداز میں کہا تو وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھنے لگی۔

''ہاں عالیہ... طلاق لے لو کاشف سے.... میں اور تم شادی کر لیتے ہیں.... ہمارے مسئلے کا یہی حل ہے''۔وہ اس کے حیرت زدہ چہرے کو بھانپتے ہوئے اب اسے تسلی دینے لگا تھا۔

''پہلے تمہارے بابا کبھی ہمارے رشتے پر نہ مانتے مگر اب طلاق یافتہ بیٹی کی شادی کے لیے وہ ذات پات کی قید میں نہیں رہیں گے......''۔

''تم سیریس ہو؟؟ نہیں... یہ مزاق ہے نا''۔اس نے استفسار کیا۔وہ جیسے خود کو یقین دلانا چاہتی تھی۔

''محبت مزاق نہیں ہوتی عالیہ.....''۔اس نے جتا کر کہا۔

اس سے پہلے کہ عالیہ کچھ کہتی اس کا سیل فون ایک دفعہ پھر بجنے لگا تھا اور وہ بوکھلاتی ہوئی نشست سے اٹھ گئی اور کان سے فون لگاتے ہوئے کیفے سے نکل گئی۔

''ہاں، ہاں، بس پانچ منٹ میں پہنچ رہی ہوں''۔

☆☆

گھر قدم رکھتے ہی وہ اپنے سامنے کاشف کو دیکھ کر ٹھٹک گئی جو اپنی گود میں عمیر کو گود میں اٹھائے ٹہل رہا تھا۔

''آپ آفس سے......''۔اس کا سوال مکمل ہونے سے پہلے ہی کاشف نے بات کاٹ دی۔

''مجھے راشدہ نے کال کر کے بلایا ہے.... بتا رہی تھی کہ عمیر کا رو، رو کر سانس اکھڑنے لگا تھا.....''۔

وہ سہم کر عمیر کی طرف لپکی جو آنکھیں موندے کاشف کے بازوؤں میں سو رہا تھا۔

''فکر مت کرو... سلا دیا ہے میں نے.... کال آتے ہی میں سب کام چھوڑ چھاڑ کر گھر آ گیا''۔اس نے تسلی سی دی مگر اگلے ہی پل سوال کیا۔

''مگر تم نے اتنی دیر کیوں کر دی آنے میں؟؟.... ویسے گئی کہاں تھی تم؟؟''۔

''وہ.. وہ... میں.... وہ مارکیٹ گئی تھی.... ش شش.. ش.... شاپنگ کرنے''۔وہ اس اچانک سوال کے لیے تیار نہیں تھی تبھی بوکھلا سی گئی۔اب کیا بتاتی کہ وہ پکڑے جانے کے خوف سے گھر سے جانے کتنے میل دور کے کیفے میں شہروز سے ملنے جاتی تھی۔

''تمہارے ہاتھ میں تو کوئی شاپنگ بیگ نہیں''۔کاشف نے سرسری سا کہا تھا۔اس کی پیشانی پر پسینے کی بوندیں چمکنے لگیں۔

''راشدہ نے جس طرح کال کی تھی.... میں ہڑبڑاہٹ میں شاپنگ بیگز اسی شاپ میں بھول آئی جہاں اس وقت موجود تھی''۔اس نے نظریں چراتے ہوئے اپنے دوپٹے کے پلو سے پیشانی کو ذرا تھپک کے پسینہ صاف کیا اور ساتھ ہی

مزید سوالوں سے بچنے کی خاطر نرمی سے عمیر کو گود میں لیتے ہوئے کہا۔
''اب آپ آفس جائیں...''۔
کاشف نے رسٹ واچ پر ٹائم دیکھا اور اثبات میں سر ہلاتا ہوا چل دیا۔

......☆☆......

رات کھانے کے بعد وہ کاشف کے لیے چائے بنا کر آئی تھی اور اسے چائے کا کپ تھما کر جانے ہی والی تھی جب کاشف نے اس کا ہاتھ تھاما تھا۔ اس کے وجود میں کرنٹ سا دوڑ گیا۔ آج دوپہر میں اس کا یہی ہاتھ شہروز نے تھاما تھا

''کبھی میرے ساتھ بھی بیٹھ جایا کرو بیگم صاحبہ''۔ وہ اس کا ہاتھ یوں ہی تھامے اپنے ساتھ صوفے پر بٹھا رہا تھا اور وہ بھی بیٹھ گئی۔
کہاں کاشف کی یہ قربت اور کہاں شہروز کا وہ لمس..... کہاں کاشف کا یہ مصنوعی اپنا پن اور ساتھ کی فرمائش اور کہاں ازلی وہ جنونی محبت اور اس سے جڑے رہنے کی حسرت۔
نہیں..... اس کے وجود پر صرف اور صرف شہروز کا حق ہے..... جس ہاتھ کو شہروز نے چھوا تھا اس ہاتھ کو اب کوئی اور نہیں تھام سکتا..... اب وہ اس نام کے رشتے میں قید نہیں رہے گی..... ہرگز نہیں رہے گی۔
''مجھے طلاق چاہئے''۔ اس نے سپاٹ چہرے سے یوں اچانک کہا تو کاشف کے ہاتھ سے چائے کا کپ گر کر چکنا چور ہو گیا اور ماربل کے فرش پر چائے کے چھینٹے دور تک جا گرے۔
''اس طرح کی باتیں مزاق میں بھی نہیں کرتے عالیہ''۔ کاشف نے سنبھل کر اس کو ذرا ڈپٹ کر کہا۔
''میں نے کہا نا مجھے طلاق چاہیے''۔ وہ نشست سے چلاتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔
''عالیہ''۔ وہ بھی چلاتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔
''ابھی اور اسی وقت مجھے طلاق چاہیے..... مجھے نہیں رہنا آپ کے ساتھ..... آپ سے شادی میری مرضی کے خلاف ہوئی تھی..... سال بعد بھی میرے دل میں آپ کے لیے کوئی احساس پیدا نہیں ہو سکا تو اس رشتے کا فائدہ ہی کیا ہے؟؟ یہ بس ایک جسمانی تعلق ہے جسے اب میں مزید نہیں نبھانا چاہتی''۔ وہ پھنکار رہی تھی کہ ایک زناٹے دار تھپڑ اس کے گالوں پر رسید ہوا اور وہ پاس موجود صوفے پر دھک سے گر گئی۔
''طلاق چاہیے نا تمہیں..... دیتا ہوں تمہیں طلاق... مگر خدا کے لیے ہمارے پاکیزہ رشتے کے لیے ایسے غلیظ الفاظ استعمال نہ کرو''۔ اس نے سلگ کر کہا تو وہ سنبھلتی ہوئی پھر سے اٹھ کھڑی ہوئی۔
''او کے فائن..... دیں طلاق''۔ انداز میں از حد ڈھیٹائی تھی کہ وہ تلملا اٹھا۔
''طلاق کے بعد عمیر میرے پاس ہی رہے گا..... اسے ساتھ لے جانے کا سوچنا بھی مت''۔ اس نے دھمکی سی دی

''عمیر میرا بیٹا ہے..... وہ میرے ساتھ رہے گا''۔ وہ پھنکاری۔
''تو ٹھیک ہے طلاق بھی نہیں ملے گی..... یہاں رہو تم اپنے بیٹے کے ساتھ.....''۔ اب کی بار اس نے قدرے نارمل انداز میں سینے پہ بازو لپیٹتے ہوئے کہا تو اس کا روم روم سلگ اٹھا۔ اسے لگا کہ اسے جذباتی بلیک میل کیا جا رہا ہے... ایک سال پہلے اس کے بابا نے عزت کا واسطہ دے کر اسے اس زبردستی کی شادی میں باندھ دیا تھا اور آج کاشف اسے عمیر کا نام لے کر زبردستی اس شادی میں باندھ رہا تھا۔ وہ ایسا ہرگز نہیں ہونے دے گی۔
''میں عمیر کو اپنے ساتھ لے کر نہیں جاؤں گی..... مجھے ابھی اور اسی وقت طلاق دیں.. میں اب ایک پل کے لیے بھی آپ کے ساتھ اس چھت کے نیچے نہیں رہ سکتی..''۔ اس بار اس نے بھی پرسکون سے انداز میں کہا تھا۔

یہ پہلی بار نہیں تھا جب عالیہ اس طرح بے وجہ کاشف سے جھگڑی تھی۔ یہ معمول کی بات تھی..... کاشف اس سب کا عادی ہو چکا تھا مگر طلاق؟؟؟ طلاق اس نے پہلی بار مانگی تھی اور اس حرکت کا وہ عادی نہیں تھا۔

.....☆☆.....

''میں نے طلاق لے لی ہے شہروز..... اب ہمیں ایک ہونے سے کوئی نہیں روک سکتا''۔ اس نے گھر سے نکلتے ہی شہروز کو کال ملائی تھی اور اس کے ریسیو کرتے ہی بنا کسی تمہید یا ہیلو، ہائے کہ اس نے اپنی طلاق کا چہک کر بتایا تھا۔

''طلاق لے لی؟؟ مگر کیوں؟؟ اتنا اچھا تو تھا تمہارا میاں''۔ اس نے متجسس سا ہو کر کہا تو عالیہ کو لگا کہ اس کا اسی وقت دم نکل جائے گا۔

''تم ہی نے تو کہا تھا کہ میں طلاق لے لوں..... یہی ہمارے سب مسئلوں کا حل.....''۔ وہ کچھ کہہ ہی رہی تھی کہ شہروز نے اسی لاپرواہ سے انداز میں کہا۔

''ڈونٹ ٹیل می کہ تم نے میرے کہنے پہ طلاق لی ہے.....''۔

''ہاں شہروز..... میں نے سچ میں..'' اس کا گلا رندھا..... کچھ سنبھل کر وہ پھر سے گویا ہوئی ''شہروز..... آج تم ہی نے تو کہا تھا کہ میں طلاق لے لوں''۔

''اوہ کم آن..... وہ تو میں نے یوں ہی کہہ دیا تھا یار..... مجھے کیا پتا تھا کہ تم سچ میں طلاق لے لوگی''۔

''یوں ہی کہا تھا؟؟ مگر کہا تو تھا نا..... اب میری عدت پوری ہوتے ہی تمہیں مجھ سے شادی کرنی ہوگی''۔ اس نے سلگ کر کہا۔

''میری منگنی ہو چکی ہے عالیہ..... دو ماہ بعد شادی ہے میری..... میں تم سے شادی نہیں کر سکتا''۔ اس نے بڑی رسانیت سے اس پر بجلی گرائی۔

''منگنی؟؟ یہ اچانک منگنی کب ہوئی تمہاری؟؟''۔ وہ تقریباً چلائی تھی۔

''تمہیں پہلے بتاتا تو تم مجھے سے دور چلی جاتی عالیہ..... میں تمہیں کھونا نہیں چاہتا تھا..... میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں..... سچ میں..... شادی نہیں کر سکتا تو کیا ہوا..... میں ہمیشہ تم سے جڑا رہوں گا..... تم سے ملتا رہوں گا.....''۔ اس نے لہجے میں شیرینی گھولنے کی کوشش کی۔

''شہروز..... میں اپنی شادی توڑ کر آئی ہوں..... تمہیں بھی اپنی منگنی توڑنی ہوگی''۔ اس نے حتمی انداز میں کہا۔

''میری فیملی نہیں مانے گی عالیہ..... تم غیر شادی شدہ تھی وہ تب نہیں مانے تھے تو اب طلاق یافتہ ایک بچے کی ماں سے شادی پر وہ کیسے مان سکتے ہیں.....؟؟''۔ وہ پرسکون سے انداز میں اس پر بجلی گرا رہا تھا۔

''مگر ہمارا پیار شادی کا محتاج تو نہیں ہے..... اس وقت کہاں ہو تم..... میں ابھی تم سے ملنے آجاتا ہوں..... میں وعدہ کرتا ہوں روز تم سے ملا کروں گا..... اب تمہیں کاشف سے ڈر کر چھپ کر نہیں رہنا پڑے گا..... ہم کھلم کھلا ایک دوسرے کے ساتھ وقت بتا سکتے ہیں.....''۔

وہ مزید بھی کچھ کہہ رہا تھا مگر عالیہ کے ہاتھ سے سیل فون گر چکا تھا..... وہ خشک آنکھوں سے زمین میں گرتی چلی گئی۔ وہ پوچھ ہی نہ پائی کہ اس کی حیثیت کیا صرف وقت گزاری کے لیے مل لینے والی عورت کی ہی ہے بس؟؟۔

گھٹنوں کے بل بیٹھے اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کو اپنے سامنے پھیلایا تھا۔ وہ خالی ہاتھ تھی اور اب ساری زندگی اسے خالی ہاتھ ہی رہنا تھا۔

.....☆☆.....

عالم وحشت

نائمہ غزل

''تمہیں کیا لگتا ہے، مجھے تمہارا انتظار ہے؟ نہیں کبھی نہیں! کبھی بھی نہیں۔'' اس نے آئینے میں نظر آتے اپنے ہی عکس سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا، دیکھنے والوں کو ایسا ہی لگنے والا تھا، مگر عشق اس کے اندر سرائیت کر چکا تھا وہی تشنہ جو من و تو کا فرق مٹا دیتا ہے، سامنے نظر آتا عکس دراصل اسے کسی اور ہی عکس کی شبیہہ دکھا رہا تھا، ذہن و دل میں جب ایک ہی عکس خود رقص ہو، ایک ہی شخص کی یادوں کا سراتھام کے رکھا ہو تو بھلا نظر پر بھی نظر کہاں آشکار ہو سکتی ہے۔ یادیں اگر دھندلی ہوں تو ہی اس عکس پر کسی اور کے عکس کی گنجائش ہوتی ہے، مگر جہاں کسی شخص کو حفظ کر کے من میں اتار لیا جائے وہاں تو ہر صورت میں ایک ہی صورت نظر آتی ہے، ہر آواز سماعتوں میں ایک ہی لہجہ بن کر اترتی ہے، پھر یہ تو خود اپنی صورت تھی وہی صورت جس پر نقش آنکھیں بس ایک ہی صورت دیکھنے کی خواہاں تھیں، وہ خود سے مخاطب تھی یا کسی اور سے، منکر سامع وہی تھی، یا شاید نہیں تھی، بس عالم دیوانگی میں اس کی بڑبڑاہٹیں جاری تھیں۔

''نہیں پانے کی چاہت کبھی نہیں رہی مجھے'' وہ بڑبڑائی، اسے پانے کی چاہت بھی وہ بھلا کیوں کرتی، وہ شخص جو خود اس کی ہستی میں سما کر اس کے اندر سانس لیتا تھا، اسے پانے کی حاجت بھی اسے کیونکر ہوتی۔

''تم کیا سمجھتے ہو، تم اس دنیا سے ماورئ ہو'' ماورئ وہ کیوں ہو سکتا تھا بھلا، ہزاروں لوگوں کے درمیان ایک عام سا شخص، ہاں مگر محبت نے اسے خاص بنا دیا تھا، مگر وہ خاکی پتلا، انہیں اپنی خصوصیت بھاتی کب ہے، یہ اہمیت، یہ محبت انہیں خدا بننے میں دیر نہیں کرتی، پھر بھلا کیا خاص بات ہوئی ان خاکی پتلوں میں، ہاں خاص تو محبت ہے جو خاکی کو بھی سونا کر دیتی ہے، انسان بھی محبت کی مٹی سے گوندھا گیا ایک پتلا ہے مگر نجانے کیوں اس پر نفس غالب آجاتا ہے، زمین میں موجود مٹی پر محبت سے کی گئی کاشت کاری، محبت اگاتی ہے، جو بیج بویا جائے فصل اسی کی کاٹنی ہوتی ہے، وہاں بھی کبھی خودرو جھاڑیاں کھڑی فصلوں کو تباہی کے دہانے پر لے آتی ہیں، مگر جہاں دھیان اور توجہ سے فصلوں کی آبیاری کی جائے، وہاں ان خودرو جھاڑیوں کے وجود کو ہی مٹنا پڑتا ہے۔

''میں نے تم سے محبت نہیں کی، کبھی نہیں کی، کیونکہ تم اس لائق کبھی بھی نہیں تھے۔'' اس نے تنفر سے سامنے نظر آتے عکس کی آنکھوں میں جھانکا، ٹھیک ہی تھا، محبت اس نے اس سے کبھی نہیں کی تھی، کیونکہ محبت کرنے کی چیز ہی نہیں، یہ تو وہ چشمہ ہے جو دل کی سرزمین میں خود سے پھوٹتا ہے اور مسلسل رواں رہتا ہے، پھر دل ہی نہیں پوری ہستی ہی اس کی لپیٹ میں آجاتی ہے۔

''ہو کیا تم! کیا اپالو کا مجسمہ؟؟ جسے بار بار دیکھنے کی چاہ ہو، کچھ بھی تو نہیں ہو تم، جسے میں دیکھنے کی چاہت رکھوں۔'' ایک آنسو پلکوں کی باڑھ پھلانگتے ہوئے رخساروں پر ڈھلک آیا تھا، بھلا اس شخص کو دیکھنے کی حاجت بھی اسے کیونکر ہوتی جس کا عکس پتلیوں پر ٹھہر گیا تھا، دیکھنے کی چاہت تو نہ نظر آنے والی چیزوں کی ہوتی ہے، جب ایک صورت ذہن کے پردے پر یوں کنداں ہو جائے کہ حقیقت کا گمان ہو تو اس چہرے کے پاس ہونے نہ ہونے سے فرق بھی کیا پڑتا ہے۔

''دور ہو جاؤ میری نظروں سے'' وہ ہذیانی انداز میں چیخی، معلوم تھا ایسا کچھ نہیں ہونے والا اور اسے خود بھی نہیں معلوم تھا کہ وہ چاہتی کیا ہے۔

''کیوں میری اذیت کا سامان کرنے پر تلے ہو، کیوں ہر وقت، ہر جگہ، ہر محفل پر چھائے رہتے ہو، مجھے نہیں ہے ضرورت تمہاری'' وہ کراہی، ضرورت نہ ہوتے ہوئے بھی اس کا ساتھ اس کے لیے باعث تقویت تھا، مگر کبھی کبھی جب حقیقت ذہن و دل پر دستک دینے لگے تو ہستی بکھرنے لگتی ہے، کبھی کبھی جب عکس ذہن کی سلیٹ سے دھندلانے لگتے

ہیں تو ایسا ہوتا ہے، دیوانگی کی کیفیت طاری ہونے لگتی ہے، وہ چیخنے لگی۔
"چلے جاؤ اب یہاں سے، چلے جاؤووو......!" وہ حلق کے بل چیخی اور پاس پڑا گلدان اٹھا کر سامنے نظر آتے عکس کو دے مارا، ایک چھناکے سے آئینے کے ہزار ہا ٹکڑے دور دور تک بکھر گئے، سامنے نظر آتا عکس غائب ہو چکا تھا، وہ چونک سی گئی اور عالمِ وحشت میں دونوں ہاتھوں سے شیشے کی کرچیاں اٹھا اٹھا کر ان میں وہی عکس تلاشنے لگی، کبھی کوئی ٹکڑا اٹھاتی کبھی کوئی۔
"کہاں گئے" وہ ہولے ہولے بڑبڑاتی جا رہی تھی اور کرچیوں کو ہاتھوں سے سمیٹ کر ان میں عکس ڈھونڈتی جا رہی تھی، دونوں ہاتھ خون سے بھر گئے تھے، مگر اسے نظر نہیں آ رہا تھا، اسے بس اس عکس کو تلاش کرنا تھا۔
"نہیں تم نہیں جا سکتے، تم مجھے چھوڑ کر نہیں جا سکتے" وہ دونوں ہاتھ گھٹنوں کے گرد لپیٹ کر سر اس پر رکھ کر سسکنے لگی، خون تیزی سے پہنے ہوئے رنگین کپڑوں کو مزید رنگین بنا رہا تھا، آہستہ آہستہ اس کا ذہن غنودگی میں ڈوب گیا۔

......☆☆......

"کیسی ہو مار یہ!" آنکھ کھلنے پر وہ خود کو اپنے آرام دہ بیڈ پر محوِ استراحت دیکھ رہی تھی، دونوں ہاتھ پٹیوں میں جکڑے ہوئے تھے، کانوں پر کسی آواز کے لمس کی دستک ہوئی تو اس نے آنکھیں کھول دیں، وہ وہی تھا، بالکل وہی، وہ اٹھ کر بیٹھ گئی اور بیڈ سے اتر کر دھیرے دھیرے اس کے قریب آئی۔
"مجھے پتہ تھا تم مجھے چھوڑ کر کہیں نہیں جا سکتے" وہ ایک بار پھر سے سامنے نظر آتے اپنے ہی عکس سے مخاطب تھی، مگر اس بار وہ جنونیت، وہ دیوانگی کی کیفیت مفقود تھی، اس کے چہرے پر ایک خوبصورت سی مسکراہٹ تھی۔ دیوانگی تو ایک ٹانک تھی جو کچھ دیر کو طاری ہو کر دھندلائے ہوئے عکس کو اجاگر کر دیا کرتی تھی۔
اب اس کی آنکھوں کی پتلیوں پر پھر سے وہی وجود ایک شان و طمطراق سے براجمان تھا۔

یہ جو آئینے میں اک شخص نظر آتا ہے
اس کی آنکھوں میں ترا عکس نظر آتا ہے

......☆☆......

کالنگ کارڈ
فرحین ناز طارق

"میں تمہیں دیکھنا چاہتا ہوں۔"
"کیوں۔" اس نے بے نیازی سے پوچھا۔
"میں نے تمہیں بناء دیکھے بناء ملے پسند کیا ہے۔ مگر تمہاری اک تخیلاتی تصویر بن چکی ہے میرے دماغ میں۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ تم اس خاکے سے کس حد تک مطابقت رکھتی ہو۔ یہ تو میں جانتا ہی ہوں کہ تم میرے اس تصور سے بھی حسین ہو گی۔"
منظر صدیقی نے دنیا جہان کی مٹھاس اپنے لہجے میں سمونے کی کوشش کی تھی۔
"بناؤ مت۔ اتنی جلدی کونسا کوئی کسی سے محبت کرنے لگتا ہے۔" وہ قدرے نروٹھے لہجے میں بولی تھی۔
"یہ سچ ہے کہ کوئی ایسے کسی سے محبت نہیں کرتا مگر یہ بھی سچ ہے کہ میں تم سے محبت کرنے لگا ہوں۔ میری محبت میں کوئی کھوٹ نہیں ہے۔"
"پھر تو محبت تصویر دیکھے بغیر بھی ہو سکتی ہے۔ میں تصویر نہیں بھیج رہی۔" اس نے دوٹوک کہا۔

"خواہ مخواہ میں اتنا وقت برباد کر رہی ہے- موڈ برباد ہوا سو الگ-" اس نے منہ ہی منہ میں گندی سی گالی دیتے کال کاٹ دی- ساتھ ہی کمپیوٹر اسکرین ویران ہو گئی-

"واہ ممنی کیا ہی عقلمند لڑکی ہو- شاباش-"

ثبینہ اسی وقت اس کے پیچھے آ کھڑی ہوئی تھی- اس نے اس کی آدھی ہی بات سنی تھی- وہ دونوں باتیں کرتی کمپیوٹر لیب سے باہر نکل آئیں-

"کیوں کیا ہوا-"

"یہ کون تھا- کس سے بات کر رہی تھی تم-" وہ اس کا سوال نظر انداز کرتے بولی-

"فیس بک فرینڈ ہے- میری تصویر مانگ رہا تھا میں نے منع کر دیا-"

"منع کیوں کیا-"

وہ اسی بے نیازی سے چپس کھاتی بولی-

"دکھا بھی دیتی تو کیا فائدہ تھا- وہ کونسا مجھ سے شادی کرنے آ رہا تھا جو تصویر دکھاتی-"

"شاباش ہوناں عقلمند- شادی اس نے واقعی نہیں کرنی تھی تم سے- آج کل کون اس جھنجھٹ میں پڑے- میری جان جب ہر ضرورت گھر کے باہر پوری ہونے لگے تو گھر جانا کون کافر چاہتا ہے- مگر ایسے لوگوں کی یہی ضرورتیں تو انہیں ہم تک لاتی ہیں- اس کو بھی خوش ہونے دو اور اپنا بھی مطلب نکالو-"

وہ [illegible] دباتے ہوئے بولی-

"[illegible] ضرورت کیسی خوشی-" وہ جز بز ہوئی-

"[illegible]؟"

"[illegible] نہیں-"

"[illegible] او- اگر ہے تو تھوڑا اس کے ساتھ گھوم پھر کر کچھ اپنا حلیہ ہی سیدھا کر لو-"

"[illegible] مطلب-"

"[illegible] میری بھولی چڑیا- یہ جو جاریہ، ماریہ وغیرہ ہم سب کے تجھے ٹھاٹھ نظر آتے ہیں، یہ سب کوئی کسی رئیس کی [illegible] نہیں ہیں- ان کے بوائے فرینڈز کی نوازشات ہیں- ان امیر زادوں کے ساتھ تھوڑا گھوم پھر لو بدلے میں خوشی [illegible] کرواتے ہیں- گھر سے بیویوں کی صلواتیں کھا کھا کے ترسے ہوتے ہیں اور رزق زیادہ ہو جائے تو اس کو [illegible] اکانے کا کوئی مصرف بھی تو ڈھونڈنا ہی ہوتا ہے ناں-"

[illegible] اس کا گھنٹہ بج چکا تھا- لڑکے لڑکیاں بھاگتے ہوئے کمروں کی طرف جا رہے تھے- اس کی کلاس نہیں تھی سو [illegible] رہی-

[illegible] بات ہو تو تصویر کی بجائے ملنے کو بلا لینا- اور ملنے پر حیثیت کا اچھی طرح اندازہ لگا لینا- کام کا ہو تو موبائل فون [illegible] لینا گفٹ کے طور پر- سچ تم سے کبھی بات کرنی پڑے تو تمہارے پڑوس میں فون کرتے شدید ہی کوفت ہوتی

[illegible] ہاتھ جھاڑتے اٹھی- کپڑوں پر آئی نادیدہ شکنیں درست کی اور اسے تاکید کرتے اک طرف چل پڑی- اس [illegible] شکنوں کا جال بچھا دیکھ کر وہ دل سے مطمئن ہوئی تھی- اک اور کونج ڈار سے بچھڑ کر ان کے ٹولے میں آ ملنے [illegible] برائی ایک واحد ایسی راہ ہے جس پر چلنے والے اپنے مقابل چلنے والے یا خود سے سبقت لے جانے والوں [illegible] حسد کی بجائے خوشی محسوس کرتے ہیں- تاکہ اپنے ضمیر کو تسلی دے سکیں کہ وہ اس راستے پہ چلنے والے اکیلے نہیں

"حمنی' میں تم سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں-"
وہ انگلش کا پیریڈ ختم ہوتے ہی کیفیٹریا کی طرف چلی آئی تھی- شبینہ وغیرہ یہاں موجود نہیں تھی- وہ اکیلی کونے والے ٹیبل پہ آبیٹھی جب حسان اس کے سامنے آبیٹھا- وہ جرنلزم کی کلاس میں اس کے ساتھ تھا- کلاس کے ذہین ترین طلباء میں اس کا شمار ہوتا تھا- شاید ہی کوئی دن ہو جب وہ اپنے سوالوں سے پرفیسروں کو زچ کرنے کی کوشش کرتا نہ دکھائی دیا جاتا-
مگر اس کے باوجود وہ اس کی بہت قدر بھی کرتے تھے- مگر سٹوڈنٹس میں وہ خبطی مشہور تھا- کتابوں کا کیڑا ہونے اور کتابی باتیں کرنے کے علاوہ اس میں کوئی ایسی خوبی نہ تھی کہ حمنی' اس کی موجودگی کو انجوائے کرتی-
"فرمایئے-"
"میں تمہیں پسند کرتا ہوں-"
"تو میں کیا کروں-" وہ بے رخی سے بولی- تو وہ کچھ گڑبڑایا مگر پھر اپنے تمام تر اعتماد سے بولا-
"مجھ سے شادی---"
اس کے چڑنے کو نظر انداز کرتا وہ برجستہ بولا-
"تم جیسے کنگلے سے شادی کروں گی میں-" وہ استہزائیہ ہنسی ہنسی-
"ابھی میرا اتنا برا وقت نہیں آیا- تم مجھے دے ہی کیا سکتے ہو-"
"کنگلا کیا مطلب- میں تمہیں دنیا کی ہر خوشی دے سکتا ہوں- اپنی بیوی بنا کر عزت دے سکتا ہوں-" سچائی اور ارادوں کی مضبوطی اس کے لہجے سے مترشح تھی-
"تم جیسے مڈل کلاس لوگ جب عملی طور پہ کچھ کر نہیں پاتے- تب عزت کی ہی بات کرنے لگتے ہیں- مگر مجھے عزت نہیں دولت چاہیئے-"
''تم عزت کا مطلب بھی نہیں جانتی- جس دولت کے لیئے عزت کو داؤ پہ لگانے پہ تلی ہو- کاش کبھی تم اس عزت کا مفہوم بھی جان پاؤ-"
"مجھے ایسی سستی بلکتی عزت نہیں چاہیئے- تمہاری یہ عزت میرے لیئے ایک موبائل فون بھی نہیں خرید سکتی- اور اب پلیز آئندہ مجھ سے ایسی بات کرنے کی جراءت بھی مت کرنا- ورنہ پروفیسرز اور کلاس فیلوز کی موجودگی میں تمہاری نام نہاد شرافت کا جنازہ نکالوں گی-"
اس نے دوٹوک انداز میں اتنے پتھریلے الفاظ کہے کہ وہ اسے دور جاتے دیکھتا رہ گیا- مگر کچھ بول نہ پایا-

.....☆☆.....

"میرے ساتھ کھانا کھانے چلو گی؟"
"کہاں-"
"جہاں میری جان کہے-"
"موبائل گفٹ کرو گے؟"
اس نے ڈرتے ڈرتے میسیج لکھا- ساتھ ہی آنکھیں بند کر لی- مبادا وہ کوئی سخت سست نہ سنا دے- اس کی فیس بک پروفائل سے، اس کی تصاویر سے، اس کی دوستیوں سے وہ اتنا اندازہ لگا چکی تھی- کہ بقول شبینہ کے وہ کام کا بندہ تھا- دوسری طرف وہ پہلے تو اس کا مطالبہ سن کر حیران ہوا- پھر بے اختیار مسکرا دیا- اس کا کام آسان ہو چکا تھا- محض چند روپوں کے عوض بنت حوا اپنی عزت بیچنے کو تیار تھی تو ابن آدم کیونکر پیچھے ہٹتا-
"یار میں تو خود چاہ رہا تھا تمہیں کوئی چھوٹا موٹا موبائل فون ہی گفٹ کر دوں- تم سے بات کرنے کے لیئے اتنی انتظار

کی کوفت تو نہ اٹھانی پڑے- میں جب تک تمہیں سن نہیں لیتا اندر باہر بے سکونی رہتی ہے-تمہاری آواز ہی تو زندہ ہونے کا احساس دلاتی ہے-"

اس نے ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھولی تو حیران رہ گئی-اس کے ہر جملے میں تم ہی تم کی گردان تھی-لفظوں کے اتنے خوبصورت پیرائے میں سمونے کا ہنر اس نے کب دیکھا تھا- وہ تو ہواؤں میں اڑتی اس سے ملنے گئی تھی-وہ جھکتے ہوئے اس کی کار میں بیٹھی تھی-مگر اس کے تحائف خصوصاً اس کے دیے 'چھوٹے موٹے موبائل' کو دیکھتے اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں-اگلے کچھ منٹوں میں وہ اس کے ساتھ ایسے گھل مل چکی تھی جیسے سالہا سال سے آشنائی ہو-

.....☆☆.....

حمنی' کا تعلق اک متوسط گھرانے سے تھا-ماں گھریلو عورت تھی-جو اس کے ابا کی کم آمدن میں بھی صبر شکر سے گزارہ کر رہی تھی-وہ کھانے پینے کی اشیاء اور کڑھائی کے کام سے پیسے بچا کر ان بہنوں کی سکول فیس ادا کرتی رہی-اس کی بڑی دونوں بہنیں میٹرک پاس کر کے گھر بیٹھ گئی تھیں اور اب امی کے ساتھ مل کر سلائی کڑھائی کا کام کیا کرتی-

یوں تو حمنی' کو پڑھنے پڑھانے سے کوئی سروکار نہ تھا-مگر تعلیم کو خیر باد کہنے کا مطلب اپنی بڑی بہنوں کی طرح گھر بیٹھ کر چولہے چوکے میں اماں کا ہاتھ بٹانا تھا- جبکہ حمنی' کو فرمانبردار بیٹی کا ٹیگ لگوا کر اماں بہنوں جیسی بورنگ زندگی جینے کا قطعاً اشتیاق نہ تھا-اس کے خواب بہت حسین ورنگین تھے-وہ تتلیوں جگنوؤں کے رنگ چرا کر اپنی زندگی میں بھرنا چاہتی تھی-خوبصورت گھر بڑی سی گاڑی نوکر چاکروں کی فوج ہیرے سونے کے زیورات، ہر وقت پیسوں سے بھرا پرس، مہنگے ترین نئے سے نئے ماڈل کے موبائل، کہانیوں جیسا خوبصورت شریک حیات، اور اس کا گولڈن کریڈٹ کارڈ اس کی احتیاجات تھیں-مگر خوابوں کے مقابل حقیقی دنیا اتنی ہی تلخ تھی- جہاں وہ بوسیدہ کپڑوں جوتوں اور پرانے سے لنڈے سے خریدے ہینڈ بیگ کو کاندھے سے لٹکائے کالج جایا کرتی- اور پھر سارا دن اپنی سہیلیوں سے شرمندہ شرمندہ رہتی- جو جوتے کپڑوں اور اسٹائل کے معاملے میں کالج کی اسٹائل آئی کون کی حیثیت رکھتی تھیں-اور جن سے کالج جوائن کرتے ساتھ ہی حمنی' نے خود آگے بڑھ کر دوستی کی تھی-اور جن کے ساتھ پھرنے کے چکر میں وہ اپنی بچپن کی کلاس فیلوز تک کو نظر انداز کر گئی تھی-وہ خوبی سے زیادہ نمائش کی دلدادہ تھی-اسے مرکز نگاہ بننا پسند تھا-اور پھر دھیرے دھیرے یونیورسٹی کا ماحول اسے راس آنے لگا-اس کی دوستیاں رنگ لائیں اور اس کا رہن سہن بدلنے لگا- گھسے پٹے جوتے کپڑے، پرس غرض بھی ظاہری تسکین کے سامان قدرے مہنگے وجدید اشیاء سے بدلتے چلے گئے-

اس کے پاس خوبصورت موبائل دیکھ کر اس کی ماں بہنوں نے قدرے اشتیاق سے یہ جادوئی ڈبہ دیکھا- جہاں شیشے جیسی چمکتی نئی نکور اسکرین پر کوئی بٹن تک نہ تھا-وہ ان کے پوچھنے سے پہلے ہی انہیں بتا چکی تھی- کہ یہ موبائل اسے اک دوست نے تحفتاً دیا ہے-اس سے آگے نہ انہوں نے پوچھا نہ اس نے بتایا-حمنی' کہ دوست کے پیچھے چھپے تذکیر و تانیث کے بھید تک کو جاننے میں اشتیاق ظاہر نہ کیا- وہ سادہ لوح عورتیں بس اتنا جاننا چاہتی تھیں کہ یہ چلتا کیسے ہے-اسے اماں کی طرف سے جو اک دھڑکا سا لگا تھا وہ خوف بھی رخصت ہو چکا تھا-رفتہ رفتہ اس کی اماں بہنیں خود بخود اس سے مرعوب ہوتی اور دبتی چلی گئیں کہ نہ کبھی اس کی دوستیوں کی نوعیت جاننے کی فکر کی نہ اتنے قیمتی تحائف دینے کی وجہ ہی پوچھنے کی ہمت کر پائیں-

وہ گھر لیٹ آنے لگی تو انہیں کہہ دیا جاب کرنے لگی ہے-ان پر پہلے ہی اس کی مرعوبیت کی چھاپ اتنی گہری ہو چکی تھی- کہ انہوں نے مزید کچھ پوچھنے کی ہمت نہ کی-اور وہ خود---اس کی سوچ تھی جب محض لڑکوں کے ساتھ بڑی بڑی نئے ماڈل کی گاڑیوں میں پھر کر یا ہوٹلوں میں کھانا کھا کر محض وقت گزاری کر کے جیب بھری رہ سکتی ہے تو نوکری کا جھنجھٹ پالنے کا کیا فائدہ- یہ جانے بغیر کہ یہ معاشرے کے عدم مساوات کے رویے سے بغاوت نہ تھی بلکہ نفس کی

اندھا دھند تقلید تھی۔عورت اپنے معیار سے گر کر نہ زندوں میں رہتی ہے نہ مردوں میں۔مگر نفس پرست، مادہ پرست لوگ اپنے غلط کے آگے بھی صحیح تو جیہات پیش کر لیتے ہیں۔سو وہ بھی اپنے غلط کو صحیح جان کر بے خوف وخطر تھی۔

.....☆☆.....

''سمندر کتنا خوبصورت ہوتا ہے کاش میں کبھی اصلی سمندر دیکھ سکوں۔'' سینما ہال سے نکلتے اس نے حسرت سے کہا

"یہ کونسی مشکل بات ہے چلو میں تمہیں گھما لاتا ہوں۔"

"نہیں کراچی بہت دور ہے اماں مجھے اکیلے تھوڑا ہی بھیجیں گی۔"

" کراچی کون جا رہا ہے۔چلو دوبئی چلتے ہیں۔"

وہ گاڑی میں بیٹھتے ہوئے بولا۔

" کیا مذاق کر رہے ہیں منظر۔اماں کراچی نہیں جانے دیتیں آپ دوبئی کی بات کر رہے ہیں۔"

"ارے یار تم گھر میں کہہ دو کہ تمہاری کمپنی تمہیں دوبئی بھیج رہی ہے۔تنخواہ بھی بڑھے گی۔یہ لو یہ چیک ان کو دے دینا۔پھر کون روکے گا بھلا۔"

"اک حل میرے پاس بھی ہے۔"

لہجے کو حتی الوسع دھیما رکھتے ہوئے وہ بولی تھی۔

"وہ کیا۔"اس کے بے دھیانی سے کہنے پر وہ گڑبڑائی تھی۔

"شادی کر کے چلتے ہیں۔" ارادتاً نظر جھکا کر شرمانے کی ایکٹنگ کرتے ہوئے وہ بولی۔منظر صدیقی نے دلچسپی سے اسے دیکھا۔زیر لب موٹی سی گالی دیتا بے آواز ہنسا تھا۔اگر اس وقت حمنی اس کے چہرے پہ اپنے لیے حقارت کے وہ رنگ دیکھ لیتی تو تمام عمر خود سے نفرت کرتی۔

"شادی بھی ہو جائے گی میری جان۔فی الحال تو تم یہ رکھو۔"

اس نے لمبا چوڑا چیک کاٹ کر حمنی کو تھمایا تھا۔اور اب قطعاً پس وپیش کی کوئی گنجائش نہ رہی تھی۔واقعی پیسے میں بہت طاقت ہوتی ہے۔اس نے یہی کہانی اماں کو کہہ سنائی اور بھولی اماں نے اس بات پر بھی اعتبار کر لیا۔اور اب وہ تین ماہ کے لیے دوبئی گھومنے جا رہی تھی۔اسے لگتا وہ ہوا میں اڑ رہی ہے۔

.....☆☆.....

منظر صدیقی جواں عمر تاجر تھا۔جو شادی شدہ ہوتے ہوئے اپنی بیوی اور حمنی' دونوں کو دھوکا دے رہا تھا۔یا شاید دھوکا تو وہ صرف اپنی بیوی کو دے رہا تھا۔کیونکہ حمنی' نے تو خود اپنی نسوانیت کو دھوکا دیا تھا۔اس کے ساتھ گھومتے پھرتے اس سے گفٹ لیتے بھی اس کے وہم وگمان میں بھی نہ آیا تھا کہ منظر صدیقی اس پہ کیا جانے والا تمام خرچ اس سے سود سمیت وصول کرے گا۔وہ تاجر کم دلال تھا۔جو کم عمر، گھر کے رسم ورواج سے باغی لڑکیوں کو خوبصورت خواب دکھا کر بیرون ملک لے جاتا تھا۔اور ان پر خرچ کی گئی رقم کی ٹھیک ٹھاک بھرپائی کرنے کے بعد انہیں اتنا ضرور دے دیتا تھا کہ وہ واپس آ کر کچھ عرصہ اس دولت سے عیش کر سکتی تھیں۔حمنی بھی ایسے ہی اس کا شکار بنی تھی۔وہ اس ٹولے کے لیے کام کرتا تھا جنہیں ہر دم تازہ گوشت کھانے کا چسکا تھا۔لہذا حمنی اب اس کے لیے بیکار تھی۔وہ اسے جتنی خاموشی سے لے کر گیا تھا اسی خاموشی سے واپس چھوڑ گیا تھا۔اس کی واپسی پر اس کی بہنیں اس سے چمکتے دمکتے اس وطن کی باتیں سننے کو بے تاب تھیں، جس نے اس کی چمک چھین لی تھی۔وہ سب حیران تھیں کہ اسے اتنی چپ کیوں لگ گئی تھی۔وہ پہلے کی طرح ہار سنگھار کی رسیا کیونکر نہ رہی تھی۔

حمنی' بنا انجام کی فکر کیے اس کے ساتھ اٹھ کر اتنی دور چلی گئی تھی کہ اس حادثے کے پیش آنے پر وہ کسی کو اپنی مدد کے لیے بھی نہ بلا سکی تھی۔کسی دوسرے کو سیڑھی سمجھ کر گھر کی عافیت کو چھوڑ کر نکلنے والی لڑکی آج پچھتاوے کے بوجھ سے جھکا

سرخود اپنے سامنے بھی اٹھانے کی ہمت نہ رکھتی تھی- بیٹھے بیٹھے روتی اور سوتے میں چیختی چلی جاتی- اس کی دنیا نا آشنا ماں بہنیں اس کی اس حالت کو سمجھنے سے قاصر تھیں- انہیں یہ سب کسی آسیب کی کرنی لگتی- سو پیر فقیر درگاہوں سے اپنی قابل بیٹی کے لیے حاسدوں کے شر سے بچنے کے تعویذ لیے چلی آتیں-

اپنی منہ زور خواہشوں کی تکمیل کی خاطر وہ جس بند گلی میں آ کھڑی ہوئی تھی- وہاں سے نکلنے کا شاید ہی کوئی راستہ تھا- اس بند گلی میں جانا سراسر اس کا اپنا فیصلہ تھا- اس وقت وہ منظر کے ساتھ کہیں آنے جانے سے انکار کر سکتی تھی مگر نہ کر سکی- کیونکہ اسے پیسے کا چسکا پڑ گیا تھا- عورت کو مرد کا چسکا پڑ گیا تھا- اور جس عورت کو ان سب چیزوں کا چسکا پڑ جائے وہ پھر نہ گھر کی رہتی ہے نہ گھاٹ کی-

ہمہ وقت سینے میں اٹھتی جلن اس کا جینا دوبھر کیے رکھتی- اس نے پیسے کے لیے ماڈرن بننے کی بہت کوشش کی تھی- مگر اس کی رگوں میں دوڑتا مڈل کلاس خون اسے ہمہ وقت پچھتاوؤں کی بھٹی میں جلائے رکھتا- سینے میں اٹھتی جلن اسے جینے نہ دیتی- اس نے بارہا کلائی کی رگ کاٹنی چاہی مگر وہ خالص نہ تھی، بداعمالی کی موت کا خوف اور قبر میں لوٹتے سانپ بچھو اسے مرنے بھی نہ دیتے-

☆☆......

اسے یونیورسٹی سے کچھ دستاویزات لینے کے لیے بلایا گیا تھا- وہ سادہ سے حلیے میں یونیورسٹی پہنچی- اس نے بڑی سی بوسیدہ چادر اچھی طرح لپیٹ رکھی تھی- اس کے تقریباً سبھی کلاس فیلوز جمع تھے اور وہ نہیں چاہتی تھی کوئی اسے پہچانے، خصوصاً اس کی وہ سہیلیاں جنہوں نے غلط راہ پر چلنے میں اس کی خوب مدد و حمایت کی تھی- اس کا رول نمبر پکارا جانا ابھی دور تھا- وہ کینٹین میں جا کر اپنی پسندیدہ ٹیبل پر بیٹھ گئی- اسے قطعاً اندازہ نہ تھا کہ کوئی اس کے تعاقب میں وہاں تک چلا آئے گا- حسان کو اپنے سامنے آ کر بیٹھتے دیکھ کر وہ چونکی تھی-

"میں جانتا تھا آج تم سے ضرور ملاقات ہو گی- تم نے ایک بار مجھ سے ایک فرمائش کی تھی- وہ چیز اتنی اہم نہیں تھی کہ اب تک یاد رکھی جاتی مگر صرف تمہیں یہ یقین دلانے کے لیے کہ مجھ جیسا کنگال انسان تمہاری ہر خواہش ضرور پوری کر سکتا ہے- میں اتنے ماہ پارٹ ٹائم جاب کر کے تمہارے لیے یہ تحفہ لایا ہوں-"

حسان نے موبائل کا ڈبہ لا کر اس کے سامنے رکھا تھا- وہ ٹکر ٹکر اس کی شکل دیکھے جا رہی تھی۔ جو اس کو چادر میں لپٹے دیکھ کر نہال ہوا جا رہا تھا- یہ شخص اس کی روح تک سیراب کر سکتا تھا، وہ جو اس کو عزت دے سکتا تھا- حمنی نے اس شخص کو ایک سراب کے لیے ٹھکرا دیا تھا- اس نے موبائل کے ڈبے کو ہاتھ تک نہ لگایا تھا- وہ اب خود کو اس کی کسی عنایت کی حق نہ سمجھتی تھی- وہ اسے اپنی آپ بیتی سنانا چاہتی تھی- اسے خود سے نفرت کرنے پہ اکسانا چاہتی تھی۔ مگر یہ اس کے اور اس کے رب کے درمیان راز تھا۔ اس راز میں وہ کسی اور کو کیسے شامل کرتی۔ وہ اسے کیسے بتاتی کہ اس نے چند کالنگ کارڈ کے عوض اپنی عزت بیچ کھائی تھی۔ ٹیبل پہ سر رکھے وہ جتنے آنسو بہا سکتی تھی بہاتی چلی گئی- وہ نا سمجھی کے عالم میں اسے دیکھتا رہا پھر اسے پکار بیٹھا- اس کا سکتہ ٹوٹا تھا اور وہ اگلے ہی پل بھاگتی ہوئی کینٹین کے دروازے سے نکل گئی تھی- وہ محض اسے جاتا دیکھتا رہا- اس محاذ پہ ابھی مزید سر کھپائی کی ضرورت تھی- وہ آنسوؤں کے راستے اپنا درد اسے دکھا گئی تھی- اب وہی آنسو اس کو امید دلا رہے تھے- وہ کسی حد تک اس کے آنسوؤں کی وجہ جانتا تھا کہ اس کی الٹے سیدھے لوگوں سے دوستیوں کے نظارے کئی بار دیکھ چکا تھا، مگر وہ اس کی آنکھوں سے بہتے پچھتاوے کے آنسو بھی دیکھ چکا تھا۔ وہ محض کتابی باتیں نہ کرتا تھا بلکہ ان پر عمل کرنا بھی جانتا تھا۔ اور ہر بار یہ ضروری تو نہیں کہ مرد ہی غلطی کر کے معافی کی امید رکھے۔ اس نے ایک عورت کو معاف کر کے اس کی کھوئی عزت لوٹانے کا فیصلہ کر کے ایک نئی روایت کی بنیاد ڈالنی تھی۔ وہ موبائل اور موٹر سائیکل کی چابی اٹھاتا مسکراتا ہوا باہر نکلا تھا- بلاشبہ وہ ایک مشکل پسند انسان تھا-

☆☆......

وہ ایک لمحہ

ریمل آرزو

''سات برس سے وہ تمہاری تلاش میں ہیں۔'' وہ تاسف سے بولی۔

''اور میں بائیس برس تک ان کو ڈھونڈتا رہا تھا۔'' وہ استہزائیہ لہجے میں ہنسا تو وہ تحیر سے اسے دیکھ کر رہ گئی۔

''ہاں عنایہ پورے بائیس برس میں ان کو اپنی آنکھوں کے سامنے تلاش کرتا رہا مگر میری تلاش لاحاصل ٹھہری۔ وہ میرے آس پاس تو تھے مگر میرے ساتھ نہیں تھے اور مجھے ان کا ساتھ چاہیے تھا جو مجھے دعاؤں سے بھی نہیں ملا۔'' گھٹن زدہ لہجے سے درد چھلک رہا تھا۔

''اور جب تمہاری تلاش تمام ہونے کو آئی تو تم انہیں اپنی تلاش سونپ کر چلے آئے۔'' وہ طنزیہ لہجے میں کہتی ہوئی اسے سلگا گئی۔

''ہاں تو اور کیا کرتا میں۔'' وہ اشتعال انگیز لہجے میں بلند آواز سے بولا تو چار سالہ طلحہ جو قریب ہی سو رہا تھا ڈر کر کچی نیند سے بیدار ہو کر رونے لگا۔

''معاف کر سکتے تھے۔'' عنایہ نے بھی قدرے بلند آواز میں کہا اور طلحہ کو اٹھا کر بہلانے لگی۔

''تم میری جگہ ہوتی تو کیا کر دیتی معاف؟'' اس نے اپنی لہو رنگ سوالیہ نظریں عنایہ کے چہرے پہ گاڑیں۔

''ہاں۔'' وہ مضبوط لہجے میں کہتے ہوئے طلحہ کو شانے سے لگائے کمرے سے باہر نکل گئی۔

اور وہ اپنی جگہ ساکت رہ گیا ان گنت سوچوں کے بھنور میں ڈوب گیا تب ہی اس کو اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہوا اور وہ گھٹن زدہ کمرے میں چھائے وحشت انگیز سکوت سے گھبرا کر باہر ٹیرس پر آ گیا چاند کی دودھیا چاندنی کے حصار میں رقص کرتے ہوئے نرم ہوا کے جھونکوں کی سرگوشیاں اس کی سماعتوں سے ٹکرائیں تو ایک پرکیف احساس اس کی رگ و پے میں سرایت کر گیا اس نے گہرا سانس لیتے ہوئے آنکھیں موندلیں اس عمل سے اس کے اندر کی گھٹن قدرے کم ہوئی تھی کچھ پل یونہی خالی الذہن خود کو ہلکا پھلکا محسوس کرتے ہوئے سرک گئے پھر وہ دھیرے سے چلتا ہوا گرل کے قریب آیا اور ایک نظر جھک کر نیچے لان میں دیکھا تو اس کی عزیز از جان بیوی بیٹے طلحہ کو شانے سے لگائے اسے سلانے کی خاطر ادھر سے ادھر ٹہل رہی تھی ایک ہلکی سی مسکان اس کے لبوں پہ ابھری اور کسی خیال کے تحت معدوم ہو گئی وہ وہیں سے پلٹ گیا واپس کمرے میں آ کر اس نے سگریٹ سلگالی اور سگریٹ کے دھوئیں میں اس کے ماضی کی پرچھائیاں رقص کرنے لگیں۔

.....☆☆.....

عنایہ اس کی زندگی کی پہلی خوشی تھی وہ واحد ہستی تھی جس نے اسے خوشیوں سے روشناس کرایا تھا مسکرانا سکھایا تھا ورنہ وہ تو مسکرانا فراموش کر چکا تھا اس نے کبھی اپنے ماں باپ کو بھی ہنستے ہوئے نہیں دیکھا تھا تب وہ سمجھتا تھا کہ شاید مسکرانا کوئی معیوب عمل ہے اسے آج بھی وہ دن یاد تھا جب وہ آخری بار کھلکھلا کر ہنسا تھا ہوا کچھ یوں تھا کہ وہ اپنے دوستوں کے ساتھ ہنسنے کھیلنے میں اس قدر مگن تھا کہ وہ یہ بھی بھول گیا کہ آج بابا گھر ہیں اور چھٹی کا دن جمعہ تو اس کے لیے ہمیشہ ہی بھاری ہوتا تھا ماں کے ساتھ ساتھ اس کی بھی کسی نا کسی بات پر بابا کے ہاتھوں شامت آ جاتی تھی آج بھی یہی ہوا تھا بچوں کے کھیل کود کا شور بابا صدیقی صاحب کو اتنا ناگوار گزرا کہ انہوں نے اس کو خوب ڈانٹا اور اس کے ننھے دوستوں کو بھی ڈانٹ کر بھگا دیا تب اس نے روتے ہوئے ہمیشہ کی طرح اپنے ننھے ننھے ہاتھ اٹھائے اور دعا کی کہ ''اللہ میاں پلیز فرائیڈے کو مت بھیجا کریں۔''

اس کا معصوم ذہن چھٹی والے دن کو ہی قصوروار ٹھہراتا تھا کیونکہ وہ دن کبھی بھی اس کے لئے خوشگوار ثابت نہیں ہوا

لما

اس دن کے بعد اس نے کوئی دوست نہ بنایا وہ اپنی ذات میں سمٹ کر رہ گیا۔
صدیقی صاحب اکثر اپنی ناتمام حسرتوں کا غصہ اس معصوم یا اہلیہ پہ اتار کر اپنے کمرے میں بند ہو جاتے اور خاکی
الماری جس کے آس پاس بھٹکنے کی بھی کسی میں ہمت تھی اور نہ ہی کسی کو اجازت تھی اس الماری میں دھری ماضی نامی
کے اوراق پلٹتے رہتے تھے۔
م کو اس الماری سے شدید نفرت تھی اسے سارے فساد کی جڑ ہی خاکی الماری لگتی تھی۔
''آخر ایسا کیا ہے اس الماری میں جو بابا کے مزاج کو بدل کر رکھ دیتا ہے۔'' وہ اپنی سوچ کے گھوڑے دوڑاتا۔
ی بھی کیا خاص بات ہے جو بابا کے علاوہ اس الماری کو کوئی بھی نہیں کھول سکتا۔
ہے کئی سوال اس کے ذہن کے دریچے پہ دستک دیتے مگر اسے جواب نہ ملتا ماں سے پوچھتا تو وہ بھی جواب دینے
جائے برہم ہو جاتیں اور کہتیں کہ ''جاؤ اپنے باپ سے پوچھو۔''
معاملہ اس کی سمجھ سے باہر تھا تجسس تھا کہ بڑھتا ہی جا رہا تھا وہ اب بڑا ہو رہا تھا ڈانٹ ڈپٹ اسے باغی کر رہی تھی
ن ایک رات اس نے بابا کے پرس سے خاکی الماری کی چابی چرالی مگر بری قسمت الماری کھولتے سمے وہ رنگے
وں پکڑا گیا۔ صدیقی صاحب کی قہر آلود نظروں نے اس کا لہو نچوڑ لیا اس کے قدموں تلے سے زمین کھینچ لی صدیقی
ب نے اس روز پہلی بار اس پر ہاتھ اٹھایا اور ایسا اٹھایا کہ مار مار کر اس کا حال بے حال کر دیا وہ ششدر تھا کہ ایسی
ا خطا کر بیٹھا ہے وہ مارتے رہے وہ چیختا رہا ان کے سامنے ہاتھ جوڑتا رہا پیر پکڑتا رہا مگر صدیقی صاحب کو اس پر
آیا اس نے مدد طلب نگاہوں سے ماں کی جانب دیکھا مگر وہ بھی خاموش تماشائی بنی کھڑی رہیں۔
ن سے اس کے دل میں نفرت کی اک لہر نے جنم لیا اور پورے وجود کو اپنی لپیٹ میں لے کر تمام احساسات کو سلا

وہ دن بھی آخری تھا جب اس کی آنکھ سے آنسو ٹپکا تھا اس دن کے بعد وہ پتھر ہو گیا۔
اس نے اپنی الگ ایک دنیا بسالی جس میں کتابیں تھیں وہ تھا اور اس کی تنہائی تھی۔
وہ گھر میں ہونے والے روز روز کے لڑائی جھگڑوں سے تنگ تھا وہ ناچاقی کی وجہ ڈھونڈ کر اسے ختم کرنا چاہتا تھا اس
دلی تمنا تھی کہ اس کے ماں باپ اس کی خاطر سمجھوتہ کر لیں ہنسی خوشی زندگی گزاریں یا پھر ایک دوسرے کو جھیلنے کی
بت سے خود کو آزاد کروالیں ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں یوں کم از کم اسے کسی ایک کی تو مکمل توجہ و محبت حاصل
لی وہ یوں گھٹ گھٹ کر آدھی ادھوری زندگی نہیں بسر کرنا چاہتا تھا مگر اب چاہے وہ لڑ لڑ کر مر جائیں اسے کوئی فرق نہیں
تا تھا وہ سانس لیتی مشینوں کے ہمراہ مشینی زندگی گزار رہا تھا اور مشینوں کے کوئی جزبات و احساسات نہیں ہوتے سو
ن کے بھی نہیں تھے ایک ساتھ رہتے ہوئے بھی ان کے درمیان صدیوں کے فاصلے تھے اور ان فاصلوں کو مٹانے کی
شش بھی نہیں کی گئی تھی وہ ہوسٹل چلا گیا پڑھائی میں مصروف ہو گیا کبھی کبھار چھٹیوں پہ گھر آتا سرد رویے اس کا
ستقبال کرتے باپ سے اس کا تعلق صرف پیسوں کے معمولات تک محدود تھا اور ماں وہ اس کے کھانے پینے کپڑے
توں کا خاص خیال رکھتی اگر باتیں کرتی تو اس میں آدھی شوہر کی شکایتیں ہوتیں وہ چپ چاپ سنتا رہتا اس کا دل چاہتا
کہ کوئی اسے بھی سنے اس کی باتوں کے جواب گرمجوشی سے دے اس نے ماں کو بتایا تھا کہ اس نے کلاس میں ٹاپ کیا
ہے مگر ماں نے یوں سرسری لیا کہ جیسے کوئی معمولی بات ہو وہ اپنی تمام حسرتیں دل میں دبائے واپس چلا جاتا۔
یونہی ماہ و سال گزر رہے تھے کہ ایک دن جب وہ یونیورسٹی سے گھر آیا تو بابا کے کمرے کے سامنے سے گزرتے
ہوئے وہ ٹھٹھک کر رک گیا خاکی الماری کے پٹ کھلے تھے پہلے تو وہ اپنی نظر کا دھوکا سمجھا پھر قریب جا کر دیکھا تو واقعی
الماری کھلی تھی اور کمرا بالکل خالی تھا مگر کمرے میں بوسیدہ پھولوں کی مہک چہار سو پھیلی ہوئی تھی وہ سحر زدہ سا الماری کی

جانب بڑھنے لگا قریب پہنچا تو اس نے دیکھا الماری بالکل خالی ہے مگر الماری کے باہر نیچے زمین پر بہت سے کاغذ بکھرے ہوئے تھے ایک پھٹی ہوئی سیاہ ڈائری میں گلاب کی خشک پتیاں اپنے ہونے کا پتا دیتے ہوئے اسے بہت کچھ یاد کروا رہی تھیں وہ نیچے دوزانو بیٹھ گیا۔ سیاہ ڈائری، چند خط، سوکھے گلاب اور ایک نسوانی تصویر کے ٹکڑے اس کی آنکھوں میں مرچیں بھر گئے۔

''محبت نے ہی محبت کے ماروں کو اک عمر محبت سے محروم رکھا۔''

اس نے محبت نامے ہاتھ میں لیئے ہوئے زخمی لہجے میں خود کلامی کی اور اس کا دل چاہا کہ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دے۔

وہ یونہی سکتے کے عالم میں اپنے سامنے بکھری ہوئی چیزوں کو دیکھے جا رہا تھا کہ اسے کسی کے کھلکھلاتے قہقہوں نے چونکا دیا۔

وہ اٹھا اور اس نے مدھم سرگوشیوں میں گھلے جلترنگ قہقہوں کی آواز کی سمت قدم بڑھا دیئے ٹی وی لاؤنج میں پہنچ کر وہ ساکت رہ گیا۔

سامنے کا منظر اس کے سر پر حیرت کا پہاڑ توڑنے کے لئے کافی تھا۔

چائے سے محظوظ ہوتے ہوئے گفتگو میں مصروف دو خوش باش نفوس اس کے ماں باپ تھے اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا اسے لگا وہ کسی خواب کے زیر اثر ہے۔

''تمام عمر سراب کے پیچھے دوڑتے بیت گئی میں نے اب جانا اس کے لئے میں محض پڑاؤ تھا جسے میں نادانی میں منزل سمجھ بیٹھا تھا جبکہ میری منزل تو تم تھیں اور تم ہی ہو۔''

صدیقی صاحب اہلیہ سے مخاطب تھے ارحم پہ نظر پڑی تو نادم سے ہو کر خاموش ہو گئے۔

''ارحم تم کب آئے؟'' ماں کی آواز پہ وہ چونکا۔

''آؤ بیٹا تم بھی ہمارے ساتھ چائے پیو'' صدیقی صاحب نے کہا تو اسے لگا کہ کوئی اجنبی اس سے مخاطب ہے وہ متحیر سا خاموش رہا۔

''ارحم بیٹا۔'' اس کی ماں نے اٹھ کر اس کے قریب آنا چاہا تو اس نے انہیں ہاتھ کے اشارے سے قریب آنے سے روک دیا۔

''نئی زندگی مبارک ہو۔'' وہ شکستہ دلی سے مسکرایا اور پھر بنا کچھ کہے سنے گھر کی دہلیز ہمیشہ کے لئے چھوڑ گیا۔

.......☆☆.......

گھر چھوڑا تو شہر بھی چھوڑ دیا۔ چھوٹی موٹی نوکری کر کے وہ تعلیم کا خرچہ اور فلیٹ کا کرایہ ادا کرتا رہا اس نے خوب محنت کی اور ایک دن ڈگری کی صورت میں اس کی محنت رنگ لے آئی اور اس کی خوش قسمتی کہ اسے فوراً ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں اچھی پوسٹ پہ نوکری مل گئی۔

وہیں آفس میں اس کی ملاقات بھوری آنکھوں گھنگھرالے بالوں اور بائیں گال میں ڈلتے ہوئے بھنور والی من موہنی سی عنایہ سے ہوئی۔ عینا نے اس کی جانب دوستی کا ہاتھ بڑھایا تو اس کی زندگی بدل گئی۔ عنایہ کے والدین انتقال کر چکے تھے اور اب وہ اپنے بھائی بھاوج کے ساتھ رہائش پذیر تھی۔ نوکری اس کی مجبوری نہیں شوق تھا جواب پورا ہو چکا وہ ریزائن دینے آئی تو جہاں پورا اسٹاف اداس تھا وہیں ارحم کے دل کی حالت ہی عجیب تھی اسے لگا متاع جاں اس سے دور جا رہی ہو۔

اس کی لب خاموش تھے مگر اس کے دل کا حال اس کی آنکھیں خوب سنا رہی تھیں جسے عینا نے سن لیا تھا۔

''جا رہی ہو؟'' وہ فقط اتنا ہی کہہ پایا تھا۔

''ہاں۔'' وہ بھی مختصراً بولی۔
''کیوں؟'' کہنا تو چاہتا تھا کہ ''مت جاؤ'' مگر کہہ نہیں پایا۔
''کیونکہ میری شادی ہو رہی ہے۔'' وہ مسکرا کر بولی تو جیسے اس کے اندر کچھ ٹوٹ گیا۔
''کس کے ساتھ؟'' اسے اپنی آواز کسی گہری سرنگ سے آتی سنائی دی۔
''ارحم صدیقی کے ساتھ۔''
وہ پراعتماد لہجے میں اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی تو اس پہ شادی مرگ سی کیفیت طاری ہوگئی۔
''کھاؤ قسم۔'' وہ بے ساختہ بے یقینی کے عالم میں اس کا ہاتھ تھام کر بولا تو وہ ہنستی چلی گئی۔
''ہاں تمہاری قسم، اگر تمہیں منظور ہے تو۔''
''مجھے منظور ہے۔'' اور یوں ایک شام وہ دونوں ایک ہو گئے عنایہ نے اس کی بے رنگ زندگی میں اپنی چاہت کے رنگ بھرے تو زندگی مسکرانے لگی۔ آج ارحم کے پاس سب کچھ تھا گھر، گاڑی، اچھی بیوی اور ایک پیارے سے بیٹے سے بھی رب نے اسے نواز دیا تھا سب کچھ ہونے کے باوجود دل میں کوئی کسک سی تھی جسے عنایہ نے بھانپ لیا تھا اور آج کل وہ جو کر رہی تھی اس کی خوشی کے لئے ہی کر رہی تھی وہ چاہتی تھی کہ ارحم اور اس کے ماں باپ کے درمیان انا و نفرت کی جو دیوار حائل ہے وہ گرا دے مگر ارحم سمجھنے کو تیار نہیں تھا۔
پہلے سالہ ازدواجی زندگی میں کبھی ان کی لڑائی نہیں ہوئی تھی مگر اب اس موضوع کو لے کر ان میں آئے روز تلخ کلامی ہونے لگی۔ عنایہ اس کے والدین سے رابطے میں تھی اور پرعزم تھی کہ وہ ضرور بچھڑے ہوؤں کا ملن کروائے گی۔

☆☆

''جرم زندگی جنم دینا جرم ہے تو جائز زندگی حرام کر دینا جرم کیوں نہیں ہے؟'' دہکتی ہوئی سوالیہ نگاہوں سے چھلکتے ہوئے لب سے اس کا دل کٹ کر رہ گیا۔
''جرم ہے تو ان کو اس جرم کی سزا مل چکی ارحم۔'' عنایہ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے نرمی سے کہا۔
''ونہہ..... ان کو کوئی سزا نہیں ملی وہ خوش و خرم ہیں؟'' ارحم نے اس کا ہاتھ بے دردی سے جھٹکتے ہوئے کہا۔
''اور اب تو میں ان کو چشم تصور سے بھی خوش باش نہیں دیکھنا چاہتا عینا جب تم ان کا ذکر کرتی ہو تو میرا خون کھول اٹھتا ہے۔'' شدید نفرت اور غصے سے اس کا وجود سلگ اٹھا تھا۔
''ارحم ان کی خوشیوں کا محور تم ہو صرف اور صرف تم۔'' وہ ملتجیانہ لہجہ میں بولی۔
''ہاہاہا..... اچھا مذاق ہے۔'' وہ مضحکہ خیز انداز میں ہنسا۔
''ارحم تمہارے بابا بہت بیمار ہیں۔'' عنایہ کو سمجھ نہیں آ رہی تھا کہ وہ ارحم کو کیسے قائل کرے کہ سب کچھ بھلا کر وہ اپنے ماں باپ کے ساتھ نئی زندگی کا آغاز کر لے۔
''میں ان کے علاج کے لئے چیک لکھ دیتا ہوں تم ان تک پہنچا دینا۔'' وہ سپاٹ لہجے میں بولا تو عنایہ متحیر رہ گئی اسے ارحم سے اتنی سنگدلی کی امید نہیں تھی۔
''ارحم انہیں پیسے کی تمہاری ضرورت ہے۔'' اب کی بار عنایہ بھی غصے سے بولی۔
''مجھے کبھی ان کی ضرورت تھی عین۔'' ارحم نے طیش میں آتے ہوئے سامنے میز پہ مکا رسید کرتے ہوئے کہا۔
''ہاں عنایہ مجھے بھی ماں کی محبت کی بابا کی شفقت کی ضرورت تھی مگر ان دونوں کے اختلافات نے مجھ سے میرا بچپن چھین کر ان گنت محرومیاں میرے دامن میں ڈال دیں آخر میرا کیا قصور تھا۔'' اس سے پہلے کہ عینا کچھ کہتی فون کی گھنٹی نے ان کو اپنی جانب متوجہ کیا۔ عینا نے گھڑی پر نظر دوڑائی اور کہا۔
''ماں کا فون ہوگا۔۔۔ میں دیکھتی ہوں۔'' عینا اٹھی تو ارحم نے اس کی کلائی تھام لی۔

''رکو۔'' عینا نے مڑ کر اسے دیکھا تو اسے اس کے تیور خطرناک لگے۔
''میں آج اس قصے کو یہیں ختم کرتا ہوں۔'' ارحم شدید طیش کے عالم میں فون کی جانب بڑھا۔
''نہیں ارحم آپ ماں سے کچھ نہیں کہیں گے۔'' عینا اس کے پیچھے بھاگی۔
''آج کے بعد اس گھر میں تمہارے منہ سے میں ان کا ذکر نہ سنوں سمجھی۔'' ارحم آپے سے باہر ہو رہا تھا۔
فون کی گھنٹی مسلسل بج رہی تھی۔
''پلیز ارحم وہ ماں ہیں۔'' عینا نے روہانسی ہو کر کہا اور ارحم سے پہلے فون کے ریسیور پہ ہاتھ رکھ دیا۔
''ہٹ جاؤ عینا۔'' ارحم دھاڑا۔
''نہیں۔'' عینا نے کہا تو ارحم نے ایک جھٹکے سے فون اس کے ہاتھ سے چھینا تو وہ دور جا گری۔
''ہیلو۔'' ایک نحیف سی جانی پہچانی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی تو ایک لمحے کے لئے وہ بھول گیا کہ اسے کیا کہنا ہے مگر اگلے ہی لمحے وہ سنبھل گیا۔
''کون ہیں آپ؟'' وہ تلخ لہجے میں بولا۔
''ماں ہوں تمہاری۔'' آواز میں لرزش تھی۔
''نہیں ہیں آپ میری ماں۔'' وہ گرج رہا تھا اور عینا تاسف سے اسے دیکھ رہی تھی۔
''آج کے بعد اگر میرے گھر میں آپ کی کال آئی تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔'' ارحم نے شدید طیش کے عالم میں گلدان اٹھا کر دیوار میں دے مارا جو ایک زوردار چھناکے کی آواز کے ساتھ ٹوٹ کر بکھر گیا۔
تب ہی لڑکھڑاتی ہوئی ایک چیز ارحم کے قدموں سے آ کر ٹکرائی۔
''ارحم بیٹا میری بات تو سنو۔'' وہ ملتجی لہجے میں بولیں۔
ارحم کچھ بول نہ پایا اس کی نگاہ نیچے تھی۔
''ہمیں معاف کر دو۔'' وہ روہانسی ہوئیں۔
ارحم نے نیچے جھک کر فٹ بال اٹھالی۔
''پلیز واپس آ جاؤ۔'' جہاں سے فٹ بال آئی تھی ارحم نے اس جانب دیکھا تو اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔
''میں آ رہا ہوں ماں۔''
ارحم نے کہا اور آگے بڑھ کر تھر تھر کانپتے سہمے ہوئے اپنے ننھے جگر پارے کو اپنی بانہوں میں بھر لیا۔!

.....☆☆.....

دستک

مھوش طالب

الخدر مسجد کے خاکستری میناروں سے صدائے اذان بلند ہوتی دیرالبلح کی بستیوں تک گونجی تھی، جہاں چونے کے پتھر کے درودیوار والے گھروں میں سے ایک گھر میں خوشی کا سامان تھا، لہٰذا اہل مکیں پر دہری نماز واجب ہوتی تھی، عبداللہ کو پروردگار نے پانچ سال بعد اولاد کی خوشی سے نوازا تھا، برآمدے میں پڑے پلنگ پر لیٹی سکینہ کے چہرے پر الوہی چمک تھی، جس کے دائیں پہلو میں کچھ گھنٹے قبل آنے والا بچہ تھا۔
امن کے پرندے مشرق سے اڑانیں بھر رہے تھے اور گل لالہ اپنے جوبن پر تھا۔

.....☆☆.....

پیلی دھوپ اس گھر کے آنگن میں پہرہ دیے بیٹھی تھی، ایسے میں جاڑے کی شدت مانند ہوگئی۔

''ام کلثوم سکون سے بیٹھ جاؤ، کیوں بے چینی پھیلائی ہوئی ہے؟'' کمرے میں بستر درست کرتی سکینہ کب سے صحن میں ٹہلتی ام کلثوم کو دیکھ رہی تھی۔

''جب تک حسن بھائی نہیں لوٹ آتے، مجھے چین نہیں آئے گا۔''

وہ بھی اپنی جگہ حق پر تھی، اعلیٰ تعلیم کے سلسلے میں اس کا لاڈلا اکلوتا بھائی گزشتہ چار برس سے مصر میں تھا، پڑھائی مکمل ہونے پر آج وہ مستقل طور پر واپس دیر البلح آ رہا تھا عبداللہ صبح ہی اسے لینے کے لئے نکل گیا تھا۔

مگر انتظار کی راہ لمبی ہو رہی تھی اور مسافروں پر پریشانی بسیرا کرنے لگی۔ رابطے کا بھی تو کوئی ذریعہ نہ تھا۔

''ام کلثوم، جاؤ، چھت پر سے کپڑے اتار لاؤ، کہر پھیل رہا ہے۔''

سکینہ خود تسبیح کے دانے گننے لگیں۔ قبل اس سے کہ وہ پہلے قدمچے کی جانب بڑھتی، لکڑی کے دروازے پر ہوئی بے چین دستک ان دونوں کو ساکت کر دینے کیلئے کافی تھی، سکینہ سے پہلے ام کلثوم ڈیوڑھی کی جانب بڑھی۔

''بھائی۔'' صبر کا پھل پاتے ہی وہ بے اختیار خوش ہو کر حسن کے سینے سے لگ گئی۔

''ام! میری جان کیسی ہو؟'' اس نے بہن کی پیشانی پر بوسہ دیا۔''

''حسن عبداللہ!'' سکینہ بھی آگے بڑھی، رسمی سلام دعا کا تبادلہ ہوا۔

وہ کمرے میں لحاف اوڑھ کر بیٹھ چکا تھا اور آتش دان دھیمے شعلے بھڑکا رہا تھا۔ کچھ ہی پلوں میں ام کلثوم اس کے لئے گرم گرم شربت لے آئیں۔

''ارے دل جیت لیا، جانتی ہو، وہاں ہوسٹل میں تمہارے ہاتھ کا بنایہ شوربہ ہر بار بہت یاد آتا تھا جیو ہزاروں سال، میری پیاری بہنا۔'' حسن کی پزیرائی پر ام کلثوم یوں مسکرائی، جیسے گل لالہ شبنم کی پہلی بوند پر کھل اٹھتا ہے۔ سکینہ اس کا سامان دوسرے کمرے میں رکھ کر واپس آئی۔

''تمہارے ابو باہر سے ہی دکان پر چلے گئے کیا؟'' سکینہ نے یونہی کہہ دیا، جانتی تھی سارا دن بھی تو دکان نہ کھولے اور ذرا سی بے پروائی وہ مول نہیں لے سکتے تھے۔

''کیا مطلب؟ ابا کہیں گئے تھے؟'' حسن انجان تھا اور سکینہ یوں ہوئی جیسے گلاب کی پتی نوچ لی گئی ہو۔

''تم نے خط میں اپنے آنے کی اطلاع اور تاریخ دی تھی، عبداللہ تو اسی دن سے انتظار میں تھے، وہ آج صبح دس بجے نکل گئے تھے۔'' بظاہر ضبط کرتی سکینہ کا لہجہ نمناک تھا۔

''اتنے ہجوم میں، میں کہاں نظر آیا ہونگا ان کو، آپ لوگ مجھے تو بتا دیتے، وہ بیچارے وہاں پریشان ہو رہے ہوں گے۔'' حسن کو افسوس ہوا۔

''کہاں جا رہے ہو؟'' اسے باہر کی جانب قدم بڑھاتے دیکھ کر سکینہ نے استفسار کیا۔

''ابو کو لینے، آپ پریشان مت ہوں، دروازے کی کنڈی چڑھا لیں۔'' وہ لمبے ڈگ بڑھتا لکڑی کا گیٹ پار کر گیا۔

''چلو کلثوم، اٹھو اور مغرب کی نماز کی تیاری کرو۔'' سکینہ نے گم صم بیٹھی بیٹی کو ٹہوکا دیا۔

گلیوں میں بھٹکتی شیرین، بہت مشکل سے اس گھر تک پہنچی تھی۔

''اللہ کے واسطے جلدی دروازہ کھولو۔'' وہ مضطرب سی خود کلام ہوئی۔

''اف شیرین، تم نے ڈرا ہی دیا، کیا آفت آ گئی ہے؟'' کلثوم جو اس دھیان میں بھاگ کر دروازے کی طرف لپکی تھی کہ ابو اور بھائی ہونگے اسے دیکھ کر مایوس ہوئی اور نتیجتاً اسی پر کوفت کا اظہار کیا۔

''حسن واپس غزہ کیوں جا رہا ہے؟'' وہ حسن کی خالہ زاد ہونے کے ساتھ ساتھ منگیتر بھی تھی، مگر اس کے منہ سے

حسن کا یوں ذکر چونکا دینے والا تھا۔
''تمہیں کیسے معلوم ہوا؟'' سکینہ بھی صحن میں آ گئی۔
''میں اسی طرف آ رہی تھی، جب حسن سے راستے میں ملاقات ہوئی۔''
''ہاں وہ تمہارے خال.....!''
''یہی تو پوچھ رہی ہوں کہ کیوں بھیجا ہے، کیا نہیں جانتے کہ حالات کس قدر خراب ہیں؟'' اسے معلوم تھا، تبھی سکینہ کی بات کاٹ دی۔
''کیا ہوا حالات کو؟'' ام کلثوم دہل گئی۔
''حالات واقعی ہی بگڑ چکے ہیں، مگر سننے میں تو یہ بھی آیا تھا کہ آدھے سے زیادہ افواہیں ہیں۔'' سکینہ کی آواز کنویں سے آتی معلوم ہوئی۔
''ماسی رانی کا ہی پہاڑ بنتا ہے، اسرائیلی سفاکیت پر اتر آئے ہیں۔'' آنسو شیرین کی پلکوں پر چمکنے لگے۔

☆☆

ساعتوں کا فاصلہ گھنٹوں میں طے ہوا تھا۔
وہ جب وہاں پہنچا تو ایک نیا دن طلوع ہو چکا تھا جو اپنے ساتھ خون ریزی کی ایک نئی اور ناقابل یقین داستان لایا تھا۔ اس نے غزہ کے ہوائی اڈے کے علاوہ اطراف کے علاقوں کا بھی کونہ کونہ چھان مارا تھا، مگر اس کے والد عبداللہ کا کچھ پتہ نہیں چل سکا۔
اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ حالات قابو سے باہر نکل چکے ہیں، مصر میں رہتے ہوئے خبروں کے ذریعے اسے سب معلومات ملتی رہتی تھی، مگر وہ ہنگامہ آرائی ایک خاص علاقے یعنی یروشلیم تک محدود تھی جسے وہ محض سیاسی چپقلش قرار دیتا رہا، خط و کتابت کے ذریعے گھر والوں سمیت سب کی خیریت کی خبر الگ سے مل جاتی تھی مگر اس وقت اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اپنے ملک کو دوبارہ سے آزاد کرانے کا وقت آ گیا ہے۔
وہ نجانے کن کن خفیہ رستوں سے بچتا بچاتا کسی جٹیل میدان میں پہنچ گیا، جہاں عورتوں کی چیخ و پکار اور شیلنگ اذیت ناک تھی اور قبل اس سے کہ وہ مزید کچھ اور دیکھ پاتا، اسرائیلی فوج کی جانب سے مسلسل ہوتے پتھراؤ کی زد میں وہ بھی آ گیا۔ بڑی زوردار فائرنگ ہوئی تھی۔ اپنی زخمی ٹانگ سہلاتے وہ خود کو بچانے کی سعی میں بھاگا تھا اور وہ اس کوشش میں کامیاب رہا تھا مگر بھاگتے ہوئے وہ کسی سخت شے سے ٹکرایا تھا، اس نے بے دھیانی میں اس پر نظر کی، وہ کوئی گردن کٹی لاش تھی۔ اس نے رک کر دیکھا اور اسے لگا اس کی سانس گھٹ رہی ہے۔ وہ عبداللہ کی لاش تھی۔

☆☆

''ہاہ۔'' کچھ لمحوں کیلئے سکینہ کی آنکھ لگی تھی، پسینے سے تر بتر پیشانی لئے وہ اٹھ بیٹھی، ام کلثوم فوراً اس کی جانب بڑھی، دونوں نے محض ایک دوسرے کی جانب دیکھا تھا اور پھر نظریں چرا لیں۔ حسن کو گئے چوبیس گھنٹوں سے زیادہ کا وقت گزر گیا تھا، وسوسے یقین میں بدلنے کو تھے۔ شیرین انہیں تسلیاں دے کر واپس چلی گئی تھی اور وہ دونوں وہاں ذات واحد کے سہارے پڑی رہ گئیں۔
افق پر لہو رنگ لالی لئے ایک طویل دن کی شروعات ہو چکی تھی ام کلثوم قرآن مجید کو جزدان میں لپیٹ رہی تھی، جب دروازہ زور سے بجا۔
''الٰہی خیر۔'' دونوں کے منہ سے بیک وقت نکلا۔

☆☆

''صبر کرو، بھائی یہ خون رائیگاں نہیں جائے گا'' حملہ آور اس علاقے کو برباد کر کے اب آگے بڑھ چکے تھے، دو چار

جو قسمت سے بچ گئے تھے وہ اپنا سب کچھ لٹ جانے کے بعد ایک دوسرے کے غم گسار بنے بیٹھے تھے۔
''کیا تمہارے سب گھر والے مارے گئے؟'' وہ شخص پھر سے مخاطب ہوا اور حسن جو اس عرصے میں یہ بات واقعی بھول چکا تھا کہ اس کی کوئی ماں اور بہن بھی ہے، بری طرح ٹھٹکا تھا، وہ دیوانہ وار اٹھا۔
''کہاں جا رہے ہو، کیا اس لاش کو یونہی چھوڑ جاؤ گے، ان (گالی) کے لیے جو لاش کی بے حرمتی کرنے میں بھی لطف اٹھا رہے ہیں۔''
حسن کے قدم تھم گئے۔
''میری بہن اور والدہ اکیلی ہیں، بتاؤ میں کیا کروں، مردہ کی حفاظت کروں یا زندگی کی آبرو بچاؤں؟''
جواباً وہ کچھ دیر خاموش رہا۔
''اگر میں وہاں گیا تو وہ لوگ مجھ سے ابو کی بابت پوچھیں گے، اب تک تو انہیں حالات کا پتہ چل گیا ہوگا، نجانے کس اذیت میں ہونگے۔'' حسن ایک نظر سامنے نڈھال کھڑے اجنبی پر ڈالتا اور دوسری عبداللہ کی سرانڈ زدہ لاش پر۔
''تم یہاں اس کو دفنانے کا انتظام کرو، میں جاتا ہوں۔''
''اور تمہارے اہل خانہ؟''
''وہ سب ذبح کئے جا چکے اور مجھے شاید ان کے چیتھڑے اکٹھے کرنے کیلئے زندہ رکھا گیا۔'' اس کے الفاظ ہی نہیں انداز بھی ایسا تھا جیسے واقعی کسی جانور کے بارے میں بات کر رہا ہو۔ تسلی دینے کی کوشش میں حسن کی زبان لکنت زدہ ہوئی۔
''میرے بھائی اگر میں لوٹ آیا تو جو خبر مجھے مل سکی میں تمہیں بتادوں گا اور اگر واپس نہ آسکا تو مجھ پر فاتحہ پڑھ لینا۔''

......☆☆......

یہودی فوج نے دیر البلح کے علاقے کو بھی گھیرے میں لے لیا تھا۔ دیواروں کے پار سے آتی سسکیوں اور دلدوز چیخوں نے دروازہ کھولتی ام کلثوم کو تھرا کر رکھ دیا۔
اس نے لرزتے ہاتھوں سے قفل کھولا اور پھر وہ اپنی وحشت ناک چیخ پر قابو نہ پا سکی۔ ادھڑے پیراہن اور بازو کٹے جسم کے ساتھ شیرین کھڑی کچھ بڑبڑا رہی تھی۔ سکینہ جہاں تھی وہیں ڈھے گئی۔ نجانے کس ہمت سے ام کلثوم نے دروازے کو بند کیا تھا۔
''بھول جاؤ حسن کو دفع کرو عبداللہ کو دین حق کی خاطر سب قربان۔'' ہکلاتے ہوئے کہتی شیرین اپنے آپ میں نہیں لگ رہی تھی۔ وہ ہوش میں ہو بھی کیسے سکتی تھی۔
''خبردار جواب کسی نے دروازہ کھولا۔'' شیرین نے اسے ٹھڈا لگایا اور اندر جانے کا اشارہ کیا۔ ام کلثوم گھسیٹ کر سکینہ کو بھی اندر لے گئی۔
''تو ہمارے مسلمان بھائی کہاں ہیں، وہ طاقتور قومیں کیوں سو رہی ہیں جو اسلام کے نام پر دنیا کے نقشے پر قائم ہیں وہ ان درندوں کے قدم اس پاک سرزمین پر پڑھنے سے روکنے کے لئے کیوں ہماری مدد کو نہیں آرہے کیا ہم سب توحید اور ختم نبوت کی بنیاد پر ایک ہی لڑی کے موتی نہیں۔'' اس کی آواز ہچکیوں کی زد میں تھی۔
''اللہ......بس اللہ ہے ہمارا۔'' شیرین کی سانسیں اکھڑنے لگی تھیں۔
''لیکن یہ ملعون یہودی کچھ بھی کرلیں سمندر بھرلیں ہمارے لہو سے اپنے ناپاک ارادوں سے ارض مقدس کو منہدم نہیں کرسکیں گے کبھی بھی۔''
''یہ......بر......بریت کی جو......مثال قائم کررہے ہیں، اسے دیکھ کر تو چنگیز خان بھی دنگ رہ جائے۔'' شیرین جو اب تک بیٹھی نہ تھی۔ دھڑام سے پتھریلے فرش پر گر چکی تھی۔ ام ایک بار پھر پاگلوں کی طرح چیخنے لگی۔ سکینہ بھی ہوش میں

آئی لیکن وہ اپنے ہوش میں آنے پر پچھتانے لگی تھی۔ ایک بار پھر دروازے پر بے ڈھنگ سی دستک ہوئی۔ یہ آخری دستک تھی جو متواتر ہو رہی تھی وہ دونوں ساکت و جامد بیٹھی رہیں، اس بار کسی نے اپنی جگہ سے ہلنے کی ہمت نہ کی۔

.....☆☆.....

وہ اس کے بتائے گئے پتے پر پہنچا تھا، ساٹھ منٹوں سے وہ دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا، اس نے بہتیرے واسطے دیے، مگر مکین شاید بالکل مایوس ہو چکے تھے اور بے یقین بھی، اردگرد بارود کی بو پھیلنے لگی تھی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اسے لوٹنا پڑا اور ابھی وہ صرف گلی کے نکڑ سے ہی مڑا تھا کہ اس نے ''ٹھاہ'' کی دھماکے دار آواز سنی، اسے اپنا وجود ہوا میں تحلیل ہوتا محسوس ہوا، اسے لگا وہ کئی ہزار زروں میں بکھر رہا ہے۔

.....☆☆.....

''حسن نے جیسے تیسے کر کے عبداللہ کو دفنا دیا تھا، مگر ایسا کرتے کرتے اس نے کئی سانسوں کو زندہ دفن ہوتے دیکھا تھا، خون بارش کی مانند بہہ رہا تھا کی اس کی اپنی آنکھیں بھی لہو رنگ ہو چکی تھیں۔ انتظار، اذیت کا روپ دھارنے لگا تو وہ دیرانے کی جانب بڑھ گیا۔ پتھر، لاٹھیاں کھاتے، کبھی کسی لاش کو ڈھانپتے وہ جہاں پہنچا تو وہ اس کا گھر نہیں تھا، وہ کٹے ابدان کا میدان تھا۔ سفید در و دیوار راکھ اور خون میں نہا گئے تھے۔ کوئی غیر مرئی قوت تھی، جو اس کے قدم آگے بڑھائے جا رہی تھی۔ کپڑے اور جسمانی اعضاء ایک ساتھ بکھرے تھے اور پھر اس کی نگاہ ایک ہرے رنگ کی پوشاک پر نظر پڑی اس سارے عرصے میں وہ پہلی بار زار و قطار رو دیا تھا وہ اس کی ام کی پوشاک تھی۔

''اللہ اکبر، اللہ اکبر!'' گریہ زاری کہ بعد اس نے کہا۔

''اسی راکھ سے اسی راکھ اور خون سے تمہاری نسلوں کو غسل دیا جائے گا تم چاہ کر بھی ہماری جڑیں نہیں اکھاڑ سکتے، کوئی آئے گا، ہم میں سے ہی کوئی آئے گا جو تمہیں شکست دے کر تمہاری نسلوں کو نیست و نابود کر دے گا'' وہ چیخ رہا تھا۔

''سن رہے ہو تم۔ اے ذلیل و رسوا ہونے والی قوم سن لو ایسا ہی ہو گا''

امن کے پرندے اڑنا بھول چکے۔ مشرقی آسمان کبھی نہ پر چھٹنے والے سیاہ بادل چھا چکے تھے۔

گل لالہ پر پھر کسی نے شبنم کرنی نہ دیکھی اور مسلے ہوئے سیاہ گلاب جا بجا بکھرے تھے۔

.....☆☆.....

ذوق آگہی

سباس گل

نکاح کی ترغیب

حضرت محمد بن سلمیؓ سے روایت ہے حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا مسلمانو نکاح کیا کرو کیونکہ میں تمہارے سب اس بات میں دنیا کی اور قوموں سے سبقت لے جانا چاہتا ہوں کہ میری امت شمار میں ان سب سے زیادہ رہے۔ مسلمانو! راہبوں کی طرح مجرد نہ رہا کرو۔

(بیہقی)

ایس حبیب خان..... کراچی

دور حکومت فرعون

فرعونوں نے مصر پر تین ہزار تین سو سال تک حکومت کی تاریخ میں 33 فرعون گزرے ہیں ہر فرعون کو تقریباً 100 سال تک اقتدار ملا تھا حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ آخری فرعون کا مقابلہ ہوا، یہ پانی میں ڈوبا اور اس کے ساتھ ہی فرعون کا اقتدار بھی ڈوب گیا فرعون ختم ہو گئے اور ریت نے ان محلات کو ڈھانپ لیا یہ ریت کے چھوٹے بڑے ٹیلے بن گئے۔ ان ٹیلوں کے اردگرد لکسر کا شہر آباد ہو گیا ان ٹیلوں میں سے کسی ایک ٹیلے پر ایک چھوٹی سی مسجد بنا دی گئی، 1900 کے شروع میں جب کھدائی شروع ہوئی تو فرعون کا محل ریت سے برآمد ہوا، پتا چلا کہ یہ مسجد فرعون کے خصوصی دربار کے اوپر بن گئی تھی یہ مسجد آج تک قائم ہے اوپر مسجد اور نیچے فرعون کا دربار ہے۔

کل شام ہم فرعون کے سنگی ستونوں کے درمیان کھڑے تھے سورج کی سرخ شعاعیں نیل کے پانیوں میں غسل کر رہی تھیں میں پانچ ہزار سال پرانے محل کی کھڑکی میں کھڑا ہو گیا دیکھتے ہی دیکھتے سورج کی سرخی نیل کے پانیوں میں گھل گئی اور اس کے ساتھ ہی فرعون کا محل اذان کی آواز سے گونج اٹھا میں نے زندگی میں ہزاروں اذانیں سنی ہیں لیکن فرعون کے محل میں اذان کی آواز کا اپنا ہی سرور تھا موذن کی آواز کا اتار چڑھاؤ محل کی دیواروں سے ٹکرا رہا تھا اور دیواروں پہ لکھی تحریروں کو پیغام دے رہا تھا کہ دنیا کے ہر فرعون کو زوال ہے لیکن خداوند کریم کا پیغام دائمی دکھائی دیا۔

مجھے بیکراں محسوس ہوا جیسے فرعون کا مجسم اپنے گزرے تکبر پہ نوحہ کناں ہو اور اللہ تعالیٰ کے فیصلے دور کھڑے مسکرا رہے ہیں۔

ایم حسن نظامی..... قبولہ شریف

مثل تعویذ ہیں تیرے الفاظ

جی ہاں، ان کو پڑھ کر ہی شفا ملتی ہے تو صرف یہ الفاظ ہی مثل تعویذ نہیں ہوتے بعض لوگ بھی اپنے وجود میں کسی مرہم کی طرح ہوتے ہیں انہیں دیکھتے ہی زمانے کے سب رنج والم دکھ درد بھی جیسے پل بھر میں رفو سے ہو جاتے ہیں ایسے لوگوں کے تو بس پاس بیٹھ کر ان سے باتیں کر کے یا پھر ان کی ایک جھلک دیکھ کر ہی قرار سا آ جاتا ہے مستنصر حسین تارڑ نے کہیں لکھا تھا کہ محبت تو پتوں کی سائیں سائیں کی طرح ہوتی ہے نہ دکھائی دیتی ہیں اور نہ پکڑ میں آتی ہیں بس اپنے حصار میں لے لیتی ہے تو ایسے لوگوں کے وجود بھی مخاطب کو اپنے حصار میں لیے رکھتا ہے۔

انتخاب: پرنس افضل شاہین..... بہاولنگر

دعا

دعا روح اور آرزو کو ہم آہنگی کا نام ہے، دینے اور لینے والے کے مابین ایک ایسے لمحے کی تخلیق کا پیش لفظ ہے جس میں خواہشوں کی تکمیل موجزن رہتی ہے دعا نہ مانگنے والے ہاتھ ریگستانوں کی طرح خالی ہی رہتے ہیں جن پر پانی کی ایک بوند برسائے بغیر بادل تیزی سے گزر جاتا ہے۔

احسان سحر..... میانوالی

پرابلم چائلڈ

ٹیچر: تم بڑے ہو کیا کرو گے؟

بچہ: نکاح

ٹیچر: میرا مطلب کیا بنو گے؟

بچہ: دلہا

ٹیچر: میرا مطلب بڑے ہو کر کیا حاصل کرو گے؟

بچہ: دلہن

ٹیچر: بدتمیز بڑے ہو کر ابو کے لیے کیا کرو گے؟

بچہ: بہولاؤں گا

ٹیچر: بے وقوف تمہارے پاپا تم سے کیا چاہتے ہیں؟

بچہ: پوتا
ٹیچر: زچ ہو کر ابے کمینے تیری زندگی کا مقصد کیا ہے؟
بچہ: شادی
گل مہر.....کراچی

سنہری باتیں

اپنے صدقے کو احسان جتا کر یا دوسروں کو اذیت پہنچا کر ضائع نہ کرو۔
کپڑے چاہے پرانے پہنو لیکن کتابیں نئی نئی خریدو۔
موت ایک بے خبر ساتھی ہے۔
نیکی اپنا انعام آپ ہے۔
جب تم سے ہو سکے ہنسو یہ بہت ارزاں دور ہے۔
کمینوں کی پرورش سے حکومتیں تباہ ہو جاتی ہیں۔
میٹھی بولی سب سے اچھی مٹھاس ہے۔
خدا سب سے بڑی صداقت ہے۔
زبان کو گلے شکوے سے بچاؤ دل کو طمانیت حاصل ہوگی۔
مایوسی کمزوری کی علامت ہے۔
ظالم کی موت پر ملول ہونا ظلم میں شامل ہونا ہے۔
سچائی خطرے سے محفوظ ہے۔
ریاض بٹ.....حسن ابدال

جواہر پارے

جس طرح سے کسی خلائی جہاز کو مدار ارضی کی گرفت سے نکلنے کے لیے ایک انتہائی بلند رفتار کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح ہمیں بھی اپنے مخصوص تعصبات سے بالاتر ہونے کے لیے بہت زیادہ قوت ارادی درکار ہوتی ہے۔
کہیں مستقبل کو مکمل طور پر جان لینے کی خواہش خدا کے حق تقدیر میں مداخلت تو نہیں ہے۔
میں سوچتا ہوں کہ آخر اس جنگ میں کسی کا ساتھ دو جو میرے خلاف آپس میں لڑ رہے ہیں۔
بڑے رشتے دار چھوٹے گاؤں کے پاس سے گزرنے والی اس ریلوے لائن کی طرح ہوتے ہیں جو بیچ میں حائل ہو کر یہاں کے رہنے والوں کو قریبی شہر جانے والی پختہ سڑک سے منقطع کر دیتی ہے۔
ان غیر متوقع بارشوں سے رخصت شدہ موسم کے دن یوں لوٹ آئے تھے جیسے کوئی بیرون ملک کی پرواز سے رہ جانے والا وقتی طور پر اپنے گاؤں واپس آ جائے۔
جاوید احمد صدیقی.....راولپنڈی

زریں اقوال

رشتوں کا نہ ہونا اتنی تکلیف نہیں دیتا، جتنا رشتوں کے ہوتے ہوئے احساس کا مر جانا تکلیف دیتا ہے۔
امیدیں کم رکھو گے تو مایوسی بھی کم ملے گی۔
کیونکہ انسان تو دکھ نہیں دیتے انسانوں سے وابستہ امیدیں ہی دکھ دیتی ہیں۔
زندگی آسان نہیں ہوتی اسے ہمیشہ آسان بنانا پڑتا ہے کچھ نظر انداز کر کے کچھ برداشت کر کے۔
برائی کو خود میں اور اچھائی کو دوسروں میں تلاش کرو یہی انسان کی سب سے بڑی اصلاح ہے۔
اپنے وقت کو ضائع مت کریں اسے کارآمد بنائیں ورنہ یہ تمہیں ناکارہ بنا دے گا۔
سچے رشتوں کو زیادہ سنبھالنا نہیں پڑتا اور جن رشتوں کو زیادہ سنبھالنا پڑتا ہے وہ سچے نہیں ہوتے۔
عبدالجبار رومی انصاری.....لاہور

فرمان رضاؓ

امام رضاؓ کا فرمان ہے کہ تم نیکی کا حکم دیا کرو اور برائی سے روکا کرو اگر تم نے ایسا نہ کیا تو تم برے لوگ سمجھے جاؤ گے پھر تمہارے نیک لوگ جتنی دعائیں کریں گے قبول نہ ہوں گیں۔
شجاعت بخاری.....تلہ گنگ

جسمانی آرائش

حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ''ہمارے یہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم ملاقات کی غرض سے تشریف لائے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک آدمی کو دیکھا جو گرد و غبار سے اٹا ہوا تھا اور بال بکھرے ہوئے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس آدمی کے پاس کوئی کنگھا نہیں ہے جس سے یہ اپنے بالوں کو درست کر لیتا؟ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دوسرے آدمی کو دیکھا جس نے میلے کپڑے پہن رکھے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ کیا اس آدمی کے پاس وہ چیز (صابن وغیرہ) نہیں ہے جس سے یہ اپنے کپڑے دھو لیتا۔

(مشکوٰۃ)

حسن اختر..... کراچی

سن ہجری کا آغاز

۶۳۸ عیسوی میں گورنر بصرہ ابوموسیٰ الاشعری نے امیر المومنین حضرت عمر بن خطاب کو خط لکھا کہ امیر المومنین ہمیں اکثر آپ کی طرف سے ہدایت نامے موصول ہوتے رہتے ہیں جو کہ کبھی کبھار ایک دوسرے سے مختلف ہدایت کے حامل ہوتے ہیں اور چوں کہ ان پر کوئی تاریخ درج نہیں ہوتی اس باعث یہ جاننے میں دشواری ہوتی ہے کہ کون سی ہدایت آخری ہے جس پر عمل کیا جائے۔

ابھی حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس مسئلے پر سوچ بچار ہی کر رہے تھے کہ ان کو یمن سے بذریعہ قاصد ماہ شعبان میں کچھ رقم کی وصولی کا رقعہ موصول ہوا لیکن تاریخ درج نہ ہونے کے باعث یہ جاننے میں دشواری ہو رہی تھی کہ یہ اسی شعبان میں تقسیم ہونا ہے یا آئندہ آنے والے سال میں۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے صحابہ کی ایک مجلس بلائی تاکہ وہ اس مسئلہ پر غور کر کے تقویم (کیلنڈر) اختیار کر سکیں۔

ایک تجویز یہ آئی کہ رومن کیلنڈر رائج کر دیا جائے لیکن اس کو بوجوہ رد کر دیا گیا۔

ایرانی کیلنڈر بھی زیر غور آیا، ہرمزان نے اس کے خاص خاص نکات کی وضاحت بھی کی لیکن طے یہ پایا کہ یہ بھی مسلمانوں کے لیے مناسب نہیں ہے۔ مجلس کی عمومی رائے یہی تھی کہ غیروں کے کیلنڈر لینے کے بجائے مسلمانوں کی اپنی تقویم (کیلنڈر) ہونا چاہیے۔

اپنی تقویم (کیلنڈر) رائج کرنے کے فیصلے کے بعد یہ سوال پیدا ہوا کہ سال کو شروع کرنے کا پیمانہ کون سا ہو۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تاریخ ولادت اور تاریخ وصال زیر غور آئی لیکن حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے تجویز دی کہ واقعہ ہجرت سے مسلمانوں کا کیلنڈر شروع کیا جائے جس سے سب نے اتفاق کیا۔

اسی طرح یہ سوال پیدا ہوا کہ مسلمانوں کا سال شروع کس مہینے سے ہو۔ ذی الحجہ کا مہینہ زائرین کے حوالہ سے زیر غور آیا۔ رمضان کے مہینے پر بھی غور ہوا چونکہ عربوں کی تاریخ میں ماہ رجب بھی ماہ مقدس تھا اس لیے رجب کا نام بھی تجویز ہوا، مگر حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے تجویز پیش کی کہ عربوں میں ماہ محرم سال کا پہلا مہینہ ہے تو مسلمان بھی اس کی پیروی کریں اور اپنے سال کا پہلا مہینہ بھی ماہ محرم ہی مقرر کریں۔ جس سے سب نے اتفاق کیا اور یوں ہجری سال تاریخ ہجرت سے دو مہینے اور آٹھ دن پہلے سے شروع کیا گیا۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے تمام عمال کو اس تقویم (کیلنڈر) کو نافذ کرنے کی ہدایت جاری کر دی۔

حکیم محمد سعید مرحوم اپنی تحقیق میں لکھتے ہیں کہ ہجرت ۸ ربیع الاول بروز منگل کو کی گئی اور یوں مسلمانوں کا تقویم ہجرت کے سترہ سال بعد اور خلافت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے چوتھے سال میں ہوا۔

ہرمزان ایک ایرانی تھا جو جنگ قادسیہ کے بعد گرفتار ہو کر خلیفہ وقت کے سامنے لایا گیا اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کے خاندانی پس منظر اور علمی لیاقت کو دیکھتے ہوئے اس کو غلام نہیں بنایا بلکہ آزاد رہنے دیا اور اس سے انتظامی اور اقتصادی معاملات پر اس کا نقطۂ نظر اور ایرانی حکومت کا طریقہ کار بھی معلوم کر لیا کرتے تھے۔

انتخاب: عائشہ صدیقہ..... کراچی

پردے کی ضرورت

عرب معاشرے میں عورتوں کے پردے کا رواج نہ تھا۔ ضرورت کے وقت عورتیں گھروں سے نکلتیں، رفع حاجت کے لیے بھی باہر جانا ہوتا تھا۔ نماز کے لیے مسجد نبوی میں بھی خواتین شریک ہوتی تھیں۔ پھر ایسے واقعات پیش آئے جن کی روک تھام کے لیے بعض اقدامات کیے گئے۔ عورتوں کے لیے پردے کا حکم، مسجد نبوی میں عورتوں اور مردوں کی صفوں کے مابین پردے کا اہتمام، مردوں اور عورتوں کو آنکھیں نیچی رکھنے کا حکم، نامحرموں سے اپنی زیب و زینت چھپانے کا عورتوں کو حکم اور ایسے ہی دیگر احکام، ایسے ہی واقعات کی روک تھام کے لیے تھے۔ تاریخ اور شان نزول کی روایات سے یہی صورت سامنے آتی ہے۔ بعض لوگ تو ہوتے ہی پست ذہنیت کے ہیں، ان کے دل ہی مرض میں مبتلا ہوتے ہیں لیکن معاشرے میں ایسے عمومی قوانین اس امر کا اہتمام بھی کرتے ہیں کہ گناہ کے مواقع

اور امکانات کا خاتمہ کیا جائے یا انہیں حتی المقدور کم کر دیا جائے تاکہ مثبت سرگرمیاں آزادی اور آسانی سے جاری رہ سکیں۔ مذکورہ احکام ایسی ہی نوعیت کے ہیں۔ پھر مناسب قانون سازی اور نصیحت و تذکرے کے بعد بھی جو لوگ قبیح راستہ ترک نہ کریں ان کے لیے سختی کے علاوہ کوئی چارہ کار باقی نہیں رہ جاتا۔ تمام انسانی معاشروں میں ہمیشہ سے یہی اصول کارفرما رہا ہے۔

عبدالرحمان.....اکبر روڈ، کراچی

ایک بادشاہ کی حکایت

ایک بادشاہ گھوڑے سے گر گیا، اس کی گردن کے جوڑ اپنی جگہ سے ہل گئے، ہاتھی کی طرح اس کی گردن بدن میں گھس گئی، اس کا سر جب تک بدن گھمایا نہ جاتا نہ گھومتا تھا۔ یونانی طبیب کے علاوہ سارے طبیب اس کے معاملے میں حیران ہو گئے۔ اس نے (علاج کر کے) اس کا سر موڑ دیا اور بدن ٹھیک ہو گیا اور اگر وہ طبیب نہیں ہوتا تو یہ اپاہج ہو جاتا۔ جب بادشاہ تندرست ہو گیا تو وہ طبیب پھر دوبارہ کسی ضرورت سے اس کے پاس آیا۔ اس کم ظرف بادشاہ نے اس کی طرف نظر بھی نہ کی، عقل مند طبیب شرمندہ ہو گیا۔ چپکے سے یہ کہتے ہوئے چلا گیا کہ اگر میں کل اس کی گردن (علاج کر کے) صحیح نہ کرتا تو یہ منہ نہیں موڑ سکتا تھا۔ اس نے غلام کے ہاتھ ایک بیج بھیجا اور کہا اس کو بادشاہ کی گردن پر رکھ دینا۔ بادشاہ کو اس بیج کی بُو سے ایک چھینک آئی، اس کا سر اور گردن جیسی تھی ویسی ہی ہو گئی۔ طبیب کو بہت ڈھونڈا تا کہ اس سے معافی چاہے اور وہ دوبارہ علاج کرے مگر وہ نہیں ملا۔

فائدہ: احسان کرنے والے کے شکر سے گردن نہ موڑو ورنہ تکلیف اور شرمندگی اٹھانی پڑے گی۔ (الحمدللہ تعالیٰ علی نعمہ ظاہرۃ و باطنۃ)

زین الدین.....صدر کراچی

ہیروئنچی

دو ہیروئنچی بیٹھے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔

ایک بولا۔

''میں نے کل سمندر سے ڈھائی ٹن وزنی مچھلی پکڑی۔

دوسرا بولا۔

''میں نے کل سمندر میں ڈور ڈالی تو جلتی ہوئی لالٹین نکلی۔''

پہلا بولا۔

''نہیں تو جھوٹ کہتا ہے۔''

دوسرا بولا۔

''تو اپنی مچھلی کا وزن کم کر دے میں اپنی لالٹین بجھا دوں گا۔''

احمد علی.....ملیر کراچی

سبق

میں اپنے بچوں کو اپنی حیثیت سے زیادہ مہنگے اسکول میں پڑھا رہا ہوں لیکن چھوٹی گاڑی میں اسکول چھوڑنے جاتا تو شرم آتی۔ دوسرے بچے بڑی بڑی گاڑیوں میں آتے ہیں۔ کل میرا بیٹا اسکول سے ایک بچے کے ساتھ باہر نکلا۔ میں نے دیکھا وہ بچہ ایک رکشے میں بیٹھ کر چلا گیا۔ رکشے والا لے کر روانہ ہو گیا۔ گھر آ کر میں نے بیٹے سے دوست کا پتا معلوم کیا سوچا اس کے باپ کو جا کر سمجھاؤں گا کہ رکشے میں بچے کا آنا جانا ٹھیک نہیں۔ وہاں پہنچ کر میں نے دروازہ کھٹکھٹایا اور.....اور وہی رکشے والا باہر نکلا۔

نداچوہدری.....گجرات

پیشہ

راشد کے ہاں نیا پڑوسی رات کھانے پر مدعو تھا اور گپ شپ ہو رہی تھی کھانے کے بعد پڑوسی نے پوچھا کہ آپ کی مصروفیت کیا رہتی ہیں؟ جھٹ اس پر راشد کا چھ سالہ بیٹا بول اٹھا۔

''ابو ماہی گیر ہیں اور مچھلیاں پکڑتے ہیں۔'' راشد کی بیوی نے جھٹ سے بیٹے کو تیزی سے ٹوکتے ہوئے کہا۔

''بیٹے یہ کیا کہہ رہے ہو، وہ اسٹاک بروکر ہیں نہ کہ ماہی گیر۔'' اس پر بیٹے نے جواب دیا۔

''نہیں، ممی میں جب بھی ابو کے آفس جاتا ہوں تو وہ فون پر کسی سے بات چیت کرنے کے بعد ہمیشہ خوشی سے دونوں ہاتھ کھول کر کہتے ہیں میں نے ابھی ابھی ایک اور بڑی مچھلی پھانسی۔ مچھلیاں تو ماہی گیر ہی پھانستے ہیں نا۔''

شہروز.....کراچی

خوش بوئے سخن

نوشین اقبال نوشی

غزل

دیکھے ہیں میں نے عقل پہ تالے پڑے ہوئے
قدموں میں تیرگی کے اجالے پڑے ہوئے
تعبیر کیسے آئے گی خوابوں کے شہر میں
آنکھوں میں رتجگوں سے ہیں جالے پڑے ہوئے
پہلے دیئے ہی جان تھی جوکھوں پڑی ہوئی
اب ہے ہوا کو جان کے لالے پڑے ہوئے
اڑتی رہی بگولوں میں پسماندہ زندگی
قرب و جوار میں ہیں حوالے پڑے ہوئے
آتش فشاں کوئی تو ہے اندر رکا ہوا
کانا زبان منہ میں ہیں چھالے پڑے ہوئے

رانا شوکت کمال.....فتح جنگ اٹک

غزل

اب کا یوں تو مرگیا ہوں
منظر سے پس نہیں ہٹا ہوں
مسئلہ درپیش مجھے اور ہے کوئی
اسے تو کب کا بھول چکا ہوں
دشمن کی چالوں کی خوب خبر ہے
میں کرم دوستوں کے نہیں بھولا ہوں
یارو دامن انا سے اب تو کھینچو
آئے تم نہ چل کے، میں آیا ہوں
اب تو جدائی بھی نعمت لگے ہے
کہتے ہو فقط تم اور میں مانگتا ہوں
مغرور جس پہ گل ہے تم وہ کلی ہو
بیزار جس سے گلشن میں وہ نالہ ہوں
جان - فہیم زیست وہ جو تم سے ہے بسر
جینا نہیں ، سوا تجھ سے جو جیا ہوں

فہیم قیصر.....اسلام آباد

غزل

سچ جو بولوں تو جان جاتی ہے
جھوٹ بولوں تو شان جاتی ہے
میں محبت کو جس طرف موڑو
بات فوراً یہ مان جاتی ہے
ہم پرندوں سے مت الجھ طوفاں
آسماں تک اڑان جاتی ہے
میں نے وعدہ نبھانا ہے اسکو
چھوڑ دوں تو زبان جاتی ہے
جھوٹ منبر پہ بولنے والے
سچ جو بولیں دکان جاتی ہے
صرف جدت کی پیروی مت کر
شعر کی آن بان جاتی ہے
ماں اگر مجھ سے روٹھ جائے تو
پاؤں چھوتے ہی ، مان جاتی ہے
آہ مظلوم کی اگر نکلے
ساتویں آسمان جاتی ہے
تو پہاڑوں کی بات کر فاخر
دنیا مٹی کو چھان جاتی ہے

دانیال فاخر.....فتح جنگ ضلع اٹک

غزل

اس کی آرزوؤں کے بنا کیا تھا میں
ہواؤں کے سپرد جلتا ہوا دیا تھا میں
بنا منزل کے وہ سفر کٹتا کیسے
تحویل ترسفر ہے اک بار گیا تھا میں
وہ چاند پہ میرا عکس بنانے والی
پچھلے پہر چھت پہ کہاں تھا میں
رسم وفا کو نبھاتے تو کیسے جاناں
اسکے تصور میں بے وفا جہاں تھا میں
وہ شخص جو مرے نام سے ناواقف ہے
جس کے سہارے دن رات جیا تھا میں
وہ سبھی افسانے پرانے ہوئے ساگر
جن کے عنوان کا پہلا بیاں تھا میں

علی عباس ساگر.....ایبٹ آباد

غزل

تم لوٹ آؤ گے یقین تھا ہم کو
یہ خوش فہمیاں ہم اکثر پالا کرتے تھے
پر جانتے نہ تھے محبت میں انتظار ایک آگ کی صورت
اختیار کر لیتا ہے
جو ہماری محبت کو جلا کے راکھ کر دیتی ہے
پر محبت میں انتظار ہمیشہ کرنا پڑتا ہے

یہی محبت کا تقاضا ہے
پر انتظار کی قید کاٹنا
محبوب کا تقاضا نہیں ہے
پر پھر وہ محبت ہی کیا
جو انتظار کا مزہ نہ چکھے

آسیہ مظہر چوہدری.....آزاد کشمیر

غزل

آگ میں رکھ دیا قدم شاید
عشق کرنے لگے ہیں ہم شاید
اب تو جینا بھی ہو گیا مشکل
عشق ڈھانے لگا ستم شاید
ایک دن ہم کو مار ڈالیں گے
زندگی کے یہ زیر و بم شاید
بے خطر کود جانا آتش میں
عشق میں ہو گیا یہ بھی کم شاید
اس کو پہلے کبھی نہ پایا تھا
عشق ہوتا ہے ایک دم شاید
آج پھر زندگی کو دیکھا ہے
عشق کرنے لگا کرم شاید
اب تو اس کا گلہ نہیں سنتے
ہو گیا عشق محترم شاید
گرم جذبات جب ہوئے دانش
سرد ہونے لگا قلم شاید

ش-م-دانش.....پاکی خیل

درد کی دہلیز

درد کی دہلیز پہ آؤ
چلو دھمال کریں
کوئی نعرہ مست بھی ہو
کوئی ہنگامہ شوق
غم کے دالان میں آؤ
چلو دھمال کریں
عشق کا سناٹا ہے
ہو کا عالم ہے یہاں
چلو دھمال کریں
حرص و لالچ و طمع
چھوڑ کر سب ہی یہاں
چلو دھمال کریں
درد کے پھول کھلے
رنجور فضا میں
غم آشنا ہے سحر
گہن لگا ہے قمر
چلو دھمال کریں
اماوس کی رات ہے
دندناتے ہیں گرگ اجل
کوئی قندیل ہوئی گل
پھر بجھا ہے چراغ
رات کی تاریکی میں
انتظار سحر میں
وقت گزاری کے لیے
آؤ چلو دھمال کریں
شجر سارے کٹ جائینگے
قلم بن کر
نیلے سمندر کی روشنائی میں
لکھیں گے پھر بھی مگر
چلو دھمال کریں
حاکم شہر نے
اس کے قاضی نے
سپہ سالار اور مفتی وقت نے
ڈور چھوڑ دی ہے انصاف کی
اور قانون کو بنایا ہے تختہ مشق
سسکتی ہے انسانیت اور
مر رہے ہیں زباں کھولنے کے سبب
خاموش رہو
چلو دھمال کریں
چلو دھمال کریں

سرور غزالی.....جرمنی

نعت

دیدار مصطفیٰ جو ملے مجھ کو ایک بار
اللہ کے حضور میں سجدے کروں ہزار
جب تک نہ دیکھ لوں گی تسلی نہ پاؤں گی
بے چین و مضطرب ہے میرا دل ہے بے قرار
اک بار دیکھ لو تو بصیرت بحال ہو
پھر دل دعا کرے گا کہ دیکھوں میں بار بار
ایسا میرا نصیب کہاں دیکھو لوں انہیں

تر دامنی کو دیکھ کر آنکھیں ہیں اشکبار
گلیاں بلا رہی ہیں مدینے کی کیا کروں
دل مانتا نہیں مچلتا ہے بار بار
کچھ پھول ڈھونڈ لوں تو مدینے کی راہ لوں
کیا پاؤں کیا سمیٹوں کہ ان پر کروں نثار

کلام: ذکیہ بلگرامی
انتخاب: پرنس افضل شاہین..... بہاولنگر

غزل

الفت کے سفر میں تھے
زمانے کی نظر میں تھے
مدہوشی میں گم ہوئے اتنے
عمر بھر ہی اثر میں تھے
وہ اتنے ہم پر چھا گئے تھے
لمحہ بھی نہ صبر میں تھے
وہ لوٹے بھی تو کب لوٹے
اپنے ہم نہ گھر میں تھے
پکارا بھی تو اس نے کب
حسن ہم تو قبر میں تھے

ایم حسن نظامی..... قبولہ شریف

غزل

سب سے پہلے آدمی انسان ہونا چاہیے
بعد اس کے صاحب ایمان ہونا چاہیے
یا تو اس دنیا کو بس آباد ہونا چاہیے
یا مکمل طور پر ویران ہونا چاہیے
جب طبیعت ہو گناہ گار پر بھی مائل تیری
سامنے پھر حشر کا میدان ہونا چاہیے
جب حصول منزل مہر و وفا کی بات ہو
سب کہیں گے راستہ آسان ہونا چاہیے
زندگی میں اس قدر آسان نہیں ہے راہبری
راہبر کو صاحب وجدان ہونا چاہیے
اب تو ہر دل کا یہی ارمان بن کر رہ گیا
گھر کے دروازے پر ایک دربان ہونا چاہیے
زندگی کی افراتفری کہا کبھی میں قمر
دل کو بہلانے کا کچھ سامان ہونا چاہیے

ریاض حسین قمر..... منگلا ڈیم

خوابیدگی

کوئی تم کو چھپ کے دیکھے
تو پلک نہ جھپکے
دیر تک دیکھتا ہی رہے
اور تو بے خبر اپنے خدوخال سے
ظریف احسن وہ باخبر
تیرے حسن جمال سے
انگڑائی کے کمال سے
سرتاپا وصال سے
خلوت کے پاتال سے
مرمریں مثال سے
حسن لازوال سے
نازنیں کے حال سے

ظریف احسن.....

دل کی دھڑکن

دل کی دھڑکن شور مچاتی
جب نل سے پانی بھرنے جاتی
مجھے چیخ کر ادھر بلاتی
نت نئے سپنے یہ دکھاتی
تیرے حسن میں الجھاتی
نئی کہاوت یہ سناتی
کبھی ملنے کے لیے بلاتی
کبھی غیروں کی طرح گزر جاتی
کبھی ہنس کر جان لیتی
غصے میں بھی عقب ڈھاتی
کبھی زمانے سے ڈرتی
کبھی سرعام یہ بلواتی
دل کی دھڑکن شور مچاتی
جب نل سے پانی بھرنے جاتی

صغریٰ کوثر.....

غزل

تجھ سے دور رہ کے بھی ہم تجھے بھلا نہ سکے
تیرے تھے پھر بھی تجھے ہم اپنا بنا نہ سکے
دل کے ارماں آنسوؤں میں بہہ گئے آخر
ہم تاریکیوں میں پھر کوئی چراغ جلا نہ سکے
تجھ سے گلہ کیا کریں ہم تیری بے وفائی کا
بگڑے ہوئے حالات سے ہم نبھا نہ کر سکے
ملے تھے ہمیں بہت سے زخم تیری محبت میں
چیر کے شکستہ دل ہم یوں بھی تجھے دکھا نہ سکے

تیری یادوں سے دامن چھڑاؤں پھر میں کیسے
اسیر تھے تیری زلفوں کے ہم نظروں کو بچا نہ سکے
محمد اسلم جاوید.... فیصل آباد

غزل

اس طرح سے پیاس بجھا لو پانی کی طرح
صحرا میں تصویر بنا لو پانی کی طرح
مجھ کو ان انگاروں پر ہی چلنے دو
تم راستے سے بوند اٹھا لو پانی کی طرح
باندھو میرے پیر ہوا کے شعلوں سے
میرے سر پر خاک نہ ڈالو پانی کی طرح
جانے والے رونے سے کب رکتے ہیں
راستے سے دیوار ہٹالو پانی کی طرح
جب بھی تم جاننا چاہو کون ہوں میں
مٹی میں ایک بوند ملا لو پانی کی طرح
پھر آنکھوں میں خواب سجانا صحرا کے
پہلے دل سے یاد نکالو پانی کی طرح
احسان سحر.... میانوالی

غزل

خلق کی کرتا تھا خدمت اور کیا
پیکر اخلاص د الفت اور کیا
فخر ہے انسانیت کا اور کیا
تھا دل مفلس کی راحت اور کیا
آفتاب وقت تھا جو بجھ گیا
کر گیا بے لوث خدمت اور کیا
تھا غلام رحمت ہر دو جہاں
کر گیا وہ دیں کی نصرت اور کیا
قدر، ہم افسوس کچھ نہ کر سکے
وہ بھی تھا خالق کی نعمت اور کیا
نہ نوازا عالمی اعزاز سے
تا قیامت ہے ندامت اور کیا
دل کو آتا ہی نہیں نیر یقین
تھی ابھی اس کی ضرورت اور کیا
نیر رضوی.... لیاقت آباد، کراچی

ماں باپ

مت مان برا یہ جو بھی کہیں
یوں پیار سے کوئی نہ ڈانٹے گا
ماں باپ نہ گر دنیا میں رہیں
پھر کون تیرا دکھ بانٹے گا
راؤ تہذیب حسین تہذیب.... رحیم یار خان

غزل

محبتوں میں انائیں کیسی
بن بادل ہوائیں کیسی
عشق کرنا کوئی جرم تو نہیں
نہیں کوئی جرم میرا سزائیں کیسی
وہ پتھر مار کر پھر زہم لگاتا ہے
جفائیں کیسی وفائیں کیسی
ہم تو دل ہار بیٹھے دشمن جاں پر
بازی جب ہار بیٹھے تو دعائیں کیسی
وہ بے وفا ہے دل تسلیم نہیں کرتا
زخمی دل پر مرہم لگائیں کیسی
آنکھ ہے پرنم دل رو رہا ہے
محفل دل کی سجائیں کیسی
اس سے بچھڑ کر ہر پل عذاب لگتا ہے
داستان ہجر کی سنائیں کیسی
وہ دل لگی کی حد تک ہے خبر ہے
محبت بھیک ہو شاید خطائیں کیسی
میں زخم پر زخم کھا کر خود کو عادی تو بنا لوں نیلم
پھر نئی چوٹ دل پر لگائیں کیسی
محبتوں میں انائیں کیسی
نہیں کوئی جرم میرا سزائیں کیسی
بحیرہ نیلم..... گجرات

غزل

غضب کا معجزہ دیکھا تیری نایاب ہستی میں
سمندر ڈوبتے دیکھا تیری آنکھوں کی مستی میں
دھواں کیسے سلگتا ہے اگر تم دیکھنا چاہو
کوئی بھی گھر جلا دینا کسی مفلس کی بستی میں
بہت ہی پاک جذبہ ہے جسے تم عشق کہتے ہو
یہ تم کو مل ہی جائے گا کسی درویش ہستی میں
نہ جانے کتنے لوگوں کو کنارے پر لگا ڈالا
عجب سا حوصلہ دیکھا تیری کاغذ کی کشتی میں
کامران خان..... حیدر آباد، سندھ

مرشد

ساحر جمیل سید

قدم قدم ہنگاموں اور حادثوں کے ساتھ ساتھ پروان چڑھنے والے عشق کی روداد دل گداز

اس نے نزہت جہاں بیگم کے کوٹھے پر آنکھ کھولی

مسلے مرجھائے گجرے، باسی پھول اور گھنگرو اس کے کھلونے بنے

بدمعاشوں کی دنیا نے اسے مرشد مانا اور پھر..... وہ کسی کا مرید ہو گیا!!

شاہی محلے کا نمازی بدمعاش جس نے سرکار سے عشق کیا اور عشق کی مریدی

وہ ایک محل جیسی عالی شان کوٹھی کا وسیع وعریض سرسبز لان تھا' جس کے اطراف کیاریوں میں خوش رنگ اور خوشنما پھولوں والے پودے کثرت سے لگائے گئے تھے۔ لان کے سبز قالین پر دودھ جیسی سفید ٹیبل اور کرسیاں سجائی گئی تھیں۔ ان کرسیوں میں سے ایک پر میر ارشد اللہ بیٹھے تھے اور ٹیبل کے اس طرف...... سامنے کی کرسی پر حسن آرا رونق افروز تھی۔ دونوں کے درمیان موجود ٹیبل پر چائے کے تمام لوازمات دھرے تھے اور میر صاحب خود ہی چائے بنانے میں مصروف تھے۔

''میٹھا کتنا پسند کیجیے گا؟'' کپ میں چینی ڈالتے ڈالتے انہوں نے رک کر حسن آرا کی طرف دیکھا۔

''میزبان کا ذائقہ جاننا چاہیں گے؟'' حسن آرا کے ہونٹوں پر ایک نرم سی مسکراہٹ جھلملائی۔

میر صاحب نے مسکراتے ہوئے چائے میں چینی ملائی اور کپ پرچ میں سجا کر حسن آرا کے سامنے پیش کر دیا۔

''بھلا لگے نہ لگے...... برا ہرگز نہیں لگے گا...... اس بات کا یقین رکھتے ہوئے گھونٹ لیجیے۔''

''شکریہ۔'' حسن آرا نے پرچ تھام لی۔ ''آپ ابھی تک اپنے کہے پر بضد ہیں۔''

''نہیں...... یہ کوئی ضد نہیں ہے...... یہ پوری طرح سے ایک شعوری فیصلہ ہے اور آپ کے سامنے محض ایک درخواست اور...... اس درخواست کے حوالے سے ایک یہ درخواست بھی کہ براہ کرم آپ ہماری درخواست قبول فرمالیں۔''

میر صاحب نے اپنے کپ میں چینی حل کی اور کپ اٹھاتے ہوئے کرسی کی پشت سے ٹک کر بیٹھ گئے۔ گزشتہ تین ملاقاتوں میں ہم نے جو کچھ بھی آپ سے کہا ہے...... اس میں کچھ بھی جھوٹ نہیں ہے...... وہ سب اپنی جگہ درست ہے مگر...... آج...... اس وقت' ایک وجہ اور بھی موجود ہے۔'' میر صاحب نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا پھر ایک آہ نما سانس بھرتے ہوئے نگاہوں کا زاویہ تبدیل کر کے فضا میں تیرتے نٹیالے بادلوں کے ٹکڑوں کی طرف دیکھنے لگے...... ایک خفیف سی بے ساختہ مسکراہٹ ان کے زیر لب مچل رہی تھی۔

''وجہ نہیں بتائیں گے......'' حسن آرا نے ایک بھولی سی چسکی لی۔

'میر صاحب کرسی پر سیدھے ہوتے ہوئے تھوڑا سا آگے کو سرک آئے۔

''ذرا آگے ہو کر دیکھیے۔'' انہوں نے حسن آراء کے صبیح چہرے پر نظریں جماتے ہوئے اپنی آنکھوں کی طرف اشارہ کیا۔

''جی...... جی...... قریب ہو کر دیکھیے ذرا۔'' حسن آراء نے ان کے اصرار بھرے لہجے پر استفہامیہ انداز میں آنکھیں ان کی آنکھوں میں ڈال دیں۔

''کہیے...... کیا دکھائی دے رہا ہے آپ کو؟''

''اپنی صورت۔'' حسن آراء نے دھیمے لہجے میں کہا۔

''اور ہم چاہنے لگے ہیں کہ ہر ایک منظر کے ساتھ یہ ایک منظر ہمیشہ آپ کے سامنے رہے۔'' میر صاحب دوبارہ پیچھے ہٹ کر اطمینان بھرے انداز میں پشت ٹکا کر بیٹھ گئے۔ دائیں ٹانگ کو انہوں نے ڈھیلے ڈھالے انداز میں دوسری ٹانگ پر ڈال دیا تھا۔

''ہم محسوس کرنے لگے ہیں کہ ہم زندگی میں پہلی بار ضرورت مندی کی لذت سے آشنا ہوئے ہیں...... ہم اپنی ذات کے سچ کے ساتھ آپ کی ضرورت محسوس کرتے ہیں...... ہمیشہ ہمیشہ کی بنیادوں پر...... ہر لمحہ' ہر پل' اس سب کے ساتھ ہم یہ یقین لے آئے ہیں حسن آراء کہ ہم آپ کی محبت میں مبتلا ہو چکے ہیں...... پتا نہیں کیسے؟ کس طرح' مگر ہمارے اندر ایسا واقع ہو آیا ہے ابھی دو چار دنوں میں ہم آپ سے محبت کرنے لگے ہیں۔''

حسن آراء کا ہونٹوں کی طرف بڑھتا ہوا ہاتھ رک گیا...... دل جیسے اچھل کر حلق میں آ دھڑکا تھا۔ وہ یک ٹک میر صاحب کی طرف دیکھتی رہ گئی۔

پہلے شادی کا تقاضا اور اب یوں اچانک اظہار محبت...... آج دوسری بار اسے اپنی ہی سماعتوں پر یقین نہیں آ رہا تھا...... وہ بس حیرت و بے یقینی سے میر صاحب کی صورت دیکھے گئی۔

''ہم اپنی اس نئی جذباتی حالت کو بھی بڑی اچھی طرح سمجھ رہے ہیں مگر ہمیں ایسے مناسب اور موزوں الفاظ

بھائی نہیں دے رہے کہ جن میں ہم اپنے جذبوں کا اظہار کرسکیں..... اپنی قلبی بے قراریاں بیان کرسکیں.....''

وہ بول رہے تھے۔ ''کمال کی بات یہ بھی ہے کہ دو چار روز پہلے تک ہم جذبوں کے اس رنگ' اس ذائقے سے قطعی ناآشنا تھے..... حالانکہ ہماری شریک حیات بہت اچھی' بہت خدمت گزار خاتون ہیں اور ہم اپنے تئیں ان سے محبت رکھنے کے دعوے دار بھی ہیں..... لیکن اب ہمیں احساس ہوتا ہے کہ ان سے ہمیں اپنائیت اور لگاؤ تو بے شک ہے لیکن محبت سے تو ہم خود بھی پہلی بار واقف ہو رہے ہیں آپ سے ملنے کے بعد..... اب..... آپ کے حوالے سے۔'' انہوں نے کپ سے ایک چسکی لی۔

''ہوش سنبھالنے سے لے کر آج تک ہر سہولت..... دنیا کی ہر آسائش کو ہم نے اپنے در کی باندی پایا ہے' ہمیں وہ سب کچھ میسر رہا ہے جس کی انسان خواہش کرسکتا ہے..... اس کے باوجود ہم ہمیشہ ہی ایک بے نام سی کمی محسوس کرتے رہے ہیں۔ ایک..... ایک خلا سا تھا جو کبھی پر نہ ہوسکا..... ہم یہ بھی کبھی نہیں جان سکے کہ ایسا کیوں ہے..... اور اب..... آپ سے ملاقات کے بعد جیسے اس بے نام کمی کو ایک عنوان مل گیا ہے..... ہمارے اندر کا وہ خلا ہم پر منکشف ہوآیا ہے..... وہ کمی محبت کی کمی تھی۔ اور وہ خلا آپ کے ساتھ..... آپ کی رفاقت کا طلب گار ہے حسن آراء۔''

میر صاحب کے لہجے میں ایک بے خودی' ایک خواب ناکی آگھلی تھی۔ ان کی محبت بھری نظریں حسن آراء کے چہرے کا طواف کرنے میں مگن تھیں..... اور حسن آرا تو جیسے ان کے لفظوں اور لہجے کے زیر اثر مسمرائز ہوئی بیٹھی تھی۔

''ہر لمحہ' ہر پل..... محبت..... رفاقت.....'' وہ خود کلامی کے سے انداز میں بڑبڑائی۔

''ہاں جی' بالکل' میر صاحب نے چائے کا ایک گھونٹ لیا۔ ''آپ نے کہا تھا کہ وہاں..... آپ کے ہاں اس موضوع پر تسلی بخش گفتگو نہیں ہوسکتی' یہ جگہ ہمیں ہر لحاظ سے بہتر اور معقول لگی اور پھر یہی وہ عمارت ہے جو آپ کی رضامندی کے بعد ہمارا گھر..... ہماری بہشت ہوگی..... اب آپ کہیے کہ آپ نے کیا سوچا..... کیا فیصلہ کیا ہے آپ نے؟''

حسن آراء نے چائے کا گھونٹ بھرا..... اس کی نظریں وسیع و عریض لان سے گزرتی ہوئی کوٹھی کی رہائشی عمارت کی طرف گئیں اور پھر اس کی بلندیوں کو ماپنے لگیں۔

''میر صاحب! آپ کے پرخلوص جذبے قابل تعظیم ہیں..... مگر ہم اس سب کے اہل نہیں..... آپ نے جو کچھ کہا..... جو کچھ آپ چاہتے ہیں وہ ہمارے لیے سعادت اور اعزاز کی بات ہے اور ہمارے لیے ایک ایسا خوبصورت خواب کہ جو ہم چاہنے کے باوجود اپنی آنکھوں میں نہیں سجا سکتے..... جو مقام آپ ہمیں دینا چاہ رہے ہیں وہ اتنا بلند ہے کہ ہمیں سوچ کر ہی ڈر لگنے لگتا ہے..... ہم اتنی بلندی سے گر کر چکنا چور ہو جائیں گے..... کرچی کرچی ہو کر بکھر جائیں گے۔'' حسن آراء کی نظریں واپس لان میں اتر آئیں۔

''آپ کا اعتماد جیتنے کے لیے ہمیں کیا کرنا ہوگا؟''

''کچھ نہیں..... بس آپ کے لیے کسی شرمندگی یا پریشانی کا باعث بننا ہم گوارا نہیں کرسکتے۔''

''شرمندگی تو تب رہے گی جب آپ ہمیں رد کریں گی..... ہمارے خلوص اور جذبوں کو ٹھکرا دیں گی' رہی بات پریشانی کی تو..... پریشانیوں سے نمٹنا ہم خوب جانتے ہیں۔''

''آپ کو یہ سب اتنا ہی آسان لگتا ہے۔''

''کہیں کوئی مشکل نہیں ہے ماسوائے..... آپ کے اقرار کر لینے کے۔''

''ہم اقرار سے خوف اور گھبراہٹ محسوس کرتے ہیں..... اس لیے کہ ہمارا ماضی..... ہماری اصل کبھی بھی اور کسی بھی صورت تبدیل نہیں ہوسکتی.....'' اندیشے اور واہمے حسن آراء کو جھنجوڑنے پر تلے ہوئے تھے۔

ماضی سے آپ کا کوئی واسطہ نہیں رہے گا اور آپ کی اصل..... اسے تو شاید آپ خود بھی ٹھیک سے شناخت نہیں کر پا رہیں..... آپ کی اصل کچھ اور ہے حسن آراء جسے کہ آپ شاید دیکھنا سمجھنا اور جاننا چاہتی ہی نہیں ہیں۔''

''ہم عرض کر چکے ہیں میر صاحب! کہ جو خواب آپ

ہمیں دکھا رہے ہیں اس کی چاہت اور خواہش رکھنے کے باوجود ہم اسے اپنی آنکھوں میں جگہ نہیں دے سکتے۔''

''چلیں..... ہم ایک ذرا مان لیتے ہیں کہ جو ہم چاہتے ہیں وہ ناممکن ہے' ایسا نہیں ہوسکتا۔ لیکن آپ یہ تو تسلیم کررہی ہیں ناکہ آپ بھی یہی خواہش رکھتی ہیں..... آپ کے دل میں بھی وہی کچھ ہے جو کہ ہمارے دل میں پنپ رہا ہے..... جو ہم نے سوچ رکھا ہے..... جو ہم چاہتے ہیں؟''

حسن آراء نے ایک ذرا میر صاحب کی اشتیاق بھری آنکھوں میں جھانکا پھر نگاہیں جھکاتے ہوئے دھیمے لہجے میں مختصراً بولی۔

''جی.....''

''یہ..... یہ ہوئی نا بات..... بس اب آپ باقی سب ہم پر چھوڑ دیں اور بالکل بے فکر ہوجائیں۔ ہر اندیشے اور ہر خدشے پر مٹی ڈال دیں.....'' میر صاحب کے پرجوش اور مسرت بھرے لہجے پر اس نے نظریں اٹھا کر دیکھا..... میر صاحب کا چہرہ کھل اٹھا تھا۔ آنکھوں میں ایک چمک اور چہرے پر انتہائی اطمینان بھری اور جاندار مسکراہٹ رقص انداز تھی۔

''اللہ اکبر..... اللہ اکبر!''

اچانک کسی طرف سے اذان کی آواز بلند ہوئی تو میر صاحب جو کچھ کہنے والے تھے ہونٹ بھینچ کر خاموش ہو رہے..... اندرونی جذبات کی شدت ان کے سرخ چہرے پر مزید سرخی پھیلا دینے کا باعث بن گئی تھی..... وہ یقیناً کچھ اور کہنا چاہتے تھے..... شاید بہت کچھ کہنا چاہ رہے تھے مگر حسن آراء نے محسوس کیا کہ وہ اذان کی وجہ سے خاموش ہو رہے ہیں۔ انہوں نے آنکھیں بند کرتے ہوئے سر بھی قدرے خم کرلیا تھا..... پھر جب تک اذان ہوتی رہی وہ اپنی جگہ اسی انداز میں بیٹھے رہے اور اذان مکمل ہوتے ہی وہ اپنے ٹیبل پر رکھتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔

''ہم نماز ادا کرلیں پھر مزید بات کرتے ہیں۔''

انہوں نے والہانہ نظروں سے حسن آراء کو دیکھتے ہوئے کہا اور اندرونی حصے کی طرف بڑھ گئے۔ ایک الوہی سی طمانیت اور شادمانی تو جیسے ان کے انگ انگ سے چھلکنے لگی تھی۔ حسن آراء ان کی پشت پر نظریں جمائے اپنی جگہ گم صم سی بیٹھی رہی..... اس کے دل و دماغ کی حالت عجیب تھی۔ ماضی اور مستقبل سے تعلق رکھنے والی سوچوں اور خیالوں نے اسے عجیب مخمصے میں مبتلا کرکے رکھ دیا تھا۔

دل نے سینے میں ایک اودھم مچا رکھا تھا اور دماغ..... دماغ الگ ایک واویلا مچائے ہوئے تھا۔

❁.....❁.....❁

چوہدری فرزند علی اکبر کی شادی کو ایک سال سے کچھ زیادہ ہی وقت گزر چکا تھا..... لیکن ابھی تک چوہدرانی کی گود ہری ہونے کے امکان پیدا نہ ہوسکے تھے..... وارث کی کوئی آس امید بنتی نظر نہیں آرہی تھی..... جس کی بنا پر یہ فرض کرلیا گیا تھا کہ ہو نہ ہو چوہدرانی ہی کسی خرابی..... کسی نقص کا شکار ہے اور اسی خرابی کی تصدیق اور تدارک کی غرض سے چوہدری فرزند علی چوہدرانی کو لے کر لاہور پہنچا تھا۔

میڈیکل چیک اپ میں کوئی سنگین یا مایوس کن بات سامنے نہیں آئی تھی۔ بقول ڈاکٹر کے چوہدرانی بس رحم کے معمولی ورم کا شکار تھی جس کے حل کے لیے کچھ میڈیسنز تجویز کردی گئی تھیں۔

چوہدرانی اور نازیہ کو واپس گاؤں روانہ کرنے کے بعد چوہدری فرزند علی اپنے خاص جاں نثاروں کے ساتھ ملتان روڈ پر واقع اپنی کوٹھی پر چلا آیا تھا۔ ارادہ یہی تھا کہ چند روز یہیں رہتے ہوئے کچھ اہم اور ضروری معاملات بھی بھگتائے جائیں اور کچھ عیش و عشرت کا سامان بھی کیا جائے مگر پہلی رات ہی ایک عجیب بدمزگی کی صورت حال بن آئی۔

اس بدمزگی اور ساری خرابی کی وجہ ایک بڑے سائز کا سیاہ کتا تھا جو رات گئے کسی طرح دیوار پھاند کر کوٹھی کے اندر آگھسا تھا اور پھر اس سے پہلے کہ اس کے خلاف کسی قسم کی کوئی کارروائی کی جاتی..... وہ کوٹھی میں خلاف معمول رونق اور خطرہ محسوس کرتے ہوئے اچانک ہی دیوار پھاند کر فرار ہوگیا۔

چوہدری فرزند کی پوچھ تاچھ پر مالی فقیر حسین نے بتایا کہ گزشتہ چند روز سے وہ روزانہ دیوار پھلانگ کر کوٹھی میں گھس آتا ہے اور پوشاک کے ساتھ نامناسب اور نامعقول قسم

کی چھیڑ چھاڑ کرتا ہے..... ہم نے اسے پکڑنے' قابو کرنے کی کوشش بھی کی ہے مگر وہ نکل بھاگتا ہے۔''

بس اتنا سنتے ہی چوہدری فرزند آگ بگولہ ہو گیا تھا..... مالی کی جان تو دو چار تھپڑوں اور ٹھوکروں کے بعد چھوٹ گئی البتہ چوکیدار منظور کی شامت آ گئی..... اسے بری طرح زدوکوب کیا گیا کہ اس کے ہوتے ہوئے کوئی کتا مسلسل پوشا کو تنگ کرنے آ رہا ہے تو کیوں..... اس نے اس آوارہ کتے کو گولی کیوں نہ ماردی!

دوسری رات باقاعدہ مورچہ بندی کی گئی اور جیسے ہی وہ کتا اپنے معمول کے مطابق کوٹھی میں داخل ہوا' اسے چھلنی کر کے رکھ دیا گیا..... اپنے ہم جنس اور آشنا کی اس درد ناک موت پر پستہ قامت پوشا کا غم واندوہ سے لبریز فطری ردعمل چوہدری فرزند برداشت نہیں کر پایا اور بے چاری بے زبان پوشا چوہدری فرزند کی اندھی انا اور وحشت و تنفر کا شکار ہو کر خود بھی جان گنوا بیٹھی۔ وہ بہت چھوٹی سی تھی جب ایک تحفے کے طور پر چوہدری فرزند کے ہاتھ لگی تھی..... چوہدری کو بھی وہ اتنی پیاری لگی تھی کہ اس نے اپنے بچوں کی طرح اس کی پرورش کی تھی..... اپنے ہاتھوں سے دودھ پلا پلا کر بڑا کیا تھا..... اس کی دیکھ بھال کی تھی اور آج..... آج اپنے ہاتھوں سے اسے گولی ماردی تھی۔ اس کی موت پر چوہدری فرزند کو یونہی محسوس ہوا تھا جیسے اس نے اپنا کوئی بچہ قتل کر دیا ہو۔

اس سب کا ذمہ دار چوہدری کے نزدیک چوکیدار منظور اور اس کی غفلت تھی سو اس نے حکمداد کو منظور کی موت کا اشارہ دیتے ہوئے واپس گاؤں کی طرف منہ کر لیا تھا۔ کہ اب فی الوقت اس کوٹھی میں رکنا اسے تکلیف اور رنج کا باعث محسوس ہو رہا تھا۔

واپسی پر تمام رستے گاڑی میں ایک گھمبیر خاموشی بھری رہی اور صبح کی اذانوں سے کچھ پہلے گاڑی حویلی کے مردان خانے میں آ رکی۔ فرنٹ سیٹ سے قادر داد نے اتر کر فوراً عقبی دروازہ کھولنے کی کوشش کی مگر اس سے پہلے ہی چوہدری فرزند علی خود دروازہ کھولتے ہوئے نیچے اترا اور بغیر کچھ کہے سنے لمبے لمبے قدم اٹھاتا ہوا زنان خانے کی طرف بڑھ گیا..... اس کا موڈ اس قدر بگڑا ہوا تھا کہ اس نے راستے میں پہرہ دیتے محافظوں کے سلام کا جواب دینا تو دور کی بات ان کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔

حویلی کے زنان خانے میں داخلے کا ایک حصہ مردان خانے کی عمارت کے عقبی طرف واقع تھا۔ چوہدری فرزند خاموشی سے آگے بڑھتا ہوا عمارت کی عقبی طرف آ گیا..... صبح قریب تھی اور تھوڑی دیر تک اذانیں ہونے والی تھیں ..... ڈھلتے چاند کی روشنی چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی..... پوری حویلی خاموشی اور سکون میں ڈوبی ہوئی تھی..... چوہدری فرزند ابھی زنان خانے والے راستے سے کچھ قدم دور ہی تھا کہ اچانک اس کی نظر دیوار کے اس درمیانی کھلے حصے میں ایک اجنبی پر پڑی تو وہ حیرت و بے یقینی سے ٹھٹک کر رک گیا۔

وہ کوئی نوجوان تھا جو زنان خانے سے نکل کر مردان خانے کی طرف آ رہا تھا اور غالباً چوہدری فرزند کو آتا دیکھ کر ٹھٹک گیا تھا' شاید وہ فوری طور پر دائیں بائیں کہیں چھپنے دبکنے کی کوشش بھی کرتا مگر چوہدری کو اپنی جانب متوجہ پا کر وہ جیسے جہاں کا تہاں کھڑا رہ گیا تھا۔ ایک لمحے کو تو جیسے چوہدری فرزند کو اپنی آنکھوں پر ہی یقین نہیں آیا مگر دوسرے ہی لمحے اسے وہ نوجوان جانا پہچانا بھی محسوس ہوا اور چوہدری نے کڑک دار آواز میں اسے تنبیہ کیا۔

''خبردار اوئے! اپنی جگہ سے ہلنا نہیں۔'' ساتھ ہی کسی لاشعوری احساس کے تحت اس کا ہاتھ برق رفتاری سے قمیص کے نیچے' کمر سے بندھے ہولسٹر کی طرف رینگ گیا۔ ٹھیک اسی وقت نوجوان پلٹ کر بھاگ کھڑا ہوا۔

''رک..... (ناقابل اشاعت) چوہدری فرزند نے ایک غلیظ گالی دیتے ہوئے اسے للکارا اور ساتھ ہی پسٹل نکالتے ہوئے اس پر فائر بھی کر دیا مگر اسے گولی چلانے میں لمحہ بھر کی تاخیر ہو چکی تھی۔ نوجوان حویلی کے عقبی حصے میں موجود بھانے کی طرف دوڑتے ہوئے دیوار کی اوٹ میں ہو چکا تھا سو دوسرے فائر کی گنجائش نہیں تھی۔

''رمضانی پکڑنا اس حرام کے جنے کو۔''

رمضان عرف رمضانی رات کو بھانے میں پہرے پر ہوتا تھا۔ چوہدری فرزند غضبناک لہجے میں اس کو آواز دیتے ہوئے خود بھی اپنی جگہ سے دوڑ پڑا تھا۔ فائر کے

ہمائے اور اس کی بلند آہنگ آوازوں سے حویلی پر طاری سکون اور خاموشی درہم برہم ہو کر رہ گئی۔ مردان خانے میں بندھے کتوں نے اچانک ہی اپنی بھیانک آوازوں میں بھونکنا شروع کر دیا تھا۔

چوہدری فرزند پسٹل ہاتھ میں سنبھالے زنان خانے والے حصے میں داخل ہوا اور عقبی طرف بھانے میں داخلے کے راستے کی طرف دوڑتا چلا گیا۔

چند لمحوں کے لیے ان دونوں نے ایک دوسرے کو آمنے سامنے سے دیکھا تھا اور اس نوجوان کی صورت شناخت کے حوالے سے چوہدری کو جو شبہ سا گزرا تھا وہ اس کے رگ و پے میں بھانبھڑ جلا گیا تھا۔ اس کے دماغ میں جیسے طوفانی آندھیوں کے جھکڑ سے چلنے لگے تھے......

وہ خود بھی طوفانی رفتار سے بھاگتا ہوا بھانے میں داخل ہوا اور داخلی راستے کے سامنے ہی زمین سے اٹھتے ہوئے رمضانی سے ٹکرا گیا۔ خود کو تو چوہدری فرزند نے بامشکل گرنے سے بچایا البتہ رمضانی اس اچانک دھکے سے دوبارہ زمین پر جا پڑا...... چوہدری نے چاروں طرف نظر دوڑائی...... اس نوجوان کا کہیں کوئی نشان نہیں تھا......

چاروں طرف کھڑی بھینسیں حویلی میں اچانک بلند ہونے والی ہاہا کار سے وحشت زدہ ہو کر اپنی بھدی آوازوں میں ڈکرا رہی تھیں۔ ایک کتا بھی وہاں موجود تھا جو منہ اٹھا اٹھا بھونک رہا تھا۔

''ادھر' پچھلے بھانے کی طرف۔''

''جو بھی ہے' جانے نہ پائے۔''

''گلشن' سانبھے۔''

مسلح محافظ ایک دوسرے کو پکارتے' سمجھاتے بھانے کی طرف دوڑے آ رہے تھے...... چوہدری فرزند نے ایک نظر عقابی نظروں سے چاروں طرف کا جائزہ لیا اور پھر آگے بڑھ کر زمین سے اٹھتے ہوئے رمضانی کی پسلیوں میں ایک زور کی لات ماری اور وہ بے چارہ ایک بار پھر کراہتا ہوا اچھل کر گر پڑا...... دوسری ٹھوکر چوہدری نے اپنے پیروں میں پڑی رمضانی کی رائفل کو رسید کی تھی۔

''کتے کے بچے! حرامی...... کدھر ہے وہ سور کا تخم...... کدھر گیا ہے وہ؟'' چوہدری فرزند نے غصے سے چیختے ہوئے آگے بڑھ کر رمضانی کو ایک اور ٹھوکر رسید کی۔

''وہ...... وہ پچھلی طرف......'' رمضانی نے کراہتے ہوئے کہا اور چوہدری فرزند کی ایک اور ٹھوکر کھا کر چیختا ہوا بھانے کے غلیظ فرش پر لوٹ پوٹ ہو کر رہ گیا۔ اسی وقت آٹھ دس مسلح افراد بھاگتے ہوئے بھانے میں داخل ہو آئے۔

''کون ہے...... کون تھا......؟ کیا ہوا چوہدری صیب؟''

آگے آگے حیران و پریشان گلشن تھا...... چوہدری فرزند نے اس کے مخاطب کرنے پر تڑپ کر اس کی طرف دیکھا۔ اور دوسرے ہی لمحے ایک ایسا بھرپور تھپڑ گلشن کے منہ پر رسید کیا کہ وہ لڑکھڑا کر رہ گیا۔

''تمہاری...... (ناقابل اشاعت) مجھ سے پوچھ رہے ہو کون تھا؟ کنجری کے بچو! پہرے پر تم لوگ تھے...... تمہارے ہوتے ہوئے کوئی حویلی میں داخل کیسے ہوا؟ کہاں مرے ہوئے تھے تم سب؟''

فرط غیض سے چوہدری فرزند کے منہ سے جیسے جھاگ اڑ رہی تھی۔

''کوئی نہیں آیا چوہدری صیب! ہم...... ہم سب چوکس تھے۔ کوئی پرندہ تک باہر سے اندر حویلی میں نہیں آیا۔''

چوہدری نے آگے بڑھ کر بولنے والے کو یکے بعد دیگرے دو چار تھپڑ رسید کر دیئے۔

''میں پاگل ہوں...... جھوٹ بول رہا ہوں...... تیری...... جاؤ دیکھو ادھر بھانے کے پچھواڑے...... جو بھی تھا اسے پکڑ کر زندہ حالت میں واپس لے کر آؤ...... اگر وہ بچ نکلا تو سب کو الٹا لٹکا دوں گا...... کتوں کے آگے ڈال دوں گا سبھی ہڈحراموں کو...... جاؤ دفع ہو جاؤ...... پکڑو اس حرام کے جنے کو۔''

چوہدری فرزند حلق کے بل دھاڑا اور مسلح افراد فوراً حرکت میں آ گئے۔ چار پانچ افراد عقبی دیوار کی طرف دوڑے اور دیوار پر چڑھتے ہوئے دوسری طرف کود گئے' جبکہ باقی افراد مردان خانے کی طرف دوڑ گئے تھے۔ یقیناً وہ گاڑیوں یا گھوڑوں پر فرار ہونے والے کے تعاقب میں نکلنے کا ارادہ رکھتے تھے۔

چوہدری پلٹ کر دوبارہ مردان خانے کی طرف بڑھ گیا..... پوری حویلی میں ایک ہلچل مچ گئی تھی۔ زنانے مردانے دونوں حصوں کی تمام روشنیاں جل اٹھی تھیں..... کتوں نے بھونک بھونک کر آسمان سر پر اٹھا رکھا تھا۔ وہ مردان خانے میں داخل ہوا ہی تھا کہ سامنے سے چوہدری جمال علی اور جاوید علی کو آتے دیکھ کر رک گیا..... ان کے ساتھ چار چھ مسلح ملازم بھی تھے۔ جمال علی اور جاوید علی کے اپنے ہاتھوں میں پسٹل دکھائی دے رہے تھے اور ان کی شکلیں بتا رہی تھیں کہ وہ نیند سے اٹھ کر دوڑے آ رہے ہیں۔

''کیا ہوا بھاہ جی! کون تھا.....؟ کیا مسئلہ ہے؟'' جمال علی اکبر نے پریشان سے لہجے میں دریافت کیا۔

''کون آیا تھا حویلی میں؟'' چوہدری فرزند نے جیسے اسے جواب دینے کے بجائے ملازموں کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا تو وہ شش و پنج سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔

''میں نے پوچھا ہے کون آیا تھا حویلی میں۔'' چوہدری کی غضبناک دھاڑ پر سبھی جیسے لرز اٹھے۔

''کک کوئی نہیں چوہدری صیب! وہ..... وہ بس نکے چوہدری جی کے دوست آئے تھے رات..... چھوٹے شاہ جی، اور تو کوئی بھی نہیں آیا گیا۔''

ایک ملازم نے بوکھلائے بوکھلائے سے انداز میں کہتے ہوئے جاوید علی اکبر کی طرف اشارہ کیا تو چوہدری فرزند ایک جھٹکے سے رخ بدل کر جاوید علی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ملازم کا جواب گویا چوہدری کے شبے پر مہر تصدیق ثبت کر گیا تھا۔ ساری گتھی جیسے ایک لمحے میں سلجھ گئی تھی۔ سارا معاملہ ایک لمحے میں پوری طرح چوہدری فرزند پر واضح ہو آیا تھا۔

''کیوں جیدے..... کہاں ہے وہ کتے کا پلا؟'' وہ جیسے بولا نہیں، غرایا تھا۔

''وہ تو شاید چلا گیا!'' جاوید گویا ابھی تک نیند کے زیر اثر تھا۔

''شاید.....'' چوہدری فرزند نے زہر خند سے کہا اور دوبارہ اسی ملازم کی طرف دیکھا۔

''تھیں تو..... ہم باہر موجود تھے وہ..... وہ باہر نہیں گیا۔''

''بھاہ جی! وہ اسرار!'' جاوید نے کچھ کہنا چاہا تھا کہ فرزند علی کا زناٹے دار تھپڑ کھا کر اپنی جگہ سے لڑکھڑا گیا۔

''بھاہ جی ہوا کیا ہے، آخر کچھ بتائیں تو؟'' جمال علی فوراً فرزند علی اور جاوید کے درمیان آتے ہوئے بولا، مگر فرزند علی اسے کوئی جواب دینے کی بجائے پلٹ کر تیزی سے زنان خانے کی طرف بڑھ گیا..... اس کا رواں رواں جیسے ایک نادیدہ آگ کی لپیٹ میں آ چکا تھا۔

جاوید علی کا دوست..... چھوٹا شاہ، اسرار حیدر رات جاوید سے ملنے حویلی آیا تھا اور اس کے بعد ملازموں نے اسے واپس جاتے نہیں دیکھا تھا..... جاوید تو اب مردانے سے سوتے میں سے اٹھ کر آ رہا تھا اور فرزند علی نے اب سے کچھ ہی دیر پہلے اپنی آنکھوں سے اسرار کو زنانے سے مردانے کی طرف آتے دیکھا تھا..... وہ ادھر کیا کرنے گیا تھا..... کس لیے گیا تھا؟ کیوں گیا تھا؟ کیوں؟''

یہ کیوں چوہدری فرزند علی کے دماغ میں جیسے چرکے لگائے جا رہا تھا۔ اس کے اندر کی آگ اور وحشت کو مسلسل بھڑکائے جا رہا تھا..... اس سے آگے..... اس کیوں کا جواب بھی چوہدری فرزند علی کے دماغ میں موجود تھا مگر وہ جیسے اس جواب کو دیکھنا سننا نہیں چاہتا تھا۔

وہ وحشت و غصے سے بھرا ہوا زنان خانے میں داخل ہوا تو سامنے سے رائفل اٹھائے چوہدری اکبر علی خان نمودار ہوا..... اس کے سر اور داڑھی کے بال بکھرے ہوئے تھے..... گو کہ آدھے سے زیادہ بال سفید ہو چکے تھے مگر اس کے مضبوط جثے اور جسمانی چستی سے اس کی عمر کا درست اندازہ مشکل تھا۔

''کیا بات ہے فرزند! کیا شور شرابہ ہو رہا ہے!'' اس نے کڑک آواز میں بدمزگی سے پوچھا مگر فرزند علی بغیر کچھ کہے خاموشی سے اس کے برابر سے گزر گیا..... سامنے برآمدے میں بیوی کے ساتھ ساتھ دونوں مائیں بھی کھڑی تھیں مگر فرزند علی سب کو نظر انداز کرتا ہوا سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔

اس بار چوہدری اکبر علی کے ساتھ ساتھ بڑی اماں.....

بڑی چوہدرانی نے بھی اسے پکارا تھا مگر فرزند علی تو جیسے کچھ سننے' دیکھنے کی حالت میں نہیں تھا..... ایک غیظ وغضب اور وحشت ناکی جیسے اس کے روئیں روئیں سے مترشح تھی..... جمال علی اور جاوید علی بھی اس کے پیچھے پیچھے آتے ہوئے چوہدری اکبر علی کے قریب پہنچ آئے تھے..... پسٹل بدستور فرزند علی کے ہاتھ میں تھا اور اس کا رخ سیڑھیوں کی طرف تھا..... یعنی اوپری منزل کی طرف..... اوپری منزل' جہاں نازیہ کا کمرہ تھا۔

''اوئے! بات تو بتا؟'' چوہدری اکبر کا لہجہ کرخت تھا۔

''بھاہ جی! کدھر جا رہے ہیں؟''

''فرزند پتر! بڑی چوہدرانی کے لہجے میں قدرے سنسنی اور تعجب تھا۔

فرزند علی سیڑھیوں تک پہنچنے کے بعد ایک ساتھ دو دو زینے پھلانگتا ہوا اوپر کی جانب بڑھنے لگا تھا۔

''باجی.....'' جاوید نے جیسے لاشعوری طور پر کہا.....

اسکے لہجے میں ایک عجیب سی سرسراہٹ تھی' جمال علی نے ایک نظر اس کی صورت دیکھی پھر جیسے اس کی چھٹی حس اسے حرکت میں لائی اور وہ فرزند کو پکارتا ہوا تیزی سے اس کے پیچھے لپکا..... اتنے میں فرزند علی سیڑھیاں طے کرتا ہوا اوپر پہنچ چکا تھا اور بغیر رکے راہداری میں پلٹ کر نازیہ کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

سادات گھرانے کے متعلق شدید ناپسندیدگی کے جذبات رکھنے کے باوجود اس نے کبھی بھی نازیہ کو ادھر جانے سے منع نہیں کیا تھا بلکہ ماں باپ کے ٹوکنے پر اس نے الٹا ہمیشہ نازیہ کی طرف داری کی تھی..... خود اس پر کوئی پابندی عائد کی تھی اور نہ کسی کو کرنے دی تھی کہ وہ اس کی پیاری اور لاڈلی بہن تھی مگر..... مگر آج اس لاڈلی بہن نے اس کی طرف داری اور لاڈ پیار کا جنازہ نکال کے رکھ دیا تھا..... اس کے اعتماد کو خاک میں رول کے رکھ دیا تھا۔

چوہدری فرزند کی لات پر کمرے کا دروازہ ایک دھماکے کی آواز سے کھلا..... دروازے کے بالکل سامنے ہی نازیہ کسی دہشت زدہ مجسمے کی صورت ساکت کھڑی پھٹی پھٹی آنکھوں سے دروازے ہی کی سمت دیکھ رہی تھی..... چوہدری فرزند کو محسوس ہوا کہ وہ جیسے بالکل اس کے آگے آگے راہداری سے پلٹ کر ابھی کمرے میں واپس آئی ہے۔

اس کا زرد چہرہ اور آنکھوں میں لرزتا خوف جیسے اس کے جرم..... اس کے گناہ کی گواہی دے رہا تھا۔

''کب سے؟'' چوہدری فرزند اس کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑے غراتے ہوئے اس کی طرف بڑھا۔

''کب سے چل رہا ہے یہ سب؟'' وہ بالکل اس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

''کک..... کیا؟'' نازیہ کی ہکلاہٹ پر چوہدری فرزند نے ایک زوردار تھپڑ اس کے منہ پر مارا اور وہ بے اختیار چیختی ہوئی لڑکھڑا کر کمرے کے فرش پر گر گئی۔

''جو پوچھا ہے صرف اس کا جواب دے..... کب سے یہ کھیل کھیلا جا رہا ہے؟'' چوہدری فرزند نے ایک گھٹنا زمین پر ٹکاتے ہوئے اپنے چوڑے ہاتھ میں اس کا گلا دبوچ لیا۔

''ایک آوارہ کتے کے کوٹھی میں گھس آنے پر' میں اس کے ساتھ ساتھ پوشا کو بھی گولی مار کر آ رہا ہوں اور..... یہاں تو نے یہ سب شروع کر رکھا ہے..... چوہدری فرزند علی کی بہن ہوتے ہوئے..... تجھے ایک بار بھی خیال نہیں آیا؟''

چوہدری فرزند علی کی آنکھوں سے ایک کرب انگیز قہر چھلکا پڑ رہا تھا۔ لہجے میں ایک اندھی وحشت غرا رہی تھی۔

''دن کے چانن میں خود جاتی رہی اور رات کی چانی میں اس کتے کو بلا لیا' اپنے ہی گھر میں' اپنے ہی خاندان' اپنے ہی ٹبر کی عزت غیرت سے دشمنی..... شہ رگ پہ وار..... بے غیرت خاندان کی غدار!' فرزند علی کے ہاتھ کی گرفت یکلخت بڑھ گئی..... نازیہ کا دم گھٹ کر رہ گیا..... اس کی دہشت زدہ سفید آنکھیں حلقوں سے ابلی پڑ رہی تھیں۔

اسی وقت کھلے دروازے میں جمال علی اکبر کی صورت دکھائی دی اور اگلے ہی لمحے وہ فرزند علی کو پکارتا برق رفتاری سے آگے بڑھا یا۔

''بھاہ جی! یہ..... یہ کیا کر رہے ہیں؟ کیا ہو گیا ہے آپ کو؟'' اس نے آتے ہی فرزند علی کو عقب سی جھپا ڈالا اور نازیہ کو اس کے شکنجے جیسی گرفت سے چھڑانے کی کوشش

کرنے لگا۔ نازیہ نے دیکھا' دروازے سے جاوید علی کے ساتھ ہی چوہدری اکبر علی خان اندر داخل ہوا تھا۔ اس کے پیچھے ہی بڑی اماں اور بھرجائی الفت بھی بھرا مار کر کمرے کے اندر آ گئیں۔ سبھی اندر کا منظر دیکھ کر ایک ذرا تو ششدر رہ گئے پھر جیسے ایک اضطراری انداز میں آگے بڑھ کر فرزند علی سے لپٹ گئے۔

'بھاہ جی'

''اے فرزند! یہ تو کیا کر رہا ہے..... پاگل ہو گیا ہے؟''

''اوئے؛ بندے کا پتر بن چھوڑ اس کو۔'' چوہدری اکبر علی نے اس کی کلائی پکڑ کر جھٹکے سے نازیہ کی گردن چھڑائی اور جمال علی اور جاوید علی اسے چھاڈال کر ایک ذرا پیچھے لے گئے..... اماں اور بھرجائی فوراً لپک کر نازیہ اور اس کے درمیان آ گئیں۔ نازیہ نے دیکھا' چھوٹی اماں کمرے میں داخل ہوئی اور پھر دروازے کے سامنے ہی وحشت زدہ سی کھڑی رہ گئی۔

''اوئے چھوڑو مجھے..... ہٹ جاؤ پیچھے.....'' فرزند علی نے خود کو چھڑانے کے لیے زور مارا اور ساتھ ہی ایک ذرا آگے ہوتے ہوئے نازیہ کے منہ پر لات مارنے کی کوشش کی مگر نشانہ الفت کا کندھا بنا اور وہ جیسے نازیہ کے اوپر ہی الٹ پڑی..... فرزند علی نے پسٹل والا ہاتھ نازیہ کی طرف سیدھا کیا تو چوہدری اکبر علی فوراً اس کے سامنے آ گیا..... ساتھ ہی اس نے اپنا بایاں ہاتھ فرزند علی کے پستول پر ڈالا اور دائیں ہاتھ کا ایک زوردار طمانچہ فرزند علی کے گال پر رسید کر دیا۔

''اوئے! ہوش پکڑ ذرا..... کس پاگل کتے نے کاٹا ہے تجھ کو..... پہلے منہ سے کچھ پھوٹ۔'' چوہدری اکبر علی نے اس کے جبڑے ہاتھ میں جکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے کہا..... ساتھ ہی اپنی آنکھیں اس کی آنکھوں میں گاڑ دیں..... چوہدری اکبر علی کا تھپڑ فرزند علی کے حواسوں پر طاری جنون کو ایک ذرا منتشر کر گیا تھا۔

''کیا آفت ٹوٹ پڑی ہے' کیوں اس کی جان کا دشمن ہو رہا ہے۔''

''دشمن میں نہیں..... یہ ہو چکی ہے..... ہماری عزت اور غیرت کی..... سامنے سے ہٹ جا ابا! میں اس کمینی چھنال کو نہیں چھوڑوں گا آج..... اوئے! چھوڑو تم دونوں مجھے۔''

چوہدری فرزند علی نے باپ کو جواب دیتے ہوئے دونوں بھائیوں کو جھڑکا اور جھٹکا تھا۔

''فرزند علی.....'' چوہدری اکبر علی جیسے اس کی بات سنتے ہی سلگ اٹھا..... ''کیا بک رہا ہے تو؟''

''اوئے! چھوڑو تم لوگ مجھے۔'' فرزند علی بھائیوں کی طرف متوجہ ہوا۔ اس نے دھکیل کر دونوں بھائیوں کو خود سے پرے کیا تو چوہدری اکبر علی نے آگے بڑھ کر اسے گریبان سے پکڑ لیا۔

''دماغ تو نہیں پھر گیا تیرا..... اپنے لفظوں کا مطلب جانتا ہے تو؟''

'ہاں دماغ پھر گیا ہے میرا..... تو ہٹ جا میرے سامنے سے۔'' فرزند علی نے ایک جھٹکے سے گریبان چھڑایا اور ایک بار پھر بھوکے عقاب کی طرح نازیہ پر جھپٹ پڑا۔ الفت اور نازیہ کے حلق سے بے اختیار چیخیں نکل گئیں۔ فرزند علی نے نازیہ کے بال مٹھی میں دبوچ کر جھٹکا دیا تو وہ اذیت کے مارے بے حال ہو کر رہ گئی۔

''پوچھو اس سے' وہ شاہوں کا چوکر ایہاں کیا کرنے آیا تھا..... کیوں آیا تھا وہ؟''

''فرزند!'' اماں نے جیسے دہائی دی تھی۔

''بھاہ جی۔''

ایک بار پھر سب نے آگے بڑھ کر نازیہ کو چھڑایا' چوہدری فرزند علی تو جیسے ہوش و حواس ہی میں نہیں تھا..... چوہدری اکبر علی اس بار اسے دھکے مارتا ہوا کمرے سے باہر راہداری تک لے آیا۔

چوہدری فرزند علی کے علاوہ باقی سبھی نیند سے اٹھے تھے..... صورت حال کا کسی کو بھی ٹھیک سے علم نہ تھا' البتہ اندازہ سبھی کو ہو چکا تھا۔

'ہوش میں آ فرزند علی.....'' چوہدری اکبر علی نے اسے کندھوں سے تھام کر سخت لہجے میں مخاطب کیا۔

''تیرے غصے اور جنون کا رخ ٹھیک نہیں ہے..... لگام دے اسے..... اس طرح کے معاملے یوں نہیں نمٹائے جاتے..... عقل سے کام لے تھوڑا' اور سوچ کہ کرنے

کا اصل کام کیا ہے اور تو کیا کرنے جا رہا ہے؟''

چوہدری اکبر علی کے لہجے میں زہر اور آنکھوں میں انگاروں کی سی تپش اتر آئی تھی۔

فرزند علی چند لمحے باپ کی سرخ ہوتی آنکھوں میں دیکھتا رہا پھر یک دم پلٹ کر سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا..... چوہدری اکبر علی نے خاموشی سے اسے جاتے دیکھا اور پھر پلٹ کر کمرے میں آ گیا..... نازیہ فرش پر اسی جگہ بیٹھی سسک رہی تھی..... لرز رہی تھی' بڑی چوہدرانی اور الفت اسے سنبھالے ہوئے تھیں..... سبھی کی نظریں چوہدری اکبر علی کے چہرے پر جم گئیں جہاں ایک سنگین اور پتھریلی خاموشی آ جمی تھی..... وہ چند لمحے کھڑا جیسے سرد نگاہوں سے نازیہ کی زرد ہوتی صورت کا جائزہ لیتا رہا پھر دونوں بیٹوں کو اشارہ کرتا ہوا چپ چاپ کمرے سے باہر نکل گیا۔

فرزند علی تھا کہ وہ سیڑھیاں اترتے ہی کسی اندھے طوفانی گھوڑے کی طرح مردان خانے میں پہنچا اور سیدھا پی پراڈو کی طرف بڑھ گیا..... چار پانچ مسلح ملازم اپنے چوہدری کے تیوروں کو سمجھتے ہوئے رائفلیں سنبھالتے بہ عجلت اس کے پیچھے پیچھے لپکے تھے۔

''بیٹھ جاؤ سب!'' فرزند علی نے تحکمانہ انداز میں کہا اور خود اچھل کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا..... پسٹل وہ پہلے ہی دوبارہ کمر سے بندھے ہولسٹر میں ڈال چکا تھا۔

ایک چہرے کی حدت اسے اندر سے جلائے دے رہی تھی..... اور وہ چہرہ تھا اسرار شاہ کا چہرہ..... اس کے پیچھے دو چہرے اور تھے' زوار شاہ اور کرار شاہ کے چہرے..... جو ہمیشہ سے اسے چبھتے آئے تھے..... دونوں ہی بدتمیز اور بددماغ جوان تھے..... جب بھی اور جہاں بھی سامنے آتے تھے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولتے تھے..... دو ٹکے کے ہاڑی اور انداز ایسے جیسے پورے نندی پور کے مالک ہوں..... ان کی گردنوں میں تو جیسے سلاخیں فٹ تھیں۔ یوں سینہ تان کر اور گردن اکڑا کر آس پاس سے چپ کر کے گزر جاتے تھے کہ جیسے زمین کی خدائی ان کے پاس ہو۔

کئی بار چوہدری فرزند علی ان کی ایسی گستاخیوں اور بدتمیزیوں کو نظر انداز کر چکا تھا یہ سوچ کر کہ چلو پورے گاؤں میں ان کی عزت بنی ہوئی ہے تو بنی رہے..... پھر دونوں گھروں کی بچیاں بھی ایک دوسرے کے ساتھ خاصی مخلص تھیں مگر شاہوں نے ایسا نہیں سوچا تھا..... انہوں نے نازیہ کو بہن بچی نہیں سمجھا تھا..... بے غیرتی اور بددیانتی کی حد کر دکھائی تھی انہوں نے۔

لہٰذا اب انہوں نے خود چوہدری فرزند علی پر یہ فرض کر دیا تھا کہ وہ ان کی گردنوں میں ڈلی وہ سلاخیں توڑ کر ان میں پٹے ڈلوائے اور انہیں ان کی اصل اوقات سمجھائے..... چوہدری فرزند علی نے نفرت اور حقارت کے ساتھ کھڑکی سے باہر تھوکا..... مسلح گرگے پچھلے حصے میں سوار ہو چکے تھے۔ مردانے کے دربان پہلے ہی چوہدری کو گاڑی کی طرف بڑھتے دیکھ کر گیٹ کھولے کھڑے تھے..... چوہدری فرزند علی نے گاڑی سٹارٹ کرتے ہوئے آگے بڑھائی اور گیٹ سے باہر نکلتے ہی گاڑی کسی وحشی بھیڑیے کی طرح سید صلاح الدین شاہ کے گھر کی طرف دوڑ پڑی۔

خاموشی اختیار کرتے ہوئے کتے ایک بار پھر اپنی بھیانک آوازوں سے آسمان لرزانے پر اتر آئے۔

نندی پور میں ایک شدید ہنگامہ خیز صبح بیدار ہونے جا رہی تھی۔

❁.....❁.....❁

سید صلاح الدین شاہ کے اٹھتے ہی سردار بی بی کی نیند بھی اکھڑ جایا کرتی تھی۔ وہ صحن سے گزرتے ہوئے بیرونی دروازے کی طرف بڑھتے تو کرار حیدر بھی نیم بیداری کی حالت میں آ جایا کرتا' پھر جب دس پندرہ منٹ بعد مسجد کے اسپیکر سے ان کی آواز بلند ہوتی تو وہ لوگ بستروں پر اٹھ بیٹھا کرتے..... گھر میں معمول کی حرکت شروع ہو جایا کرتی۔

اس صبح بھی سید صلاح الدین اپنے معمول کے مطابق مسجد کے لیے نکلے تھے۔ انہیں گھر سے روانہ ہوئے پانچ چھ منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ کسی نے بیرونی دروازہ اس خوفناک انداز میں دھڑ دھڑایا جیسے قیامت دروازے پہ آ پہنچی ہو۔ سردار بی بی اور کرار حیدر تو پہلے ہی جاگ رہے تھے' حجاب بی بی کی آنکھ بھی کھل گئی۔

''کون ہے اوئے!'' کرار حیدر ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا تھا۔

''شش.....شاہ جی! میں ہوں غلام محمد۔'' ایک ہانپی گھبرائی وحشت زدہ سی آواز سنائی دی۔ کرار حیدر اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھا ہی تھا کہ غلام محمد صحن میں داخل ہوآیا۔ سردار بی بی اور حجاب بھی کمروں سے نکل کر برآمدے میں چلی آئی تھیں کہ نجانے کیا آفت آ گئی ہے۔

''کیا بات ہے چاچا! کیا مسئلہ ہے؟''

''وہ..... وہ..... چھوٹے شاہ جی .....'' غلام محمد کا سانس اس بری طرح پھولا ہوا تھا کہ وہ جملہ بھی مکمل نہ کر سکا۔

''کون.....کیا؟''

''اپنے چھوٹے شاہ جی ..... اسرار پتر مشکل میں ہیں.....بچ..... چوہدریوں کے پانچ چھ بندے بندوقیں لے کر ان کے پیچھے دوڑ رہے تھے.....ادھر.....ادھر نہر کی طرف۔''

غلام محمد کی بات سنتے ہی حجاب بی بی کا تو کلیجہ ہل کر رہ گیا۔ ایک ہی لمحے میں ساری صورتحال اور سنگینی جیسے اس پر منکشف ہوآئی تھی۔

''کیا کہہ رہے ہو چاچا!'' کرار حیدر کو شاید ٹھیک سے سمجھ نہیں آئی تھی۔ اس کے لہجے میں قدرے حیرت اور بے یقینی تھی۔

''خدا کی قسم سچ کہہ رہا ہوں..... میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔''

''اسرار.....اوئے اسرار.....'' کرار حیدر نے گلام محمد سے مزید کچھ کہنے پوچھنے کی بجائے چھت کی طرف منہ اٹھاتے ہوئے اسرار کو پکارا مگر اسے کوئی جواب نہیں ملا۔

''میری بات کا یقین کریں شاہ جی! میں گھر کے باہر ہی چارپائی ڈالے سو رہا تھا۔ گولی چلنے کی آواز پر میری آنکھ کھلی۔ پھر کچھ دیر بعد میں نے چھوٹے شاہ جی کو دیکھا' وہ حویلی کی طرف سے بھاگتے ہوئے آئے اور میرے قریب سے گزر کر نہر کی طرف نکل گئے..... پھر چوہدریوں کے چار پانچ بندے نظر آئے ..... سبھی رائفلیں اور بندوقیں سنبھالے ہوئے تھے۔ میں گھبرا کر سوتا بن رہا اور وہ بھی میری چارپائی کے قریب سے دوڑتے ہوئے چھوٹے شاہ جی کے پیچھے نہر کی طرف چلے گئے تو میں اٹھ بیٹھا.....ضرور کوئی بڑی گڑبڑ ہے شاہ جی! میں تو وہاں سے سیدھا دوڑتا ہوا' یہاں آپ کے پاس آیا ہوں کہ آپ لوگ کچھ کر سکتے ہو تو فوراً کرو.....خدانہ کرے کہیں کوئی.....''

غلام محمد نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا.....کرار حیدر جانتا تھا کہ غلام محمد کا چھوٹا سا کچا گھر چوہدریوں کی حویلی کی عقبی طرف واقع ہے۔ اس کی اس وقت اور اس طرح آمد بھی کسی غیر معمولی بات کا ثبوت تھی مگر..... جو کچھ وہ کہہ رہا تھا وہ کرار حیدر کو شاید ہضم نہیں ہوا جو وہ فوراً پلٹ کر تیزی سے چھت پر جاتی سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔ بات سمجھ میں آنے والی یا یقین کیے جانے والی نہیں تھی مگر جب اپنی آنکھوں سے اس نے اسرار کی خالی چارپائی کو دیکھا تو غلام محمد کے کہے پر پوری طرح یقین ہوآیا.....اب اصل معاملہ کیا تھا اس پر سوچ بچار بعد کی بات تھی.....فوری طور پر تو یہ ضروری ہو گیا تھا کہ اسرار کی مدد کی جائے ..... اسے چوہدریوں کے ڈشکروں سے بچایا جائے .....غلام محمد کے بیان سے اسے اتنا اندازہ تو بخوبی ہو گیا تھا کہ جو بھی ہے .....معاملہ انتہائی سنگین نوعیت کا ہے۔ سردار بی بی اور حجاب اپنی جگہ الگ پتھرائی کھڑی تھیں.....غلام محمد کی ساری بات ان دونوں نے بھی سنی تھی اور سنتے ہی سن ہو کر رہ گئی تھیں۔ سردار بی بی تو سمجھتے ہوئے بھی پوری طرح سمجھنے سے قاصر تھی البتہ حجاب بی بی ساری بات سمجھ چکی تھی اور اسے فوراً ہی چاچا غلام محمد کے کہے پر یقین بھی ہوآیا تھا کیونکہ وہ اس بظاہر انہونے واقع کے پس منظر سے پوری طرح واقف تھی..... وہ جانتی تھی کہ اگر یہ صورتحال بن آئی ہے تو ایسا کیوں ہوا ہے.....اس کے پیچھے اصل وجہ کیا ہے؟

اسے کل رات چھت سے اسرار کی غیر موجودگی کا خیال بھی گزرا..... نازیہ اور اسرار دونوں کے چہرے اس کی نگاہوں میں گھوم گئے۔

کل دن میں اس کے استفسار پر اسرار نے بتایا تھا کہ وہ بابے جلال کے ڈیرے پر وڈی سی آرد یکھنے گیا ہوا تھا..... اب اسے سمجھ آ رہی تھی کہ اسرار نے یقیناً جھوٹ اور غلط بیانی سے کام لیا تھا۔ وہ بابے جلال کے ڈیرے کی بجائے یقینی طور پر نازیہ سے ملنے کل بھی حویلی گیا ہوگا اور کل کی

طرح آج بھی رات اس نے وہیں گزاری ہوگی اور اب ..... واپسی کے وقت کسی طرح نظروں میں آ گیا ہوگا جو چوہدریوں کے کمینے ملازم اس کے پیچھے پڑ گئے تھے..... آگے کی صورت حال کے تصور ہی سے اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے .....جس بات کے ڈر سے وہ نازیہ اور اسرار کو سخت سست سناتی رہتی تھی وہی انہونی بن آئی تھی اور اب ایسے میں کچھ بھی ہوسکتا تھا..... کچھ بھی.....!

''چاچا! تو مسجد جا کے بابا سائیں کو اطلاع دے..... میں نہر کی طرف جاتا ہوں۔''

کرار حیدر نے بہ عجلت سیڑھیوں سے اترتے ہوئے غلام محمد سے کہا اور خود اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

''کرار.....'' سردار بی بی نے سرسراتی آواز میں اسے پکارا مگر اس نے جیسے سنا ہی نہیں ..... وہ تقریباً دوڑنے والے انداز میں اندر گیا اور فوراً ہی واپس نکل آیا..... اسکے ہاتھ میں ریپٹر اور کارتوسوں والی بیلٹ دیکھ کر سردار بی بی اور حجاب دونوں ہی تیزی سے اس کے رستے میں آ گئیں۔

''ویر جی! کدھر جا رہے ہیں آپ!'' حجاب بی بی نے محسوس کیا کہ اس کی آواز میں واضح طور پر ایک لرزش ہے۔

''کرار.....نہیں پتر! نہیں.....رک جا!'' سردار بی بی نے آگے بڑھ کر اسے بازو سے تھام لیا۔ غلام محمد ابھی صحن میں کھڑا تھا۔

''روکیں نہیں ماں جی! جانے دیں مجھے۔'' اس نے بیلٹ کندھے پر ڈالی تو حجاب بی بی نے فوراً بیلٹ دبوچ لی۔

''نہیں ویرے! یہ..... یہ ٹھیک نہیں ہے۔''

''چھوڑ واسے.....ہٹ جاؤ.....'' کرار نے جھٹکے سے بیلٹ چھڑائی پھر جھنجلائے ہوئے انداز میں ہونق بنے کھڑے غلام محمد سے مخاطب ہوا۔

''اوئے چاچا! تو کھڑا کیا دیکھ رہا ہے..... مسجد جا!'' کرار حیدر کے تیور دیکھتے ہوئے غلام محمد فوراً ہی پلٹ کر صحن سے نکلتا چلا گیا۔

''ماں جی! آپ ہٹ جائیں سامنے سے۔'' کرار بازو چھڑاتے ہوئے تیزی سے بیرونی دروازے کی طرف بڑھا تو دونوں ماں بیٹی پھر آگے بڑھ کر اس سے لپٹ گئیں۔

''کدھر جا رہا ہے تو..... کیا کرنے جا رہا ہے؟''

''ماں جی کیا ہو گیا ہے آپ کو؟''

''بس تو..... تو باہر نہیں جائے گا..... اندر چل میں..... میں کہہ رہی ہوں اندر چل..... یہ مجھے پکڑ!'' سردار بی بی نے ہاتھ ریپٹر کی طرف بڑھایا تو کرار نے بازو فضا میں بلند کر لیا۔

''ماں جی! اسرار خطرے میں ہے مجھے جانے دیں۔''

''نہیں.....تو کہیں نہیں جائے گا..... اپنے بابا کو آنے دے..... وہ..... وہ دیکھ لیں گے..... سنبھال لیں گے سارا معاملہ۔''

''ویر جی! خدا کے لیے آپ نہیں جائیں۔'' حجاب بی بی کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

''بھلا نہ بن پتر! ہوش کر۔''

''ہوش آپ لوگ کریں..... کیا ہو گیا ہے آپ کو؟'' کرار حیدر جیسے بے بسی سے چیخ اٹھا۔

''بس تو اپنے بابا کو آنے دے۔''

''بہت دیر ہو جائے گی ماں جی! بہت دیر ہو جائے گی..... کیوں نہیں سمجھ رہے آپ لوگ جانتے نہیں کیا..... چوہدری جانوروں کے ٹولے سے تعلق رکھتے ہیں..... پاگل کتوں والے دماغ ہیں سب کے..... مار ڈالیں گے وہ اسرار کو..... پتر کی لاش دیکھنا چاہتی ہیں کیا؟''

وہ پھٹ پڑا تھا..... اس کے بعد دونوں ماں بیٹی اسے روکتی رہ گئیں مگر کرار حیدر اپنا آپ چھڑا کر دروازے سے باہر نکل گیا..... وہ دونوں عقب سے اسے پکارتی رہیں مگر کرار باہر نکلتے ہی نہر کی طرف دوڑتا چلا گیا۔ چھوٹے بھائی کی سلامتی کی فکر کے علاوہ اور کسی بات کی جیسے اسے کوئی پرواہ ہی نہیں رہی تھی۔

سردار بی بی لرزتی ٹانگوں کے ساتھ صحن میں بچھی کرار حیدر کی چارپائی پر بیٹھ گئی۔ اس کی پریشان صورت پر زردی اتر آئی تھی اور آنکھوں میں آنے والے لمحات کی دہشت ..... اچانک ٹوٹ پڑنے والی اس افتاد نے جیسے اس کے وجود کی ساری توانائی ہی سلب کر لی تھی۔

''یا اللہ رحم..... رحم میرے مالک! میرے بچوں کی

حفاظت کرنا میرے مولا۔''

اس کے ہونٹوں سے بے ساختہ اپنے بچوں کے لیے دعائیں پھوٹ پڑیں۔ حجاب بی بی نے فوراً اس کے برابر بیٹھتے ہوئے اس کے گرد بازو لپیٹ دیا۔

''حجاب..... پتری مجھے پانی پلا 'میرا دل ڈوبا جارہا ہے۔ خدا..... خدا خیر کرے۔''

''خدا نے چاہا تو سب ٹھیک ہوجائے گا ماں جی! آپ حوصلہ رکھیں۔ میں پانی لاتی ہوں۔'' وہ اٹھ کر فوراً برآمدے میں رکھے مٹکے کی طرف بڑھ گئی..... اسے احساس ہوا کہ اس کا کیا جملہ محض طفل تسلی کی حیثیت رکھتا ہے..... چوہدریوں کی طاقت اور فرعونیت کوئی ڈھکی چھپی بات تو تھی نہیں..... ان کے سارے کارندے بھی اول درجے کے وحشی اور بدمعاش تھے اور چاچا غلام محمد کے بقول ان میں سے چار پانچ مسلح بدمعاش اسرار کے پیچھے تھے اور اب ویر جی بھی مسلح ہوکر گھر سے نکل گئے تھے..... ٹکراؤ یقینی تھا اور اس ٹکراؤ کا ممکنہ نتیجہ کیا ہوسکتا تھا..... یہ وہ دونوں ماں بیٹی ہی سوچنا نہیں چاہتی تھیں..... بس دعائیں تھیں اور وہ ان دونوں ہی کے دلوں کی گہرائیوں سے اٹھنے لگی تھیں۔

اچانک ایک گاڑی کی آواز سنائی دی اور وہ آواز عین ان کے دروازے کے سامنے آکر ایک جھٹکے سے رک گئی۔ ایک شدید خدشے کے زیر اثر دونوں کے کلیجے دھک سے رہ گئے..... حجاب بی بی گلاس میں پانی لے کر صحن کی طرف آرہی تھی کہ بیرونی دروازے سے چھ سات بندے جیسے ایک ساتھ بھرمار کر اندر گھس آئے۔ آگے آگے سرتاپا غضب بنا ہوا چوہدری فرزند علی تھا اور اس کے پیچھے خطرناک صورتوں والے اس کے پالتو بدمعاش..... گلاس حجاب بی بی کے ہاتھ سے نکل کر اس کے پیروں میں گرا اور وہ خود جیسے اپنی جگہ پتھرا کر رہ گئی۔ آنے والوں کا انداز اور تیور خود چیخ چیخ کر ان کی نیتوں کی کہانی سنا رہے تھے۔

اندر گھستے ہی چوہدری فرزند علی تیر کی طرح سیدھا حجاب کی طرف بڑھا تو سردار بی بی تڑپ کر اپنی جگہ سے اٹھی اور حجاب کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

''کک..... کیا بات ہے فرزند پتر..... کیا..... کیا ہوا ہے؟'' وہ بری طرح ہکلائی تھی۔ چوہدری فرزند نے کوئی جواب دینے کی بجائے اسے زور کا دھکا دیا اور حجاب بی بی کو چٹیا سے دبوچ کر اس بے دردی سے کھینچا کہ وہ بے اختیار درد کے مارے چیخ اٹھی۔

سردار بی بی فوراً لپک کر دوبارہ آگے بڑھی اور چوہدری فرزند کے الٹے ہاتھ کا تھپڑ کھا کر چکرا سی گئی۔

''تجھے ہمارے ساتھ چلنا ہے..... سمجھی تو.....!''

چوہدری نے قہر آلود لہجے میں حجاب بی بی سے کہا اور پھر تقریباً گھسیٹنے والے انداز میں اسے بیرونی طرف کو کھینچ لے گیا..... سردار بی بی نے دوبارہ آگے بڑھ کر حجاب کو بچانے چھڑانے کی کوشش کی مگر چوہدری کے بندوں نے اسے فوراً ہی دبوچ کر ایک طرف پٹخ دیا۔

''کیا کر رہے ہو..... کہاں لے جارہے ہو میری بچی کو..... ہائے میری بچی..... میری حجاب..... شاہ جی..... ارے کوئی بچائے میری بچی کو۔'' سردار بی بی ایک بار پھر واویلا مچاتی ہوئی اٹھ کر آگے بڑھی تھی کہ ایک ڈشکرے نے رائفل کا بٹ اس کی کنپٹی پر رسید کیا اور وہ لڑکھڑا کر دھڑام سے صحن کے کچے فرش پر ڈھیر ہوگئی..... حجاب نے چیخ کر ماں کو پکارا مگر اس بار وہ اٹھی نہیں..... بس فرش پر پڑی پھڑکتی رہی۔

چوہدری فرزند حجاب کو بالوں سے دبوچے بے رحمی سے گھسیٹتا ہوا باہر گلی میں لے گیا۔ تبھی حجاب نے دیکھا کہ ساتھ والی خالہ ثریا کا دروازہ کھلا ہوا تھا..... وہاں ایک یا دو افراد موجود تھے مگر چوہدری اور اس کے گرگوں کے باہر گلی میں آتے ہی دروازہ فوراً بند ہوگیا..... سامنے چاچے نذیر کے دروازے پر بھی اسے اسی طرح کا شبہ سا گزرا تھا..... وہ چیختی چلاتی رہی لیکن آس پڑوس والے تبھی جیسے اپنے اپنے گھروں میں مردہ پڑے تھے۔ کوئی باہر نہیں نکلا..... کسی نے اس کی چیخ وپکار پر کان نہیں دھرے..... اس کی اس چیخ وپکار کے علاوہ چاروں طرف ایسی خاموشی تھی جیسے وہ زندہ لوگوں کی کوئی بستی نہیں بلکہ قبرستان ہو..... ہاں البتہ اس کے اس شور شرابے پر اس کے اپنے ہی گھر کے صحن میں بندھی بکریوں نے ضرور چیخنا شروع کردیا تھا..... یوں جیسے وہ اس سارے ظلم کے خلاف احتجاج کررہی ہوں!

ٹھیک اسی وقت دور کہیں گولی چلنے کی آواز بلند ہوئی تو چوہدری فرزند ٹھٹک کر رک گیا..... فائر دوبارہ ہوا اور پھر جیسے دوطرفہ فائرنگ شروع ہوگئی۔ آواز گودور سے آرہی تھی پھر بھی یہ اندازہ بخوبی ہو رہا تھا کہ فائرنگ کی یہ آواز نہر کی سمت سے بلند ہو رہی ہے۔ چوہدری ایک ذرا رکا رہا پھر حجاب کو اٹھا کر زبردستی گاڑی میں ڈالا گیا اور ان لوگوں کے سوار ہوتے ہی گاڑی ایک جھٹکے سے دوڑ پڑی۔ حجاب بی بی بدستور چلا رہی تھی کہ اچانک چوہدری فرزند نے اس کا گلا دبوچ لیا۔

''چپ کر جا کتیا! ورنہ ابھی کے ابھی یہیں گلا گھونٹ کر مار ڈالوں گا تجھے۔''

گرفت اتنی سخت تھی کہ حجاب بی بی کے حلق سے خرخراہٹ کی آوازیں خارج ہونے لگیں۔ وہ پشت کے بل گاڑی کے فرش پر پڑی تھی۔ چوہدری کا ایک پاؤں اس کے پیٹ پر تھا اور دوسرا کلائی پر..... دائیں ہاتھ میں اس نے بدستور حجاب بی بی کی چٹیا دبوچ رکھی تھی اور بائیں ہاتھ سے اس کا گلا دبا رکھا تھا..... حجاب بی بی کوشش کے باوجود نہ تو اپنی چٹیا چھڑا سکی اور نہ ہی گلا..... اس کا دم گھٹا جا رہا تھا' دماغ پر اندھیرا سا چھانے لگا..... اس کی پھٹی پھٹی دہشت زدہ آنکھیں چوہدری کے خونخوار چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

''اب اگر آواز نکالی تو ذبح کر کے پھینک دوں گا.....'

چوہدری نے کسی درندے کی طرح غراتے ہوئے ایک غلیظ گالی دی اور پھر حجاب کا گلا چھوڑ دیا۔

سانس کی آمد و رفت بحال ہوتے ہی اس کے ذہن پر چھاتے اندھیرے چھٹنے لگے اور وہ چوہدری کے پیروں تلے بے دم سی پڑی لمبے لمبے سانس لینے لگی..... گاڑی گاؤں کی تاریک اور خاموش گلیوں میں خاک اڑاتی حویلی کے مردان خانے میں جا رکی تو حجاب بی بی کو انتہائی بے رحمی سے باہر گھسیٹ لیا گیا..... مردان خانی کے وسیع و عریض احاطے میں سامنے ہی ایک بڑی سی چارپائی پر چوہدری اکبر علی خان یوں بیٹھا ہوا تھا جیسے انہی لوگوں کے انتظار میں بیٹھا ہو..... حجاب بی بی کو یہاں کچھ اور مسلح افراد بھی دکھائی دیئے۔

دو چار رائفل بردار چوہدری اکبر علی کی چارپائی کے دائیں بائیں بھی کھڑے تھے۔ چوہدری فرزند اسے چٹیا سے دبوچے آگے بڑھا اور چوہدری اکبر علی کے سامنے زمین پر دھکیل دیا..... حجاب بی بی لڑکھڑاتی ہوئی منہ کے بل گری تھی۔ گھٹنا زمین سے ٹکرایا تو اس کے منہ سے ایک درد بھری کراہ خارج ہوئی' بالوں کے آزاد ہوتے ہی خون کے شدید دباؤ نے اس کی کھوپڑی کے اندر جیسے ٹھوکریں برسانا شروع کر دیں۔ تکلیف اور ذلت کی انتہا درجہ گھٹن نے اسکے اعصاب شل کر ڈالے تھے..... دوپٹہ اور چپل پتا نہیں کب اور کہاں اس کے وجود سے الگ ہو گئے تھے..... وہ چوہدریوں اور ان کے بدمعاشوں کے درمیان ننگے سر اور ننگے پاؤں زمین پر سر جھکائے بیٹھی سسک رہی تھی..... وہ جسے کبھی گھر میں کسی نے سخت لہجے میں پکارا تک نہیں تھا..... گھر بھر کی لاڈلی اور چہیتی اس وقت درندہ نما انسانوں کے گھیرے میں..... ان کے رحم و کرم پر پڑی تھی..... صرف چند منٹوں میں زندگی کا نقشہ کیا سے کیا صورت اختیار کر گیا تھا..... ابھی کچھ ہی دیر پہلے وہ اپنے بستر پر پڑی کیسے مزے اور سکون سے سو رہی تھی اور اب..... چند ہی منٹوں میں کیسے سب کچھ غارت ہو گیا تھا..... وہ کہاں سے کہاں اور کس حال کو پہنچ گئی تھی..... سب کچھ اتنی برق رفتاری سے وقوع پذیر ہو گزرا تھا کہ اس کے حواس اس سب کو قبول ہی نہیں کر پا رہے تھے..... اسے یہ سب کسی بھیانک خواب کا حصہ معلوم ہو رہا تھا..... ایک بھیانک خواب کا ایسا کرب ناک اور ذلت آمیز حصہ جس کا کہ حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہ ہو۔

کتنی ہی وحشیانہ اور بے رحم نظریں اسے اپنی وجود میں چبھتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ اسکے اردگرد موجود افراد میں سے ابھی کوئی کچھ بولا نہیں تھا کہ نندی پور کی فضائیں اچانک سید صلاح الدین شاہ کی آواز سے گونج اٹھیں۔

''چوہدری اکبر علی! یہ تم لوگوں نے ٹھیک نہیں کیا۔''

حجاب بی بی کے ساتھ ساتھ وہاں موجود سبھی افراد چونک پڑے تھے..... روز اس وقت سید صلاح الدین کی آواز اذان کی صورت نندی پور کے کچے پکے مکانوں میں بیداری کی لہر دوڑایا کرتی تھی لیکن آج وہ آواز غیر متوقع طور پر کسی اور ہی صورت بلند ہوئی تھی۔

''تم لوگوں نے انتہائی اوچھی اور غیر انسانی حرکت کی ہے۔'' مسجد کے لاؤڈ اسپیکر سے ان کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

''اگر میرے کسی بچے سے کوئی غلطی..... کوئی جرم سرزد ہوا تھا تو اس کے انصاف کا یہ کوئی طریقہ نہیں..... تم لوگوں نے اخلاق' قانون اور شریعت..... تینوں کی توہین کی ہے..... یاد رکھنا اگر میرے کسی بھی بچے کو کوئی نقصان پہنچا تو پورا گاؤں سن رہا ہے کہ اس کی ذمہ داری تم پر ہوگی..... ''زواز' کرار' اسرار'' اب وہ اپنے بیٹوں سے مخاطب تھے ..... ''تم تینوں میری بات دھیان سے سن لو..... چوہدریوں نے ہمارے گھر پر شب خون مارا ہے..... تمہاری ماں جی شدید زخمی حالت میں گھر پڑی ہے اور ہم لوگوں کی عزت..... ہماری غیرت چوہدریوں کے رحم وکرم پر..... پتر جی! میں چوہدریوں کی حویلی جارہا ہوں..... تم لوگ قانون کو اپنے ہاتھ میں نہیں لینا..... میں اگر مر جاؤں تو صرف اتنا یاد رکھنا کہ تمہاری طرف سے کہیں کوئی زیادتی یا ناانصافی نہ ہو..... البتہ اپنی عزت' غیرت اور خودداری کا تحفظ آخری سانس تک تمہارے پیش نظر رہنا چاہیے..... اللہ نگہبان۔''

حجاب بی بی نے اپنے بابا سائیں کی آواز میں جذباتی دباؤ کی لرزش محسوس کی' یقیناً وہ ضبط کی آخری حدوں کو چھو رہے تھے۔

''اپنی عزت' غیرت اور خودداری کا تحفظ آخری سانس تک تمہارے پیش نظر رہنا چاہیے۔'' وہ خوب اچھی طرح سمجھ رہی تھی کہ عزت' غیرت کے تحفظ سے ان کی کیا مراد ہے۔ وہ اس کے بھائیوں کو تاکید کررہے تھے کہ بے شک جان سے جانا پڑے..... مگر اپنی بہن کی حفاظت کرنا..... اس کی آبرو کے لیے اگر تمہیں مرنا بھی پڑے تو دریغ مت کرنا..... اس کی آنکھوں سے بہنے والے آنسوؤں میں تیزی آ گئی..... وہ جانتی تھی کہ جیسے ہی اس کے بھائیوں کو اس سانحے کی خبر ملے گی وہ ہر بات سے بے پرواہ و بے نیاز ہو کر حویلی پر ٹوٹ پڑیں گے اور اب انہیں اطلاع مل چکی تھی..... ان کے اپنے بابا سائیں کی زبانی..... مزید ہنگامے اور خرابی کے آثار بن آئے تھے ..... یقینی طور پر اس کے غیرت مند بھائی مزید کچھ ہی دیر میں مرنے یا مار دینے کی نیت سے یہاں پہنچنے والے تھے..... خون خرابہ ہونا اب ناگزیر ہو آیا تھا۔

فضا میں ایک ذرا گہری خاموشی نے سانس لیا پھر مسجد کے اسپیکر سے سید صلاح الدین کی آواز دوبارہ بلند ہوئی۔ اب وہ اذان دے رہے تھے..... انتہائی پرسوز آواز میں ..... گویا یہ ان کی آخری اذان ہو..... جیسے..... جیسے وہ عرش معلیٰ پر براجمان خدا کو پکار رہے ہوں..... اسے اپنے گھر پر ٹوٹ پڑنے والی آفت کا احوال سنا رہے ہوں!

حویلی کے مردان خانے میں ایک سنسنی اتر آئی تھی۔ وہاں موجود سبھی افراد متفسرانہ انداز میں ایک دوسرے کی صورتیں تکنے لگے..... شاید کسی کو بھی شاہوں کے ہاں سے اس طرح..... اس طریقے کے ردعمل کی توقع نہیں تھی۔

چوہدری اکبر علی کی بوڑھی اور مکار آنکھیں پرسوچ انداز میں سکڑ گئیں..... چند لمحوں کے لیے چوہدری فرزند بھی جیسے ان اعلان نما باتوں کے اثرات ونتائج کے حوالے سے الجھ کر رہ گیا..... پھر اچانک جیسے اس پر کوئی جنون اتر آیا اور وہ آگے بڑھ کر حجاب بی بی پر ٹوٹ پڑا..... اس نے حجاب کو ٹھوکروں پر رکھ لیا تھا۔

''تم لوگ کچھ بھی کرو..... وہ جائز اور درست ہے..... اخلاقی' قانونی اور شرعی ہے..... کیوں ..... شریعت تو تمہارے گھر کی کھیتی ہے نا! اخلاق' قانون' انصاف کی بات کرتا ہے خبیث بڈھا..... سمجھ کیا رکھا ہے تم لوگوں نے ..... سب کی بوٹیاں کر کے کتوں کو نہ کھلا دیں تو کہنا..... آنے تو دے ذرا ان سور ماؤں کو۔''

وہ غصے اور جنون میں بول رہا تھا اور حجاب بی بی کو پیٹ رہا تھا اور وہ معصوم جان اس کے ٹھڈے ٹھوکروں میں زمین پر ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہی تھی..... ہزار ضبط کے باوجود اس کے حلق سے چیخیں نکل رہی تھیں..... وہ رو رہی تھی..... چلا رہی تھی مگر چوہدری فرزند علی غصے اور وحشت کے ہاتھوں جیسے پاگل ہو چکا تھا۔

''پورا گاؤں سن رہا ہے..... تو؟ گاؤں کو سنا کے کیا حاصل کرلے گا تیرا باپ..... کیا سمجھتا ہے وہ' گاؤں والے اس کے ساتھ تیری مدد کو آئیں گے' چھڑا لے جائیں گے

تجھے..... جو بھی آئے گا اسے چیر کر حویلی کے باہر لٹکا دوں گا میں اور تجھے..... تجھے تو میں تیرے بھائیوں کے سامنے ننگا نچاؤں گا' تیرا وہ بھائی..... کتے کا پلا اسرار..... اسے تو میں تڑپا تڑپا کر اپنے ہاتھوں سے جہنم رسید کروں گا..... اس کے سامنے تجھ پر کتے چھڑوں گا..... سمجھ کیا رکھا ہے اس حرام کے جنے نے..... چوہدریوں کے گھر میں گھس کر ان کی عزت سے کھلواڑ کرے گا اور اپنی عزت محفوظ رہے گی اس کی..... ابھی کچھ ہی دیر میں میرے بندے ڈنڈا ڈولی کر کے لائیں گے اسے..... اس کے سامنے تیری عزت و آبرو کی دھجیاں اڑاؤں گا میں..... حرامی کتے' سالے.....''

چوہدری فرزند کے منہ سے جیسے مارے غصے کے جھاگ اڑ رہی تھی..... شاید وہ ابھی حجاب کو مزید تشدد کا نشانہ بناتا کہ چوہدری اکبر علی نے آگے بڑھ کر اسے بازو سے تھاما اور تقریباً زبردستی گھسیٹ کر اندرونی حصے کی طرف لے گیا۔

حجاب بی بی کے ساتھ جتنا ناروا سلوک ہو چکا تھا اس نے اس بے چاری کو ادھ موا کر ڈالا تھا۔ وہ وہیں زمین پر ٹوٹی بکھری سی پڑی رہ گئی..... اس میں اتنی سکت بھی نہیں تھی کہ وہ اپنے شکستہ وجود کو سمیٹ کر اٹھ بیٹھتی..... چوہدریوں کے مشلّح گرگے اس کے اردگرد موجود تھے جن کی ہوسناک نگاہوں کی تپش اس کے ابتر وجود کی پور پور پر سرسرا رہی تھی۔

نجانے چوہدری اکبر علی اور فرزند علی کے درمیان اندر کیا بات چیت ہوتی رہی..... ہاں یہ ہوا کہ کچھ دیر بعد جب وہ دونوں واپس آئے تو چوہدری اکبر علی کے اشارے پر حجاب بی بی کے نیم مردہ وجود کو گھسیٹ کر حویلی کے کسی کمرے میں لے جا پھینکا گیا..... کمرے میں مکمل طور پر تاریکی تھی' قدرے حبس اور گھٹن بھی تھی..... حجاب بی بی کے حواس اس قدر مختل تھے کہ وہ ٹھیک سے سوچنے سمجھنے اور محسوس کرنے کے بھی قابل نہ تھی۔ اسے جہاں لا کر ڈالا گیا وہ بے سدھ سی وہیں پڑی رہی۔ ذہن تھا کہ جیسے کسی اندھے کنویں میں غوطے کھا رہا تھا۔

اس نے اندھیرے میں دیکھنے کی کوشش کی مگر ہوش و حواس بصارت کی طرف مرتکز نہ ہو پائے..... کنپٹیوں اور پپوٹوں میں شدید درد کی لہریں سی تڑپیں اور پھر اس کے اطراف میں پھیلا اندھیرا اس کے دماغ میں بھرتا چلا گیا' اور وہ خود بھی جیسے تحلیل ہوتی ہوئی اس اندھیرے کا حصہ بن گئی۔ پتا نہیں وہ نیند تھی' غشی کی کوئی حالت تھی یا پھر بے ہوشی کی کیفیت..... بہرحال وہ ذہنی و جسمانی' ہر طرح کی تکلیف و اذیت سے غافل ہو گئی تھی۔

غفلت انگیزی کی اس حالت نے کتنی دیر اسے اپنی آغوش میں چھپائے رکھا' اس حوالے سے وہ کوئی حتمی رائے تو قائم نہ کر سکی البتہ اندازہ اسے یہی ہوا تھا کہ وہ محض چند منٹوں کے لیے اپنے ہوش و حواس سے محروم رہی ہے' کیونکہ جب اسے ہوش آیا تو کمرے میں بدستور وہی گہرا اندھیرا بھرا ہوا تھا..... ایسا گاڑھا اور گھپ اندھیرا کہ وہ اپنا آپ تک دیکھنے سے قاصر تھی..... کچھ دیر تک تو وہ بالکل بے حس و حرکت اپنی جگہ پڑی رہی' کسی لاش..... کسی مردے کی طرح ساکت..... شاید اسے اپنے زندہ ہونے پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

پورا وجود کسی پیپ زدہ پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا..... سر کی کھال اکڑی ہوئی تھی..... دماغ اندر سے ایک جکڑن کا شکار تھا اور جسم کے مختلف حصوں میں ٹیسیں کلبلا رہی تھیں..... بدن کی اس دردناک خستہ حالی نے اسے یقین کر لینے پر مجبور کر دیا کہ ابھی وہ زندہ ہے..... جسم و جاں کا رشتہ ابھی برقرار ہے..... سانسوں کی نازک ڈور ابھی ٹوٹی نہیں ہے۔

اس نے حرکت کی کوشش کی تو بے اختیار کراہ کر رہ گئی..... وجود میں ایک ساتھ درد کی کئی لہریں دوڑ گئی تھیں۔ ایڑیوں اور ٹخنوں میں ہونے والی جلن نے اسے احساس دلایا کہ ان کی کھال چھلی ہوئی ہے..... دائیں گھٹنے' بائیں کولہے' کہنی اور دائیں ہاتھ کی پشت میں بھی ایسی ہی جلن سلگ رہی تھی..... پسلیاں' کمر اور کندھے بھی بری طرح دکھ رہے تھے..... جسمانی حالت زار جو بھی تھی..... کچھ دیر پہلے کی غشی نما نیند یا بے ہوشی کی کیفیت اس کی ذہنی حالت کو کافی حد تک بہتری کی طرف لے آئی تھی۔ دماغ کم از کم سوچنے سمجھنے کے قابل ہو آیا تھا۔ اتنا وحشیانہ تشدد..... اتنی توہین اور ذلت اٹھانے کے بعد بھی وہ زندہ تھی.....

ہوش حواس ٹھیک کام کر رہے تھے..... یہ بات اس کے لیے حیرت و بے یقینی کے ساتھ ساتھ دکھ اور افسوس کا باعث بھی تھی..... ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ وہ مر جاتی..... ریزہ ریزہ ہو کر بکھر جاتی..... اور کچھ نہیں تو اپنے حواس ہی گنوا بیٹھتی..... پاگل ہو جاتی لیکن ایسا کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ ذلت و اذیت کی آخری حدوں سے ہو گزرنے کے باوجود بھی وہ زندہ تھی..... نا صرف زندہ تھی بلکہ اپنے ہوش و حواس میں بھی تھی..... اس کا ذہنی توازن بالکل درست تھا شاید..... شاید ابھی قدرت کو اس کا مزید امتحان مقصود تھا..... ابھی کوئی اور سزا اور عذاب جھیلنا باقی تھا۔

اس کے دماغ میں چوہدری فرزند کا زہریلا لہجہ پھنکارا۔

''تجھے تو میں تیرے بھائیوں کے سامنے ننگا نچاؤں گا..... تیری عزت و آبرو کی دھجیاں اڑاؤں گا میں۔'' ایک کرب انگیز خوب اس کی روح تک کو لرزا گیا..... وہ اپنے بدن کی تمام قوت کو مجتمع کر کے بے اختیار کراہتی ہوئی اٹھ کر بیٹھ گئی..... اس کے وجود کا رواں رواں سنسنا اٹھا تھا..... اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر بغور اپنے اطراف میں دیکھنے کی کوشش کی مگر آنکھوں کو کچھ بھائی نہیں دیا۔ اسے خوف محسوس ہوا کہ شاید وہ اپنی بینائی گنوا بیٹھی ہے۔ دونوں ہاتھ اضطراری انداز میں چہرے کی طرف اٹھے..... اس نے چھو کر ٹٹول کر دیکھا..... آنکھیں چہرہ کوئی تکلیف..... کوئی زخم نہ تھا..... اس نے بیٹھے بیٹھے زمین کو ٹٹولا..... کچا فرش تھا..... کمرے کی فضا میں حبس اور گھٹن کے علاوہ ایک ہلکی ہلکی نامانوس بو بھی رچی ہوئی تھی۔ وہ فرش کو اندھوں کی طرح ٹٹولتی ہوئی آہستہ آہستہ ایک طرف کو سرکنے لگی..... چند فٹ سرکنے گھسٹنے کے بعد وہ ایک دیوار کے قریب پہنچ گئی۔ سانس اتنے ہی سے پھول گیا تھا۔ اس نے دیوار کے ساتھ ٹیک لگالی۔ جسم سے اٹھتی ٹیسوں کو برداشت کرنے کے لیے اس نے ہونٹ سختی سے بھینچ رکھے تھے۔ دیوار سے ٹیک لگا کر اس نے سننے کی کوشش کی مگر اس کی سماعت تک کسی قسم کی کوئی آواز نہ پہنچی..... گھور تاریکی اور گہری خاموشی کے علاوہ اس کے راد گرد کچھ نہیں تھا..... کوئی اندازہ نہیں تھا کہ یہ زندان خانہ حویلی کے کس حصہ میں واقع ہے..... باہر کی صورت حال کیا ہے..... اس بات کا تو اسے پورا یقین تھا کہ اذان کے بعد بابا سائیں سیدھے حویلی آئیں گے یا زیادہ سے زیادہ جماعت کراتے ہی وہ حویلی کا رخ کریں گے..... بھائیوں کا بھی جلد از جلد پہنچ آنا یقینی تھا..... اسے ماں جی کا خیال آیا..... انہیں الفل کی ضرب کھا کر گرتے اور تڑپتے ہوئے دیکھا تھا اس نے اور پھر اپنے بابا سائیں کی زبانی اسے معلوم ہوا تھا کہ ماں جی شدید زخمی ہیں۔ دل پر ایک گھونسہ سا لگا اور بے اختیار اس کی آنکھیں چھلک پڑیں۔

''یا اللہ! تو ہم سب پر اپنا کرم فرما..... کوئی غلطی کوتاہی یا جانے انجانے میں ہم سے کوئی گناہ سرزد ہوا ہے تو معاف فرما..... اے غفور و رحیم! قادر مطلق! رحم کر..... ہم سب کو اپنی حفظ و امان مین رکھ..... ایسے امتحان اور آزمائش سے بچا جسے سہنے کی سکت ہم ناتواں لوگوں میں نہیں ہے..... اے محافظ و نگران' پاک ذات' عزت کی زندگی دے اور عزت کی موت مقدر کر..... مزید ذلت و رسوائی سے محفوظ رکھ..... یا پھر موت دے دے..... بے شک تو زبردست اور طاقت و اختیار والا ہے..... تیری یہ بندی تجھی سے مدد مانگتی ہے اور تیری ہی پناہ چاہتی ہے..... تیرے سامنے کس کی مجال کہ دم مارے..... سب تیرے ہی قبضہء قدرت میں ہے..... سب معجزے سب کرشمے تیرے ہی اختیار میں ہیں۔ تو اپنے پیاروں کے صدقے بہتری اور سلامتی کے اسباب پیدا فرما یا پھر ذلت کی زندگی کے بجائے عزت کی موت سے سرفراز فرما' میرے مالک!''

وہ دیوار کے سہارے سر جھکائے بیٹھی سسکتی رہی اور خدا کے حضور گڑگڑاتی رہی..... وقت دھیرے دھیرے گزرتا رہا..... خاموشی اور اندھیرا بدستور جوں کا توں برقرار رہا..... کسی طرف سے کوئی آہٹ..... کوئی آواز بلند نہ ہوئی..... روشنی کی کوئی مدھم سی کرن بھی کہیں نہ سرسرائی تو ایک عجیب طرح کے خوف اور اضطراب نے اس کی نسوں میں کلبلانا شروع کر دیا..... اس کے اندازے کے مطابق تو اتنا وقت گزر چکا تھا کہ اب تک تو سورج کو بھی ابھر آنا چاہیے تھا جبکہ اس کے اطراف ہنوز وہی گہری تاریکی پر پھیلائے ہوئے تھی۔ ضرور کوئی شدید گڑبڑ تھی..... یہ

تو سوچنا ہی حماقت اور جہالت کی بات تھی کہ نظام فطرت تلپٹ ہوکر رہ گیا ہے..... آج سورج ہی طلوع نہیں ہوا..... ہاں یہ عین ممکن تھا کہ سورج کی روشنی اس قید خانے تک نہیں پہنچ پاتی..... ممکن تھا کہ یہ جگہ..... یہ قید خانہ حویلی کے نیچے کسی تہہ خانے کی صورت وجود رکھتا ہو..... اسے یہاں کی گھٹن، حبس اور نامانوس بو کا کچھ اور شدت سے احساس ہونے لگا۔ یقیناً بات کچھ ایسی ہی تھی یا..... یا پھر..... یا پھر..... بے اختیار اس کے ہاتھ ایک بار پھر آنکھوں کو ٹٹولنے لگے..... اسے یہ خیال بھی آیا کہ اس کی بے ہوشی وقتی اور لمحاتی نہیں تھی..... وہ اچھا خاصا وقت بے ہوشی کی حالت میں گزار چکی ہے، شاید کئی گھنٹے..... یا پھر سارا دن..... اور اس دوران باہر کی دنیا میں کیا کچھ ہوگزرا تھا اس بارے میں بھی کوئی حتمی اندازہ نہیں لگایا جاسکتا تھا..... بس بے رحم اور سفاک اندیشے تھے بھیانک خدشات تھے جو اس کے دل و دماغ کو تہہ بالا کرنے پر تلے ہوئے تھے۔

آنکھوں کی تھمتی ہوئی رم جھم ایک بار پھر شدت اختیار کرگئی..... باپ بھائیوں اور ماں کی سلامتی اور بہتری کی دعائیں ایک بار پھر اس کے ہونٹوں سے جاری ہوگئیں..... سینے میں بوجھ اور گھٹن کا احساس شدت اختیار کرگیا..... سر درد سے پھٹنے لگا..... مزید بہت سا وقت یونہی گزر گیا..... وہ دیوار کے سہارے بیٹھی بیٹھی تھک گئی تو نڈھال سی ہوکر وہیں دیوار کی جڑ میں لیٹ گئی کئی گھنٹے اس طرح گزر گئے پھر ایک بار دوبارہ اس کی آنکھیں بوجھل ہونے لگیں۔ دماغ دھندلانے لگا، جسمانی زبوں حالی، ذہنی و اعصابی دباؤ، تھکاوٹ..... اسے معلوم بھی نہ ہوسکا کہ وہ کب دوبارہ اپنے گرد و پیش اور اپنے آپ سے بے نیاز ہوگئی۔ اس بار نیند نے مہربانی کی تھی اور اسے تمام اعصاب شکن، جاں گسل سوچوں خیالوں سے کہیں دور لے گئی تھی۔

کسی آہٹ کی آواز تھی جو اسے نیند کے حصار سے باہر کھینچ لائی۔ ایک مدقوق سی زرد روشنی میں اس نے دیکھا یہ نیچی چھت کا ایک کشادہ کمرہ تھا..... چھت میں موجود بلب روشن تھا جس کی ناکافی روشنی میں اس نے اس نحوست زدہ سے کمرے کو دیکھا..... فرش کچا تھا لیکن چھت اور دیواریں پختہ تھیں، کمرے میں کہیں کوئی کھڑکی، دروازہ یا روشن دان نہیں تھا البتہ سامنے والی دیوار کے بائیں کونے میں فرش سے لے کر چھت تک ایک خلا سا موجود تھا جیسے کوئی راہداری ہو..... آہٹ کی آواز بھی اسی طرف سے بلند ہوئی تھی..... وہ فوراً گھبرا کر دیوار کے سہارے اٹھ بیٹھی..... دل بری طرح دھڑک اٹھا تھا۔

وہ تین مسلح افراد تھے جو اس خلا سے نمودار ہوئے تھے۔

''چل بھئی گامے! باندھ سالی کو۔'' ایک شخص نے اپنے ساتھی کو مخاطب کیا اور وہ فوراً آگے بڑھ آیا۔ حجاب ہراسیمہ سی ان کی درشت صورتیں دیکھ رہی تھی۔ گامانامی وہ شخص حجاب کے سامنے آبیٹھا..... اس کے ہاتھ میں ایک کپڑا اور رسی تھی..... اس نے پہلے حجاب کے دونوں پاؤں رسی میں جکڑے پھر اسے بازو سے پکڑ کر دیوار سے تھوڑا آگے گھسیٹا اور اس کے دونوں ہاتھ پشت پر کرکے اچھی طرح کس دیئے..... حجاب اس قدر ڈری سہمی ہوئی تھی کہ ان کے سامنے کسی قسم کی کوئی حیل حجت تو کیا وہ آواز تک نہیں نکال سکی..... باقی دونوں افراد اس کے سامنے کھڑے اسے گھورتے رہے..... ہاتھ پاؤں باندھنے کے بعد گامے نے حجاب کے جبڑے پکڑ کر اس طرح دبائے کہ اس کا منہ خود بخود کھل گیا۔ گامے نے ہاتھ میں موجود کپڑا اچھی طرح اس کے منہ میں ٹھونسا اور اوپر سے ایک دوپٹہ نما کپڑا لپیٹ کر اس کی گدی پر گرہ لگادی۔

''چل اٹھالا.....'' وہ شخص واپس پلٹتے ہوئے بولا اور گامے نے حجاب کو اٹھا کر یوں کندھے پر ڈال لیا جیسے وہ کوئی چھوٹی سی بے وزن بچی ہو۔

''میرے ساتھ کون ہوگا؟'' تیسرے شخص نے سوال کیا تھا۔

''ظفر اور گلو..... باقی رستے میں تم لوگ اس چھنال کو حکم داد اور سانگھے کے حوالے کروگے اور پھر سیدھے کارخانے کا رخ کروگے۔''

''وہ رستے میں ملیں گے کس جگہ؟''

''جس جگہ بھی مل جائیں..... یہ تیری پریشانی نہیں ہے..... تجھے جتنا کہا ہے بس اتنا ذہن میں رکھ۔'' وہ آگے

اس سرنگ نما راہداری میں داخل ہوئے اور پندرہ بیس
دم چلنے کے بعد راہداری میں دائیں ہاتھ مڑ گئے .....
افراد آگے آگے تھے اور گاما حجاب کو کندھے پر لادھے ان
کے پیچھے۔

حجاب کے ذہن میں سائیں سائیں کی آوازیں گردش
کر رہی تھیں..... بے شمار سوال اس کے دماغ میں پھنکار
نے لگے تھے۔

''کیا ہونے والا ہے؟ یہ لوگ مجھے کہاں لے جا رہے
ں..... کیوں لے جا رہے ہیں..... بابا سائیں' زوار' کرار'
رار ماں جی' ایک ساتھ سبھی کی صورتیں اس کی نگاہوں میں
لوم گئیں..... وہ سب کہاں ہیں؟ کس حال میں ہیں؟ کیا
ھ ہو چکا ہے اور اب مزید کیا ہونے جا رہا ہے؟''

چند قدم چلنے کے بعد وہ عجلت آمیزی سے زینوں پر
ڑھتے ہوئے اوپر ایک دروازے تک پہنچے اور دروزے
سے نکل کر ایک طرف کو بڑھتے چلے گئے..... تازہ ہوا نے
یکدم حجاب کے حواسوں کو چھوا تھا..... اطراف میں موجود
ندھیرے سے اسے معلوم ہوا کہ رات کا وقت ہے۔ یعنی
یادہ نہیں بھی تو ایک پورا دن تو وہ اس تہہ خانے میں گزار
ی تھی۔

ایک بار پھر اس کی ذہنی رو اپنے والدین اور بھائیوں
ی طرف مڑ گئی..... اس کے اندر کوئی چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا
کہ ضرور کوئی نہ کوئی انہونی ہو گزری ہے..... ہو نہ ہو ضرور
کچھ ایسا روح فرسا واقع ہو چکا ہے جس کی تلافی..... ازالہ
ب کبھی نہ ہو سکے گا..... بصورت دیگر یہ تو کسی صورت ممکن
ں نہ تھا کہ وہ اتنی دیر تک یہاں قید رہتی اور اس کے بابا
بھائی اس تک نہ پہنچ پاتے۔

اندھیرے میں کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ ایک
ریکٹر ٹرالی کے پاس جا پہنچے..... ٹرالی میں بھاری بھرکم
ریاں لادھی جا رہی تھیں۔ حجاب کو انہوں نے ٹرالی کے
رمیان بوریوں کے بیچ میں بنی ایک خالی جگہ پر ڈال
یا تو وہی شخص حجاب پر جھک آیا جس نے گامے کو اس کے
نھ پاؤں باندھنے کے لیے کہا تھا۔

''اگر زندہ رہنا چاہتی ہے تو چپ چاپ اس جگہ پڑی
ہنا..... کوئی حرکت یا ڈرامہ شرامہ کرنے کی کوشش کی تو تیرا
حشر بہت برا ہو گا..... اتنا برا کہ تیرے فرشتے بھی نہیں سوچ
سکتے..... سمجھی؟''

وہ چند لمحے اسے گھورتا رہا پھر پیچھے ہٹ کر ٹرالی سے
نیچے اتر گیا..... بوریاں ایک بار پھر لادھی جانے لگیں.....
حجاب کے چاروں طرف بوریاں اس ترتیب سے رکھی گئی
تھیں کہ درمیان میں ایک قبر نما جگہ بچ گئی تھی جس میں
اس وقت حجاب بے بس بندھی پڑی تھی..... پھر اس قبر کے
اوپر بھی بوریاں رکھی جانے لگیں اور مزید کچھ ہی دیر میں
حجاب جیسے اس قبر میں دفن ہو کر رہ گئی..... ٹرالی کے اردگرد
نقل و حرکت کی آوازیں سنائی دیتی رہیں پھر ٹریکٹر سٹارٹ
ہونے کی آواز بلند ہوئی اور ٹرالی حرکت میں آ گئی۔ ساتھ
ہی حجاب کے کولہے اور کہنی میں تکلیف کی ایک لہر سی
کسمسائی اور وہ بہ دقت تمام کروٹ سی بدلتے ہوئے پہلو
کے بل ہو گئی۔

اس کے اطراف میں بھی بوریاں تھیں اور اوپر بھی
بوریوں کی دھاک سی لگی ہوئی تھی۔ سانس لینے میں کوئی
دقت نہیں تھی لیکن حبس کا احساس ضرور تھا..... بوریوں سے
خارج ہوتی مخصوص مہک بتا رہی تھی کہ ان میں چاول
بھرے ہوئے ہیں..... اس خیال ہی سے اس کے وجود میں
سرد لہر سی دوڑ گئی کہ اگر ٹرالی کی حرکت یا کسی جمپ جھٹکے سے
بوریاں اس کے اوپر آ گریں تو اس کا کیا بنے گا؟

ذلت اور صدمے کے شدید ترین احساسات نے اس
کے ہوش و حواس کو اس بری طرح شل کر رکھا تھا کہ بھوک
کا احساس ہونے کے باجود ابھی تک اسے کھانے کی طلب
نے پریشان نہیں کیا تھا' البتہ پیاس اسے ضرور بے حال
کرنے لگی تھی..... پانی کی شدید طلب محسوس ہو رہی تھی
لیکن سوائے صبر اور برداشت کے کوئی چارہ نہ تھا..... اس
نے محسوس کیا کہ ٹریکٹر ٹرالی حویلی سے نکلنے کے بعد گاؤں
کی ٹیڑھی میڑھی گلیوں سے ہوتی ہوئی جی ٹی روڈ کی طرف
بڑھ رہی ہے..... پتا نہیں اسے کہاں لے جایا جا رہا تھا اور
کیوں؟ یہ تو اسے معلوم تھا کہ لاہور ارگوجرانوالہ میں
چوہدریوں کی فیکٹریاں اور کارخانے ہیں مگر اس بات
کا اسے کوئی اندازہ نہیں تھا کہ راستے میں اسے کن کے
حوالے کیا جانے والا ہے' اور وہ لوگ اس کے ساتھ کیا

سلوک کریں گے؟

❁.....❁.....❁

اس نے نزہت جہاں بیگم کے کوٹھے پر آنکھ کھولی تھی ۔۔۔۔مسلے مرجھائے گجرے، باسی پھول اور گھنگرو اس کے کھلونے بنے تھے۔

ذرا ہوش سنبھالا تو اس صبح شام رنگ بدلتے ماحول نے اس کے دل و دماغ پر عجیب متضاد اثرات مرتب کرنے شروع کردیئے..... روشنیوں' رنگوں اور مسکراہٹوں سے چھلکتی یہاں کی راتیں بڑی زندہ اور بارونق ہوتی تھیں اور صبح جب وہ جاگتا تو سارا طلسم کہیں غائب ہو چکا ہوتا..... در و دیوار کے ساتھ ساتھ مکینوں پر بھی ایک نحوست زدہ سا اضمحلال اور مردنی چھائی ہوئی دکھائی دیتی..... سبھی کے رویے' انداز اور لہجے تک بدلے ہوئے ہوتے..... اس کا معصوم ذہن یہ سب محسوس تو کرتا تھا مگر سمجھنے سے قاصر رہتا تھا کہ یہ سب کیا گورکھ دھندہ ہے۔

اپنے گھر اور اردگرد کے تمام گھروں سمیت محلے بھر کی یہی حالت تھی..... یہی معمول' یہی طور اطوار تھے۔ یہاں سبھی کی سبھی عورتیں باجیاں تھیں..... یا پھر خالائیں' ایک حسن آراء نامی پیاری سی عورت تھی..... تھی تو وہ بھی باجی ہی مگر دوسری باجیوں سے بہت الگ..... بہت مختلف سی تھی وہ..... ہر وقت اس کے لیے پریشانی و فکرمند رہنے والی..... اس کے نہانے دھونے' پہننے' اوڑھنے' کھانے پینے غرض کہ اس کے ہر معاملے اور ضرورت و کام کا خیال رکھنے والی..... وہ اسے سلاتی بھی اپنے کمرے میں اپنے ساتھ ہی تھی..... اکثر دروازہ بند کرکے وہ اسے کہا کرتی تھی کہ اکیلے میں..... تنہائی میں تم مجھے اماں کہا کرو..... میں صرف دوسروں کے سامنے تمہاری باجی ہوں..... ویسے میں تمہاری ماں ہوں..... اس لیے تم تنہائی میں مجھے اماں' امی یا ماں جی کہا کرو۔'' اور جب وہ اس کا کہا مانتے ہوئے اسے امی یا ماں جی کہا کرتا تو اس کے چہرے پر عجیب رنگ بکھر جایا کرتے ..... چہرے پر ایک خوبصورت سی مسکراہٹ اتر آتی..... وہ نہال سی ہو کر اسے بازوؤں میں بھر کر یوں اپنے سینے سے لگالیا کرتی جیسے اسے اپنے جسم و جاں میں چھپالینا چاہتی ہو..... یہی وجہ تھی کہ وہ اسے باقی تمام باجیوں اور خالاؤں سے زیادہ اچھی..... زیادہ پیاری لگا کرتی تھی..... دوسری باجیاں یا خالائیں اسے ڈانٹتی ڈپٹتی بھی تھیں مگر باجی امی نے اسے کبھی نہیں ڈانٹا تھا' بلکہ جو کوئی اسے ڈانٹتا تھا باجی امی اس سے خفا ہو جایا کرتی تھی۔

عمر کے ساتھ ساتھ سمجھ بوجھ میں تھوڑا مزید اضافہ ہوا تو یہاں کے معمولات اور دوغلے ماحول کی حقیقت کا اسے کچھ کچھ اندازہ ہونے لگا..... ساتھ ہی اس کا ذہن ناگواری اور ناپسندیدگی کے احساسات سے بھی آشنا ہوا..... ناگواری اور ناپسندیدگی کے یہی احساسات پکتے پکتے تلخی اور ضد میں تبدیل ہوتے چلے گئے..... فطری طور پر وہ حساس واقع ہوا تھا..... باجی امی کے علاوہ باقی تقریباً سبھی کا رویہ اور برتاؤ اس کے ساتھ کچھ ایسا کرخت اور ہتک آمیز ہوتا تھا کہ وہ کم گو اور کم آمیز ہوتا چلا گیا..... مزاج میں گہری سنجیدگی' ضد اور غصے کے عناصر مضبوط سے مضبوط تر ہوتے گئے..... اس کا زیادہ تر وقت باجی امی کے کمرے میں گزرتا یا پھر محلے میں اسی جیسے اس کے دو دوست تھے..... جن کے ساتھ وہ گھوم پھر لیتا تھا..... ان دوستوں میں سے ایک کا نام ساون تھا اور دوسرے کا مراد' باقی یہاں کا ماحول اور لوگ اسے بالکل بھی پسند نہیں تھے۔

کوئی اسے شانی کہہ کر پکارتا' کوئی میرو تو کوئی شاہو کہتا..... کوئی بھی درست طریقے سے اس کا نام نہیں لیتا تھا حالانکہ اس کا نام بہت خوبصورت تھا..... خود اسے بھی اپنا نام اچھا لگتا تھا مگر باجی امی تک بھی اسے اس کے صحیح اور پورے نام سے مخاطب نہیں کرتی تھی البتہ وہ انتہائی پیار اور محبت بھرے انداز میں اسے میر صاحب یا میر بابو کہا کرتی تھی اور یہ انداز تخاطب کم از کم اسے برا یا ناگوار نہیں گزرتا تھا..... وہ شروع دن سے دیکھتا آیا تھا کہ باجی امی پابندی کے ساتھ پانچ دفعہ نماز پڑھا کرتی ہے..... عموماً نماز کے دوران اور بعد میں جب وہ جائے نماز پر بیٹھی ہوتی تو اس کی آنکھوں سے خاموشی کے ساتھ آنسو بہتے رہتے جن کا شاید خود باجی امی کو بھی احساس نہیں ہوا کرتا تھا..... امی کی دیکھا دیکھی وہ خود بھی جائے نماز پر کھڑا ہونے لگ گیا اور پھر یونہی غیر محسوس طریقے سے خود اسے بھی نماز کی عادت ہوتی چلی گئی۔

گلی محلے میں کھیل کے دوران لڑائی جھگڑا اور ہاتھا پائی ہو ہی جایا کرتی تھی لیکن ایک روز ایک ایسا واقعہ ہو گیا کہ ں سے پورا محلہ چونک اٹھا..... اس دن پہلی دفعہ سب نے محسوس کیا کہ یہ بچہ یہاں کے باقی تمام بچوں سے مختلف ہے..... بچوں سے لے کر بڑوں تک سبھی کی نظر میں وہ ب الگ امتیازی حیثیت اختیار کر گیا..... وہ دن..... وہ ں اس کی پہچان..... اس کی شناخت طے کر گیا تھا! اس ت اس کی عمر صرف ت یرہ چودہ برس تھی..... وہ چھت ے مغرب کی نماز پڑھ کر اترا تھا کہ باجی شگفتہ نے بے وجہ ں اس کی بے عزتی شروع کر دی..... اس نے احتجاجاً تراض اٹھایا تو بڑی خالہ نزہت جہاں نے آ کر اس کے ہ پر تھپڑ جما دیا..... وہ باہر چاچے گوگے پان والے کے وکھے کے ساتھ تھڑے پر آ بیٹھا..... موڈ بری طرح اب تھا اور ایسے میں الیاسا چوئی آ کر اس پر جگت بازی رنے لگ گیا..... وہ پہلے ہی الیاسے سے چڑتا تھا..... ں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا یا کھیلنا اس نے کبھی بھی پسند نہیں کیا اور اس وقت تو وہ ویسے ہی غصے سے بھرا بیٹھا تھا' سو اس نے الیاسے کو بری طرح جھڑک کر رکھ دیا..... ٹھیک اسی ت تھوڑے ہی فاصلے پر آگے پیچھے تین ٹش پش کرتے نگے آ کر رکے..... چہل پہل اور گہما گہمی کی شروعات ں..... سبھی لوگ ان تانگوں کی طرف متوجہ ہو گئے..... ن میں سے آگے والے تانگے پر رستم لہوری سوار تھا اور ہی دونوں تانگوں پر اس کے ہٹے کٹے آٹھ دس چیلے..... وہ ی گرامی بدمعاش تھا اور وہاں موجود کم و بیش سارے ہی ب اسے بخوبی جانتے پہچانتے تھے۔

الیاسا چوئی اس کے جھاڑ پلانے پر ایک ذرا تو ٹھٹک را اس کی صورت دیکھتا رہ گیا..... پھر اس نے اچانک اس لے منہ پر ایک چپت لگائی اور پلٹ کر بھاگ کھڑا ہوا..... ی خالہ کے طمانچے سے دہکا ہوا اس کا گال کچھ اور اسلگ ا..... اس نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے جھپٹ کر ساتھ ے بوتلوں کے کریٹ سے ایک بوتل نکالی اور تانگوں کی رف دوڑے جاتے الیاسے چوئی کی طرف کھینچ ماری..... تم لہوری تانگے سے اتر رہا تھا..... الیاسا چوئی رخ بدلتا ا بوتل سے بچ نکلا اور بوتل رستم لہوری کے پاؤں نیچے رکھتے ہی اس کے دونوں پیروں کے درمیان جا کر پختہ فرش سے ٹکرائی اور ایک چھناکے سے ٹوٹ کر' رستم کے بے داغ سفید لاچے اور پیروں کو داغ دار کرتی ہوئی بکھر گئی.....

اردگرد یکا یک ایک سکوت..... ایک پر ہول سی خاموشی اتر آئی۔ رستم لہوری نے جہاں پاؤں دھرے تھے وہیں جم کر رہ گیا..... ایک لمحے کو تو جیسے سبھی کو سانپ سونگھ گیا..... اگلے ہی پل بیسیوں حیران و پریشان نظریں اس پر اٹھیں..... رستم لاہوری کے چیلے یکا یک حرکت میں آئے اور اس کے سر پر پہنچ گئے..... ایک دو تھپڑ اسے مزید پڑ گئے..... ایک ہٹے کٹے شخص کا ہاتھ اس نے تھاما تو دوسرے نے گالی دیتے ہوئے اس کی گدی میں ایک دھپ رسید کر دی۔

''ادھر لاؤ اس کارٹون کو'' اچانک رستم لاہوری کی گرجدار آواز بلند ہوئی تو وہ سب ٹھٹک گئے..... فوراً ہی انہوں نے اسے دبوچ کر رستم لہوری کے سامنے جا کھڑا کیا اور خود سب پیچھے ہٹ گئے۔ چاروں طرف ایک سنسنی پھیل گئی تھی۔ سبھی اپنی اپنی جگہ ساکت کھڑے تھے..... رستم کے چہرے کے تاثرات بڑے خراب دکھائی دے رہے تھے..... اندھیرا ابھی پوری طرح نہیں چھایا تھا البتہ گلی' کوٹھوں اور بالا خانوں کی تمام روشنیاں جل چکی تھیں۔ کچھ جھروکوں اور دروازوں سے بھی گھبرائی سہمی سی آنکھیں یہ منظر دیکھ رہی تھیں۔

رستم لاہوری دونوں ہاتھ کولہوں پر جمائے' چند لمحے تو کھڑا اسے گھورتا رہا پھر آنکھ سے پیروں کی طرف خفیف سا اشارہ کرتے ہوئے بھاری آواز میں بولا۔

''صاف کر۔''

اس نے رستم لہوری کے پیروں کی طرف دیکھا..... اس کے پیروں میں کوہاٹی چپل تھی..... چپل پاؤں اور اس کے خوبصورت سفید لاچے پر پانی اور مٹی کے چھینٹے تھے..... پیروں کے اوپری حصوں پر کانچ کے ذرات کے ساتھ ساتھ چند ایک ننھے ننھے سے خون کے قطرے بھی چمک رہے تھے۔ اس نے نظریں اٹھا کر سامنے موجود اس بھاری بھرکم جن جیسے آدمی کے چہرے کی طرف دیکھا..... لاچے ہی کی طرح اس کا سفید کرتا بھی بے شکن اور اجلا تھا..... چوڑے جبڑے' بڑی بڑی سیاہ مونچھیں اور انگاروں جیسی

سرخ آنکھیں۔

'صاف کر.....' رستم نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سر کو اشارۃً جنبش دی۔

''میں نے جان بوجھ کر ایسا نہیں کیا...... میں نے تو اسے.....الیاسے کو بوتل ماری تھی۔''

اس نے گویا حکم کی تعمیل سے انکار کیا تھا...... رستم لہوری کی پیشانی پر شکنیں ابھر آئیں۔

''صاف کر۔'' وہ جیسے غرایا تھا۔

''جی! میں نے بتایا ہے کہ میں......'' اسکا جملہ اس کے منہ ہی میں جھنجھنا کر رہ گیا۔

رستم کے بھرپور تھپڑ نے اسے لڑکھڑا کر دو قدم پیچھے ہٹا دیا تھا...... ایک اور تھپڑ...... گال میں پھر سے آتشیں لہر سرایت کر گئی...... اس نے بے اختیار اپنے گال کو چھوتے ہوئے نفرت سے رستم لہوری کی طرف دیکھا تو رستم نے پھر سے اپنے پیروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

''صاف کر......''

وہ چند لمحے تو اپنی جگہ کھڑا رہا پھر دو قدم آگے بڑھ کر رستم کے سامنے بالکل تن کر کھڑا ہو گیا...... یہ گویا خاموش چیلنج تھا کہ میں ایسا نہیں کرتا...... تم! میرا سر جھکا سکتے ہو تو جھکا لو۔''

رستم کے چہرے پر ایک ذرا بے یقینی اور ایک تھوڑی حیرت کے آثار نظر آئے اور فضا ایک اور تھپڑ سے گونج اٹھی...... وہ دوبارہ لڑکھڑایا...... اور پھر سے رستم کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑ کر اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

اس بار رستم لہوری نے اسے بغور گھورا...... اس کے چہرے پر ایک پرعزم سی چمک تھی اور آنکھوں میں ضد اور غصے کی آگ...... رستم نے پھر اس کے منہ پر تھپڑ رسید کیا اور وہ لڑکھڑانے کے بعد پھر آگے بڑھ آیا...... رستم کے چیلے خاموش نظروں سے ایک دوسرے کی صورتیں تکنے لگے...... جھروکوں اور دروازوں میں ہاتھ بے اختیار کھل آنے والے ہونٹوں پر آ جمے...... اردگرد موجود لوگوں اور دکان داروں کی آنکھیں بھی جیسے آپس میں سرگوشیاں کرنے لگی تھیں۔

پھر سے 'چٹاخ' کی آواز بلند ہوئی اور وہ پھر سے دو قدم آگے بڑھ آیا...... رستم لہوری کا غصہ حیرت و بے یقینی میں تبدیل ہونا شروع ہو گیا...... یہ کہنا کوئی ایسا غلط نہیں ہو گا کہ پورے لاہور میں اس کے نام کا ڈنکا بجتا تھا اچھے اچھے بدمعاش اور پہلوان اس کا سامنا کرنے سے کتراتے تھے...... اور تو اور کئی ایک پولیس ملازمین بھی اس کے نام سے گھبراتے تھے...... خود اسے اپنی شخصیت کے رعب داعب کا بڑا گھمنڈ تھا اور آج...... آج ایک معمولی سا چھوکرا سر بازار اس کی شخصیت کا کچرا کیے جا رہا تھا۔ اس نے ایک اور تھپڑ مارا تو اسے اپنا ہاتھ سنسناتا ہوا محسوس ہوا...... لڑکے نے منہ میں بھر آنے والا خون حقارت سے ایک طرف تھوکا اور پھر سے رستم کے سامنے تن کر کھڑا ہو گیا...... اس کی شعلے اگلتی آنکھیں مسلسل رستم کی آنکھوں میں گڑی ہوئی تھیں۔ اس بار رستم ایک ذرا اس کی آنکھوں میں جھانکتا رہا پھر اس نے الٹے ہاتھ سے اس چھوکرے کے دوسرے گال پر تھپڑ رسید کر دیا...... اس کے منہ سے نکلتے خون کو دیکھ کر شاید رستم کو اندازہ ہو گیا تھا کہ اندر سے اس کا گال پھٹ چکا ہے...... ساتھ ہی رستم کا ذہن برق رفتاری سے اس چھوکرے کے متعلق فیصلہ کرنے میں مصروف ہو گیا۔

یقینی بات تھی کہ وہ تھا تو کوئی طوائف زادہ ہی لیکن اس کے نین نقش...... روپ...... اس کے رنگ ڈھنگ اور تیور...... یہ سب شاہوں اور سرداروں والا تھا...... اس کے اندر یقیناً ایک غیر معمولی روح تھی اور وہ خود کسی غیر معمولی انسان کی بازگشت...... رستم نے دیکھا کہ اگر اندر سے اس کا گال پھٹا تھا تو اسی طرف...... بھنو کے نیچے سے بھی خون رسنا شروع ہو آیا تھا لیکن وہ چھوکرا...... وہ پھر اس کے روبرو اسی طرح اکڑ کر سر اٹھائے کھڑا تھا۔

''نہیں مانتا میں تمہارا حکم...... تم جو کر سکتے ہو کر لو مجھے مرنا گوارا ہے مگر محکوم ہونا نہیں...... میں سراپا احتجاج ہوں اور یونہی رہوں گا۔'' وہ جیسے با زبان خاموشی یہی سب کہہ رہا تھا۔

اس بار رستم اسے تھپڑ مارتے ہوئے قدرے متذبذب تھا...... چھوکرا دوبارہ آگے بڑھنا چاہتا تھا کہ اچانک ا...

عورت دائیں طرف سے بھاگتی ہوئی آئی اور اس چھوکرے سے لپٹ گئی۔

''مت مارو..... مت مارو اسے، بچہ ہے..... اس کا اور تمہارا بھلا کیا جوڑ..... کیا مقابلہ! معاف کردو اسے۔''

رستم لہوری کو تو یہاں کے سبھی مکین جانتے تھے البتہ وہ زیادہ لوگوں کو نہیں جانتا تھا کیونکہ وہ کوٹھوں اور طوائفوں میں دلچسپی رکھنے والا بندہ نہیں تھا۔ آج بھی وہ ادھر آیا تو کسی اور کام سے تھا..... لیکن یہاں پہنچتے ہی یہ تماشا بن کھڑا ہوا تھا..... وہ زیادہ تر لوگوں کو نہیں جانتا تھا مگر جن چند ایک کو جانتا یا پہچانتا تھا..... حسن آراء بھی انہی میں سے تھی..... اس کی اس طرح مداخلت، چہرے کی گھبراہٹ اور لہجے کی تڑپ سے صاف ظاہر تھا کہ یہ چھوکرا اسی کا لختِ جگر ہے۔

''کیا..... کیا غلطی کی ہے اس نے..... کیا کیا ہے؟''

حسن آراء نے فوراً اسے بازو سے پکڑ کر ایک طرف کھینچ لیا۔ بیٹے کے خون آلود ہونٹ اور زخمی رخسار دیکھ کر اس کے ہونٹوں سے بے اختیار ایک سسکاری سی نکلی..... آنکھوں میں فوراً ہی آنسو تیر گئے..... اردگرد بیسیوں افراد موجود تھے پھر بھی ایک سناٹے کا عالم تھا۔ رستم کے چیلے بھی اپنی اپنی جگہ حیران و پریشان سے خاموش کھڑے تھے۔

''ہائے میرے اللہ!'' حسن آراء جیسے روہانسے انداز میں کراہی تھی..... ''ایک بچے کو کتنی بے دردی سے پیٹا ہے..... اپنی بہادری اور طاقت ثابت کرنے کے لیے اس معصوم کی جان لے لوگے کیا؟ معاف کردو اسے..... اس کی..... اسکی طرف سے میں معافی مانگتی ہوں تم سے۔''

حسن آراء نے باقاعدہ رستم لہوری کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے..... چھوکرے نے فوراً اس کے ہاتھ تھام کر سینے سے لگا لیے۔ وہ منہ سے کچھ نہیں بولا البتہ اپنی آنچ دیتی آنکھوں سے برابر رستم کی آنکھوں میں دیکھتا رہا..... رستم تھا کہ اس نے تانگے سے اترتے ہوئے جہاں پاؤں رکھے تھے، ہنوز وہیں جما کھڑا تھا..... چند لمحے وہ چپ چاپ کھڑا یک ٹک اس چھوکرے کو تکتا رہا..... پھر اس نے رخ بدلا اور تانگے پر سوار ہو گیا..... اس کے چیلوں نے اس کی تقلید کی اور تینوں تانگے واپس روانہ ہو گئے۔ فوراً ہی یہ پورا واقع سرسراتا ہوا سارے محلے میں پھیل گیا۔ حسن آراء اسے اپنے کمرے میں لے آئی۔ وہ مسلسل آنسو بہاتی رہی اور اس کے منہ..... اس کے چہرے کی ٹکوریں کرتی رہی..... کوٹھے کی روایات اور مصروفیات سے تو وہ گزشتہ کئی سالوں سے کٹی ہوئی تھی۔ بس کبھی کبھار کسی گیت غزل کی حد تک وہ صاحب ذوق مہمانوں کی تسکین کا کچھ سامان کر دیا کرتی ورنہ زیادہ تر تو بیمار ہی رہتی تھی..... تقریباً اپنے کمرے تک محدود ہو چکی تھی وہ.....

اس تکلیف دہ واقعہ کے بعد رات گئے جب بازار کی رونقیں اپنے شباب کے عروج پر پہنچی ہوئی تھیں لوگوں نے دیکھا کہ وہی تینوں تانگے ایک بار پھر بازار میں داخل ہوئے اور سیدھے نزہت جہاں بیگم کے کوٹھے کے سامنے جا رکے..... رستم اور اس کے بندے تانگوں سے اتر کر تیزی سے اوپر جاتے زینوں کی طرف بڑھے تو ایک ذرا تو دیکھنے والی آنکھوں پر سکتے کی سی کیفیت اتر آئی۔ رستم لہوری کی دوبارہ آمد کی خبر سنسنی خیز سرگوشیوں کی صورت چاروں طرف دوڑ گئی۔ حسن آرا اس وقت اس کا سر اپنی گود میں رکھے ہولے ہولے سے اس کا سر دبا رہی تھی اور بار بار اپنے رخساروں پر بہہ آنے والے آنسو پونچھ رہی تھی..... اس کا سر دوپٹے میں بندھا ہوا تھا..... حسن آراء نے دو گولیاں بھی کھلا دی تھیں پھر بھی درد میں کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔ وہ ماں کی گود میں سر رکھے، آنکھیں بند کیے لیٹا ہوا تھا..... ہال میں محفل اپنے جوبن پر تھی کہ اچانک ساز خاموش ہو گئے..... آوازیں تھم گئیں..... باہر ایک ہلچل، ایک افراتفری سی محسوس ہوئی اور چند ہی لمحوں بعد رستم لہوری دروازہ کھولتا ہوا کمرے کے اندر آن کھڑا ہوا۔

اس کے جسم پر وہی سفید کرتا اور داغ دار لاچا تھا۔ چہرے پر گہری سنجیدگی اور آنکھوں میں ایک عجیب سا اضطراب..... حسن آراء کا دل دھک سے رہ گیا..... وہ بھی رستم کے اس طرح اندر داخل ہونے پر ایک جھٹکے سے اٹھا اور پلنگ سے نیچے اتر کھڑا ہوا..... سر پر بندھا ہوا دوپٹہ اس نے فوراً ہی اتار کر پلنگ پر اچھال دیا تھا۔

رستم چند لمحے اس کی صورت تکتا رہا..... چھوکرے

کا منہ سوجھا ہوا تھا..... تھپڑوں کی وجہ سے اس کا ایک گال تو پوری طرح سیاہی مائل نیلاہٹ اختیار کیے ہوئے تھا اور دوسرے گال پر بھی انگلیوں کے نشان واضح تھے..... لیکن اس کے تیور اب بھی وہی تھے..... اس کے چہرے یا آنکھوں میں رستم کو کسی ڈر خوف یا گھبراہٹ کی پرچھائیں تک نظر نہیں آرہی تھی۔

رستم اس کی طرف بڑھا تو حسن آرا فوراً اسے ایک طرف ہٹاتے ہوئے خود سامنے آ کھڑی ہوئی۔

''رستم!..... یہ ناسمجھ بچہ ہے..... میں نے پوچھا ہے..... وہ ایک اتفاقیہ غلطی ہوئی ہے اس سے اور..... اور پھر تم اچھی خاصی سزا بھی دے چکے ہو اسے..... خدا کے لیے اب اسے کچھ مت کہو۔''

حسن آراء کی آواز بھیگی ہوئی تھی..... رخساروں پر آنسو پھسل رہے تھے..... کمرے کے باہر سے کچھ ایسی آوازیں سنائی دیں جیسے نزہت بیگم اندر آنا چاہ رہی ہو لیکن غالباً دروازے کے باہر موجود رستم کے بندوں نے اسے وہیں روک لیا تھا۔ رستم رک کر حسن آراء کی صورت دیکھنے لگا..... پھر اس کی آنکھیں س کے برابر کھڑے اس چھوکرے پر آ ٹکیں جو اب بھی کڑی نظروں سے اسے گھور رہا تھا..... وہ چند لمحے اپنی جگہ خاموش کھڑا رہا..... اس کے چہرے پر عجیب کشمکش کی دھوپ چھاؤں سی پھیلی ہوئی تھی جیسے فیصلہ نہ کر پا رہا ہو..... یا پھر کچھ کہنے کے لیے مناسب الفاظ سوچ رہا ہو..... پھر وہ ایک گہرا سانس چھوڑتے ہوئے متحمل انداز میں بولا۔

''بائی جی! مجھے افسوس ہے کہ میری طرف سے اس چھوکرے کے ساتھ زیادتی ہوگئی..... اس وقت میں اسے کوئی سزا دینے نہیں بلکہ اس سے معافی مانگنے آیا ہوں۔''

حسن آراء کو جیسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔

''بندہ بندہ جانتا ہے کہ رستم لہوری نے کبھی کسی سے ناحق زیادتی نہیں کی۔'' وہ کھڑا بول رہا تھا۔ اس حوالے سے کوئی مجھ پر انگلی نہیں اٹھا سکتا..... مگر آج شام جو ہوا' اس نے مجھے میری ہی نظروں میں شرمندہ کر دیا ہے..... بس کیا کروں..... کھوپڑی بڑی جلدی گرم ہو جاتی ہے میری..... غصہ آ گیا تھا سو زیادتی کر گیا چھوکرے کے ساتھ..... لیکن رب سوہنا جانتا ہے کہ یہ تین چار گھنٹے کیسی کرب ناک بے چینی میں گزرے ہیں میرے..... اس وقت سے اب تک پانی کا گھونٹ تک حلق سے نہیں ترا' بس اسی لیے اٹھ کر چلا آیا کہ جب تک اپنی اس زیادتی کی تلافی نہیں کر لوں گا دل و دماغ کا بوجھ کم نہیں ہوگا!''

حسن آراء کے چہرے پر ایک پراطمینان سی حیرت اتر آئی۔ رستم کا لہجہ اور چہرہ اس کے کہے کی تائید کر رہا تھا..... آج پہلی بار حسن آرا کو یقین آیا کہ رستم لہوری کے متعلق جو قصے مشہور ہیں وہ سچ ہوں گے..... اسکے برابر کھڑے اس کے لخت جگر کے تاثرات بھی نرم پڑ گئے..... آنکھوں میں دہکتی آگ کی تپش بھی مدھم پڑ گئی تھی۔

رستم دھیمے قدموں سے آگے بڑھ کر اس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

''کیوں شہزادے..... تیرا کیا خیال ہے؟ غلطیاں تو سبھی سے ہوتی ہیں..... بچوں سے بھی' بڑوں سے بھی..... غلطی مان لینے والے کو معاف کر دینا چاہیے یا نہیں؟'' وہ جواب تک براہ راست اس کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا' اس نے نظریں جھکا لیں..... اسے محسوس ہوا کہ یہ وہ بدد ماغ اور ظالم شخص نہیں ہے جو چند گھنٹے پہلے جبراً اسے اپنے قدموں میں جھکانا چاہ رہا تھا یہ تو کوئی اور ہی تھا..... یہ شخص تو اس کے سامنے خود جھکتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات فوراً ہی اعتدال پر آ گئے۔

رستم نے پاؤں کی مدد سے ایک طرف پڑی تپائی کو گھسیٹ کر قریب کیا اور تپائی پر بیٹھتے ہوئے اس نے چھوکرے کو بھی بازو سے پکڑ کر نرمی سے اپنے قریب ہی پلنگ پر بٹھا لیا..... حسن آرا اپنے آنسو پونچھتی اور دوپٹہ سنبھالتی ہوئی پلنگ کے دوسرے کونے پر بیٹھ گئی تھی۔

''چل شہزادے..... اب ناراضگی ختم کر یا پھر جس طرح چاہے اپنا غصہ نکال لے' میں تیرے سامنے بیٹھا ہوں۔''

''آپ نے غصے ناراضگی کی گنجائش ہی ختم کر دی ہے' اب کیا غصہ دکھاؤں؟''

اس کے پرسکون انداز پر رستم کا چہرہ کھل اٹھا۔

''اگر یہ بات ہے تو پھر ملا رستم سے ہاتھ۔''

اس نے ایک نظر رستم کے آگے بڑھے مضبوط اور چوڑے ہاتھ پر ڈالی پر نظریں اٹھا کر اس کی چہرے کی طرف دیکھا۔

''ہاتھ ملانے کا مطلب؟'' اس کے سوال پر رستم مسکراتے ہوئے بولا۔

''ہاتھ ملانے کا مطلب..... ہاتھ ملانے کا مطلب ہوا کہ ہماری آپس میں کوئی رنجش نہیں' ہم دوست ہیں۔''

''دوست.....''

'ہاں دوست.....' اور رستم دوستی کا مطلب خوب جانتا ہے۔''

شہزادہ چند لمحے اس کی صورت دیکھتا رہا پھر اس نے اپنا ہاتھ رستم کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

''او خیر میرے شہزادے کی..... دل خوش کر دیا تو نے قسم سے..... ورنہ آج تو رستم لہوری سو بھی نہ پاتا۔'' رستم نے کہا پھر دروازے کی طرف دیکھ کر قدرے بلند آواز میں بولا۔

''اوئے نصیرے..... دلاور! منہ مٹھا کراؤ اوئے! ہماری دوستی ہوگئی ہے۔''

اس کی آواز پر فوراً ہی دو بندے اندر داخل ہوئے..... دونوں ہی سامان سے لدے پھندے تھے۔ انہوں نے آتے ہی رنگ برنگے شاپر رستم کے سامنے رکھ دیئے۔ کچھ سامان پلنگ پر رکھ دیا گیا..... ایک نے مٹھائی کا ڈبہ کھول کر رستم کے سامنے کیا تو دوسرے نے ایک شاپر سے کانچ کے گلاس نکالا اور ایک تھیلے سے ڈرم نما تھرماس برآمد کر لیا۔

رستم نے ڈبے سے برفی کا ایک ٹکڑا اٹھایا اور شہزادے کے ہونٹوں کی طرف بڑھایا۔

''لے رستم کی جان! اپنی دوستی کی خوشی میں منہ مٹھا کر۔''

اس نے حیران نظروں سے ان رنگ برنگے شاپروں کی طرف دیکھتے ہوئے برفی کا وہ ٹکڑا رستم کے ہاتھ سے لے لیا..... رستم نے ایک ٹکڑا اپنے لیے اٹھایا اور اس کی آنکھ کا اشارہ سمجھتے ہوئے اس کا بندہ مٹھائی کا ڈبہ حسن آراء کے ہاتھوں میں تھما کر خاموشی سے باہر نکل گیا۔

''یہ..... یہ سب کیا ہے؟'' حسن آراء نے متحیرانہ انداز میں سوال کیا تھا۔

''یہ میرا دوستانہ خلوص ہے..... اپنے شہزادے کے لیے۔''

دوسرے بندے نے تھرماس سے دودھ کا گلاس بھر کر رستم کو تھمایا اور پھر وہ بھی الٹے قدموں باہر نکل گیا۔

''لے میری جان! یہ ہلدی ملا دودھ پی..... غٹا غٹ چڑھا جا۔'' رستم نے گلاس اسے تھمایا اور ایک بڑا سا شاپر اٹھا کر اس کے برابر پلنگ پر الٹ دیا..... پلنگ پر فروٹ کا ڈھیر سا لگ گیا تھا۔

''یہ سارا فروٹ تو نے اکیلے نے کھانا ہے..... سمجھا۔'' رستم نے اس کے بالوں میں انگلیاں ہلاتے ہوئے کہا اور ایک سیب خود اٹھا لیا..... دونوں ماں بیٹا حیران نظروں سے کبھی سامان کے اس ڈھیر کو دیکھنے لگتے اور کبھی رستم کی صورت..... وہ واقعی کھلے دل کا ایک کمال بندہ ثابت ہوا تھا..... اپنی زیادتی کا اسے احساس ہوا تھا تو اس نے آ کر برملا اپنی غلطی تسلیم کر لی تھی اور اپنے طریقے سے اپنی زیادتی کی تلافی کی بھرپور کوشش بھی..... وہ دس پندرہ منٹ مزید بیٹھا شہزادے سے باتیں کرتا رہا پھر اجازت لیتا ہوا اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھ گیا..... دروازے کے قریب پہنچ کر وہ ٹھٹک کر رک گیا۔

''لو..... یہ تو مجھے خیال ہی نہیں آیا۔'' اس نے اپنی گدی میں ایک چپت رسید کی اور پلٹ کر دوبارہ اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

''اتنی باتیں بھی ہوگئیں..... دوستی بھی ہوگئی' مگر میں اپنے اس چھوٹے دوست کا نام پوچھنا بھول ہی گیا۔'' اس کے چہرے پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

شہزادے نے ایک نظر ماں کی طرف دیکھا' پھر رستم کی طرف متوجہ ہوا۔

''شانی..... میرو..... شاہو۔''

''ہائیں۔'' رستم نے نا سمجھنے والے انداز میں پلکیں جھپکائیں..... ''یہ کیسا نام ہے بھئی! مجھے سمجھ نہیں آئی۔''

''کوئی مجھے شانی کہتا ہے' کوئی میرو تو کوئی شاہو..... آپ کا جو دل چاہے کہہ لیں۔''

اس کے جواب پر رستم کے چہرے پر سنجیدگی اتر آئی...... وہ دوبارہ اس کے سامنے تپائی پر بیٹھ گیا۔

''دیکھ شہزادے!'' رستم نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے ٹھہرے ٹھہرے انداز میں کہا۔

''زندگی میں کبھی کسی کو یہ حق اور اختیار مت دینا کہ وہ تیری پہچان...... تیری شناخت طے کرے...... اگر ایسا کرے گا تو تیری اپنی کوئی شناخت ہی نہیں رہے گی...... تو زندگی میں اپنی کوئی پہچان نہیں بنا پائے گا...... تجھے کچھ اندازہ ہے کہ رستم لہوری کیوں چل کر تیرے پاس آیا ہے؟''

وہ چپ چاپ سوالیہ نظروں سے اس کی صورت دیکھتا رہا تو رستم خود ہی بولا۔

''میں نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے...... شیطانوں سے تو واسطہ رہتا ہی ہے رحمان کے بندوں کی صحبت بھی پائی ہے...... لوگوں اور دنیا کو بہت قریب سے دیکھتا آیا ہوں میں...... شام کو تجھ سے سامنا ہوا...... دیکھا تجھے...... تیری آنکھوں کی آگ اور تیرے اندر کی آزاد روح کو محسوس کیا ہے میں نے...... تو بھی اپنے اندر جھانک کر دیکھنے کی کوشش کرنا...... یہاں کے دوسرے چھوکروں کی طرح زندگی نہیں گزارنی تو نے...... تو...... تیرا اصل کچھ اور ہے...... اسے پہچان اور ہمیشہ اس کی حفاظت کرتے رہنا...... میری بات سمجھ رہا ہے نا؟''

رستم کے تائید طلب انداز پر اس نے اثبات میں آہستہ سے سر ہلایا۔ اس کی سوچتی ہوئی سی آنکھیں رستم کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں...... رستم کی یہ باتیں حسن آرا کے ذہن میں ایک دریچہ وا کر گئیں...... ایک پر رعب اور باوقار چہرہ اس کی آنکھوں میں لہرایا دل میں ایک ٹیس سی تڑپی اور دو خاموش آنسو اس کے رخساروں پر لڑھک آئے......!

''چل پھر اب بتا...... کیا نام ہے تیرا؟'' رستم کے سوال پر اس کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی۔

''میر شاہ نواز ارشد۔''

''واہ بھئی! میر...... شاہ نواز'' رستم کے چہرے پر واضح پسندیدگی کا تاثر ابھر آیا...... اس نے ایک نظر حسن آراء پر ڈالی اور دوبارہ شاہ نواز کی طرف دیکھنے لگا۔

''بادشاہوں کو نوازنے والا...... نوازنے والوں کا سردار...... '' میر شاہ نواز ارشد......'' بڑا سوہنا نام ہے تیرا تو شہزادے! پھر بھلا یہ شانی' میرو اور شاہو کیوں؟''

''بس جس کا جو دل چاہتا ہے وہ ویسے ہی بلاتا ہے۔''

''اور تیرا دل...... تیرا دل کچھ نہیں چاہتا...... تجھے یہ شانی' میرو اور شاہو کہلوانا اچھا لگتا ہے کیا؟''

''نہیں تو......'' اس نے بے ساختہ کہا تھا۔

''تو بس پھر...... آج کے بعد شانی' میرو اور شاہو کہنے والوں کی کوئی بات مت سننا' ماننا...... سب سے پہلا اور بنیادی کام ہی یہی ہے...... اپنے نام کی حفاظت...... اپنا نام منوا شاہ نواز...... اپنا نام خود بتا سب کو۔'' رستم نے اس کی پیشانی چومی۔

''اب میں چلتا ہوں...... میری دو باتیں اگر دل مانے تو ان پر ضرور عمل کرنا' پہلی یہ کہ تجھے اپنی پہچان' اپنی شناخت خود بنانی ہے اور دوسری...... اپنی زندگی کا ہر چھوٹا بڑا فیصلہ ہمیشہ خود کرنا...... رب راکھا۔''

رستم لہوری نے اس کا کندھا تھپتھپایا اور پھر بغیر رکے کمرے سے نکلتا چلا گیا...... وہ چلا گیا لیکن اس لڑکے شاہ نواز کی سوچوں کو ایک مخصوص رخ دے گیا...... ایک ایسا رخ جو اس کے مزاج...... اس کی شخصیت...... اس کی آئندہ شناخت کی باقاعدہ سمت طے کر دینے کا گیا۔

(ان شاء اللہ باقی آئندہ ماہ)

Pakistanipoint.com
Waqar Azeem